وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ

کتاب

تفہیمِ اسلام

بجواب

"دو اسلام"

یعنی

احادیثِ رسول ﷺ کے متعلق پیدا کردہ مغالطوں کا کامیاب ازالہ

از

مولانا مسعود احمد صاحب بی۔ ایس سی (کراچی)

ناشر

اہلِ حدیث اکادمی کشمیری بازار لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر ۸

مطبع ـــــــــــ اشرف پریس۔ لاہور
طابع ـــــــــــ شیخ محمد اشرف کشمیری بازار۔ لاہور
ناشر ـــــــــــ اہلحدیث اکادمی کشمیری بازار۔ لاہور
تعداد ـــــــــــ ایک ہزار
تاریخ ـــــــــــ شعبان ۱۳۸۶ھ، نومبر ۱۹۶۶ء
قیمت ـــــــــــ ۱۰ روپے

گروہ ایک جویا تھا علمِ نبی کا — لگایا پتا جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذبِ خفی کا — کیا قافیہ تنگ ہر مدّعی کا

کئے جرح و تعدیل کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو — اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازنِ علمِ دیں جس بشر کو — لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو

پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزا اس کا چکھ کر

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا — مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا — ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا

طلسمِ ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ مُلّا کو چھوڑا، نہ صوفی کو چھوڑا

(حالیؒ)
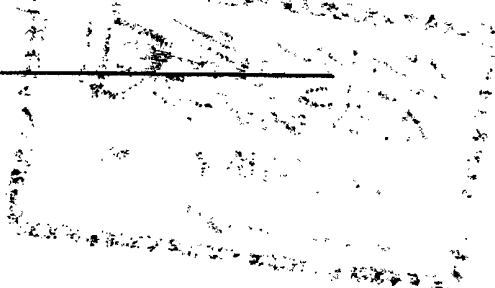
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

تصدیر

صحیح تعلیمات اسلامی خصوصاً حدیث شریف اور علمائے اسلام کے متعلق انگریزی تعلیم یافتگان اُن سے وابستگان اور متاثر حضرات میں جو بڑی بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اُن کا ایک بڑا مرقع محترم ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برق کی مشہور کتاب " دو اسلام " ہے جس کا موضوع علمائے کرام کی عمومی تضحیک حدیث شریف کا استخفاف بلکہ انکار اور شعائر اسلامی کے احترام سے بے اعتنائی ہے۔ چونکہ تقریباً ساری کتاب ہی غلط فہمیوں یا مغالطوں پر مبنی ہے اس لیے متعدد اہل قلم کو اس کے جواب کے لیے قلم اٹھانا پڑا۔ جہاں تک مجھے علم ہے سب سے پہلے جماعت اہل حدیث ہندوستان کے ایک بزرگ عالم حضرت محمد داؤد صاحب رازؔ نے " خالص اسلام " تالیف فرمائی اور شائع کی جو قدرۃً برقؔ صاحب کا جواب ہونے کے باوجود بہت عمدہ اور دلچسپ ہے۔ مولانا رازؔ کے علاوہ بھی بعض اہل قلم نے اپنے اپنے انداز سے جواب لکھے اور حق یہ ہے کہ ہر شخص نے بساط بھر قابل قدر کوشش فرمائی جزاہم اللہ تعالیٰ۔ چند سال ہوئے راقم کا کراچی جانا ہوا اور مکرم مولانا مسعود احمد صاحب بی۔ ایس۔ سی سے ملاقات ہوئی۔ دوران ملاقات اُن کے ہاں ایک مسودہ دیکھا۔ معلوم ہوا کہ موصوف اپنے ہفتہ واری حدیث شریف کے دروس میں برقؔ صاحب کی کتاب " دو اسلام " کے اعتراضات پر تفصیل سے گفتگو کیا کرتے تھے جن کو مولوی عبدالسلام صاحب بریلوی قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ اور یہ مسودہ ان ہی دروس حدیث کی تنقیح شدہ شکل ہے۔ راقم نے اُس کو دیکھا تو اس کا اسلوب ایسی دل آزار قسم کی تحریروں کے عام جوابات سے مختلف پایا، سنجیدہ، متین اور ناصحانہ جیسے کہ مغالطوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کسی شخص کو سمجھا رہے ہوں۔ علاوہ ازیں ایک خاص بات یہ محسوس ہوئی کہ فتنہ پرداز لوگ جن روایات و احادیث کو عام طور پر ہدف طعن بناتے ہیں اُن کے جوابات تحقیقی لیکن عام فہم اور محتاط انداز میں اس کتاب میں یکجا طور سے آ گئے ہیں۔ بنا بریں خیال ہوا کہ اس سلسلہ میں دوسری کتابوں کے باوجود اس کتاب کو شائع ہو جانا چاہئے۔ بہت ممکن ہے اس کے مطالعے سے احادیث شریفہ کے متعلق بہت

سے خلجان اور مغالطے رفع ہو سکیں اور بتوفیقہٖ تعالیٰ، ارواحِ سعیدہ پر مؤلف کا جذبۂ اخلاص اثر افگن ہو۔ اگرچہ ڈاکٹر برقؔ صاحب نے غالباً خاندانی تاثیر کے باعث "دو اسلام" کے موقف سے فی الجملہ رجوع کا مکرّر اعلان فرما دیا ہے (ہفت روزہ چٹان لاہور)

لیکن اوّلاً اُن کی کتاب شائع و ذائع ہے۔ ثانیاً اس کے مندرجات اسی پھیلے ہوئے فتنۂ انکارِ حدیث کی بار بار کی کہی ہوئی باتیں ہیں جس سے عموماً جدید تعلیم یافتہ جلد متأثر ہو جاتے ہیں۔ ثالثاً کیا عجب کہ مؤلف "دو اسلام" کے بقایا شکوک و شبہات اگر کچھ باقی رہ گئے ہوں تو وہ دُور ہو جائیں وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ غرضیکہ بریں وجوہ جن کی بنا پر راقم نے "اہلِ حدیث اکادمی" کے منصرم، مکرم شیخ محمد اشرف صاحب کے سامنے اس کتاب کی اشاعت کی تجویز رکھی تو انہوں نے منظور کر لیا۔ جزاہ اللہ تعالیٰ۔ چنانچہ "تفہیم اسلام بجواب دو اسلام" کے نام سے "اہلِ حدیث اکادمی" کے سلسلۂ مطبوعات کی یہ آٹھویں کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش ہو رہی ہے۔

ایک عظیم غلط فہمی کا ازالہ

جب غلط فہمیوں کے ازالہ ہی کی ٹھہری تو کیوں نہ ایک ایسی عظیم غلطی کے ازالہ کی کوشش کر لی جائے جو مولانا شبلی مرحوم (مقدمہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) سے لے کر اب تک کے ایسے لوگوں میں موجود چلی آ رہی ہے جو اس مبحث میں نہایت نیک نیتی سے بھی کچھ لکھتے ہیں اور جس سے برقؔ صاحب نے بھی "دو اسلام" میں فائدہ اٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ "کسی بھی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے یہ دیکھا جائے گا کہ وہ قرآن مجید کے خلاف تو نہیں" اور سہارا اس میں لیا جاتا ہے چھٹی صدی ہجری کے حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ کے اس قول کا

وکل حدیث رایتہ یخالف العقول او ینا قض الاصول فاعلم انہ موضوع ... او یکون مما یدفعہ الحس والمشاہدۃ او مباینا لنص الکتاب والسنۃ المتواترۃ او الاجماع (فتح المغیث للسخاوی ص ۱۱۲ طبع لکھنؤ)

یعنی "موضوع (جھوٹی) روایت کی علامت یہ ہے کہ عقل، "اصول" محسوسات و مشاہدہ، نص قرآنی متواتر حدیث اجماع .... میں سے کسی ایک کے خلاف ہو"

لیکن ذہن کو ہر طرح کے تاثرات سے الگ کر کے دیکھا جائے تو پہلی نظر میں معلوم ہو سکتا ہے کہ ابن جوزی رحمہ اللہ کے اس فرمان میں صحیح حدیث کے پہچاننے کا طریق نہیں بیان ہو رہا ہے بلکہ موضوع روایتوں کی

علامت بتانا انکے پیش نظر ہے جس کی وضاحت خود انہی سے تدریب الروی (ص۱۰۶ الطبع جدید) میں منقول ہے
قال (یعنی ابن الجوزی) ومعنی مناقضته للاصول ان یکون خارجاً من دواوین
الاسلام من المسانید والکتب المشهورۃ اھ یعنی کسی روایت کے "مخالف" اصول" ہونے کا مطلب
یہ ہے کہ وہ متداول ومشہور کتب حدیث (مثلاً صحاح ستہ، سنن دارمی، موطا امام مالک، مصنف عبدالرزاق
وغیرہ) اور مسانید (مسند امام احمد، مسند حمیدی وغیرہ) میں موجود ہو" یعنی دَور تدوین وتالیف کتب حدیث
کے بعد جو بچی کھچی روایات چھٹی صدی (یعنی ابن جوزی کے زمانے) میں اِدھر اُدھر پھیل کر گمراہی کا سبب بن
رہی تھیں اور جن سے غرض مند فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ان کی پہچان کے لیے یہ قاعدہ بنایا جس نے بھی
بنایا۔ لہذا صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن اربعہ وغیرہا مستند کتابوں کی احادیث کو اس "اصول" کے تحت
پرکھنا درست نہیں اور ایسا کرنا فن حدیث سے ناواقفیت پر مبنی ہوگا۔ ھذا وللتفصیل موضع آخر دعا ہے کہ
اللہ تعالیٰ "تفہیم اسلام" کے مؤلف، مرتب وناشر کی اس خدمت حدیث اور انتصار علماء کرام کو قبول
فرمائے اور ہم سب کو اعتقاد میں پختگی اور عمل میں اخلاص سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔ والحمد للہ
اولاً وآخراً وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ وبارک وسلم

عاجز ابو الطیب محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

مدیر: المکتبۃ السلفیہ لاہور۔

۲۵ رجب الخیر ۱۳۸۷ھ

فہرست مندرجات کتاب تفہیم اسلام

نوٹ: ابواب کے عنوانات وہی ہیں جو برق صاحب کی کتاب "دو اسلام" میں ہیں

نمبر شمار	عنوانات	نمبر صفحہ
	تمہید	۱
۱	مُلّا کی اصطلاحی تعریف	۱
۲	عالم کی تعریف	۱
۳	جماعت حقہ کا تعارف	۲
۴	حدیث (دنیا مردار ہے) پر برق صاحب کا اعتراض اور غلط فہمیوں کا آغاز	۳
۵	حدیث مذکور پر اعتراض کا جواب کہ یہ روایت ہے ہی نہیں؟	۴
	(ا) حق و باطل کا غلط معیار۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے اصحاب کی "زبوں حالی"	۴
	(ب) دنیا کی مذمت اور قرآن	۷
	(ج) دنیا کی دینی اصطلاحی تعریف	۱۰
	(د) روایت زیر بحث کا صحیح مطلب	۱۴
۶	برق صاحب کے دیگر متفرق اعتراضات اور ان کے جوابات	۱۵
۷	حدیث کے وحی ہونے کے دلائل	۱۸
	(ا) انبیاء سابقین پر کتاب الٰہی کے علاوہ نزول وحی	۱۸
	(ب) حدیث اگر حجت ہے تو اس کا وحی ہونا ضروری ہے	۲۲
	(ج) حدیث کے حجت شرعیہ ہونے کے دلائل	۲۲
	(د) حدیث کے وحی ہونے کا ثبوت قرآن سے	۳۰
۸	برق صاحب کے متفرق اعتراضات کا خلاصہ اور ان کا جواب	۳۶

باب - ۱

"حدیث میں تحریف کے اسباب" ۳۷

۹	احادیث صحیحہ کے وجود کا اعتراف از برق صاحب	۳۷
۱۰	حدیث کی حفاظت	۳۸
۱۱	فن حدیث کا کمال - صحیح اور وضعی احادیث میں خطِ امتیاز	۳۸
۱۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور احادیث کی حفاظت و کتابت	۴۰
۱۳	صحابہ کرامؓ کا حدیث کی حفاظت کرنا	۴۸
	(ا) حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی کتب احادیث	۴۸
	(ب) حضرت عمرؓ کی طرف سے حدیث کی حفاظت اور تعلیم کا انتظام	۴۹
	(ج) حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی کتب احادیث	۵۰
	(د) متعدد صحابہ کرامؓ کی کتب احادیث کا تذکرہ	۵۲
	(ہ) صحابہ کرامؓ کی کثیر تعداد احادیث تحریر کرتی تھی	۵۷
۱۴	حدیث قرطاس اور برق صاحب کی غلط فہمی	۵۸
	(ا) "حسبنا کتاب اللہ" کا صحیح مطلب اور حضرت عمرؓ کا حدیث کو حجت سمجھنا	۵۹
	(ب) حدیث قرطاس کا صحیح مفہوم	۶۹
	(ج) کتاب اللہ کا اطلاق حدیث پر بھی ہوتا ہے	۷۲
۱۵	کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے منع فرمایا تھا ؟	۷۳
۱۶	برق صاحب کی حیرت انگیز غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۷۴
۱۷	تدوین حدیث پر شبہات اور ان کا ازالہ	۷۵
۱۸	امام بخاریؒ سے پہلے بے شمار احادیث لکھی جا چکی تھیں	۸۷
۱۹	عبداللہ بن مسعودؓ کا حدیث کو کتاب اللہ کہنا	۹۲
۲۰	معمولی نیکی سے بے شمار گناہوں کی معافی کی وجہ	۱۱۱

	(ا) قرآن مجید اور گناہوں کی معافی	۱۱۲
	(ب) کون سے گناہ معاف ہوتے ہیں	۱۱۴
	(ج) گناہوں کی مغفرت عقل کی کسوٹی پہ	۱۱۵
	(د) قرآن مجید اور نیکی بدی کا اٹل قانون	۱۱۶
۲۱	حدیث کے متعلق بعض ائمہ کی طرف منسوب کردہ غلط اقوال	۱۱۹
۲۲	باب اول کا خلاصہ	۱۲۳

باب ـ ۲

"تدوین حدیث"

	"تدوین حدیث"	۱۲۴
۲۳	کیا صحابہؓ جمع صحابہ کے خلاف تھے؟	۱۲۴
۲۴	جمعِ احادیث پر شبہات اور ان کا ازالہ	۱۲۴
۲۵	حضرت انسؓ پہ برق صاحب کا شبہ	۱۲۷
۲۶	برق صاحب کا اعترافِ حق	۱۲۷
۲۷	کلمہ گو کی بخشش کا صحیح مفہوم	۱۲۹
۲۸	شرح صدر کی حدیث پر عقلی اعتراض اور اس کا جواب	۱۳۱
۲۹	ائمہ دین کی طرف منسوب کردہ غلط اقوال	۱۳۵

باب ـ ۳

"چند عجیب راوی اور صحابہؓ"

	"چند عجیب راوی اور صحابہؓ"	۱۳۸
۳۰	بعض کذابین کا دعویٰ صحابیت اور برق صاحب کی غلط فہمی	۱۳۸
۳۱	باب سوم کا خلاصہ	۱۴۰

باب ـ ۴

"کچھ ائمہ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق"

	"کچھ ائمہ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق"	۱۴۱

۳۲	حضرت انسؓ اور حضرت ابو سعیدؓ کے متعلق برق صاحب کا شبہ	۱۴۱
۳۳	کذب کے معنی	
۳۴	صحابہؓ کا آپس میں ایک دوسرے پر اعتراض کرنا	۱۴۲
۳۵	حدیث "میت پر نوحہ کرنے سے میت پر عذاب ہوتا ہے"۔ پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۴۳
۱۳۶	کیا صحابہؓ کے زمانہ میں احادیث کا چشمہ مکدر ہو گیا تھا	۱۴۷
۱۳۷	حدیث میں قحطانی بادشاہ کے متعلق پیشین گوئی اور برق صاحب کی غلط فہمی	۱۴۸
۱۳۸	برق صاحب کی حیرت انگیز غلط فہمی کہ صحابہ کرامؓ حدیث میں تحریف کرتے تھے	۱۴۹
۱۳۹	ائمہ کے آپس میں ایک دوسرے کے متعلق قابل اعتراض اقوال اور ان کی حقیقت	۱۵۱

باب ۔ ۵

"حدیث پر ایک مکالمہ"

		۱۵۹
۴۰	احادیث لکھنے کی ممانعت اور ان کو مٹانے کی روایتوں کی حقیقت	۱۵۹
۴۱	قرآن و حدیث علیحدہ کیوں رکھے گئے	۱۶۰
۴۲	دو قسم کی وحی نازل کرنے میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت	۱۶۱
۴۳	حدیث کی حفاظت کا وعدۂ الٰہی	۱۶۲
۴۴	علم حدیث کے متعلق غیر مسلم محققین کی رائے	۱۶۳
۴۵	حدیث کا ذکر قرآن مجید میں	۱۶۴
۴۶	اقوالِ رسول کا جزو ایمان ہونا۔ برق صاحب کا اعتراف	۱۶۸
۴۷	صحیح احادیث کہاں ملیں گی؟	۱۶۸
۴۸	اقوالِ رسولؐ کا من جانب اللہ تشریح قرآن ہونا	۱۷۰
۴۹	کیا صحیح احادیث کا سراغ نہیں ملتا؟	۱۷۱
۵۰	رسول کی دائمی اطاعت پر برق صاحب کے اعتراض کا جواب	۱۷۲

۵۱	رسولؐ کو چٹھی رساں سمجھنا۔ برق صاحب کی حیرت انگیز غلط فہمی	۱۷۵
۵۲	کیا صحابہؓ احکامِ رسولؐ کی تعمیل ضروری نہیں سمجھتے تھے؟	۱۷۸
۵۳	احادیثِ رسولؐ کے وحی ماننے پر اعتراضات	۱۷۹
۵۴	رسولؐ کی پوری زندگی کے افعال اللہ تعالیٰ کے منظور کردہ ہیں	۱۸۰
۵۵	ظاہری اعمال اور امتیازات کی اہمیت	۱۸۳
۵۶	رسول اور چٹھی رساں کا فرق	۱۸۷
۵۷	روایت بالمعنیٰ اور روایت بالالفاظ	۱۸۸
۵۸	وحی بغیر الفاظ کی حقیقت	۱۹۰
۵۹	رسول اور فلسفی میں فرق	۱۹۱
۶۰	وحی خفی سے تنصیص رسول ہونا صحیح نہیں	۱۹۳
۶۱	"قرآن حدیث کا محتاج ہے" اس کا صحیح مفہوم	۱۹۴

باب - ۶

"تحریف احادیث کے اسباب"

	"تحریف احادیث کے اسباب"	۱۹۵
۶۲	تحریف کے خود ساختہ اسباب اور ان کا جواب	۱۹۵
۶۳	کتا پالنے کی حدیث پر اعتراض	۱۹۸
۶۴	کیا قاتلانِ حسین محدث تھے؟	۱۹۹
۶۵	صحتِ مفہوم کے اعتبار سے اکثر احادیث کا قرآن مجید کے مثل ہونا۔	۲۰۰
۶۶	عملی تواتر کی حقیقت	۲۰۱
۶۷	کیا حدیث انسانی تصنیف ہے؟	۲۰۲
۶۸	کیا قرآن مجید ہر لحاظ سے مکمل ہے؟	۲۰۳
۶۹	کیا احادیث ڈھائی سو سال بعد تحریر میں آئیں؟	۲۰۷
۷۰	قرآن کا اسلام مشکل ہے یا حدیث کا؟	۲۰۷

۷۱	برق صاحب کا چند موضوع احادیث پر اعتراض	۲۰۹
۷۲	صحیح احادیث قرآن مجید کے خلاف نہیں	۲۱۰
۷۳	حدیث قرآن کی تشریح کرتی ہے	۲۱۰
۷۴	کیا ہر اچھی بات کو رسول کی طرف منسوب کرنا جائز ہے؟	۲۱۲
۷۵	کیا حدیث "طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم" موضوع ہے؟	۲۱۳
۷۶	حدیث کے جانچنے کا معیار	۲۱۴

باب ۔ ۷

مؤطا پر ایک نظر

	مؤطا پر ایک نظر	۲۱۶
۷۷	مؤطا امام مالکؒ کی صحت پر شبہ اور اس کا ازالہ	۲۱۶
۷۸	نیند سے جاگنے کے بعد وضو کرنا۔ دو حدیثوں میں تعارض اور اس کا جواب	۲۱۷
۷۹	بوسہ لینے سے وضو نہ ٹوٹنا۔ احادیث میں تعارض اور اس کا جواب	۲۱۸
۸۰	جماع بغیر انزال کے بعد غسل۔ احادیث میں تعارض اور اس کا جواب	۲۱۹
۸۱	حضرت عائشہ صدیقہؓ سے عریاں سوال پوچھنے پر اعتراض اور اس کا جواب	۲۲۰
۸۲	توہینِ رسول کا شاخسانہ اور اس کا جواب قرآن کی روشنی میں	۲۲۳
۸۳	ہر سال لیلۃ القدر کی آمد پر اعتراض اور اس کا جواب	۲۲۴
۸۴	آیۂ رجم کے متعلق غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۲۲۷
۸۵	زنا کی سزا کا تاریخی پس منظر	۲۲۷
۸۶	حدیث کا وحی ہونا	۲۲۸
۸۷	نسخِ آیات کا ثبوت قرآن مجید سے	۲۲۹
۸۸	اسنادِ حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب	۲۳۲
۸۹	صحیح مسلم کی صحت پر اجماع	۲۳۳
۹۰	گوشت خوری کے متعلق حضرت عمرؓ کے قول پر اعتراض اور اس کا جواب	۲۳۴

باب - ۸

"صحیح بخاری پر ایک نظر"

۹۱	صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی صحت پر اجماع	۲۳۶
۹۲	کیا صحیح بخاری کی احادیث قرآن مجید سے متصادم ہیں؟	۲۳۷
۹۳	حدیث اور تاریخ کا فرق	۲۳۸
۹۴	ایک پیشین گوئی پر اعتراض اور اس کا جواب	۲۳۹
۹۵	حدیث "مسجد حرام اور بیت المقدس کی تعمیر میں ۴۰ سال کا وقفہ" پر اعتراض اور اس کا جواب	۲۴۳
۹۶	حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بیان پر اعتراض اور اس کا جواب	۲۴۹
۹۷	توریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت۔ برق صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب	۲۵۱
۹۸	برق صاحب کا تاریخی شہادت تسلیم کرنے سے انکار	۲۵۳
۹۹	توریت اور انجیل میں تحریف کا ثبوت	۲۵۴
۱۰۰	اہل کتاب کے حق ہونے پر عجیب و غریب دلیل اور اس کا جواب	۲۶۱
۱۰۱	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اہل کتاب پر بھی ضروری ہے	۲۶۴
۱۰۲	اہل کتاب کو ایمان بالقرآن کی دعوت	۲۶۶
۱۰۳	توریت کے محرف ہونے پر توریت کی اندرونی شہادت	۲۷۰
۱۰۴	کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا جانتے تھے؟ حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب	

باب - ۹

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر حدیث میں" ۲۷۴

۱۰۵	روزہ میں مباشرت اور برق صاحب کا اعتراض	۲۷۴

۱۰۶	مباشرت کے صحیح معنی	۲۷۴
۱۰۷	اہانتِ رسولؐ کا شاخسانہ اور قرآن مجید	۲۷۹
۱۰۸	مباشرت کے صحیح معنی سے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی لاعلمی۔ برق صاحب کی غلط فہمی اور کتاب "دو اسلام" کی تالیف کا محرک	۲۸۱
۱۰۹	برق صاحب کا اعتراف کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل امت کے لیے واجب الاتباع ہے۔	۲۸۲
۱۱۰	"ایام ماہواری" کے دوران "مباشرت" کا صحیح مطلب	۲۸۸
۱۱۱	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اہلیہؓ کا ایک برتن سے نہانا۔ برق صاحب کی غلط فہمی اور اس کا جواب	۲۸۹
۱۱۲	حضرت عائشہؓ کا غسل۔ برق صاحب کی عجیب غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۲۹۲
۱۱۳	برق صاحب کا عریاں ترجمہ کرنا اور پھر اعتراض کرنا	۲۹۴
۱۱۴	حضرت صفیہؓ سے نکاح اور برق صاحب کی غلط فہمی	۲۹۵
۱۱۵	برق صاحب کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورہ کرنے کو جماع پر محمول کرنا	۲۹۶
۱۱۶	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی قوت پر اعتراض اور اس کا جواب	۲۹۷
۱۱۷	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل میں تضاد کا شاخسانہ اور اس کا جواب	۲۹۸
۱۱۸	عجیب و غریب غلط فہمی	۲۹۸
۱۱۹	پال برنٹن کا خراجِ عقیدت	۲۹۹
۱۲۰	حضرت عائشہؓ کی بوقت نکاح کم سنی پر اعتراض اور اس کا جواب	۳۰۰
۱۲۱	متعہ کی منسوخی اجازت پر اعتراض	۳۰۰
۱۲۲	صحابہؓ کے متعلق برق صاحب کی تضاد بیانی	۳۰۲

باب - ۱۰

"حدیث میں نماز کی صورت"

	"حدیث میں نماز کی صورت"	۳۰۳
۱۲۳	حدیث معراج اور برق صاحب کی غلط فہمی	۳۰۳
۱۲۴	چند احادیث پر اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۱
۱۲۵	رفع یدین پر اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۲
۱۲۶	نماز ظہر و عصر جمع کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب	۳۲۲
۱۲۷	برق صاحب کا ترجمہ غلط کرنا	۳۲۳
۱۲۸	برق صاحب کا ایک تسبیح کو قرآنی آیت سمجھنا، حالانکہ وہ قرآن میں نہیں ہے	۳۲۴
۱۲۹	احادیث میں تضاد کی مثالیں اور ان کا صحیح حل	۳۲۴
۱۳۰	نماز عصر جلدی پڑھنے پر اعتراض	۳۲۷

باب - ۱۱

"بہترین عمل"

	"بہترین عمل"	۳۳۰
۱۳۱	بعض احادیث میں جہاد کا ذکر نہ ہونے پر برق صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب	۳۳۰
۱۳۲	برق صاحب کا غلط ترجمہ کرنا۔ اعتراض اور اس کا جواب	۳۳۲
۱۳۳	جہاد افضل ہے یا حج؟ برق صاحب کا اعتراض اور اس کا جواب	۳۳۲
۱۳۴	ذکر اللہ کی فضیلت پر اعتراض اور اس کا جواب	۳۳۴
۱۳۵	متقی کی تعریف:	
	(۱) برق صاحب کے الفاظ میں	۳۳۴
	(۲) قرآن مجید کے الفاظ میں	۳۳۵

باب - ۱۲
"اللہ کی عادت"

نمبر	عنوان	صفحہ
۱۳۶	کیا مُلاّ اور حدیثی اسلام مسلمانوں کی بُری حالت کے ذمہ دار ہیں ؟	۳۳۷
۱۳۷	جہاد مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہے	۳۳۸
۱۳۸	جہاد کے متعلق بعض غیر مسلمین کی غلط رائے	۳۳۹
۱۳۹	برق صاحب کے چند اعتراضات اور ان کا جواب	۳۴۰
۱۴۰	کیا صرف کلمہ پڑھنے سے جنت مل جاتی ہے ؟	۳۴۱
۱۴۱	سزا اور جزا کی حقیقت	۳۴۷

باب - ۱۳
"لفظ مغفرت کی تحقیق"

نمبر	عنوان	صفحہ
۱۴۲	مغفرت کا معنیٰ	۳۴۹
۱۴۳	مغفرتِ ذنوب پر قرآن مجید کی صراحت	۳۵۱
۱۴۴	کیا ہر گناہ کی سزا ملنی ضروری ہے	۳۵۲
۱۴۵	کون سے گناہ معاف ہو سکتے ہیں ؟	۳۵۲
۱۴۶	گذشتہ اور آئندہ ملنے والی سزاؤں کا فرق	۳۵۳
۱۴۷	مغفرت ذنوب کا صحیح مفہوم	۳۵۴

باب - ۱۴
"مسئلہ شفاعت"

نمبر	عنوان	صفحہ
۱۴۸	حدیثِ شفاعت پر اعتراض اور اس کا جواب	۳۵۹

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور "جھوٹ" ۳۶۵
یوسف علیہ السلام اکرم الناس ہونے کے باوجود شفاعت کبریٰ کے مستحق کیوں نہیں؟ ۳۶۶
مسئلہ شفاعت پر عقلی اعتراض اور اس کا جواب ۳۶۷

باب - ۱۵

"قرآن سے متصادم احادیث"

اسلام لانے پر مجبور کرنے کی کیا حدیث میں اجازت ہے؟ ۳۶۹
زیر بحث حدیث کا صحیح مفہوم اور اس کی مطابقت ۳۶۹
ارتداد کی سزا پر اعتراض اور اس کا جواب ۳۷۲
ارتداد کی سزا کا پس منظر ۳۷۴
ارتداد کی سزا دین و عقل کی روشنی میں ۳۷۵
ایک شبہ اور اس کا ازالہ ۳۷۶
ایمان بالرسول کا تقاضا ۳۷۷

باب - ۱۶

"غلامی اور اسلام"

کیا قرآن لونڈی غلام کے مسائل سے خاموش ہے؟ ۳۷۸
قرآن مجید سے لونڈی غلاموں کے مسائل کی فہرست ۳۸۲
کیا مسلمان کافر کا غلام بن سکتا ہے؟ ۳۸۳
قرآن مجید سے مسلمانوں کے قیدی بن جانے کا ثبوت ۳۸۵
غلامی سے متعلق حدیث اور برق صاحب کی غلط فہمی ۳۸۸
اسلام میں غلاموں کے قابل رشک حقوق ۳۸۸
مومن کے غلام کی قابلِ رشک زندگی ۳۸۹

۱۶۶	غلامی کا مکمل انسداد کیوں نہیں کیا گیا؟	۳۹۲
۱۶۷	غلامی کی رہائی کے لیے اسلام نے کیا کیا؟	۳۹۴
۱۶۸	برق صاحب کا تحقیق نہ کرنا	۳۹۵

باب - ۱۷
"تقدیر"

		۳۹۷
۱۶۹	تقدیر کا تخیل قرآن اور حدیث میں	۳۹۷
۱۷۰	تقدیر کا فائدہ	۴۰۰

باب - ۱۸
"متضاد احادیث"

		۴۰۲
۱۷۱	جہنم میں عورتوں کی کثرت پر اعتراض اور اس کا جواب	؍؍
۱۷۲	جنگ خیبر میں درخت کاٹنے پر اعتراض اور اس کا جواب	۴۰۵
۱۷۳	ڈاکوؤں اور ظالموں کی عبرت ناک سزاؤں پر اعتراض اور اس کا جواب	۴۰۶
۱۷۴	نحوست کے متعلق غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۴۰۹
۱۷۵	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھول پر اعتراض اور اس کا جواب	۴۱۲
۱۷۶	آنحضرتؐ کا سفر میں دیر سے اٹھنا۔ برق صاحب کی غلط فہمی	۴۱۴
۱۷۷	قبلہ کی طرف منہ کر کے قضائے حاجت کرنا۔ تعارض احادیث کا جواب	۴۱۵
۱۷۸	حالتِ احرام میں شکار۔ احادیث میں تعارض کا جواب	۴۱۶
۱۷۹	حالتِ احرام میں خوشبو لگانا۔ دو حدیثوں میں تعارض کی حقیقت	۴۱۹
۱۸۰	کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ دو حدیثوں میں تعارض کی حقیقت کی تحقیق	۴۲۰
۱۸۱	شہد نہ کھانے کا عہد۔ برق صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ	۴۲۱
۱۸۲	معراج کی حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب	۴۲۳

نمبر	عنوان	صفحہ
۱۸۳	حبر النساء کے متعلق برق صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ	۴۲۴

باب - ۱۹

"چند دلچسپ احادیث"

نمبر	عنوان	صفحہ
	"چند دلچسپ احادیث"	۴۲۸
۱۸۴	سورج کے سجدہ کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب	۴۲۸
۱۸۵	سورج کا شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع ہونا	۴۳۱
۱۸۶	مکھی کے ایک پر میں شفا ہونا	۴۳۳
۱۸۷	اولاد کی ماں باپ سے مشابہت کے اسباب	۴۳۶
۱۸۸	مرغ کا فرشتہ کو دیکھنا۔ برق صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ	۴۳۷
۱۸۹	تین سلام کرنے اور کسی بات کو تین دفعہ دہرانے پر اعتراض اور اس کا ازالہ	۴۳۸
۱۹۰	عرش الٰہی کا ہلنا اور اس پر اعتراض	۴۴۱
۱۹۱	قرآن مجید کا سات قراتوں میں نزول۔ برق صاحب صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ	۴۴۳
۱۹۲	برق صاحب کا خلاف حقیقت بیان	۴۴۴
۱۹۳	کھجور کے تنے کا رونا۔ برق صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ	۴۴۵
۱۹۴	معجزہ کا ثبوت قرآن کریم	۴۴۷
۱۹۵	مسلمانوں کو معجزہ دکھانے پر اعتراض اور اس کا جواب	۴۴۸
۱۹۶	فرقوں کی بنیاد تقلیدی اختلاف سے قائم ہوئی ہے	۴۴۹
۱۹۷	چھپکلی کو قتل کرنے میں حکمت	۴۵۰
۱۹۸	برق صاحب کی عجیب و غریب غلط فہمی	۴۵۱
۱۹۹	حضرت جبرئیل کے پروں پر اعتراض	۴۵۱
۲۰۰	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ختنہ پر اعتراض اور اس کا جواب	۴۵۳
۲۰۱	حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیویوں کے پاس دورہ کرنا	۴۵۵
۲۰۲	بعض احادیث کے متعلق برق صاحب کی غلط فہمی	۴۵۸

باب - ۲۰

	"صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا"	۴۶۲
۲۰۳	تدوین احادیث کے متعلق غلط فہمی کا ازالہ	۴۶۲
۲۰۴	برق صاحب کا سچے اور جھوٹے کی روایت کو مساوی درجہ دینا	۴۶۳
۲۰۵	برق صاحب کا ہر صحیح بات کو حدیث ماننے کا نظریہ اور اس کی خرابی	۴۶۴
۲۰۶	اسناد ضروری کیوں ہیں؟	۴۶۶
۲۰۷	حدیث کا وحی ہونا	۴۶۶
۲۰۸	کیا دینی مسائل مشورہ سے طے کئے گئے؟	۴۶۸
۲۰۹	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کی شرعی حیثیت	۴۷۳
۲۱۰	علاوہ قرآن کے وحی کا نزول	۴۷۸
۲۱۱	صحت احادیث کے لیے برق صاحب کے تجویز کردہ معیاروں کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں	۴۷۹
۲۱۲	ضمیمہ ۔ رسول کی اتباع و اطاعت کے متعلق قرآنی آیات	۵۳۱ تا ۵۶۷

تمت الفہرس وللہ الحمد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَ
عَلٰی سَائِرِ الْاَنْبِیَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ ط اَمَّا بَعْدُ

تمہید

چند روز ہوئے، ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ صاحب کی کتاب "دو اسلام" دیکھنے میں آئی، پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی، کہ ڈاکٹر صاحب جیسا آدمی اور اس قسم کی باتیں، ڈاکٹر کی ڈگری وسیع مطالعہ اور گہرے علم و تحقیقات کے بعد ہی ملا کرتی ہے، وسیع مطالعہ سے ذہن صاف ہو جاتا ہے، اور غور و فکر کی عادت پیدا ہوتی ہے، ایسا آدمی جب کسی بات کو سنتا ہے، تو بغیر تحقیق کے اس کو قبول نہیں کرتا اور بغیر غور و فکر کے اس کو رد نہیں کرتا، لیکن تعجب ہے، کہ ڈاکٹر صاحب نے صرف حدیث ہی کا نہیں بلکہ قرآن مجید کا مطالعہ بھی سرسری کیا، اس وجہ سے آپ کو بہت سی غلط فہمیاں ہو گئیں، کتاب "دو اسلام" ان ہی غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے، اور ہماری یہ کتاب انہی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے لکھی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی غلط فہمیوں کو دور فرمائے۔ آمین۔ برقؔ صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

ملا کی تعریف

"ملا سے مراد متعصب، تنگ نظر، کم علم اور کوتہ اندیش واعظ اور امام مسجد ہے نہ کہ صحیح النظر عالم" (دو اسلام حاشیہ ص ۲۷۸)

میں بھی ان مضامین میں لفظ "ملا" کو انہی معنوں میں استعمال کروں گا، جن معنوں میں ڈاکٹر صاحب نے استعمال کیا ہے۔

عالم کی تعریف

ڈاکٹر صاحب کی محولہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے، کہ عالم بحقیقت وہ ہے جو صحیح النظر ہو، قرآن کی اصطلاح میں اس کو راسخ فی العلم کہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

"بحمد اللہ کہ اسلام میں کچھ محققین بھی ہو گزرے ہیں جنہوں نے ایسے تمام واقعات پر سخت تنقید کی، فجزاہم اللہ احسن الجزاء" (دو اسلام ص ۹)

میں بھی اس کتاب میں جہاں کہیں عالم کا لفظ استعمال کروں گا، انہی معنوں میں استعمال کروں گا جن معنوں میں ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔

جماعت حقہ

ڈاکٹر صاحب شاید ناواقف نہ ہوں، کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہی اور اب بھی موجود ہے، جو تمام خرافات، بدعات، موضوعات، مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم سے اسی طرح بیزار تھی اور ہے، جس طرح خود ڈاکٹر صاحب بیزار ہیں، اس جماعت کی ایک تبلیغی تحریک بھی ہمیشہ سے جاری ہے، مختلف ادوار اور مختلف ممالک میں اس کے مختلف نام رہے، یہ تحریک کبھی شدت اختیار کر لیتی ہے، اور کبھی حالات کے ناسازگار ہونے کے باعث سست بھی ہو جایا کرتی ہے، اس جماعت کا ذکر مسلم اور غیر مسلم حضرات نے مختلف کتابوں میں ایک ایسی جماعت کی حیثیت سے کیا ہے، جو اسلام کو اپنے اصلی خدوخال میں پیش کرنا چاہتی ہے، اور اس اسلام کی دعوت دیتی ہے، جو عہد رسالت میں تھا، ہندوستان میں حکومت برطانیہ، اور خود ان خرافات کے پرستار نام نہاد مسلمانوں نے جس طرح اس تحریک کی مخالفت کی، یہ ایک خونچکاں داستان ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہ تحریک اگرچہ آج کل بہت سست ہو گئی ہے لیکن بحمداللہ مردہ نہیں ہوئی ہے، ہندوستان میں اس تحریک کا ابتدائی دور جہاد فی سبیل اللہ سے معمور ہے، یہی وہ لوگ تھے جو ایک طرف اللہ کے ذکر میں سرشار، تو دوسری طرف میدان جنگ میں کفار کے مقابلہ کے لئے سینہ سپر تھے، ذکر اللہ کے فضائل کی احادیث نے انہیں جہاد سے غافل نہ بنایا تھا کیونکہ وہ ان احادیث کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اور کبھی غلط فہمیوں میں مبتلا نہیں ہوتے تھے آج بھی اگر برق صاحب کے ممدوح امام ابن تیمیہ جیسا مصلح پیدا ہو جائے تو یہ بکھرے ہوئے سپاہی پھر جہاد کے لئے صف آرا ہونے کو تیار ہیں۔

ایک بات اور ذہن نشین کر لیجئے یہ جماعت فرقہ کی حیثیت سے کبھی نمودار نہیں ہوئی نہ اس نے اپنا کوئی ایسا امام بنایا، جس کی وہ تقلید کرتی ہو نہ ایسی فرقہ وارانہ کتابیں تصنیف کیں، جو دوسرے فرقوں کے لئے ناقابل حجت ہوں، اس جماعت کا اصول وہی ہے، جو صحابہ کرام کا تھا یعنی "قرآن و حدیث" یا دوسرے لفظوں میں "اتباع رسول" یہ جماعت انہی احادیث کو واجب العمل سمجھتی ہے، جن کے متعلق برق صاحب نے تحریر فرمایا ہے، کہ :-

"۱۔ اس طرح کی ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت صلعم کی حیات طاہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں" (دو اسلام صفحہ ۳۴۲)

"یہ تمام تفاصیل احادیث پر ملتی ہیں، اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پر ہم نازاں ہیں، اور جس سے اب تک کروڑوں غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں" (دو اسلام صفحہ ۳۴۳)

"۲۔ اس میں کلام نہیں کہ حضور کے ان اوصاف جمیلہ کا چرچا صرف احادیث کی بدولت ہوا۔ اور

ہم حدیث کے اس گراں بہا ذخیرے پر ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے" (دو اسلام ص۱۹۹)

یہ جماعت خود ساختہ اسلام کو اتنا ہی برا سمجھتی ہے، جتنا آپ، گھڑی ہوئی احادیث سے اتنا ہی بیزار ہے، جتنا آپ، لہٰذا آپ یہ نہ سمجھئے، کہ اس معاملہ میں آپ تنہا ہیں، بلکہ یہ پوری جماعت بھی آپ کے ساتھ ہے، ہاں فرق صرف اتنا ہے، کہ بعض صحیح احادیث کو آپ غلط سمجھ بیٹھے، اور اس ہی غلط فہمی کے ازالہ کے لئے یہ کتاب لکھی جا رہی ہے

آغاز ازالہ اس مختصر تمہید کے بعد اب میں ڈاکٹر صاحب کی غلط فہمیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ڈاکٹر صاحب دو اسلام کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ ۱۹۱۶ء کا ذکر ہے، میں قبلہ والد صاحب کے ہمراہ امرتسر گیا، میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا، جہاں نہ بلند عمارات، نہ مصفا سڑکیں، نہ کاریں، نہ بجلی کے قمقمے، اور نہ اس وضع کی دکانیں دیکھ کر دنگ رہ گیا، لاکھوں کے سامان سے سجی ہوئی دکانیں، اور بورڈ پر کہیں رام بھیجا سنت رام لکھا ہے، کہیں دنی چند اگروال...... ہال بازار کے اس سرے سے اس سرے تک کسی مسلمان کی کوئی دکان نظر نہیں آئی، ہاں مسلمان ضرور نظر آئے، کوئی بوجھ اٹھا رہا تھا کوئی گدھے لاد رہا تھا...

غیر مسلم کاروں اور فٹنوں پر جا رہے تھے، اور مسلمان اڑھائی من بوجھ کے نیچے دبا ہوا مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا...." (دو اسلام ص۱۳)

خلاصہ اس کا یہ ہے، کہ ہندوؤں کے پاس مال و دولت کی فراوانی، اور مسلمانوں کو مفلوک الحال دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کو حیرت ہوئی کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا، کہ اس کا سبب مندرجہ ذیل حدیث ہے" اَلدُّنْیَا جِیْفَةٌ وَّطُلَّابُهَا کِلَابٌ[1] " یہ دنیا ایک مردار ہے، اور اس کے متلاشی کتے ہیں (دو اسلام ص۱۵) برق صاحب نے اس حدیث کا مطلب بھی بعض ملاؤں سے دریافت کیا، لیکن تسلی نہیں ہوئی، اور اس طرح احادیث کے متعلق ان کی غلط فہمیوں کا آغاز ہوا، غلط فہمی سے برق صاحب کا سب سے زیادہ اعتراض اسی روایت پر ہے، لہٰذا اس غلط فہمی کا ازالہ تفصیل کے ساتھ درج ذیل ہے۔

جملہ معترضہ برق صاحب نے صرف امرتسر ہی کو دیکھا، اگر کہیں وہ دہلی، بمبئی، کلکتہ، حیدرآباد وغیرہ مشہور شہر دیکھتے، تو انہیں ہندوؤں کے دوش بدوش اور ان کے ہم پلہ مسلمانوں کی بھی دکانیں نظر آتیں، بلکہ اگر وہ اس وقت پاکستان کے کسی بھی چھوٹے یا بڑے شہر کو دیکھیں، تو مسلمانوں کی لاتعداد پر رونق دکانیں جگمگاتی نظر آئیں گی، حالانکہ ان مسلمانوں کا اسلام وہی اسلام ہے، جو امرتسر کے ان مسلمانوں کا تھا جن کا ذکر برق صاحب نے کیا ہے۔

[1] یہ روایت کہیں ملی نہیں، بلفرض ثبوت یہ سب جواب ہیں۔

حق و باطل کا غلط معیار

قبل اس کے کہ میں حدیث مذکور کے صحیح مطلب کی وضاحت کروں بہتر سمجھتا ہوں کہ امرتسر میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ مشاہدہ کیا، اس سلسلہ میں انہیں قرآن مجید کی چند آیات کی سیر کراؤں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

(۱) فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ○ (قصص ۷۹)

ایک دن قارون اپنے ساز و سامان اور کروفر کے ساتھ نکلا، تو ان لوگوں نے جو دنیا کے طالب تھے کہا اے کاش جو مال و اسباب قارون کو دیا گیا ہے ہمیں بھی ملتا واقعی یہ بڑا خوش قسمت ہے۔

(۲) وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ○ (قصص ۸۰)

اور جو اہل علم تھے، انہوں نے کہا، تم پر افسوس ہے اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لئے جس نے ایمان قبول کیا، اور نیک عمل کئے، اور یہ چیز ان ہی کو ملتی ہے، جو صابر ہیں۔

نتیجہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر برائی کے ساتھ کیا، جو دنیا کے طالب تھے، اور ان لوگوں کو علماء کا خطاب دیا، جن لوگوں نے اس کی طرف توجہ بھی نہیں کی، بلکہ وہ صرف ایمان اور عمل صالح کے ثواب کے خواہاں رہے، آیت ۲ سے یہ بھی ثابت ہوا، کہ اللہ کا ثواب ان ہی کے لوگوں کے پیش نظر ہوتا ہے، جو صابر و قانع ہوتے ہیں، اور دنیا کے حریص نہیں ہوتے، بہر حال آیات مذکورہ سے ثابت ہوا، کہ دنیا اچھی چیز نہیں، اور اس کے طالب بھی اچھے نہیں۔

(۳) فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ (قصص ۸۱)

پھر ہم نے قارون کو مع اس کے محل کے زمین میں دھنسا دیا۔

(۴) وَاَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ یَقُوْلُوْنَ وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَوْلَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَیْكَاَنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (قصص ۸۲)

پھر شام کو جو لوگ قارون کے مثل بننے کی تمنا کرتے تھے صبح کو کہنے لگے، افسوس یہ رزق و سامان کی فراوانی تو اللہ جس بندے کو چاہے دیتا ہے اور جس سے چاہے روک لیتا ہے، اگر اللہ کا احسان نہ ہوتا، تو ہم بھی دھنسا دیئے جاتے، افسوس کہ کافروں کے لئے فلاح نہیں ہے۔

نتیجہ دنیاوی مال و دولت کے حریص کا انجام اچھا نہیں ہوتا، دنیاوی مال و دولت اگر کسی کے پاس زیادہ

جو اور مومنین کے پاس اس کی قلت ہو، تو یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اس مالدار سے خوش ہے، اور فقراء مومنین سے ناراض ہے، قارون بہت مالدار تھا اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب اس کے مقابلہ میں تنگ حال تھے، اور اللہ ان تنگ حال مسلمانوں ہی سے خوش تھا، کیا کوئی کہہ سکتا ہے، کہ ضرور کوئی نہ کوئی خامی تھی جس کی وجہ سے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے اصحاب تنگ حال تھے، کیا کوئی حدیثی اسلام تھا جس نے انہیں اس درجہ پر پہنچایا تھا برق صاحب امرتسر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مختلف حالات میں دیکھ کر آپ متعجب نہ ہوں، موسیٰ علیہ السلام اور قارون بھی ایسے ہی مختلف حالات میں تھے، اس میں حیرت واستعجاب کا کونسا مقام ہے۔

برق صاحب اب ذرا اوپر چلیئے۔ نوح علیہ السلام اور ان کے صحابہ کرام کی حالت ملاحظہ فرمایئے۔

(۵) فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ (ھود - ۲۷)

کافروں کے سرداروں نے نوح علیہ السلام سے کہا، ہم تو تجھ کو اپنے ہی جیسا آدمی سمجھتے ہیں، اور ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ تیرے متبعین صرف وہی لوگ ہیں جو ہم میں سب سے زیادہ رذیل اور کم عقل ہیں، اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تم کو ہم پر کسی قسم کی فوقیت حاصل نہیں، بس ہم تو یہی خیال کرتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو

نتیجہ برق صاحب مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر جو نتیجہ آپ نے نکالا ہے، بالکل وہی نتیجہ سرداران قوم نوح نے نکالا تھا، یہ کافر سر والے تھے، صاحب فضل تھے، اور نوح علیہ السلام کے صحابہ کرام فاقہ کش اور کافروں کی نگاہ میں بے عقل سمجھے جاتے تھے، لہٰذا کافروں نے ان کو ناحق سمجھا، اور اپنے کو حق پر

خیر الامم کی حالت

برق صاحب اب ان مسلمانوں کی حالت ملاحظہ فرمایئے، جو خلاصہ امم تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۶) وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ ۝ (توبہ - ۹۲)

جہاد میں نہ جانے کا ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جو آپ کے پاس آتے ہیں کہ آپ ان کو سواری دے دیں آپ کہہ دیتے ہیں، کہ میرے پاس تو کچھ نہیں جس پر تمہیں سوار کر سکوں، وہ لوگ واپس ہو جاتے ہیں، اور اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں

(٧) اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (توبہ - ۹۳)

گناہ تو ان لوگوں پہ ہے جو باوجود مالدار ہونے کے جہاد پر نہ جانے کی اجازت مانگتے ہیں، یہ اس پہ راضی ہیں، کہ زنان پس ماندہ کے ساتھ بیٹھے رہیں، اللہ تعالے نے ان کے قلوب پر مہر لگا دی ہے، وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

نتیجہ نہ صحابہ کرام کے پاس خرچ کرنے کو مال تھا، نہ اللہ کی زمین پر قائم ہونے والی سب سے بہتر حکومت کے پاس کچھ تھا، کہ مسلمانوں کے لئے سامان جہاد تہیا کرتی، دنیا کی آنکھوں نے جس سے بہتر انسان نہ دیکھا ہو، وہ انسان، وہ مقدس ترین اللہ کا رسول اور مومن کامل یہ کہہ رہا ہے، کہ میرے پاس کچھ نہیں، یہ کونسا اسلام تھا جس کے باعث وہ مقدس ترین انسان تنگ حال تھا آج کل کے مسلمان تو حدیثی اسلام کی وجہ سے تنگ حال ہیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے متعلق کیا کہا جائے، پورا عرب فتح ہو چکا ہے، لیکن تنگ حالی موجود ہے، برخلاف اس کے منافق مالدار تھے، اور جہاد سے گریز کرتے تھے نتیجہ ظاہر ہے، کہ دنیاوی عیش و راحت کی فراوانی سے حق و باطل کا امتیاز نہیں ہوتا۔

ہر رسول کے زمانہ میں کافر خوش حال تھے مندرجہ ذیل آیات کو ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (سبا ۳۴)

ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا، تو اس بستی کے خوشحال لوگوں نے کہا، کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس کے ساتھ تم کو بھیجا گیا ہے۔

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (سبا)

اور کہا، کہ ہمارے پاس مال و اولاد کی کثرت ہے اور ہم کو عذاب نہیں دیا جائے گا

قُلْ اِنَّ رَبِّىْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (سبا)

اے رسول کہدو، کہ میرا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے، اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے، کہ مذکورہ بالا آیات میں مسلمانوں کی جو حالت بیان کی گئی ہے وہ ابتدائی دور کی ہے لیکن جب انہوں نے اللہ کے راستہ میں قدم رکھا، اور صبر و استقامت کو ملحوظ رکھا، تو پھر مالدار ہو گئے یہ شبہ حقیقت پر مبنی نہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے

کہ مسلمانوں کو مال و دولت کی فراوانی بخشی گئی، پھر بھی یہ ثابت کرنا ممکن ہے، کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب میں سے ہر شخص کو اتنا ہی مال مل گیا تھا، جتنا قارون کو، بلکہ مومن ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب میں سے ہر شخص اتنا ہی مالدار ہو گیا تھا، جتنا اس زمانہ کے یہودی تھے، یا اسلامی حکومت اسی جاہ و حشمت کی مالک ہو گئی تھی، جو سلاطین روما اور ایران کے ہاں تھی، اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے کہ مومن کی آخرت بھی اچھی، اور اسی نسبت سے دنیا بھی اچھی، تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا تمام انسانوں کے مقابلہ میں اچھی ہونی چاہیئے تھی، اور آپ کے پاس عیش و راحت، ساز و سامان کی اتنی فراوانی ہونی چاہیئے تھی کہ کسی انسان کو اتنی میسر نہ ہوتی لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عسرت کا جو نقشہ آیت بالا میں کھینچا گیا ہے، یہ ابتدا کی بات نہیں ہے، بلکہ اس زمانہ کی بات ہے، جب پورا عرب فتح ہو چکا تھا اور اسلامی فوجیں حدود عرب کو عبور کر کے تبوک پر یلغار کر رہی تھیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں سے صرف ۱½ سال باقی رہ گیا تھا، اب اگر کوئی شخص اس معیار پر کہ مسلمانوں کے پاس دنیاوی سامان کی کمی ہے، مسلمانوں کو گمراہ سمجھ بیٹھتا، اور عہد رسالت ہی میں اس کا انتقال ہو جاتا، تو بتلایئے کیا آپ کہہ سکتے تھے، کہ اس کا معیار حق و باطل صحیح تھا، ہرگز نہیں، نوح علیہ السلام کی قوم کی گمراہی کا یہی سبب اوپر بیان ہو چکا ہے، لیکن کیا وہ قوم اس معاملہ میں حق بجانب تھی؟ ہر زمانہ میں مسلمانوں کی اکثریت کافروں کی طرح مالدار نہ ہو سکی، نہ یہ حدیث کو ماننے کا نتیجہ اس وقت تھا نہ اب ہے

دنیا کی مذمت اور قرآن

کیونکہ برقی صاحب کی غلط فہمی کی سب سے بڑی وجہ حدیث زیر بحث ہی ہے، لہٰذا میں بھی قدرے تفصیلی روشنی ڈال رہا ہوں، حدیث کا اصل مطلب تو آگے بیان ہوگا، آیات بالا سے اتنا تو ثابت ہو گیا، کہ دنیا ایک بے حقیقت شے ہے، انبیاء کے پاس نہ ابتدائی دور میں اس کی فراوانی ہوئی، نہ آخری دور میں، بلکہ بعض انبیاء تو ابتدائی دور ہی میں بے نیل مرام دنیا سے رخصت ہو گئے، اور بہت سے شہید بھی کر دیئے گئے، اور اس پر قرآن شاہد ہے فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ (البقرہ۔ ۸۷)

قارون کے قصہ میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کے طالبین کو اہل علم میں شمار نہیں کیا، بلکہ دنیا کو حقیر سمجھنے والوں کے لئے اہل علم کا لقب استعمال کیا، اس سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہوا، کہ دنیا اچھی چیز نہیں، اس کی مزید برائی کے لئے چند اور آیات ملاحظہ فرمائیں۔

(۸) لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ	شہروں میں کافروں کی آمد و رفت سے آپ دھوکہ میں نہ آ جائیں، یہ ساز و سامان بہت تھوڑا ہے پھر ان کا

وَبِئْسَ الْمِهَادُ ہ (آل عمران - ۱۹۶) ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے

ایک اور جگہ ارشاد ہے :-

(۸) وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (توبہ - ۸۵)

اور کافروں کے اموال اور کافروں کی اولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالے، ملکہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیاوی عذاب دینا چاہتا ہے، اور یہ کہ ان کی جانیں ایسی حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں

نتیجہ شہروں میں کافروں کا تجارت کی غرض سے آنا جانا۔ اور ان کی تاجرانہ چہل پہل، ان کی فوجوں کا شہر در شہر مظاہرہ و جلوس، مال، اور اولاد کی کثرت، ایک بے حقیقت شے ہے، اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے حق اور ہی چیز ہے جس کا معیار اس دنیا کی زیب و زینت نہیں۔

(۹) وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (طٰہٰ - ۱۳۱)

کافروں کو جو مال ہم نے دے رکھا ہے اس کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھو، یہ محض دنیاوی جاہ و حشمت ہے تاکہ اس میں ان کی آزمائش کرے، اور تمہارے رب کا رزق بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔

نتیجہ آیت سے ظاہر ہے، کہ دنیا کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا بھی اللہ کو پسند نہیں، اگر یہ دنیا اچھی چیز ہوتی، تو اللہ تعالیٰ اس کی طمع سے کیوں روکتا، اور مسلمان کیوں کافروں کے مقابلہ میں دنیا سے محروم ہوتے، جب صحابہ کرام جن کی ایمانی قوت کی مناسبت سے ان کی دنیا بھی اتنی ہی اچھی ہونی چاہیئے تھی کافروں کے مقابلہ میں پسماندہ تھے، تو آج پسماندگی کا سبب حدیث کو قرار دینا کہاں تک صحیح ہے، اگر کوئی یہ کہدے کہ صحابہ کرام کی محرومی کا سبب قرآن تھا جس نے ان کو دنیا کی طرف نظر اٹھانے کی بھی ممانعت کر رکھی تھی تو آخر اس الزام کا کیا جواب ہوگا، کیا آپ انصاف سے کہہ سکتے ہیں، کہ جو جواب قرآن کی طرف سے دیا جائے گا، وہی جواب حدیث کی طرف سے نہیں دیا جا سکتا۔

جنگ احد میں مسلمانوں کی عارضی شکست کے اسباب بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ تم دنیا کی طرف مائل ہو گئے، ارشاد باری ہے۔

(۱۰) وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ

اللہ نے تو البتہ اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قلع قمع کر رہے تھے، اسی اثنا میں تم نے بزدلی کا مظاہرہ کیا، اور حکم کی تعمیل میں

مَا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ۔ (آل عمران - ۱۵۲)

اختلاف کیا، اور حسب دلخواہ فتح آجانے کے بعد نافرمانی کی، بات یہ ہے کہ بعض تم میں دنیا کے طالب ہیں، اور بعض تم میں آخرت کے طالب ہیں، پھر اللہ نے تم کو کافروں سے روک لیا تاکہ تم کو مبتلائے مصیبت کرے۔ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ پھر تم کو غم پر غم پہنچا (آل عمران - ۱۵۳)

تنقیح آیت بالا میں دنیا کے طالبین کی کتنی سخت مذمت ہے، کیا اب بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی طلب اچھی چیز ہے، ازواج مطہرات کے متعلق ارشاد باری ہے:-

لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (احزاب - ۳۲) یعنی ہر عورت سے تمہارا مرتبہ بالا ہے۔

یہ آیت ازواج مطہرات کی فضیلت کے لئے نص قاطع ہے، مگر یہ فضیلت ہے، کس سبب سے دینی شغل اور انہماک، تقویٰ اور پاکیزگی کی وجہ سے، اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اسی نسبت سے ان کی دنیا بھی دنیا کی ہر عورت سے بہتر ہوتی لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ان کو دنیا ملنا تو کجا، دنیا کی طلب سے بھی روکا جارہا ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

(۱۱) يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۝ (احزاب - ۲۸)

اے نبی اپنی بیویوں سے کہدیجئے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی بہار کی طالب ہو تو آؤ میں تم کو مال و متاع دے کر اچھی طرح سے رخصت کردوں۔

(۱۲) وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (احزاب - ۲۹)

اور اگر تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور دار آخرت مطلوب ہے، تو پھر تم میں سے نیک کرداروں کے لئے اللہ نے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

تنقیح دنیا اگر اچھی چیز ہوتی، تو ازواج مطہرات کو اس سے کیوں روکا جاتا، ظاہر اور بالکل ظاہر ہے، کہ دنیا میں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہے، کہ اللہ تعالےٰ اس چیز کو ازواج مطہرات کے لئے ناپسند فرماتا ہے، اور ان سے صاف کہدیا جاتا ہے، کہ یا تو دنیا لے لو، اور رسول سے علیحدہ ہو جاؤ، یا اللہ، رسول اور آخرت چاہیئے، تو پھر دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھو،

برقی صاحب حدیث ہی کو الزام نہ دیجئے، قرآن کو غور سے پڑھیئے، جو بات وہاں ہے وہی یہاں ہے کیا یہ آیت اس بات کی ترجمانی نہیں کرتی، کہ مسلمانوں کے لئے آخرت، اور کافروں کے لئے دنیا، مسلمانوں کو آخرت

کی طرف نظر رکھنی چاہیئے، اور دنیا کی طلب سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے، اللہ والوں کے لئے یہ جگہ عیش و راحت کی جگہ نہیں۔

(۳) مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (ھود۔ ۱۵)

جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کی عیش و راحت کا طالب ہے، ہم ایسے لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا دے دیتے ہیں، اور ان کے لئے دنیا میں کوئی کمی نہیں ہوتی، ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں کچھ نہیں، سوائے آگ کے، جو کچھ عمل انہوں نے کئے تھے، وہ سب ناکارہ کر دیئے گئے اور جو کچھ وہ کرتے تھے، وہ باطل تھا

(۴) مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (شوریٰ۔ ۲۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو، ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے، اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس میں سے دے دیں گے لیکن آخرت میں اس کا کچھ بھی حصہ نہیں

نتیجہ آیات بالا سے ثابت ہوا، کہ ہر شخص کے لئے دنیا کی طلب مذموم ہے، برخلاف اس کے آخرت کی طلب محمود ہے، طالب دنیا کے لئے سوائے دوزخ کے کچھ نہیں، پھر بھی اگر دنیا مردار نہیں، تو اور کیا ہے، اور اس کا طالب کتا نہیں، تو پھر کیا ہے، کہ آخرت میں اس کے لئے سوائے آگ کے کچھ نہیں، ایسا شخص تو کتے سے بھی بدتر ہے، کہ آگ کی خاطر دنیا کی طلب میں لگا پڑا ہے، جس کا نتیجہ سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں کیا یہ آیتیں حدیث زیر بحث کی تائید نہیں کرتیں، کیا مسلمانوں کی زبوں حالی کی ذمہ دار یہ آیتیں تو نہیں، اگر نہیں تو حدیث نے کیا قصور کیا، برقی صاحب انصاف کیجیئے۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى

دنیا کسے کہتے ہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اگر دنیاوی عیش و راحت کے سامان مومن کے لئے پیدا ہی نہیں کئے گئے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان دنیاوی نعمتوں کا احسان کیوں جتایا ہے، اور مال و دولت کو اپنا فضل کیوں قرار دیا ہے، یہ سوال صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے، کہ ہم نے دنیا کی صرف ایک قسم سمجھ رکھی ہے، حالانکہ دنیا کی دو قسمیں ہیں، مومن کی دنیا اور کافر کی دنیا، جہاں کہیں قرآن و حدیث میں دنیا کا لفظ آیا ہے، اس سے کافر کی دنیا مراد ہے، قرآن نے کافر کی دنیا کی چند خصوصیات بیان کی ہیں، جو مندرجہ ذیل آیات مبارکات میں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (جاثیہ۔ ۲۴)

کافر کہتے ہیں، بجز اس دنیا کی زندگی کے ابدی کوئی زندگی نہیں، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو صرف زمانہ کی گردش سے موت آتی ہے، اس کے متعلق ان کے پاس کوئی علم نہیں وہ محض گمان کرتے ہیں۔

نتیجہ منکرِ قیامت کی دنیا حساب وکتاب سے بےخوفی کی دنیا ہے، اور جب حساب وکتاب نہیں، تو پھر ڈر ہی کس بات کا، خوب مزے اڑاؤ، ایسے آدمی کی دنیا اس مصرع کا مصداق ہوتی ہے

"بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

(۲) وَوَيْلٌ لِلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ۝ الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ (ابراھیم۔ ۲)

ان منکروں کے لئے بڑا سخت عذاب ہے، جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی سے محبت کرتے ہیں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (اعلیٰ)

بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی

(۳) وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ (محمد ۱۲)

اور کافر جو مزے اڑا رہے ہیں، اور اس طرح کھا رہے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے

نتیجہ جانور ہر جگہ منہ مارتے ہیں، ان کو حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی، نہ حساب وکتاب کا خوف ہوتا ہے، اور یہی حالت کافر کی ہے، کہ وہ حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں کرتا، جو کچھ مل جائے، اور جس طرح مل جائے، سب ہضم کر لیتا ہے، آخرت سے بالکل بے خوف ہوتا ہے

(۴) وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ ۖ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (انعام۔ ۳۲)

دنیا کی زندگی کچھ نہیں بجز لہو ولعب کے اور آخرت تو انہی کے لئے ہے، جو پرہیزگاری کرتے ہیں کیا اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔

(۵) اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ۖ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ

جان لو کہ دنیاوی زندگی لہو ولعب، زینت، اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا، اور مال واولاد میں کثرت کی خواہش کا نام ہے، اس دنیا کی مثال

الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (حدید۔ ۲۰)

ایسی ہے جیسے پانی برسا فصل اچھی ہوئی اور کسان اس کو دیکھ کر خوش ہوئے، لیکن پھر خشک ہو کر زرد نظر آنے لگی، اور پھر ریزہ ریزہ ہو گئی، اور آخرت میں سخت عذاب اور مغفرت اور رضوان بھی ہے اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سرمایہ ہے۔

(۶) اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (تکاثر)

زیادتی کی خواہش نے تم کو غافل رکھا یہاں تک کہ تم قبرستان پہنچ گئے۔

(۷) وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۔ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۔ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۔ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (ھمزہ)

ہر عیب کنندہ اور غیبت گوئندہ کی خرابی ہے جس نے مال کو جمع کیا اور گن گن کر رکھا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مال ہمیشہ رہے گا، ہرگز نہیں، بلکہ (ایک وقت آنے والا ہے جب) وہ دوزخ میں پھینک دیا جائے گا"

(۸) وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (کہف۔ ۲۸)

"اور اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھو جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی رضا کے طالب ہیں، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیاوی زندگی کی زینت کی طلب میں ان سے کنارہ کشی کر لے۔

خلاصہ مندرجہ بالا آیات سے واضح ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں دنیا کہتے ہیں، لعب و لہو، نام و نمود، فخر و ریا، تکبر اور اترانے کو، مال و دولت کی فراوانی کی حرص کو، مال جمع کرنے، اور گنانے کے پھیر میں رہنے کو، مال کو اس طرح ہڑپ کر جانے کو جس طرح جانور ہڑپ کر جاتے ہیں، دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینے کو، بلکہ آخرت و حساب و کتاب کے انکار کو، حلال و حرام کی تمیز کے اٹھ جانے کو، مال و دولت کے حصول میں اس قدر انہماک کو، کہ اللہ اور اس کے احکام سے غفلت ہو جائے، اللہ والوں کو چھوڑ کر مال، اور مالداروں کی طرف رغبت کرنے کو، فرائض کے ترک کو، وغیرہ وغیرہ، اگر یہ دنیا مردار نہیں، تو اور کیا ہے اور اس کے طالب کتے نہیں، تو اور کیا ہیں، یہی وہ دنیا ہے، جس کو حدیث میں مردار کہا گیا ہے اور اس کے طالب کو کتا، قرآن و حدیث کی اصطلاح ایک ہے، کاش برق صاحب دنیا کے اصطلاحی معنوں پر جو قرآن و حدیث میں بیان ہوتے ہیں غور کرتے تو کبھی غلط فہمی نہ پیدا ہوتی، اس مشہور مصرع میں کس خوبی سے ان اصطلاحی معنوں کو ادا کیا گیا ہے

"چیست دنیا؟ از خدا غافل بدن"

یعنی دنیا کیا چیز ہے؟ دنیا نام ہے خدا سے غافل ہونے کا، اور اگر خدا سے غافل نہ ہو تو پھر یہ دنیا مومن کی دنیا ہے اور یہ اصطلاحی دنیا سے علیحدہ ایک چیز ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس اصطلاحی دنیا سے علیحدہ رہنے کی بار بار تاکید فرماتا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (منافقون - ۹)	اے ایمان والو، تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دے اور جو ایسا کرے گا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا
إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ (تغابن - ۱۵)	اے مسلمانو، تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش کی چیزیں ہیں، اور اللہ کے پاس اجر عظیم ہے۔

(یعنی کہیں ایسا نہ ہو، کہ مال و اولاد کی حرص میں تم اللہ کو بھول جاؤ، اور اجر عظیم سے محروم ہو جاؤ) پھر فرمایا

وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (تغابن - ۱۶)	جو شخص نفسانی حرص و طمع سے محفوظ رہا، بس ایسے ہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

غرض یہ کہ مومن کی دنیا وہ ہے کہ نہ دنیا کی فراوانی اور اس کے حصول میں انہماک اس کو اللہ سے غافل کرتا ہے، اور نہ وہ اس کی حرص میں مبتلا ہوتا ہے، بلکہ وہ دنیاوی ساز و سامان کو آزمائش کی چیزیں سمجھتا ہے، اور ان کو اسی طریقہ سے استعمال کرتا ہے جس طریقہ سے اللہ نے حکم دیا ہے، ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد ہے۔

رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ (النور)	یہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت اور خرید و فروخت ان کو اللہ کے ذکر اور نماز ادا کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس دن دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی

مندرجہ بالا آیات بینات سے یہ بات واضح ہو گئی، کہ دنیا کا لفظ جہاں کہیں قرآن و حدیث میں آتا ہے وہاں اس سے مراد وہ دنیا ہوتی ہے جس میں پھنس کر انسان اللہ کو بھول جاتا ہے، اور یہ بھی ثابت ہو گیا، کہ ایسی دنیا یقیناً مردار ہے، اور اس کے طالب کا ٹھکانہ سوائے آگ کے اور کہیں نہیں، اب میں اس آیت کو پیش کرتا ہوں، جو حدیث زیر بحث کے بالکل متوافق اور لفظاً مطابق ہے، اور گویا حدیث مذکور اس ہی آیت کی تفسیر ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۹) وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۔

(اعراف - ۱۷۵)

ان لوگوں کو اس شخص کا حال سنایئے جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں، لیکن اس نے روگردانی کی اور شیطان کا اتباع کیا، اور گمراہوں کی جماعت میں داخل ہو گیا اور اگر ہم چاہتے، تو ان آیات کی بدولت اس کا مرتبہ بلند کر دیتے لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا، اور اپنی خواہش کی پیروی کی پس اس کی مثال کتے کی ہے اگر اس پر بوجھ رکھا جائے تو ہانپے اور چھوڑ دیا جائے تو ہانپے

کتا ہر حال میں ہانپتا رہتا ہے، خواہ راحت ہو یا تکلیف، اور کہیں کوئی کھانے کی چیز مل جائے، تو پھر دوسرے کتے کی شرکت اس کو گوارا نہیں ہوتی، چاہتا ہے، کہ بلا شرکت غیرے میں ہی اس کو کھا جاؤں، اپنے ہم جنس کو دیکھ کر بھونکنے اور بھنبوڑنے لگتا ہے، جب انسان کی بھی یہ حالت ہو جاتی ہے، کہ احکام الٰہی کو چھوڑ کر اپنی خواہش پر چلتا ہے، دنیا کی فراوانی ہو تو اور زیادہ ملنے کی حرص ہا ئی تنگ دستی ہو تو اس کی تڑپ ہو جو، چاہتا ہے، کہ دنیا صرف میرے لئے ہو، تو اس کی یہ دنیا بمنزلہ مردار کے ہوتی ہے، اور وہ مثل کتے کے ہوتا ہے، اور یہ حدیث اس پر صادق آتی ہے، کہ دنیا مردار ہے، اور اس کے طالب کتے ہیں"

نتیجہ آیت بالا سے ثابت ہوا، کہ احکام الٰہی کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی کرنا دنیا ہے، اور یہ دنیا ایسی ہی حرام ہے، جیسے مردار اور اس کے چاہنے والے مثل کتوں کے ہیں۔

آخری گذارش غالباً اب حدیث کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہو گا، ان تمام مباحث میں میں نے دنیا کے اصطلاحی معنوں کے لئے قرآن مجید کا حوالہ دیا ہے، اب ان اصطلاحی معنوں کے ثبوت کے لئے حدیث کا حوالہ دے کر اس بحث کو ختم کرتا ہوں، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَلَسَ ذَاتَ يَوْمٍ عَلَى الْمِنْبَرِ وَجَلَسْنَا حَوْلَهٗ فَقَالَ اِنِّیْ مِمَّا اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِیْ مَا يُفْتَحُ عَلَيْكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتِهَا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوَ يَاْتِی الْخَيْرُ بِالشَّرِّ فَسَكَتَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھ گئے اور ہم لوگ آپ کے گرد بیٹھ گئے، آپ نے فرمایا مجھے اپنے بعد جن باتوں کا تم پر خوف ہے ان میں سے ایک یہ ہے، کہ تم پر دنیا کی زیبائش اور مال و دولت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے، ایک شخص نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول کیا اچھی چیز بھی برائی پیدا کرتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے

فَقِيْلَ لَهٗ مَا شَأْنُكَ تُكَلِّمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا يُكَلِّمُكَ فَرَأَيْنَا أَنَّهٗ يُنْزَلُ عَلَيْهِ قَالَ فَمَسَحَ عَنْهُ الرُّحَضَاءَ فَقَالَ أَيْنَ السَّائِلُ وَكَأَنَّهٗ حَمِدَهٗ فَقَالَ إِنَّهٗ لَا يَأْتِي الْخَيْرُ بِالشَّرِّ وَإِنَّ مِمَّا يُنْبِتُ الرَّبِيْعُ يَقْتُلُ أَوْ يُلِمُّ إِلَّا آكِلَةَ الْخَضْرَاءِ أَكَلَتْ حَتّٰى إِذَا امْتَدَّتْ خَاصِرَتَاهَا اسْتَقْبَلَتْ عَيْنَ الشَّمْسِ فَثَلَطَتْ وَبَالَتْ وَرَتَعَتْ وَإِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ فَنِعْمَ صَاحِبُ الْمُسْلِمِ مَا أَعْطٰى مِنْهُ الْمِسْكِيْنَ وَالْيَتِيْمَ وَابْنَ السَّبِيْلِ أَوْ كَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنَّهٗ مَنْ يَأْخُذُهٗ بِغَيْرِ حَقِّهٖ كَالَّذِيْ يَأْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ وَيَكُوْنُ شَهِيْدًا عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ علی الیتامی)

اس شخص سے کہا گیا، کہ تجھے کیا ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کرتا ہے حالانکہ وہ تجھ سے کلام نہیں فرماتے، پھر ہم نے دیکھا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے، پھر آپ نے پسینہ پونچھا اور فرمایا سائل کہاں ہے، گویا آپ نے اس کے سوال کو پسند فرمایا، پھر آپ نے فرمایا، بیشک اچھی چیز برائی پیدا نہیں کرتی، مگر فصل ربیع ایسی گھاس بھی پیدا کرتی ہے جو مار ڈالتی ہے یا بیمار کر دیتی ہے، مگر اس سبزی چرنے والے کو نقصان نہیں پہنچاتی، جو چرے، پھر جب اس کے دونوں کوکھ بھر جائیں، تو وہ سورج کے سامنے آجائے، پھر لید کرے اور پیشاب کرے، اور اس کے بعد پھر چرنے لگے، اور بیشک یہ مال ایک میٹھی سبزی ہے، پس اس مسلمان کا مال کتنا اچھا ہے، جو اپنے مال سے مسکین، یتیم اور مسافر کو دیتا رہتا ہے، اور بیشک جو شخص اس مال کو ناجائز طریقے سے لے گا، وہ اس جانور کی طرح ہے، کہ کھائے اور سیر نہ ہو، اور وہ مال اس پر قیامت کے دن گواہ ہوگا۔

حدیث بالا سے ثابت ہوا، کہ دنیا سے مراد مسلم کی دنیا نہیں جس کو وہ حلال طریقے سے حاصل کرتا ہے، اس کا حریص نہیں ہوتا، اور پھر اس کے خرچ کرنے میں بخل نہیں کرتا، ہاں دنیا سے مراد وہ دنیا ہے جس کو حرص اور طمع کے ساتھ ناجائز طریقے سے حاصل کیا جائے، اور اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کیا جائے، یہ ہے وہ دنیا جو مردار ہے، اور بے شک اس کے طالب کتے ہیں، غرض یہ کہ حدیث میں خود اس بات کی وضاحت ہے، کہ لفظ دنیا کا اطلاق کس دنیا پر ہوتا ہے، قرآن اور حدیث میں یہ لفظ ایک ہی اصطلاح میں استعمال ہوا ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے، کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ کاش برق صاحب قرآن و حدیث کا عمیق مطالعہ فرماتے، تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں: "میں مسلسل چودہ برس تک حصول علم کے لئے مختلف علماء وصوفیہ کے

ہاں رہا، درس نظامی کی تکمیل کی سینکڑوں واعظین کے وعظ سنے بیسیوں دینی کتابیں پڑھیں، اور بالآخر مجھے یقین ہو گیا، کہ اسلامی تعلیمات کا ماحاصل یہ ہے" (دو اسلام ص۱۵)

اس کے بعد برق صاحب نے سلسلہ وار ان چیزوں کو شمار کیا ہے، جن کو انہوں نے اسلامی تعلیمات کا ماحاصل سمجھا تھا، میں بھی ان چیزوں کو اسی سلسلہ سے بیان کر رہا ہوں۔ اور ساتھ ساتھ اپنے معروضات بھی پیش کر رہا ہوں۔

(۱) "فرائض خمسہ یعنی توحید کا اقرار اور صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج کی بجا آوری"

برق صاحب ان پانچوں چیزوں کا حکم قرآن میں موجود ہے، آخر اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

(۲) "اذان کے بعد ادب سے کلمہ شریف پڑھنا"

مؤذن کلمہ شریف پڑھتا ہے ہم بھی اپنے عہد توحید و رسالت کی تجدید کر لیتے ہیں، رہا ادب سے پڑھنا تو آخر اس میں کیا اعتراض ہے، برق صاحب بے ادبی کو تو آپ بھی پسند نہیں کریں گے

(۳) "مختلف رسوم مثلاً جمعرات، چہلم، گیارہویں وغیرہ کو باقاعدگی سے ادا کرنا"

واقعی یہ خرافات ہیں، ہمیں آپ سے اتفاق ہے، صحیح حدیث کو ماننے والے ان بدعات سے کلیتہً بیزار ہیں

(۴) "قرآن کی عبارت پڑھنا"

معلوم نہیں کہ اس میں کیا اعتراض ہے، اس لئے کہ تلاوت قرآن کا حکم تو قرآن میں موجود ہے، ارشاد ہے

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ (عنکبوت ۴۵)	اس کتاب کی جو وحی آپ کو کی جاری ہے، اس کی تلاوت کیا کرو۔

ہاں اگر آپ کا مقصد یہ ہے، کہ بے سمجھے اور بغیر علم و عمل کی نیت کے پڑھنا، تو پھر ہمیں بھی آپ سے اتفاق ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

لَمْ يَفْقَهْ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فِيْ اَقَلَّ مِنْ ثَلٰثٍ	جو شخص تین دن سے کم میں قرآن ختم کرتا ہے، وہ کچھ نہیں سمجھتا (ابوداؤد، ترمذی، دارمی)

گویا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا بھی یہی ہے، کہ قرآن سمجھ کر پڑھا جائے، دیکھا برق صاحب حدیث بھی آپ کی تائید کرتی ہے، دوسری حدیث میں ہے ؎

ثُمَّ تَدَبَّرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)	یعنی قرآن کے مضامین میں غور و فکر کیا کرو، تاکہ تم نجات پاؤ

ایک شخص دریافت کرتا ہے، کہ اے اللہ کے رسول:۔

كَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْآنَ	یعنی علم کیسے جاتا رہے گا، حالانکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں،
وَنُقْرِئُهُ أَبْنَاءَنَا وَيُقْرِئُهُ أَبْنَاءُنَا	اور اپنے بیٹوں کو پڑھائیں گے، اور ہمارے بیٹے اپنے
أَبْنَاءَهُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ	بیٹوں کو پڑھائیں گے، اسی طرح قیامت تک ہوتا رہے گا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

أَوَ لَيْسَ هٰذَا الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰى يَقْرَءُونَ	یعنی کیا یہود و نصاریٰ تورات و انجیل نہیں پڑھتے
التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ لَا يَعْمَلُونَ بِشَيْءٍ مِمَّا	لیکن ان کے احکام پر عمل نہیں کرتے، جو ان میں دیئے
فِيهِمَا۔	گئے ہیں۔ (احمد، ابن ماجہ)

غرض یہ کہ احادیث متعددہ سے یہ بات ثابت ہے، کہ قرآن کو سمجھ کر غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے، اور اس پر عمل کیا جائے، یہی تلاوت کا حق ہے، کسی حدیث میں صراحت نہیں، کہ بغیر سمجھے پڑھنا بھی کار ثواب ہے، بہر حال برق صاحب اتنا آپ کو بھی تسلیم کر لینا چاہیئے، کہ جو شخص قرآن کو بغیر سمجھے پڑھتا ہے، وہ کچھ دیر ضرور اپنے آپ کو لغو کاموں سے بچا لیتا ہے، اور اگر اس کی یہ نیت بھی ہو، تو پھر لامحالہ ایسا پڑھنا بھی کچھ نہ کچھ مفید ضرور ہو گا۔

(۵) "اللہ کے ذکر کو سب سے بڑا عمل سمجھنا"

برق صاحب کاش وہ حدیث آپ تحریر فرما دیتے، جس کا یہ مفہوم ہے، بہر حال اتنا ضرور عرض کئے دیتا ہوں، کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ذکر کی فضیلت بیان کی گئی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرۃ۔۱۵۲)	تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ	یعنی زمین و آسمان کی پیدائش میں، اور رات، دن کے
اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝	آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں
الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا	یعنی ان لوگوں کے لئے جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، کھڑے
وَعَلٰى جُنُوبِهِمْ (آل عمران۔۱۹۰)	بیٹھے، اور اپنی کروٹوں پر۔

مزید سنیئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ (عنکبوت۔۴۵)	اور بیشک اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔

لیجیئے جس چیز پر آپ کو اعتراض ہے، وہ قرآن میں موجود ہے۔

(۶) "قرآن اور درود کے ختم کرانا" (۷) "اچھل اچھل کر ہو حق کا ورد کرنا"

(۸) "نجات کے لئے کسی مرشد کی بیعت کرنا" (۹) "مردوں سے مرادیں مانگنا"

(۱۰) "مزاروں پر سجدے کرنا" (۱۱) "خلیفہ لباس کو پیغمبری لباس سمجھنا"

(۱۲) "مزاروں اور بازاروں میں سب کے سامنے ڈھیلا کرنا" (۱۳) "تعویذوں اور منتروں کو مشکل کشا سمجھنا"

(۱۴) "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب، نیز حاضر ناظر قرار دینا"

(۱۵) "کسی بیماری یا مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے ملاجی کی ضیافت کرنا"

(۱۶) "گناہ بخشوانے کے لئے قوالی سننا" (۱۷) "ہر غیر مسلم کو ناپاک و نجس سمجھنا"

(۱۸) "امام ابو حنیفہ رح کی فقہ پر ایمان لانا"

برق صاحب ہمیں ان تمام باتوں میں آپ سے اتفاق ہے، احادیث صحیحہ ان کی تائید نہیں کرتیں، یہ تمام خرافات ہیں، جو گھڑ لئے گئے ہیں، ہاں قرآن کی رو سے مشرکین عقیدتاً نجس ضرور ہیں

(۱۹) "صحاح ستہ کو وحی سمجھنا"

صحاح ستہ یہ چھ کتابیں ہیں صحیح بخاری و صحیح مسلم کو چھوڑ کر باقی کتابوں میں چند ضعیف احادیث بھی ہیں، پھر ان تمام کتابوں میں صحابہ اور ائمہ دین کے اقوال بھی ہیں، لہٰذا یہ کہنا، کہ جو کچھ صحاح ستہ میں ہے وحی ہے صحیح نہیں۔ گویا اس صورت میں ہمیں آپ سے اتفاق ہے لیکن ان کتابوں میں جو صحیح احادیث ہیں، ان کے متعلق ہم بلا خوف و جھجک بغیر کسی پس و پیش و احساس کمتری کے اعلان کرتے ہیں، کہ بیشک ان کا مفہوم منشا وحی الٰہی ہے، اور ان پر ہمارا اسی طرح ایمان ہے جس طرح قرآن پر، وہ اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح قرآن، ہماری موجودہ اصطلاح میں اس کا نام وحی خفی ہے یہی ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف کا نقطہ آغاز ہے، اس وحی خفی کے اثبات میں ارادہ تھا کہ آپ کی کتاب کے آخری باب کے سلسلہ میں اپنی معروضات پیش کرتا اور آپ کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتا لیکن مسئلہ کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے، کہ تمہید میں بھی کچھ لکھا جائے، لہٰذا لکھنے کی کوشش کرتا ہوں وباللہ التوفیق، یہ بحث کئی عنوانات پر مشتمل ہے، جو ذیل میں سلسلہ وار درج کئے جا رہے ہیں۔

کیا انبیاء سابقین پر کتاب الٰہی کے علاوہ وحی نازل ہوئی

انبیاء سابقین پر کتاب الٰہی کے علاوہ بھی وحی نازل ہوئی تھی، اس کی چند مثالیں ذیل میں ملاحظہ ہوں :۔

آدم علیہ السلام :۔ اللہ تعالٰی فرماتا ہے :۔

قَالَ يَآدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (بقرہ۔ ۳۳) اے آدم فرشتوں کو ان کے نام بتادو۔

پھر ارشاد فرمایا۔

يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ الآیۃ (البقرۃ۔ ۳۵) — اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، اور خوب کھاؤ جہاں سے جی چاہے، مگر اس درخت کے قریب جانا

لیکن شیطان کے بہکانے سے انہوں نے اس درخت میں سے کھالیا۔

وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (طٰہٰ۔ ۱۲۱) — آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بہک گئے

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (البقرۃ۔ ۳۷) — آدم علیہ السلام کو ان کے رب کی طرف سے چند کلمات سکھلائے گئے، پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی بیشک اللہ تواب اور رحیم ہے ہم نے کہا تم سب یہاں سے اترو، پھر جب کبھی تمہارے پاس میری ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، تو وہ بے خوف و بے غم ہوگا۔

آدم علیہ السلام جنت سے اتارے جاتے ہیں، اس وقت کتاب ہدایت کے بھیجنے کا وعدہ کیا جاتا ہے، گویا ابھی تک کتاب نہیں آئی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے باتیں کرتا تھا، حتیٰ کہ اس کتاب سے پہلے اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو چند کلمات بھی سکھلائے تھے جن کے ذریعہ سے ان کی توبہ قبول ہوئی، لہٰذا ثابت ہوا، کہ کتاب اللہ کے علاوہ بھی آدم علیہ السلام پر وحی آتی تھی۔

موسیٰ علیہ السلام:۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِىَ يٰمُوْسٰى اِنِّىْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (طٰہٰ) — جب موسیٰ علیہ السلام آگ کے پاس پہنچے تو ان کو پکارا گیا اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں، اپنی جوتیاں اتار دے

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (طٰہٰ) — سن جو کچھ وحی کی جارہی ہے

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ (طٰہٰ) — میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو

پھر اللہ تعالےٰ نے پوچھا۔

مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (طٰہٰ، ۱) — اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں یہ کیا ہے

پھر عصا اور ید بیضا کے معجزات عطا ہوئے، پھر ارشاد ہوا

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۴) — فرعون کے پاس جا، وہ بہت سرکش ہو گیا ہے

الغرض موسیٰ علیہ السلام فرعون کو تبلیغ کرتے ہیں جادوگروں سے مقابلہ ہوتا ہے، اس موقع پر پھر

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (طٰہٰ ۔ ۶۸) مت ڈرو تم ہی غالب رہو گے

پھر موسیٰ علیہ السلام وہاں سے ہجرت کرتے ہیں، فرعون غرق ہو جاتا ہے، موسیٰ علیہ السلام وادی سینا میں تشریف لے آتے ہیں، پھر اس موقع پر ان کو کتاب دی جاتی ہے، ارشاد باری ہے:۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ — اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہر قسم کے نصائح

مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا — اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی، اور حکم دیا کہ اس کو

بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا — قوت کے ساتھ پکڑو، اور اپنی قوم کو حکم کرو کہ ان

(الاعراف ۔ ۱۴۵) — اچھی باتوں پر عمل کرے۔

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام قوم کے پاس واپس آئے، اور بچھڑا پوجنے کی وجہ سے ان پر اتنا غصہ آیا، کہ وہ تختیاں زمین پر پٹخ دیں، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ (طٰہٰ ۔ ۱۵۰) — اور تختیاں پٹخ دیں

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ — اور جب موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا

الْاَلْوَاحَ (۱۵۴) — تو تختیاں اٹھالیں۔

برقی صاحب دیکھا آپ نے کتاب تو اب ملی ہے لیکن اس سے پہلے اللہ تعالےٰ موسیٰ علیہ السلام پر بے شمار مرتبہ وحی کر چکا تھا کتاب دینے کے بعد فرمایا "اسے مضبوطی سے پکڑو" اور تو اور کتاب جب نازل ہوئی، تو ایسی کہ اس میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر طرح کی تفصیل تھی لیکن اس کے بعد بھی وحی جاری رہی، موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو کوہ طور پر لے جاتے ہیں، یہ لوگ اللہ تعالےٰ کو دیکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں، ایک بجلی آتی ہے، اور سب مر جاتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے ہیں، تو جواب ملتا ہے۔

عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ — میں اپنا عذاب پہنچاتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور

رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ۱۵۶) — میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔

الغرض کتاب الٰہی سے پہلے بھی وحی جاری ہے، اور کتاب الٰہی کے بعد بھی وحی جاری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے مختلف مواقع پر گفتگو فرمائی، جس کا خلاصہ یہ ہے، اے

خلاصہ موسیٰ یہ مقدس وادی ہے، جوتے اتار دو، یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے، اسے زمین پر ڈال دو، ڈرو نہیں، میرے پاس رسول ڈرا نہیں کرتے، اس کو اٹھالو، یہ پھر لاٹھی بن جائے گا، ہاتھ کو جیب میں

ڈالو، فرعون کے پاس جاؤ، اس سے نرمی سے بات کرنا، انہوں نے جواب دیا ڈر لگتا ہے، کہیں وہ قتل نہ کر دے، دعا کی مجھے ایک وزیر چاہیئے، میری زبان صاف نہیں، اس کی اصلاح فرمایئے، جواب ملا، اچھا یہ باتیں قبول وغیرہ وغیرہ، حکم ملا گائے کو ذبح کرو، قوم نے طرح طرح کے بے ہودہ سوالات کئے اللہ تعالٰے جواب دیتا رہا، غرض یہ کہ اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں، جو کہ قرآن میں مذکور ہیں، برقی صاحب انصاف سے بتایئے، کیا یہ سب باتیں اس کتاب الٰہی میں موجود تھیں، جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی،

یوسف علیہ السلام :- ارشاد باری ہے :-

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (یوسف - ۱۵)

جب وہ یوسف علیہ السلام کو لے کر چلے اور اس بات پر اتفاق کیا، کہ ان کو کنوئیں میں ڈال دیا جائے، تو ہم نے یوسفؑ کو وحی بھیجی، کہ تم ان کو اس کام کی خبر دو گے اور وہ نہ سمجھتے ہوں گے

یوسف علیہ السلام ابھی بچے ہیں لیکن وحی آ رہی ہے، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے :-

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (یوسف - ۲۲)

جب وہ جوان ہوئے، تو ہم نے ان کو حکم دیا اور علم دیا -

ابھی انہیں کتاب نہیں دی گئی تھی، ورنہ وہ مبلغ کی حیثیت سے سامنے آتے، اس کے بعد زنان مصر نے انہیں اپنی طرف مائل کرنا چاہا، انہوں نے انکار کیا، جس کے نتیجہ میں وہ قید خانہ میں بھیج دیئے گئے، قید خانہ میں تبلیغ شروع ہوتی ہے، اگر بالفرض حکم و علم کے ملنے سے مراد کتاب الٰہی کا ملنا ہے، تو پھر کتاب سے پہلے بچپن میں وحی کا آنا ثابت ہے، گویا یوسف علیہ السلام پر کتاب الٰہی کے علاوہ وحی آتی تھی۔

دیگر انبیاء کرام سے اللہ تعالیٰ کی گفتگو اللہ تعالےٰ کے فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف عذاب الٰہی کے ساتھ بھیجے گئے ہیں، آگے ارشاد ہوتا ہے :-

يُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ (ھود - ۷۴)

ابراہیمؑ قوم لوط کے بارے میں ہم سے جھگڑنے لگے

اللہ تعالےٰ نے جواب دیا اے ابراہیم

اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا (ھود - ۷۶)

اس بات کو جانے دو -

کیا ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے مجادلہ، اور سوال و جواب صحف ابراہیم میں موجود تھا -

زکریا علیہ السلام دعا کرتے ہیں، اے اللہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں، مجھے فرزند عنایت فرما، اللہ تعالیٰ

نے فرمایا اچھا تمہارے ہاں لڑکا ہوگا جس کا نام یحییٰ ہوگا، اور یہ نام پہلے کسی کا نہیں ہوا، پوچھا اے اللہ کیسے ہوگا، میں بوڑھا ہوں، میری بیوی بانجھ ہے، جواب ملا، یہ میرے لئے آسان ہے، عرض کیا اے اللہ اس کی نشانی مقرر فرما دے، جواب دیا اس کی نشانی یہ ہے، کہ تین رات تک بات نہ کر سکو گے (مریم ۳۔۱۰)
کیا یہ باتیں حضرت زکریا علیہ السلام کی کتاب میں موجود تھیں

نتیجہ قرآن مجید کے محولہ بالا واقعات سے ثابت ہوا، کہ انبیاء علیہم السلام کے پاس کتاب الٰہی کے علاوہ بھی وحی آیا کرتی تھی، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ سید المرسلین کے پاس سوا قرآن کے دوسری وحی نہ آئے، ضرور آتی تھی، اور ان سے زیادہ آتی تھی، ورنہ لازم آئے گا، کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں آپ اس نعمت سے محروم تھے، انبیاء سابقین سے اللہ تعالیٰ کی باتیں ہوتی تھیں، سوال و جواب ہوتے تھے، کیا ایسا ہوسکتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ قرآن کے علاوہ کبھی اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا، اور نہ کبھی جواب ملا، ضرور سوال و جواب ہوئے، لیکن وہ قرآن میں موجود نہیں، لہٰذا وہ دوسری وحی (حدیث) میں ہیں۔

(۲) حدیث اگر حجت ہے، تو پھر اس کا منزل من اللہ ہونا ضروری ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف)	صرف اس چیز کا اتباع کرو، جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے، اور اس کے علاوہ کسی ولی کا اتباع مت کرو۔

اب اگر یہ ثابت ہو جائے، کہ حدیث حجت ہے، اور اس کے بغیر قرآن پر عمل کرنا ناممکن ہے تو پھر یقیناً حدیث وحی ہے، کیونکہ آیت بالا کی رو سے صرف وحی کا اتباع لازم ہے، اور غیر وحی کا اتباع حرام ہے۔

حدیث کے حجت ہونے کے دلائل!

دلیل اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اور قوم کو مخاطب کیا "اے قوم میں اللہ کا رسول ہوں مجھے قرآن مجید دیا گیا ہے، وغیرہ وغیرہ" یہی یا اس قسم کے الفاظ ہوں گے، جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کو مخاطب کیا ہوگا، اگر یہ الفاظ حجت ہیں، تو پھر یہ ماننا پڑے گا، کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اور قرآن اللہ کی کتاب ہے، اگر یہ الفاظ حجت نہیں، تو پھر لازم آئے گا، کہ نہ آپ

رسول ہیں، نہ قرآن اللہ کی کتاب ہے، آپ کی رسالت اور قرآن مجید پر ایمان لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ الفاظ حجت ہوں، جب تک یہ الفاظ حجت نہ ہوں، قرآن بھی حجت نہ ہوگا، اور یہ الفاظ حدیث کے الفاظ ہیں، لہذا حدیث کا حجت ہونا لازمی ہے۔

دلیل دوم قرآنی الفاظ کی تشریح و معانی، اور آیات قرآنی سے استنباط مسائل آج کل بھی لوگ کر رہے ہیں، اور ہمیشہ کرتے رہیں گے، عہد رسالت میں بھی لازماً ایسا ہوا ہوگا، اور یہ بھی عقلاً محال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کوئی دوسرا تشریح و استنباط کے فرائض انجام دے، لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کام کو بھی انجام دیتے ہوں گے، اور جب آپ کسی آیت قرآنی کی تفسیر کرتے ہوں گے، تو کیا کسی کو اس کے تسلیم کرنے سے انکار کرنا جائز تھا کیا وہ کہہ سکتا تھا کہ آپ کی منزل من اللہ آیت سچی، اور آپ کی تفسیر غلط، بس آپ آیت سنا دیجئے تفسیر ہم خود کر لیں گے" ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا اور جب ایسا نہیں ہو سکتا، تو پھر تفسیر قرآن کے سلسلہ میں حدیث کا حجت ہونا ظاہر ہے۔

ایک شبہ یہاں بعض لوگوں کو ایک شبہ بھی پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ آپ کی تفسیر صرف آپ کی زندگی میں حجت ہے، آپ کے انتقال کے بعد آپ کے خلیفہ کی تفسیر حجت ہوگی، کیونکہ وہی اس وقت مرکز ملت ہوگا، اور تفسیر کا تعلق مرکز ملت سے ہے منصب رسالت سے نہیں، یہ شبہ بذات خود مضحکہ خیز ہے گویا رسالت کا منصب، مرکز ملت کے منصب سے کم درجہ ہے، یہ عقلاً اور شرعاً محال ہے، اور اگر بالفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مرکز ملت کی تفسیر حجت ہوگی، تو بہر حال قرآن کے علاوہ ایک دوسری چیز حجت مانی گئی، اور یہ یقیناً مرکز اولین یعنی رسول کی تشریح سے کم درجہ کی چیز ہوگی، جب یہ حجت ہو سکتی ہے، تو مرکز اولین یعنی رسول کی تشریح کا حجت ہونا زیادہ قرین عقل ہے

دلیل سوم رسول صاحب وحی ہوتا ہے، اور ہمارا ایمان ہے، کہ اس کی حدیث وحی الٰہی ہوتی ہے لہذا آیت بالا کی رو سے اس کا اتباع لازمی ہے، اور اس طرح ہم کسی قسم کے شرک میں مبتلا نہیں ہوتے لیکن جو لوگ مرکز ملت کی تشریح کو حجت شرعی سمجھتے ہیں، اور اس کی اتباع کو لازمی قرار دیتے ہیں، وہ یہ بتائیں، کہ آیا ان کی یہ تشریح وحی ہوتی ہے یا نہیں، اگر وہ یہ کہیں کہ وحی ہوتی ہے، تو گویا ہر مرکز ملت یعنی خلیفہ صاحب وحی ہوا، اور یہ باطل ہے، اور اگر وہ یہ کہیں، کہ وحی نہیں ہوتی، تو پھر آیت بالا کی رو سے اس کا اتباع حرام، اور حرام کو حلال بلکہ فرض سمجھنا شرک اور کفر کے سوا کچھ نہیں، لہذا قرآن کی تشریح کے لئے صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ اس کی تشریح بھی وحی ہو، ورنہ اس کا اتباع حرام بلکہ شرک ہوگا، اور وحی صرف رسول کے پاس آتی ہے، لہذا صرف رسول کی تشریح حجت ہوگی، کسی اور کی تشریح

حجت نہیں ہوگی، یعنی حدیث رسول حجت شرعیہ ہے، لہٰذا وحی ہے۔

دلیل چہارم کیا قرآن خود مکتفی ہے، ہرگز نہیں، بلکہ اس کو سمجھنے کے لئے لغت کی ضرورت ہے اور یہ مسلمہ امر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں، خصوصاً اس صورت میں کہ اسلامی حکومت اس جگہ قائم ہو، جہاں کی مادری زبان عربی نہ ہو، اور مرکز ملت عربی سے ناآشنا ہو، ایسی صورت میں قرآن کو سمجھنے کے لئے عربی لغت کی طرف رجوع کرنا ہوگا، پس ثابت ہوا، کہ قرآن کفایت نہیں کرتا، بلکہ اپنی تشریح کے لئے دوسری چیز کا محتاج ہے، اور یہ ثبت ہے، اور جب یہ چیز حجت ہے، تو وہ چیز حجت کیوں نہ ہو، جو قرآن کی شرعی لغت ہے یعنی حدیث۔ لغت میں کسی لفظ کی تشریح یا معنی کسی ایک آدمی یا چند آدمیوں کی طرف منسوب ہوتے ہیں، وہ آدمی بھی معصوم نہیں ہوتے، گو ان سے غلطی نہ ہو، پھر اکثر وہ مجہول ہوتے ہیں، مزید براں ان کے بیان کردہ معانی کاتب لغت تک سنداً نہیں پہنچتے، پھر لغت کا مؤلف ضروری نہیں کہ صادق القول اور راسخ فی العلم ہو اگر باوجود ان تمام عوارض کے لغت کے مندرجات حجت ہوں، تو کتنے افسوس کا مقام ہے، کہ معصوم، الصادق المصدوق، صاحب وحی، انسان کامل، معلوم و معروف شخصیت کے بیان کردہ معانی، جو صادق القول اور راسخین فی العلم نے باسند باوثوق معروف و مشہور، صادق القول، مسلمہ استادوں سے حاصل کرکے جمع کئے ہوں، حجت نہ ہوں، پھر یہ افسوس اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے، جب کہ ان معانی پر امت کا عملاً اجماع ہو، وہ معانی مخبر صادق تک لفظاً بھی مشہور و متواتر ہوں، اور عملاً بھی متواتر ہوں، پھر بھی وہ تو حجت نہ ہوں، اور حجت ہو، تو وہ لغت کہ نہ باسند ہے، اور نہ یہ ضروری ہے، کہ اس کا مؤلف مسلم یا شرع باوقار عالم ہو، بلکہ ہو سکتا ہے، کہ متعصب، غیر مسلم، یا کم علم ملا ہو۔

دلیل پنجم لغت زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، لہٰذا کس لغت کو حجت قرار دیا جائے، اور کس کو نہیں اس مشکل کا حل سوائے اس کے اور کوئی نہیں، کہ اس لغت کو حجت مانا جائے، جو مہبط وحی نے بتائی، اور وحی کے اولین مخاطبین نے سمجھی، اور اس وقت بولی جاتی تھی، جب قرآن عزیز اترد رہا تھا۔

دلیل ششم ہر فن اور ہر علم کی ایک اصطلاح ہوتی ہے بعض اوقات لغت میں کچھ معنی ہوتے ہیں اور اصطلاح میں کچھ، ایسی صورت میں اصطلاحی معنی ہی منشاء کلام کو سمجھنے کے لئے حجت ہوتے ہیں، نہ کہ لغوی معنی، ایک شخص گو وہ کتنا ہی بڑا ادیب کیوں نہ ہو علوم ریاضی، علوم طبیعات، علوم طب وغیرہ کی کتابوں کو نہیں سمجھ سکتا، اس لئے کہ وہ فنی اصطلاح سے ناواقف ہوتا ہے، اس کے لئے لغت کا علم بیکار ہی نہیں ہوگا، بلکہ مزید حیرانی کا موجب، قرآن چونکہ علوم شرعیہ کا منبع ہے، لہٰذا اس کی بھی کوئی نہ کوئی اصطلاح

ہونی چاہیئے، مثلاً زکوٰۃ کے لغوی معنی کچھ اور ہیں، اور شرع میں کچھ اور، اور شرع میں وہی معنی معتبر ہیں، جو کہ اصطلاحاً مشہور و معروف ہیں، اور اصطلاح بھی اس شخص کی مستند مانی جائے گی جس پر قرآن نازل ہوا یا جن کے زمانہ میں قرآن نازل ہوا، کیونکہ مرورِ ایام سے اصطلاح بھی بدل جایا کرتی ہے، الغرض حدیث قرآن کے اصطلاحی معنی بیان کرتی ہے لہٰذا تشریح قرآن کے لئے وہی حجت ہے اور بس۔

دلیل ہفتم لغت میں ایک ہی لفظ کے دو دو، تین تین، چار چار، بلکہ دس دس، بیس بیس معانی دیئے ہوتے ہیں، اگر قرآنی تشریح کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو قرآن بازیچہ اطفال بن جائے گا کوئی کچھ معنی کرے گا، اور کوئی کچھ، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا، کہ الحاد کو پنپنے کا موقع ملے گا اختلافات کا ایک سیلاب عظیم ہوگا، اور امت مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی، جیسا کہ من مانی تفسیر کرنے سے فی الواقع ہو چکا ہے، اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا وجود اس کا عملی ثبوت ہے ان فرقوں نے حدیث کا براہ راست انکار کرنے کے بجائے اس کو ٹالنے کے لئے چور دروازے تلاش کئے کبھی قرآن کو بطور حجت پیش کیا، اور اس کے معانی وہ اختیار کر لئے جو حدیث کے خلاف تھے، اور پھر بطور فخر کے کہنے لگے، کہ ہمارے قول کی دلیل قرآن ہے، بھلا قرآن کے مقابلہ میں حدیث کیسے مانی جائے گی، کبھی اپنی عقل ناقص کو معیار بنا کر حدیث کو خلاف عقل سمجھ لیا، اور اس طرح حدیث سے نجات حاصل کر لی اس اختلاف اور الحاد کے سدباب کے لئے ضروری ہے، کہ قرآن کے ہر لفظ کے ایک معنی مقرر ہوں اور یہ کون کر سکتا ہے، سوائے رسول کے، کیونکہ رسول ہی ایسی شخصیت ہے، جس پر سب جمع ہو سکتے ہیں، لہٰذا ضروری ہے، کہ حدیث حجت ہو، اور قرآن کی وہی تشریح قابل تسلیم ہو، جو حدیث میں بیان کر دی گئی ہو، پس ثابت ہوا، کہ حدیث حجت ہے، لہٰذا منزل من اللہ ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ اس مشکل کا حل بعض لوگوں نے یہ بتایا ہے، کہ مرکز ملت کی تشریح ہر شخص کو تسلیم کرنی ہوگی، لہٰذا اختلاف و الحاد کا کوئی امکان نہیں تو اس کا جواب یہ ہے، کہ یہ جبری اتفاق ہوگا، اس سے ذہنی اختلاف دور نہ ہوگا، اور ہو سکتا ہے کہ کبھی یہ ذہنی اختلاف عملاً پھوٹ پڑے، اور بڑے بڑے فتنوں کا موجب بن جائے، مثلاً خارجی اور سبائی تحریکیں، اور ان کی ایک حد تک کامیابی یا لبقا اسی ذہنی اختلاف کا نتیجہ تھیں، دوسرا جواب اس کا یہ ہے، کہ تاریخ اس بات کی تائید نہیں کرتی، کہ مرکز ملت نے کوئی تشریح کی ہو اور کبھی اس کو چیلنج نہ کیا گیا ہو، بلکہ بارہا ایسا ہوا، یہ ایک ایسی چیز ہے، جس سے تاریخ کے طالب علم بخوبی واقف ہیں، تیسرے یہ کہ اگر ایک مرکز ملت اپنے زمانہ میں ایک آیت کے کچھ معنی کرے، دوسرا مرکز ملت کچھ

اور تیسرا مرکز ملت کچھ اور معنی کرے، اور اسی طرح معنی بدلتے رہیں، تو کیا یہ سب تشریحات صحیح مانی جائیں گی کیا ہر تشریح کالوحی من السماء ہو گی، کیا یہ تمام تشریحات "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کی مصداق نہ ہوں گی، اور ایک غیر مسلم ان میں سے کون سی تشریح کو قرآنی تشریح خیال کرے گا، فرض کیجیے کہ ایک مرکز ملت پانچ وقت کی نماز فرض قرار دے، اور دوسرا مرکز ملت تین وقت کی نماز فرض مانے تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دونوں تشریحات صحیح ہیں، کوئی غلط نہیں، جیسا کہ تقلیدی مذاہب میں ہوا اور ہو رہا ہے، ایک ہی چیز ایک مذہب میں حلال، دوسرے میں حرام، اور دونوں اپنے اپنے دائرہ میں حق پر، اب اگر کوئی حرام کھا رہا ہے، تو کھاتا رہے، ہمیں بولنے کی کیا ضرورت، وہ ہمارے لئے حرام ہے، لیکن اس کے لئے حلال ہے، اس کو نادانی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، کتنا عجیب اور کس قدر مضحکہ خیز وہ سماں ہو گا، جب ایک ہی زمانہ میں دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف مراکز ملت قائم ہو جائیں، اور ہر ایک اپنی اپنی تشریح کرتا رہے، حلال و حرام کا فرق ہو، اختلافات بعیدہ ہوں، لیکن ہم پھر بھی یہی کہیں کہ سب ٹھیک ہیں،

برق صاحب ذرا غور فرمائیے، وہ وقت کتنا عجیب ہو گا، جب کہ ایک مرکز ملت کسی لفظ کی تشریح کرے، اور اتفاق سے وہ لفظ لغت اضداد سے ہو اور دوسرا مرکز ایسے معنی کرے، جو پہلے کی ضد ہو، کیا یہ صورت ظہور پذیر نہیں ہو سکتی، ضرور ہو سکتی ہے پھر کیا یہ صورت حق ہو گی؟ نہیں بالکل باطل ہو گی، عقل سلیم کسی ایک معنی اور اس کی ضد دونوں کو صحیح نہیں مان سکتی، لہٰذا مرکز ملت کے معانی حجت نہیں ہو سکتے، اور نہ اس سے اختلاف و الحاد کا سد باب ہو سکتا ہے، یہ مرکز ملت کا مفروضہ اصول ہی بالکل مضحکہ خیز ہے، کاش یہ لوگ غور کرتے۔

چوتھی بات اس سلسلہ میں یہ بھی غور طلب ہے، کہ جب کوئی مرکز ملت ہی نہ ہو، جیسا کہ آج کل ہے تو پھر اختلاف و الحاد کو روکنے کی کیا صورت ہو گی، اختلاف اور الحاد کے سد باب کے لئے کوئی ایسا ذریعہ ہونا چاہیے، جو عارضی نہ ہو، بلکہ مستقل اور دائمی ہو، مرکز ملت اول تو اس مرض کی دوا نہیں، اور پھر مستقل اور دائمی نہ ہونے کی وجہ سے اس کو علاج کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں، اس کا سد باب وہی چیز کر سکتی ہے جو خود دائمی اور مستقل ہو، اور وہ سوائے حدیث کے اور کچھ نہیں، لہٰذا حدیث کے حجت ہونے میں کیا شبہ رہا، اور جب وہ حجت ہوئی، تو آیت زیر عنوان کی رو سے وحی ہوئی،

دوسرا شبہ اور اس کا ازالہ

بعض لوگ کہتے ہیں، کہ قرآن اپنی تشریح آپ کرتا ہے، لہٰذا ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں، لیکن یہ محض دعوی ہی دعوی ہے،

حقیقت اس کے خلاف ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" صلوٰۃ قائم کرو، صلوٰۃ کسے کہتے ہیں، اس کی تفصیل نہیں، قرآن میں جب اس کی تشریح تلاش کرتے ہیں، تو عجیب حیرانی ہوتی ہے ایک جگہ ارشاد ہے۔ "اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ" صابرین پر اللہ کی طرف سے صلوٰۃ ہوتی ہے اور رحمت، دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے "وَصَلِّ عَلَیْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ" ان پر صلوٰۃ بھیجیے، بیشک آپ کی صلوٰۃ ان کے لئے باعث سکون ہے، ایک جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلوٰۃ نازل ہو رہی ہے، دوسرے آیت میں بندے کو حکم ہو رہا ہے، کہ صلوٰۃ نازل کرو، اب کوئی کیا سمجھے، ایک جگہ ارشاد ہے "اَقِیْمُوا الدِّیْنَ" دین قائم کرو، ہوسکتا ہے، کہ صلوٰۃ کے معنی دین کے ہوں اور اس آیت میں صلوٰۃ کی تشریح دین سے کی گئی ہو، پھر ارشاد ہوتا ہے "وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ" وزن قائم کرو، لہٰذا صلوٰۃ کے معنی وزن کے بھی ہوسکتے ہیں، پھر ارشاد ہوتا ہے "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّیْلِ" یعنی دن کے دونوں اطراف اور کچھ رات کے وقت بھی صلوٰۃ قائم کرو، اس آیت سے معلوم ہوا، کہ صلوٰۃ ایسی چیز ہے، جو مسلسل قائم نہ رکھی جائے، بلکہ دن اور رات کے بعض اوقات میں قائم کی جائے، "صلوٰۃ" کے معنی کولہے ہلانے کے بھی ہیں، اس لحاظ سے اگر کوئی اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے معنی یہ کرے، کہ ناچ کی محفل قائم کرو" اور ثبوت میں یہ آیت پیش کرے "اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ" دنیا کی زندگی بس لہو ولعب ہی تو ہے، اور جب دنیا کی زندگی لعب ولہو ٹھہری تو دنیا میں محفل رقص وسرود قائم کرنا ہی "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" کا منشا ہے، تو بتائیے اس کی تردید کیسے ہو سکتی ہے۔

دوسری مثال، اور دلیل ششم اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" زکوٰۃ دو، دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَیْنٰهُ	یعنی اے یحییٰ کتاب کو قوت سے پکڑلو، اور ہم نے
الْحُكْمَ صَبِیًّا وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا	یحییٰ کو بچپن میں ہی حکمت دے دیا تھا، اور اپنی طرف سے
وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِیًّا۔ (مریم)	مہربانی دی تھی اور زکوٰۃ دی تھی، اور وہ متقی تھے۔

اس دوسری آیت میں زکوٰۃ کے معنی پاکیزگی کے ہیں، تو پہلی آیت کے معنی ہوئے "پاکیزگی دو" لو یہ معنی سراسر باطل ہیں، اور اگر پہلی آیت میں زکوٰۃ سے مراد ٹیکس ہے، تو دوسری آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ٹیکس دیتا تھا، اور یہ بالکل مضحکہ خیز ہے۔

ان دونوں مثالوں سے واضح ہوا، کہ قرآن اکثر مقامات میں تشریح اصطلاحی کا محتاج ہے،

یعنی ایک استاد کی ضرورت ہے، جو اسے پڑھائے، اور اس کے مشکل مقامات کو حل کرے، اور وہ استاد سوائے رسول کے اور کون ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ منصب رسول کو خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ)

اللہ نے ان میں ایک رسول مبعوث کیا، جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے۔ ان کو پاک کرتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اب اگر پڑھانے میں تشریح شامل نہیں ہے، تو پھر رسول کا تلاوت کر دینا کافی تھا، لیکن محض تلاوت پر اکتفا نہیں کی گئی، بلکہ تلاوت کا منصب بتانے کے بعد تعلیم کا منصب بھی بتایا گیا، کیوں کہ رسول اللہ کی طرف سے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے، لہٰذا اس کی تشریح بھی من جانب اللہ ہونی چاہیے اور یہی وہ چیز ہے، جس کو وحی خفی کہا جاتا ہے، اب اس کے حجت ہونے میں کیا شبہ رہ گیا۔

دلیل نہم

قرآن مجید کی بہت سی آیات بالکل ناقابل عمل اور ناقابل تشریح ہیں، جب تک ان کی وہ تشریح تسلیم نہ کی جائے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۱) اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (البقرہ ع) حج کے چند مہینے معلوم ہیں۔

معلوم کے معنی ہیں "بتایا گیا" قرآن میں تو ان کے نام نہیں بتائے گئے، اگر بتائے گئے ہیں، تو کہاں ہیں، ظاہر ہے، کہ سوائے حدیث کے یہ نام کسی نے نہیں بتائے، غرض یہ کہ بغیر حدیث کے یہ آیت ناقابل عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۲) اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (توبہ ۳۶)

یعنی اللہ کے نزدیک زمین و آسمان کی پیدائش کے دن سے بارہ مہینے ہیں، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، یہ ہے دین قیم (توبہ ۳۶)

آیت مذکورہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ دین بارہ مہینوں اور چار محترم مہینوں پر مشتمل ہے لیکن قرآن ان چار محترم مہینوں کے نام بتانے سے قاصر ہے، بتائیے کن مہینوں کو حرمت والے مہینے سمجھا جائے، اگر یہ کہا جائے، کہ رواج کے مطابق مان لیا جائے، تو بھی ٹھیک نہیں، کیوں کہ کفار تو ان مہینوں کو بدل دیا کرتے تھے، جیسا کہ خود قرآن مجید نے بتایا ہے

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ (توبہ ع ۳) یعنی مہینوں کا آگے پیچھے کر لینا کفر میں زیادتی ہے

تو پھر مہینوں کا تقرر کفار کے ہاتھ میں رہا، نہ اللہ کے ہاتھ میں رہا، نہ رسول کے ہاتھ میں، نہ مرکز ملت کے ہاتھ میں، جس مہینہ کو کافر حرمت والا کہدیں، بس ہم بھی اس کی حرمت کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ (البقرۃ - ۱۹۴) یعنی کفار کسی مہینے کی حرمت کریں، تو تم بھی بدلہ میں حرمت کرو۔

گویا قرآن کی آیت کفار کی محتاج ہوئی، جو عمل کفار کا، وہی قرآن کا منشا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۴) وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ (الحج) یعنی معلوم شدہ دنوں میں اللہ کا نام ذکر کریں۔

قرآن پھر ساکت ہے، کہ ان ایام کی تشریح کرے، اب بتایئے اس پر کس طرح عمل ہو،

(۴) حروف مقطعات کیوں واقع ہوتے ہیں، ان کی تشریح سے قرآن خاموش ہے، اور جو لوگ ان حروف کی تشریح قرآن سے کرتے ہیں، وہ سوائے تک بندی کے اور کچھ نہیں، اول تو یہی نہیں معلوم، کہ یہ حروف الفاظ کے پہلے حروف ہیں، پھر اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے، تو قرآن میں یہ کہاں ہے کہ فلاں جگہ جو "ص" استعمال کیا گیا ہے، اس سے مراد صابر ہے، یا فلاں لفظ ہے۔ اللہ فرماتا ہے:۔

(۵) وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۙ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ (صافات) اور ہم میں سے ہر ایک کا مقام معلوم ہے، اور ہم صف باندھنے والے ہیں۔

معلوم نہیں ان آیات کا متکلم کون ہے، پوری سورت پڑھ جایئے کہیں اس جملہ کا متکلم نہیں ملے گا

(۶) وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (البقرۃ) اللہ کے لئے حج اور عمرہ پورا کرو۔

معلوم نہیں یہ حج کیا چیز ہے؟ اور عمرہ کیا چیز ہے؟ اور ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۷) وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ (مریم - ۶۴) ہم نہیں نازل ہوتے مگر تیرے رب کے حکم سے۔

اس آیت میں متکلم اللہ ہے، کیونکہ اس سے اوپر کی آیات میں مسلسل جمع متکلم کا صیغہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے استعمال کیا ہے، لہٰذا مطلب یہ ہوا، کہ اللہ نازل نہیں ہوتا، مگر رسول کے رب کے حکم سے گویا اللہ کا بھی کوئی حاکم ہے جس کے حکم سے وہ نازل ہوتا ہے (نعوذ باللہ)

غرض یہ کہ اس قسم کی بیسیوں گتھیاں ہیں، ان کو کون سلجھائے، اگر یہ کام مرکز ملت کے سپرد کر دیا جائے، تو مختلف ادوار میں، بلکہ ایک ہی زمانہ کے مختلف مراکز میں حج کے مختلف مہینے ہوں گے، ایام معلومات مختلف ہوں گے، حروف مقطعات کی مختلف تشریحات ہوں گی، ایک ہی آیت کے مختلف متکلم مان لئے جائیں گے، مسلمان خواہ کچھ بھی کہیں، غیر مسلم تو ان مختلف تشریحات کو دیکھ کر ہنسنے کے

سوا اور کیا کرے گا، ان گتھیوں کا بس ایک ہی حل ہے، اور وہ یہ کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کو حل کریں، لہذا حدیث حجت ہوئی، اور آیت زیر عنوان کی رو سے وحی ہوئی۔

دلیل دہم اسی طرح قرآن مجید کی متعدد آیات پر عمل کرنا ممکن نہیں ہو گا، مثلاً اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۱) وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (بقرہ) — اور جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیرے، اور جہاں کہیں بھی تم ہو، اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لو۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ ہر وقت ہر حال میں منہ کعبہ کی طرف رہنا چاہیئے، کیا یہ ممکن ہے آخر یہ حکم کس وقت کے لئے ہے؟ کون بتائے، کس طرح اس پر عمل ہو۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے

(۲) وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (بقرہ) — جب خرید و فروخت کرو، تو گواہ کر لیا کرو

بتایئے یہ کس طرح ممکن ہے، کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کے خریدنے کے وقت ہر دو کاندار و خریدار گواہ کر لیا کریں، کیا یہ حکم قرآنی ممکن العمل ہے؟ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے

(۳) يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف) — اے بنی آدم ہر مسجد کے قریب اپنی زینت لے لیا کرو۔

اس آیت پر کس طرح عمل کیا جائے، زینت لباس بھی ہے، زیورات بھی ہیں، میزیں اور کرسیاں بھی ہیں، فرش و فروش، جھاڑ و فانوس بھی، کیا یہ سب چیزیں لے کر مسجد کے قریب جانا چاہیئے غرضکہ اس قسم کی بہت سی آیات ہیں، جو ناقابل عمل ہیں جب تک ان کے معنی اور موقع و محل متعین نہ ہو، اور یہ چیزیں کون متعین کر سکتا ہے سوائے رسول ؐ کے، لہذا حدیث حجت ہوئی، اور آیت زیر عنوان کی رو سے وحی ہوئی۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

مندرجہ بالا دس دلائل سے ثابت ہوا، کہ حدیث حجت ہے، لہذا آیت زیر عنوان کی رو سے حدیث وحی ہوئی، ورنہ غیر وحی کا اتباع لازم آئے گا، اور یہ آیت کے خلاف ہے۔

(۳) حدیث کے وحی خفی ہونے کا ثبوت قرآن مجید سے

اللہ تبارک و تعالےٰ نے فرمایا ہے:۔

(۱) مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (حشر) — جو درخت تم نے کاٹے یا چھوڑ دیئے سب اللہ کے حکم سے تھا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ درخت اللہ تعالےٰ کے حکم سے کاٹے گئے تھے لیکن وہ حکم قرآن میں کہاں ہے؟ کہیں نہیں، پس ثابت ہوا کہ قرآن کے علاوہ کوئی وحی تھی، جس کے ذریعہ حکم بھیجا گیا تھا، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۲) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ الآیۃ (البقرۃ)

اور اس قبلہ کو جس پر آپ اس وقت ہیں یعنی بیت المقدس کو، ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا، کہ ہم جان لیں کون رسول کی اتباع کرتا ہے

اس قبلہ کو مقرر کرنے کا حکم قرآن میں کہیں نہیں، لہٰذا وہ حکم بذریعہ وحی خفی تھا، اس آیت میں قبلہ سے مراد بیت المقدس ہے، کیونکہ اس سے آگے ارشاد ہے فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا "ہم عنقریب اس قبلہ کی طرف آپ کو موڑ دیں گے جس کی آپ کو خواہش ہے، یعنی کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا) اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۳) وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ (تحریم)

نبی نے ایک بات پوشیدہ طور پر اپنی ایک بیوی سے کہی، لیکن بیوی نے اس بات کو ظاہر کر دیا اللہ نے نبی کو اس افشار راز سے مطلع کر دیا اور اس نے بعض بات جتا دی، اور بعض بات سے چشم پوشی کی، پس جب نبی نے اس بیوی سے اس بات کا ذکر کیا، تو بی بی نے پوچھا، آپ کو کس نے خبر دی، نبی نے فرمایا، مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے۔

قرآن میں کہیں نہیں، کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کو مطلع کیا ہو کہ فلاں بی بی نے تمہارا راز ظاہر کر دیا، پھر علیم و خبیر اللہ نے کس طرح خبر دی، ظاہر ہے، کہ وحی خفی کے ذریعہ۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

(۴) إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ ٥ بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ۔ (آل عمران)

جس وقت اے نبی تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے، بلکہ اگر تم صبر کرو گے اور پرہیز گاری اختیار کرو گے، اور کافر پورے جوش و خروش سے تم پر حملہ آور ہوں گے تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔

یہ خبر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے پہلے صحابہ کو دی تھی، اور جس کا ذکر اللہ تعالے نے جنگ کے بعد ان آیات میں کیا ہے، قرآن میں کہاں ہے، آخر آپ کو کیسے معلوم ہوا، کہ اللہ تعالے تین ہزار بلکہ پانچہزار فرشتوں سے مدد فرمائے گا۔ اللہ تعالے فرماتا ہے۔

(۵) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ (مجادلہ)

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جن کو سرگوشی سے منع کر دیا گیا تھا، پھر انہوں نے وہی کیا جس کی ممانعت کی گئی تھی، اور وہ اب بھی گناہ کی، زیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی کرتے ہی رہتے ہیں

ظاہر ہے، کہ اس آیت کے نزول سے پہلے سرگوشی سے منع کیا گیا ہوگا، لیکن ممانعت کا حکم قرآن میں اس آیت کے بعد ہے، پس ثابت ہوا، کہ پہلے بذریعہ وحی خفی منع کیا گیا تھا، اللہ تعالے فرماتا ہے۔

(۶) حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ)

نمازوں کی حفاظت کرو، خصوصًا درمیانی نماز کی اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے رہو، اگر تم کو خوف ہو تو پھر نماز پیدل یا سواری پر ہی پڑھ لو لیکن جب امن ہو جائے، تو پھر اسی طرح اللہ کا ذکر کرو، جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے، اور جس طریقہ کو تم نہیں جانتے تھے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا، کہ نماز پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے، جو بحالت جنگ معاف ہے لیکن بحالت امن اسی طریقہ سے نماز پڑھنی چاہیئے، اس طریقہ کی تعلیم کو اللہ تعالے نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، لیکن قرآن میں یہ طریقہ کہیں مذکور نہیں، ظاہر ہے، کہ اللہ تعالے نے سکھایا، اور حدیث کے ذریعہ سکھایا، جو بذریعہ وحی نازل ہوئی۔ اللہ تعالے فرماتا ہے:۔

(۷) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (جمعہ)

اے ایمان والو جب جمعہ کے دن نماز کے لئے تم کو بلایا جائے، تو اللہ کے ذکر کی طرف جلدی سے آجاؤ، اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔

آیت سے ظاہر ہوتا ہے، کہ نماز جمعہ کے لئے بلایا جاتا تھا، اس بلانے کا کیا طریقہ تھا، یہ بلانا کس کے حکم سے مقرر ہوا تھا، پھر جمعہ کی نماز کا اہتمام علاوہ اور دنوں کے کوئی خاص درجہ رکھتا تھا، پھر جمعہ کی نماز کا کوئی خاص وقت مقرر ہوگا، یہ تو ہو نہیں سکتا، کہ ہر وقت تیار رہو، جب بلائیں چلے آؤ،

خواہ دن میں کئی مرتبہ بلایا جائے، یہ سب چیزیں اس آیت کے نزول سے پہلے مقرر ہو چکی تھیں لیکن قرآن اس سے خاموش ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۸) فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ (نساء) یعنی اگر دو سے زاید لڑکیاں ہوں، تو ان کو دو تہائی ترکہ ملے گا۔

آیت سے ظاہر نہیں ہوتا، کہ کن حالات میں ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا، لہٰذا لازمی ہے، کہ ان حالات کا علم بذریعہ وحی خفی دیا گیا ہو، اسی طرح اس آیت میں یہ بھی نہیں بتایا گیا، کہ تقسیم کے بعد باقی ترکہ کا کیا کیا جائے، آخر اس کا بھی کوئی مصرف ہونا چاہیئے یہ نہیں ہوسکتا، کہ اسے ضائع ہوئے دیا جائے، یا یونہی چھوڑ دیا جائے، لہٰذا اس کے متعلق بھی کوئی ہدایت ہونی چاہیئے لیکن وہ ہدایت بھی قرآن میں نہیں، ظاہر ہے، کہ وہ ہدایت حدیث میں ہوگی، لہٰذا حدیث وحی ہوئی، اللہ فرماتا ہے:۔

فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ (بقرۃ) اب تم رمضان کی راتوں میں عورتوں سے مل سکتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ پہلے رمضان کی راتوں میں عورتوں سے ملنا منع تھا، لیکن ممانعت کا حکم قرآن میں کہیں نہیں، لہٰذا یہ حکم بذریعہ وحی خفی نازل ہوا تھا، لہٰذا حدیث وحی خفی ہوئی۔

(۴) حدیث بھی منزل من اللہ ہے

اللہ تبارک وتعالےٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:۔

(۱) وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ (نساء) اور اللہ تعالےٰ نے تم پر کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم اللہ کی آیات کے ساتھ کفر اور استہزاء ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو، جب تک وہ کوئی اور بات نہ کریں، اگر تم ان کے پاس بیٹھ گئے، تو پھر تم بھی ان ہی کے مثل ہوگئے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا، کہ اس آیت کے نزول سے پہلے یہ حکم نازل ہو چکا تھا، لیکن وہ حکم قرآن میں نہیں، اور جو حکم قرآن میں ہے اس کا مضمون اور انداز تخاطب یہ نہیں ہے، جو اس آیت میں بیان ہوا ہے، لہٰذا وہ قرآن کے علاوہ کوئی حکم تھا، جو بذریعہ وحی خفی نازل ہوا تھا، اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا، کہ کتاب سے مراد صرف قرآن ہی نہیں، بلکہ حدیث بھی ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۲) وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ وَكَانَ اور اللہ نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اور حکمت نازل فرمائی، اور وہ چیزیں بتائیں جن کو آپ نہیں

فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (نساء) جانتے تھے، اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

اس آیت میں اگر کتاب سے مراد قرآن ہے، تو حکمت سے مراد سوائے حدیث کے اور کیا ہے اگر حکمت سے بھی قرآن ہی مراد ہے، تو متعدد مقامات پر کتاب و حکمت کی تکرار بے فائدہ ہے پس ثابت ہوا کہ حکمت سے مراد حدیث ہے، اور یہ کہ حدیث بھی منزل من اللہ ہے۔ اللہ فرماتا ہے:۔

(۳) اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (نور) — اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو اس کے ذمہ ہے جو اس پر لازم ہے، اور تم جوابدہ ہو اس چیز کے جو تم پر لازم ہے اور اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے

دوسری جگہ فرماتا ہے:۔

اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (بقرہ) — اللہ کی ہدایت ہی حقیقت میں ہدایت ہے۔

یہ ہدایت کس طرح آتی ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ) — میری طرف سے وقتاً فوقتاً ہدایت آتی رہے گی پس جن لوگوں نے میری ہدایت کی پیروی کی تو وہ بے خوف اور بے غم ہوں گے۔

پہلی آیت سے ثابت ہوا، کہ رسول کی اطاعت ہدایت ہے، اور دوسری اور تیسری آیات سے ثابت ہوا، کہ اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے، جو اللہ کی طرف سے نازل ہوتی رہتی ہے، لہذا ثابت ہوا کہ رسول کے تمام احکام منزل من اللہ ہیں، لہذا حدیث منزل من اللہ ہوئی، کیونکہ اللہ تعالےٰ نے یہ کہیں نہیں فرمایا، کہ رسول کی اطاعت صرف قرآن کی اطاعت ہے، اس کے علاوہ نہیں بلکہ مطلق اطاعت کا حکم دیا، لہذا قرآن اور غیر قرآن ہر قسم کی اطاعت اس میں شامل ہے۔

اسلامی تعلیمات کے ماحصل کے سلسلہ میں برق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

(۲۰) "تمام علوم جدیدہ مثلاً طبیعات، ریاضیات، اقتصادیات، تعمیرات وغیرہ کو کفر خیال کرنا"

(۲۱) "غور و فکر اور اجتہاد و استنباط کو گناہ قرار دینا"

(۲۲) "صرف کلمہ پڑھ کر بہشت میں پہنچ جانا"

(۲۳) "ہر مشکل کا علاج عمل اور محنت سے نہیں، بلکہ دعاؤں سے کرنا" (دو اسلام ص۱۶)

برق صاحب یہ کسی ملا ہی نے کہا ہوگا، لہذا ہمیں آپ سے اتفاق ہے۔

برق صاحب پھر تحریر فرماتے ہیں۔ کہ:۔

"میں سارا قرآن پڑھ گیا، اور کہیں بھی محض دعا یا تعویذ کا کوئی صلہ نہ دیکھا، کہیں بھی زبانی خوشامد کا اجر زمرّد محلات، لاکھ لاکھ حوروں اور محلوں کی شکل میں نہ پایا، یہاں میرے کانوں نے صرف تلواروں کی جھنکار سنی، اور میری آنکھوں نے غازیوں کے وہ جھرمٹ دیکھے، جو شہادت کی لازوال دولت حاصل کرنے کے لئے جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود رہے تھے" (دو اسلام صفحہ ۱۹)

برق صاحب جو کچھ آپ نے قرآن میں دیکھا، یہ سب کچھ حدیث میں بھی ہے، میں کہاں تک فضائل جہاد کی احادیث نقل کروں، احادیث کے دفتر کے دفتر اس سے پر ہیں، براہ کرم آپ صرف مشکوٰۃ شریف ہی سے ابواب فضائل الجہاد نکال کر پڑھیں تو آپ کو اس سلسلہ میں قرآن سے بہت زیادہ مواد ملے گا۔ اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں نے سوچا کہ حدیث و قرآن کی بتائی ہوئی راہوں میں اتنا فرق کیوں ہے، اور ایسی کسی مقام پر آپس میں نہیں ملتیں، احادیث کی تاریخ پڑھی، تو مجھ پر منکشف ہوا کہ کہیں تو اعدائے اسلام نے توہین اسلام کے لئے، اور کہیں ہمارے علماء نے قرآن کے تیغ و سنان والے اسلام سے بچنے کے لئے تقریباً چودہ لاکھ احادیث وضع کر رکھی ہیں، جہاں ایک ایک دعا کا صلہ لاکھ لاکھ جنت دیا ہوا ہے" (دو اسلام صفحہ ۲)

برق صاحب قرآن و حدیث کی راہوں میں تو فرق نہیں ہے، ہاں قرآن اور خود تراشیدہ اسلام میں فرق ضرور ہے، اور یہ ٹھیک ہے کہ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں، جنہوں نے اس قسم کی احادیث وضع کیں، مُلّا کی تو میں کہتا نہیں، مگر برق صاحب کیا علماء کے ہاں ان احادیث کی کوئی وقعت ہے، ہرگز نہیں، علماء کے ہاں تو جہاد اسی درجہ پر ہے، جہاں آپ اسے سمجھتے ہیں، صحیح احادیث میں اس کے فضائل بے شمار ہیں، اور قیامت تک اس کو باقی رکھا گیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِلٰى	یعنی جہاد میری بعثت سے لے کر اس وقت تک
اَنْ يُّقَاتِلَ اٰخِرُ اُمَّتِي الدَّجَّالَ لَا	نافذ رہے گا، جب تک کہ میری امت کا آخری
يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَّلَا عَدْلُ عَادِلٍ	گروہ دجال سے جنگ کرے گا، نہ ظالم کا ظلم
(ابوداؤد)	اور نہ عادل کا عدل اسے باطل کر سکے گا۔

ہاں برق صاحب یہ چودہ لاکھ کی تعداد آپ نے بہت زیادہ لکھ دی، اس پر مزید غور فرمائیے گا،

اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اور ساتھ ہی یقین ہو گیا، کہ اسلام دو ہیں، ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے اور دوسرا وضعی احادیث کا اسلام" (دو اسلام ص۲۰)

برق صاحب ہمیں آپ سے اتفاق ہے۔ یہ خود تراشیدہ اسلام واقعی اصلی اسلام سے علیحدہ ایک چیز ہے، اور اس کی بنیاد متعدد وضعی احادیث پر رکھی گئی ہے، اور بعد ازاں بدعات و خرافات پر، لیکن ایک وہ اسلام ہے جس کی بنیاد صحیح احادیث پر ہے، وہ وہی اسلام ہے جو قرآن نے بتایا ہے، بے شک آپ وضعی احادیث کے اسلام کو نہ مانیں لیکن صحیح احادیث کے اسلام کو مان لینے میں تو آپ کو تامل نہیں ہونا چاہیے، اور غالباً نہیں ہوگا، کیونکہ آپ نے خود ہی آخری باب کا عنوان "صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا" مقرر کیا ہے، لہٰذا ہمیں آپ سے اختلاف ہی کب ہے، ہاں چند غلط فہمیاں آپ کو ہو گئی ہیں، جن کا ازالہ انشاء اللہ آئندہ صفحات میں کر دیا جائیگا یہاں تک تمہید کا جواب تھا، اب اصل کتاب کا جواب شروع کرتا ہوں، اللہ سے توفیق طلب کرتا ہوں، اور آپ سے انصاف کا خواہاں ہوں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پہلا باب

"حدیث میں تحریف"

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

غلط فہمی • وضعی احادیث، اقوال رسول کے ساتھ یوں خلط ملط ہو چکی ہیں، کہ حق کو باطل سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو رہا ہے" (دو اسلام ص۳۷ ملخصاً)

ازالہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر) — ہم نے یہ نصیحت نازل فرمائی ہے، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

یہ تو میں تمہید کے جواب میں ثابت کر آیا ہوں، کہ حدیث وحی ہے، اور اس کا اتباع لازمی ہے، لہذا اس کی حفاظت بھی اللہ کے ذمہ ہے، بیشک اللہ نے اس کی حفاظت کی، حفاظت کے اسباب مہیا کیے، جن کے ذریعہ صحیح احادیث کو محفوظ کر دیا گیا اور موضوعات کو چھانٹ کر الگ کر دیا گیا، ایک طرف اگر تحریف کا عمل جاری تھا، تو دوسری طرف تخلیص کا عمل بھی جاری تھا، حق کو باطل سے علیحدہ کر دیا گیا، اور جس بات کو آپ ناممکن سمجھ رہے ہیں، وہ ممکن ہو گئی، اور اس کو آپ نے خود تسلیم کیا ہے۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

• لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، کہ کوئی حدیث صحیح موجود ہی نہیں"

اس سے ذرا آگے تحریر فرماتے ہیں :-

• دوم کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں" (دو اسلام ص۳۴۱)

پھر تحریر فرماتے ہیں :-

اُدھر یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے، جس پہ ہم نازاں ہیں" (دو اسلام ص۳۴۳)

برق صاحب آپ کے اس اعتراف کے بعد اب کوئی ضرورت اس امر کی باقی نہیں رہتی کہ تخلیص احادیث کی تاریخ پیش کی جائے، اور یہ ثابت کیا جائے، کہ دودھ الگ اور پانی الگ کر دیا گیا، تاہم اس سلسلہ میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

حدیث کی حفاظت حدیث کی حفاظت دو طرح سے ہوئی (۱) عملاً اور (۲) نقلاً جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، اس پر ہر زمانے میں عمل ہوتا رہا، اور ہر زمانے میں وہ پڑھی جاتی رہی، اور پڑھائی جاتی رہی، مثلاً حدیث میں ہے، کہ نماز پانچ وقت کی فرض ہے، ظہر کی چار رکعت ہیں، مغرب کی تین رکعت ہیں، ہر رکعت میں ایک رکوع، اس کے بعد دو سجدے ہیں، سال میں دو عیدیں ہیں وغیرہ وغیرہ، اس قسم کی بے شمار حدیثیں ہیں، جو ہر زمانہ میں بچہ بچہ کی زبان پر تھیں، اور اگر زبان سے بیان نہ بھی ہوئیں، تو کم از کم ذہن میں اور عمل میں ہر ایک کے موجود تھیں، تواتر کے ساتھ ان پر عمل ہو رہا تھا، اور تواتر کے ساتھ نقل کی جا رہی تھیں، ان احادیث کی صحت قطعی ہے، اور ان کا تواتر قرآن کے تواتر سے بھی زیادہ وسیع ہے،

قرآن کی آیات چند علماء اور حفاظ کی حفاظت میں تھیں لیکن یہ احادیث ہر عالم اور جاہل، مرد و عورت، چھوٹے اور بڑے کے عمل میں آ رہی تھیں، اور ان کے ذہن میں محفوظ تھیں، پھر نقل کے اعتبار سے بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے، فرض کیجیئے، ایک محدث نے ایک حدیث بیان کی، اس کے ہزاروں شاگردوں نے، وہ حدیث سنی، پھر اسی حدیث کو اس کے ہم عصر سینکڑوں محدثین نے اپنے ہزار ہا تلامذہ کو یہی حدیث املا کرائی، ذرا حساب لگا کر دیکھیئے، ایک ہی حدیث کو ایک ہی زمانہ میں لاکھوں نے حاصل کیا، اور اس کو محفوظ کیا، لہذا بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر بے شمار احادیث ایسی ہیں جن کی صحت قرآن مجید کی آیات کی طرح قطعی ہے، غرضکہ عملاً اور علماً مفہوم حدیث کی حفاظت ہو رہی تھی، اور ساتھ ساتھ حفظ و کتابت کے ذریعہ الفاظ حدیث کی حفاظت کا بھی انتظام ہو رہا تھا، لاکھوں آدمی حدیث کو حفظ بھی کر رہے تھے، اور ضبط تحریر میں بھی لا رہے تھے، پھر ہر حدیث کو پرکھنے کے لئے فنون بھی ترتیب دیئے جا رہے تھے تاکہ کہیں کوئی شوشہ ادھر ادھر نہ ہو جائے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں، کہ حدیث کو پرکھنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے، یعنی فن اسماء الرجال کے ذریعہ حدیث کی سند میں جو راوی آئے ہیں، ان کی جانچ پڑتال، پس اگر راوی جانچ پڑتال سے ثقہ ثابت ہو جائیں، تو حدیث صحیح ہو جائے گی، حالانکہ یہ ان کی لاعلمی ہے، حدیث کو پرکھنے کے فنون کی تعداد تقریباً سو ہے، اور ہر فن کی ایک مستقل حیثیت ہے، اور ہر فن پر مستقل تحریری مواد ہمارے پاس موجود ہے، جب ان تمام معیاروں سے کوئی حدیث بے داغ ثابت ہو جائے، تو اس کو صحیح کہا جاتا ہے، جن لوگوں کو یہ

مغالطہ ہوا، کہ بس سند ہی ایک ذریعہ ہے، وہ اس دھوکہ میں بھی پڑ گئے، کہ کسی شخص نے کوئی حدیث گھڑ دی اور دو چار ثقہ آدمیوں کے نام بطور سند کے اس گھڑے ہوئے متن کے ساتھ لگا دیئے، لہذا حدیث صحیح ہو گئی، ان کو یہ نہیں معلوم کہ اس طرح سند لگا دینے سے حدیث صحیح نہیں ہو گی، قطع نظر دوسرے فنون کے وہ تو فن اسماء الرجال کے معیار پر پوری نہیں اترے گی مثلاً ایک شخص سلمی کوئی حدیث گھڑ لیتا ہے اور سند یہ لگا دیتا ہے کہ مجھ سے امام مالک نے بیان کیا ان سے امام نافع نے ان سے عبداللہ بن عمر نے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ سند اگرچہ اصح الاسانید اور سلسلۃ الذہب (سونے کی زنجیر) ہے لیکن حدیث کی صحت کے لئے کافی نہیں اس لئے کہ جب سلمی اس حدیث کو اس سند سے بیان کریگا تو ہر سننے والا اپنی سند میں سلمی کا نام ضرور لے گا اور سلمی کی وجہ سے اس حدیث کی تصحیح میں تامل ہو گا۔ سلمی سے اوپر کی سند بے شک بہت اعلیٰ اور معتبر ہے لیکن پوری سند میں یہ بات نہیں لہذا حدیث پایہ اعتبار سے گر جائے گی اور محض اوپر کی سند اس کی صحت کے لئے کافی نہ ہو گی۔ اب حدیث کی صحت کے لئے سلمی کا حال معلوم کرنا ہو گا اگر حالات نہ مل سکے تو وہ مجہول ہو گا اور اس کی روایت کا اعتبار نہیں ہو گا۔ اور اگر حالات مل گئے تو یا تو وہ صادق ہو گا، یا کاذب اگر کاذب ہوا تو اس کی حدیث کا انکار کر دیا جائے گا اور وہ حدیث جھوٹی ہو گی اور تمام محدثین نے اگر دھوکہ کھا کر اس کو صادق کہہ دیا اگرچہ یہ ناممکن ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی واضع حدیث کو تمام محدثین نے صادق کہا ہو لیکن پھر بھی اگر بالفرض محال ایسا ہو جائے تو پھر دوسرے عیوب کی تلاش ہو گی مثلاً حافظہ کی خرابی، وہم، مبالغہ آمیزی، متن و سند میں تحریف، الفاظ کا خلط ملط کرنا، تدلیس وغیرہ وغیرہ اگر ان میں سے ایک بھی عیب پایا گیا تو اس حدیث کا اعتبار نہیں ہو گا اب اگر ان تمام جرحوں سے وہ بچ گیا اور تمام محدثین نے غلطی سے بالاتفاق اس کو ہر لحاظ سے ثقہ کہہ دیا اگرچہ یہ ناممکن ہے اور نہ ایسا ہوا ہے کہ کسی وہمی، یا بد حافظہ کو محدثین نے ثقہ کہا ہو، تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے کیا امام مالک کے دوسرے شاگرد بھی اسے بیان کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر بیان کرتے ہیں تب تو خیر وہ حدیث دوسری سند سے ثابت ہو جائے گی اور اگر دوسرے شاگرد بیان نہیں کرتے بلکہ وہ سلمی کے خلاف روایت کرتے ہیں تو سلمی کی روایت کردہ حدیث شاذ ہو گی۔ اور صحت کے درجہ سے گر جائے گی اور اگر سلمی کی بیان کردہ حدیث کا مضمون بالکل نیا ہو گا، تو پھر وہ ہر حالت میں غریب ہو گی، اور یہ بھی ایک قسم کا نقص ہی ہے، بہر حال سلمی کی بیان کردہ حدیث ہرگز صحت کے درجہ تک نہ پہنچے گی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے، کہ ابتدائی منازل ہی میں وہ ضعیف ثابت ہو جائے گی، مزید براں سلمی جیسے جھوٹے آدمی کے لئے یہ کتنا مشکل ہو گا، کہ وہ اپنی پوری زندگی تقویٰ و طہارت اور خلوص کے ساتھ گذارے، اور اگر یہ مشکل کام اس نے انجام دے بھی لیا، تو بھی محدثین کے چنگل سے نکلنا اس کے لئے بہت مشکل ہو گا، اس لئے

کہ محدثین کی گرفت سے وہ لوگ بھی نہ بچ سکے، جو صالح تھے، لیکن نیک نیتی سے حدیث میں تحریف کر دیا کرتے تھے، یہ لوگ باوجود اپنے زہد و اتقاء کے محدثین کو دھوکہ نہ دے سکے، غرض یہ کہ محدثین نے جس حدیث کو صحیح کہا، وہ حقیقت میں قطعی الصحت ہے، اس لئے کہ شبہ اور شکوک کے تمام منازل کو اس نے عبور کر کے ہی مقام صحت کو حاصل کیا ہے، جو لوگ اب بھی صحیح حدیث کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ فن حدیث سے نا آشنا ہیں اور ان تفاصیل کا انہیں علم نہیں ہے اگر ان فنون کو عام کر دیا جائے تو ان شاء اللہ تمام شکوک دور ہو جائیں گے اور محدثین کے کارناموں کی یہ لوگ بھی اسی طرح داد دیں گے جس طرح بعض غیر مسلم یورپین محققین نے دی ہے الغرض ان معروضات کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بس جو شخص چاہے حدیث گھڑ دے اور اس کے ساتھ ایک سند لگا دے، وہ حدیث صحیح ہو جائے گی اور نہ یہ کہنا صحیح ہے، کہ معاملہ اس قدر الجھ چکا تھا کہ اس کو سلجھانا انسانی دسترس سے باہر تھا۔

برق صاحب! صحیح احادیث اور موضوع احادیث کا معاملہ بڑا صاف تھا صحیح کو موضوع سے بڑی آسانی سے الگ کر دیا گیا، واضعین کے نام محدثین کو معلوم تھے، وہ نام آیا، اور حدیث کو موضوع سمجھ لیا گیا، بڑے بڑے علماء اور مورخین جن کے نام کے ساتھ عوام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں محدثین کے ہاں وضاعین اور کذابین کی فہرست میں شامل ہیں، وہ نہ کسی کے علم سے دھوکہ کھا سکے نہ کسی کے زہد و تقوی سے ان کو مغالطہ ہوا۔ محدثین کی اصل محنت تو اس کام میں صرف ہوئی، کہ جو حدیث درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی، وہ حدیث من وعن محفوظ ہے یا نہیں، گھڑی ہوئی احادیث کے سلسلہ میں انہیں کوئی دشواری پیش ہی نہیں آئی، لہٰذا تحریف کا شبہ بے بنیاد ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"صحابہ کی تمام تر توجہ قیام سلطنت، نشر اسلام اور تعمیر ملت پر صرف ہو رہی تھی (ص ۳۷)

جواب برق صاحب! گویا آپ کا یہ مطلب ہے، کہ صحابہ کرام نے حفاظت حدیث کے سلسلہ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، یہ خیال بھی غلط فہمی پر مبنی ہے، قبل اس کے کہ صحابہ کرام رضی کی جدوجہد کے متعلق کچھ عرض کروں، میں یہ بتانا چاہتا ہوں، کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حفاظت کی طرف توجہ دی، مندرجہ ذیل حدیثیں ملاحظہ فرمائیے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور احادیث کی حفاظت

(۱) قبیلہ عبد القیس کے لوگ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں حاضر ہوئے، تو آپ نے ان کو بہت سے امور دین کی تعلیم دی، پھر فرمایا:۔

• احفظوھن واخبروا بھن من وراءکم (صحیح بخاری کتاب الایمان)	ان احکام کی حفاظت کرنا، اور اپنے پیچھے والوں کو بھی اس سے مطلع کر دینا۔

(۲) حضرت ابن مسعود رضؓ فرماتے ہیں:۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا بالموعظۃ فی الایام کراھۃ السآمۃ علینا (صحیح بخاری)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نصیحت کرنے کے لئے چند دن مقرر کر رکھے تھے، ہماری پریشانی کے خیال سے روزانہ وعظ نہیں فرماتے تھے۔

(۳) حضرت انسؓ فرماتے ہیں:۔

انہ کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثا حتی تفھم عنہ (بخاری کتاب العلم)	جب آپ کوئی مسئلہ بیان فرماتے، تو تین مرتبہ اس کو دہراتے، یہاں تک کہ وہ مسئلہ سمجھ میں آجاتا۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند احادیث بیان کرنے کے بعد فرمایا:۔

لیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسی ان یبلغ من ھو اوعی لہ منہ (صحیح بخاری کتاب الایمان)	یعنی حاضر کو چاہیئے، کہ غائب کو میری باتیں پہنچائے اس لئے کہ شاید حاضر ایسے شخص کو پہنچائے، جو اس سے زیادہ اس کو محفوظ کر سکے۔

متعدد صحابہؓ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے (کتب حدیث) یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی محدثین نے صحابہ سے احادیث کو اخذ کیا، اور ان کو بالکل محفوظ کر دیا۔

(۵) یمن کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور عرض کیا:۔

ابعث معنا رجلا یعلمنا السنۃ والاسلام (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ)	ہمارے ساتھ کسی آدمی کو بھیج دیجئے، جو ہمیں سنت اور اسلام کی تعلیم دے، آپ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو بھیج دیا

(۶) مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی تعلیم کے لئے کچھ دن مقرر کر رکھے تھے، ایک عورت آئی اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول:۔

ذھب الرجال بحدیثك فاجعل لنا من نفسك یوما نأتیك فیہ تعلمنا مما علمك اللہ قال اجتمعن	یعنی مرد تو آپ کی احادیث حاصل کرتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے لئے بھی کوئی دن مقرر فرما دیجئے تاکہ اس دن ہم آپ کی خدمت میں حاضر

يوم أكن أو كنا أو صحيح مسلم۔ کتاب الجود الصلٰوۃ) ہو جیسا کہ قرآن کی سورتیں یاد کی جاتی ہیں اللہ نے آپ کو سکھائی ہیں وہ ہمیں بھی سکھا دیجئے آپ نے فرمایا فلاں فلاں نے جمع کر لیا ہے

کتابت احادیث

احادیث کی تعلیم اور اس کی حفاظت کے اہتمام کے ساتھ ساتھ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث کو لکھوایا بھی تھا، مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔

(۱) کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الصدقۃ (ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الصدقہ تحریر فرمائی تھی۔

(۲) ابو راشد الحرانی فرماتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص نے میرے سامنے ایک کتاب رکھی، اور فرمایا:۔

ھذا ما کتب لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی ابواب الدعوات) یعنی یہ وہ کتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھ کر مجھ کو دی تھی۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوشتہ منذر بن ساوی کو بھیجا، جس میں مختلف ہدایات تھیں۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص۲۰)

(۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:۔ کہ

وجد فی قائم سیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتابان (دارقطنی ص۳۲۳ کتاب الحدود) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار کے قبضہ میں دو نوشتے ملے تھے ان میں بھی مختلف ہدایات مندرج تھیں

(۵) موسیٰ بن طلحہ کہتے ہیں:۔

عندنا کتاب معاذ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (دارقطنی۔ کتاب الزکوٰۃ) ہمارے پاس وہ کتاب ہے جو حضرت معاذ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھی تھی۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اس کتاب کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کے ساتھ بھیجی تھی منگوایا، اور اس کو پڑھوا کر سنا (نصب الرایہ کتاب الزکوٰۃ جلد ۲ ص۳۵۲)

(۶) ایک تحریر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عکیم کو بھی بھیجی تھی جس میں مختلف احکام درج تھے (ابوداؤد، کتاب اللباس، ترمذی وطبرانی صغیر وغیرہ)

(۷) تین نوشتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وائل کو عطا فرمائے تھے (المعجم الصغیر للطبرانی ص۲۴۹)

(۸) یزید بن عبداللہ کہتے ہیں، ایک شخص کے پاس ایک سرخ چمڑے کا قطعہ تھا، اس میں مختلف احکام درج تھے، ہم نے پوچھا:۔

من کتب لك هذا الکتاب قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — یعنی تم کو یہ کتاب کس نے لکھ کر دی، تو انہوں نے کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

(ابوداؤد، کتاب الخراج، کتاب الاموال ص۱۲)

(۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب لکھ کر زیاد بن جہور کو روانہ فرمائی تھی (طبرانی صغیر ص۸۲)

(۱۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو چند کلمات کی منادی کرنے کے لئے روانہ فرمایا، اور ان کے پیچھے حضرت علی کو مع ایک کتاب کے روانہ فرمایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ کتاب، حضرت ابوبکر کے حوالہ کر دی (ترمذی ابواب تفسیر القرآن)

(۱۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:۔

کتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی کل بطن عقولہ ثم کتب انہ لا یحل لمسلم ان یتوالی مولی رجل مسلم بغیر اذنہ ثم اخبرت انہ لعن فی صحیفتہ من فعل ذلك (صحیح مسلم۔ کتاب العتق) — یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تحریر فرمایا تھا کہ دیت عصبہ کے ذمہ واجب الادا ہے پھر یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ مسلمان کو جائز نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کے مولی کو بغیر اس کی اجازت کے اپنا مولی بنالے پھر مجھے خبر دی گئی کہ آپ نے اس کتاب میں اس کام کرنے والے پر لعنت فرمائی۔

(۱۲) امام زہری فرماتے ہیں، ایک کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمائی تھی، پھر انہوں نے اس کا مضمون بیان کیا، اور یہ ایک طویل حدیث ہے (کتاب الاموال ص۱۲۵، سیرۃ ابن ہشام)

(۱۳) ایک کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مومنین کے نام لکھی تھی

وشهدت علی نسختہ هذہ الصحیفۃ صحیفۃ رسول اللہ علی بن ابی طالب وحسن بن علی وحسین بن علی رض (کتاب الاموال ص۱۹۳) — اور اس کتاب کے ایک نسخہ پر بطور شہادت کہ واقعی یہ رسول اللہ کا صحیفہ تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور حضرت حسن رضی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے دستخط تھے

(۱۴) امام طاؤس فرماتے ہیں:۔

عندنا فی کتاب رسول اللہ صلی اللہ — یعنی ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علیہ وسلم وفی الانف اذا قطع مارنہ مائۃ من الابل (نیل الاوطار جزء ۷ ص۲۹ بحوالہ کتاب امام شافعی)	کی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ناک کا اگلا نرم حصہ کٹ جائے تو دیت میں سو اونٹ ہوں گے
(۱۵) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتب الی اھل الیمن کتابا فیہ الفرائض والسنن والدیات وبعث بہ عمرو بن حزم (نسائی جلد ۲ ص۲۱۸)	یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا تو اہل یمن کے لئے ایک کتاب بھی لکھ کر مرحمت فرمائی تھی جس میں فرائض، سنن اور دیات کے مسائل کی تفصیل تھی

مشہور تابعی امام زہری فرماتے ہیں، میں نے وہ کتاب پڑھی، اور وہ کتاب ابوبکر بن حزم کے پاس تھی (نسائی ص۲۱۸ ج۲) پھر امام زہری نے اس کتاب کا مضمون بیان کیا ہے (ملاحظہ ہو نسائی)

حضرت سعید بن مسیب نے بھی اس کتاب کو پڑھا تھا، اور اس کے مضمون کو نقل کیا ہے (نسائی ج ص۲۱۸) خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس کتاب کی صحت کی شہادت دی (نیل الاوطار جزء ص۱۶)

امام یعقوب فرماتے ہیں:۔

لا اعلم فی جمیع الکتب المنقولۃ کتابا اصح من کتاب عمرو بن حزم ھذا فان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والتابعین یرجعون الیہ ویدعون رأیھم (نیل الاوطار جزء ۷ ص۱۶)	یعنی جتنی کتابیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول یعنی مکتوب چلی آرہی ہیں ان میں میرے علم کے مطابق کوئی کتاب عمرو بن حزم کی اس کتاب سے زیادہ صحیح نہیں کیونکہ صحابہ کرام اور تابعین عظام اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنی رایوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

امام یعقوب کے بیان سے معلوم ہوا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی بہت کتابیں تھیں، اور سب صحیح تھیں، لیکن ان کے علم کے مطابق سب سے زیادہ صحیح کتاب عمرو بن حزم کی کتاب تھی، کیونکہ تواتر اور شہرت کا جو درجہ اس کو حاصل تھا، وہ کسی کتاب کو نہ تھا امام ابن عبد البر فرماتے ہیں:۔

ھذا کتاب مشھور عند اھل السیر معروف ما فیہ عند اھل العلم (نیل الاوطار)	یعنی یہ کتاب اہل سیر کے نزدیک مشہور ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے

(۱۶) امام محمد بن مسلم فرماتے ہیں:۔

ھذہ نسخۃ کتاب رسول اللہ صلی	یہ اس کتاب کا ایک نسخہ ہے جو کتاب رسول

الله علیه وسلم الذی کتبه فی الصدقة وھی عند آل عمر بن الخطاب رض

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات کے متعلق لکھوائی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کتاب حضرت عمرؓ کے خاندان میں تھی

پھر فرماتے ہیں:۔

اقرأنیها سالم بن عبد الله بن عمرؓ نوعیتها علی وجهها وھی التی انتسخ عمر بن عبد العزیز من عبد الله بن عبد الله بن عمر وسالم بن عبد الله بن عمر فذکر الحدیث (ابوداؤد ج۱ ص۲۲۴ دارقطنی ص۲۰۹)

یہ کتاب حضرت عمرؓ کے پوتے حضرت سالم نے مجھے پڑھائی تھی اور میں نے اس کو پوری طرح محفوظ کرلیا ہے۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے اس کتاب کو حضرت عمرؓ کے پوتوں سالم اور عبداللہ سے لے کر لکھوایا تھا پھر اس کے بعد امام محمد بن مسلم نے اس کا مضمون بیان کیا ہے جو کتب حدیث میں مذکور ہے۔

(۱۷) سوید بن غفلہ فرماتے ہیں:۔

قدم علینا مصدق رسول الله صلی الله علیه وسلم فقرأت فی کتابه لا یجمع بین متفرق ولا تفرق بین مجتمع خشیة الصدقة (دارقطنی ص۲۰۴ و ابوداؤد ج۱ ص۲۲۹)

یعنی ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تحصیلدار آیا میں نے اس کی کتاب میں پڑھا کہ زکوٰۃ کے خوف سے متفرق مال جمع نہ کیا جائے اور مجتمع مال کو متفرق کیا جائے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تحصیلداروں کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب موجود ہوتی تھی، جس میں تحصیل زکوٰۃ کے متعلق احکام درج ہوتے تھے

(۱۸) متعدد صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احادیث لکھوایا کرتے تھے، عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:۔

بینما نحن حول رسول الله صلی الله علیه وسلم نکتب اذ سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم ای المدینتین تفتح اولا قسطنطینیة او رومیة فقال النبی صلی الله علیه وسلم لا بل مدینة هرقل اولا (دارمی ص۶۸)

یعنی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے اس حالت میں آپ سے پوچھا گیا کونسا شہر پہلے فتح ہوگا قسطنطنیہ یا رومیہ؟ آپ نے فرمایا ہرقل کا شہر سب سے پہلے فتح ہوگا۔

کیا اب بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں

فرمایا، مندرجہ بالا حوالہ جات سے ظاہر ہوا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی بہت سی کتابیں لکھیں، کچھ مدینہ منورہ میں رہیں، کچھ آپ نے گورنروں کے ہمراہ مختلف ممالک کو روانہ فرمائیں، اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس حدیث کی حفاظت کا انتظام اور اہتمام فرمایا، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی حکم دیا، کہ احادیث کو قلم بند کر لو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو احادیث لکھنے کا حکم دیا

ایک موقع پر آپ نے فرمایا:۔

(۱) اکتبوا لابی شاہ (صحیح بخاری جز اول ص۲۱، صحیح مسلم ج ۱ ص۵۶۹) — یہ احادیث ابو شاہ رضی اللہ عنہ کو لکھ کر دے دو۔

(۲) حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے آپ نے فرمایا:۔

اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا حق (ابوداؤد ج ۲ ص۱۵۸) — یعنی احادیث لکھا کرو قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس منہ سے حق کے سوا دوسری بات نہیں نکلتی۔

(۳) ایک شخص نے آپ سے عرض کیا:۔

انی لاسمع منك الحدیث فیعجبنی ولا احفظہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعن بیمینك و اومأ بیدہ الخط (ترمذی ج ۲ ص۱۰۷) — یعنی میں آپ سے حدیثیں سنتا ہوں مجھے بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن یاد نہیں رہتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے سیدھے ہاتھ سے مدد لو اور ہاتھ سے لکھنے کو اشارہ فرمایا

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

قیدوا العلم بالکتاب (جامع بیان العلم ج ۱ ص۷۲) — علم کو لکھ کر محفوظ کر لو۔

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

العلم ثلاثۃ آیۃ محکمۃ او سنۃ قائمۃ او فریضۃ عادلۃ وما کان سوی ذلك فھو فضل (ابوداؤد) — یعنی علم تین ہیں۔ محکم آیت۔ قائم سنت۔ اور عادل فرائض۔ اور جو ان کے سوا ہے وہ فاضل ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا، کہ حقیقی علم تین ہیں، قرآن، سنت اور فرائض، اور ان ہی تینوں کو لکھ کر منضبط کرنے کا آپ نے حکم دیا تھا، فرائض کا علم اگرچہ قرآن اور حدیث میں آ جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کو علیحدہ ذکر

کرنے کا مشغلہ ہے، کہ اس کے لئے علم الحساب کی ضرورت ہے، اور کیونکہ علم الحساب قرآن و حدیث کے تحت نہیں آتا، اس لئے آپ نے علم الحساب سیکھنے کے لئے فرائض کو علیحدہ کر دیا۔

حدیث کی حفاظت کرنے والے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی حفاظت کا حکم ہی نہیں دیا بلکہ حفاظت کرنے والے کے لئے دعا بھی فرمائی، آپ نے فرمایا:۔

نضر اللہ عبدا سمع مقالتی فحفظها ووعاها واداها (نسائی ابوداؤد وغیرہ)

یعنی اللہ اس بندے کو تروتازہ رکھے جو میرے اقوال سنے، پھر ان کو حفظ کرے، اور محفوظ کرے اور دوسروں تک پہنچا دے۔

اس حدیث کو متعدد صحابہ نے روایت کیا ہے (کتب حدیث) ان ہی احادیث کی تعمیل میں صحابہ کرام اور دیگر محدثین نے احادیث کو حفظ کیا، پھر ان کو مکتوب کر کے محفوظ کر لیا، پھر ان کو دوسروں تک پہنچا دیا، یہی وہ سلسلہ ہے، جو مؤلفین صحاح تک قائم رہا، بلکہ آج تک قائم ہے، اور انشاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا۔

"صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حدیث کی حفاظت کرنا"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کتاب حدیث:۔

عن انس ان ابا بکر رضی اللہ عنہ کتب لہ ھذا الکتاب لما وجھہ الی البحرین۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذہ فریضۃ الصدقۃ التی فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المسلمین والتی امر اللہ بھا رسولہ (صحیح بخاری کتاب الزکوۃ)

یعنی حضرت انس فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب ان کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک نوشت لکھ کر دی جس کا مضمون یہ تھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ یہ زکوۃ کے فرائض ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے اور ان ہی کا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے۔

حدیث کے راوی حماد بن سلمہ کہتے ہیں:۔

اخذت ھذا الکتاب من ثمامۃ (نسائی۔ کتاب الزکوۃ)

میں نے یہ کتاب حضرت انسؓ کے پوتے ثمامہ سے حاصل کی تھی۔

حضرت عمرؓ کی حدیث:۔ حضرت عمرؓ نے بھی زکوۃ کے متعلق ایک کتاب تحریر فرمائی تھی،

محمد انصاری فرماتے ہیں:۔

ان عمر بن عبد العزیز حین استخلف ارسل الی المدینة یلتمس عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الصدقات فوجده عند آل عمرو بن حزم کتاب النبی صلی الله علیه وسلم الی عمرو بن حزم فی الصدقات ووجد عند آل عمر بن الخطاب کتاب عمر الی عماله فی الصدقات بمثل کتاب النبی صلی الله علیه وسلم الی عمرو بن حزم فامر عمر بن عبد العزیز عماله علی الصدقات ان یاخذوا بما فی ذینك الکتابین فکان فیهما. الخ
(دارقطنی ص۲۱۰)

یعنی جب حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو مدینہ بھیج کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب الصدقہ تلاش کرائی وہ کتاب عمرو بن حزم کے خاندان کے پاس ملی۔ یہ وہ کتاب تھی جو آپ نے عمرو بن حزم کو لکھ کر مرحمت فرمائی تھی اور حضرت عمر کی کتاب حضرت عمر کے خاندان کے پاس ملی ان دونوں کتابوں کا مضمون ایک ہی تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے حکم دیا کہ ان کتابوں کے مطابق صدقات وصول کئے جائیں پھر محمد انصاری نے ان کتابوں کا مضمون بیان کیا جو کتب حدیث میں محفوظ ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں:۔

انه قرأ کتاب عمر بن الخطاب فی الصدقة (موطا امام مالک ص۱۰۹)

یعنی میں نے حضرت عمر کی کتاب پڑھی۔ اس کا مضمون یہ ہے۔۔۔۔

حضرت عمرؓ کی دوسری تحریر۔

عن ابی امامة قال کتب معی عمر بن الخطاب الی ابی عبیدة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال الله ورسوله مولی من لا مولی له والخال وارث من لا وارث له (ترمذی ابواب الفرائض ج۲)

یعنی حضرت عمر نے ابو امامہ کے ہمراہ حضرت ابو عبیدہ کو یہ لکھ کر روانہ فرمایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس شخص کا وارث اللہ و اس کا رسول ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو اور ماموں وارث ہے اس شخص کا جس کا کوئی وارث نہ ہو

حضرت عمرؓ کی تیسری تحریر:۔

کتب عمر الی عتبة بن فرقد ان النبی

یعنی حضرت عمر نے عتبہ بن فرقد کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن الحریر الا	نے حریر پہننے سے منع فرمایا تھا۔ مگر ہاں! حضرت
ما کان ھکذا وھکذا اصبعین وثلثۃ	محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دو، تین، یا ۴ انگل کے
واربعۃ۔ (ابوداؤد، کتاب اللباس)	حاشیہ تک کی اجازت دی ہے۔

حضرت عمرؓ کا چوتھا نوشتہ ورثہ کے متعلق ایک مقدمہ پیش ہوا، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

ما احرز الولد والوالد فھو لعصبتہ	یعنی جو مال بیٹا یا باپ جمع کرے وہ اس کے عصبہ کے
من کان قال فکتب لہ کتابا فیہ	لئے ہے خواہ وہ کوئی ہو پھر حضرت عمر نے اس فیصلہ
شہادۃ عبدالرحمن بن عوف وزید	کو لکھ کر دے دیا اور اس پر بطور شہادت عبدالرحمن بن عوف
بن ثابت ورجل اخر (ابوداؤد)	زید بن ثابت اور ایک اور آدمی کے دستخط کرائے۔

پھر خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں مقدمہ پیش ہوا:۔

فقضی لنا بکتاب عمرؓ	تو عبدالملک نے حضرت عمر کی اس کتاب
(ابوداؤد۔ کتاب الفرائض)	کے مطابق فیصلہ فرمایا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کی حفاظت کی

عن عبداللہ بن عمر قال کتب رسول	یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الصدقہ
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الصدقۃ	لکھوائی تھی۔۔۔ اس پر حضرت ابوبکر اپنی وفات
۔۔۔ فعمل بھا ابوبکر حتی قبض ثم	تک عمل کرتے رہے پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالی
عمل بھا عمرؓ حتی قبض	عنہ اپنی وفات تک عمل کرتے رہے۔

(ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۶)

حضرت عمرؓ کا حدیث کی حفاظت اور تعلیم کا اہتمام کرنا:۔

ان عمر بن الخطاب خطب یوم الجمعۃ	یعنی حضرت عمر نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ
۔۔۔۔ قال اللھم انی اشھدک علی	میں ارشاد فرمایا! اے اللہ میں شہروں کے امراء پر تجھ کو
امراء الامصار وانی انما بعثتھم	گواہ کرتا ہوں میں نے ان کو لوگوں پر صرف اس
علیھم لیعدلوا علیھم ولیعلموا	لئے مقرر کیا ہے کہ وہ ان میں عدل قائم کریں
الناس دینھم وسنۃ نبیھم صلی اللہ	اور ان لوگوں کو دین اور نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ

علیہ وسلم (صحیح مسلم جلد ۱ صـ۲۲۷) — وسلم کی سنت کی تعلیم دیں

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں :۔

تعلموا الفرائض والسنة کما تعلمون القرآن (جامع بیان العلم ج۲ صـ۲۳۱) — فرائض اور سنت کو اسی طرح سیکھو جس طرح قرآن کو سیکھتے ہو۔

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں :۔

قیدوا العلم بالکتاب (جامع بیان العلم جلد ۱ صـ۷۲) — اس علم کو محفوظ کر لو!۔

حضرت عمرؓ خود بھی وقتاً فوقتاً سنت کی تعلیم دیا کرتے تھے مثلاً ایک مرتبہ مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا

اقبلوا علی بوجوهکم اصلی بکم صلوة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التی کان یصلی ویامر بها فقام مستقبل القبلة ورفع یدیه حتی حاذی بهما منکبیه ثم کبر ثم رکع وکذلک حین رفع فقال القوم هکذا کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی بنا (خلافیات للامام البیهقی) — میری طرف منہ کرو میں تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نماز پڑھ کر بتاؤں جس طرح کہ آپ پڑھتے تھے اور پڑھنے کا حکم دیا کرتے تھے پس حضرت عمر کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھایا پھر تکبیر کہی پھر رکوع کیا اور جب رکوع سے اٹھے تب بھی اسی طرح رفع یدین کیا تمام صحابہ نے فرمایا اس ہی طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں نماز پڑھایا کرتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کی کتاب حدیث :۔

عن ابن الحنفیة قال ارسلنی ابی خذ هذا الکتاب فاذهب الی عثمان فان فیه امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الصدقة — یعنی حضرت علی نے اپنے لڑکے محمد بن حنفیہ سے فرمایا اس کتاب کو حضرت عثمان کے پاس لے جاؤ اور ان سے اس پر عمل کے لئے کہو۔ کیونکہ اس میں آپ کے احکام مندرج ہیں۔

حضرت عثمان نے فرمایا :۔

اغنها عنا (صحیح بخاری کتاب الجهاد) — ہم اس سے مستغنی ہوں یعنی میرے پاس یہ احکام موجود ہیں

حضرت عثمانؓ کا سنت کی تعلیم کا اہتمام کرنا :

عن عثمان انه توضا بالمقاعد فقال الا اریکم وضوء رسول اللہ صلی — یعنی حضرت عثمان نے مقاعد میں لوگوں سے کہا کیا میں تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو نہ بتاؤں

اللہ علیہ وسلم فتوضا ثلاثا ثلاثا	پس انہوں نے وضو کیا اور ہر عضو کو تین تین مرتبہ
(صحیح مسلم)	دھویا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ حضرت عثمان رضؓ کو تبلیغ سنت کا کتنا جوش تھا کہ باوجود خلافت کا بوجھ سنبھالنے کے وضو تک کی سنتوں کی تعلیم دیتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کی کتاب

حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں:۔

من زعم ان عندنا شیئا نقرؤہ الا	جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہمارے پاس یعنی اہل بیت
کتاب اللہ وھذہ الصحیفۃ صحیفۃ	کے پاس کوئی خاص کتاب ہے جس کو ہم پڑھتے ہیں سوائے
فیھا اسنان الابل واشیاء من الجراحات	کتاب اللہ کے اور اس صحیفہ کے وہ جھوٹ کہتا
فقد کذب وقال فیھا قال رسول	ہے اس میں اونٹوں کے دانتوں کی دیت اور
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی	جراحات کے احکام ہیں اور اس میں یہ بھی ہے کہ فرمایا
ابواب الولاء۔ بخاری ومسلم)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔۔۔

اس کتاب میں حضرت علی نے صدقات کے احکام بھی تحریر کئے تھے، اور یہی وہ کتاب تھی جس کو انہوں نے حضرت عثمان رضؓ کے پاس بھیجا تھا، اور یہ کہا تھا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں اس کتاب کا ذکر صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر گذر چکا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سنت کی تعلیم کا اہتمام کرنا

حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں:۔

تزاوروا وتذاکروا الحدیث فانکم	یعنی ایک دوسرے سے ملتے رہا کرو اور احادیث
ان لم تفعلوا یدرس علمکم	کا دورہ کرتے رہا کرو ورنہ تمہارا علم مٹ جائے گا
(خالص اسلام ص ۸۹)	

بلکہ حضرت علی نے تو یہاں تک فرما دیا:۔

اذا کتبتم الحدیث فاکتبوہ باسنادہ	جب تم احادیث لکھا کرو تو ان کو سند کے
(مستدرک حاکم، منتخب کنز العمال ج ۴ ص ۵)	ساتھ لکھا کرو۔

بلکہ حضرت علی رضؓ خود بھی سنتوں کی تعلیم دیا کرتے تھے، مثلاً ایک مرتبہ وضو کیا، ہر عضو کو تین تین مرتبہ دھویا اور پھر فرمایا۔

احببت ان اریکم کیف کان طھور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی وصحیح بخاری نحوہ)	میں چاہتا تھا کہ تمہیں بتاؤں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح وضو کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی شہرہ آفاق کتاب

حضرت عبداللہ بن عمرو نے حدیث کی ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام صادقہ تھا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

ما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم احد اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب (صحیح بخاری)	یعنی صحابہؓ میں سے کوئی شخص بھی مجھ سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان نہیں کرتا سوائے عبداللہ بن عمروؓ کے اس لئے کہ وہ لکھا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

یہی وہ عبداللہ ہیں جن سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ لکھا کرو اس زبان سے سوائے حق کے دوسری بات نہیں نکلتی، (ابوداؤد، کتاب العلم جلد ۲ صفحہ ۱۵۸)

یہی وہ کتاب ہے جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی، اور ان کے پرپوتے عمرو بن شعیب سے محدثین نے اس کو اخذ کیا، اور ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

حضرت ابوہریرہ کی حدیث کی کتابیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ احادیث نہیں لکھتے تھے، لیکن بعد میں انہوں نے بھی کئی کتابیں لکھیں، ابن وہب کی روایت میں ہے، ایک تابعی کہتے ہیں:۔

فاخذ بیدی الی بیتہ فارانا کتبا من حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقال ھذا ھو مکتوب عندی (فتح الباری ج ۱ صفحہ ۱۸۴، جامع بیان العلم جزاول صفحہ ۷۴)	حضرت ابوہریرہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور مجھے احادیث کی کتابیں دکھائیں اور فرمایا کہ یہ میرے پاس کتابی شکل میں بھی موجود ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک کتاب اپنے شاگرد ہمام کے لئے مرتب کی تھی، جو صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہے (اور اب چھپ چکی ہے) (صحیفہ ہمام بن منبہ پیش لفظ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صفحہ ۱۴)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ایم، اے، ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی، ڈی لٹ لکھتے ہیں:۔

"مسند ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے نسخے عہد صحابہ ہی میں لکھے گئے، چنانچہ ابوہریرہ کی مسند کا نسخہ عمر بن عبدالعزیز کے والد عبدالعزیز بن مروان گورنر مصر (المتوفی ۸۶ھ) کے پاس بھی تھا، انہوں نے کثیر بن مرہ کو لکھا کہ

"تمہارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی جو حدیثیں ہوں، انہیں لکھ کر بھیجدو الا حدیث ابی ھریرۃ فانہ عندنا" یعنی ابوہریرہ کی حدیثوں کے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے پاس موجود ہیں (پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۲۶)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک تالیف ان کے شاگرد بشیر بن نہیک نے مرتب کی، دارمی نے روایت کی، بشیر کہتے ہیں، کہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو کچھ سنتا تھا لکھ لیتا تھا، جب میں نے ان سے رخصت ہونا چاہا تو

اتیتہ بکتابی فقلت ھذا سمعتہ منك قال نعم (پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۲۶ وجامع بیان العلم للمخص ص۳۷) ان کے پاس اپنی کتاب لایا اور ان کو پڑھ کر سنائی اور ان سے کہا یہ وہ چیز ہے جو میں نے آپ سے سنی ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں، کہ عمرو بن امیہ ضمری اولین اسلامی سفیر اور عہد نبوی کے بہت ممتاز سفارتی افسر تھے، ان کے ایک فرزند کی جو ابوہریرہ کے شاگرد تھے، روایت ہے۔۔۔۔

ارانا کتبا کثیرۃ من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوہریرہ نے ہم کو احادیث نبوی کی بہت سی کتابیں دکھائیں،

پھر فرمایا:۔

قد اخبرتك ان کنت حدثتك فھو مکتوب عندی (پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۲۷ وجامع بیان العلم جلد اول ص۷۴) میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر میں نے وہ حدیث تم سے بیان کی ہے تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہیے۔

اس روایت سے ثابت ہوا، کہ جتنی احادیث انہیں حفظ تھیں، وہ سب انہوں نے لکھ کر محفوظ کر لی تھیں، حضرت ابوہریرہ کا ایک مرتبہ مروان نے امتحان بھی لیا، پردے کے پیچھے ایک کاتب سے ان کی بیان کردہ احادیث تحریر کرائیں، سال بھر بعد مروان نے حضرت ابوہریرہ کو پھر بلایا، اور وہی حدیثیں پھر سنیں کاتب نے تحریر شدہ احادیث سے مقابلہ کیا، تو ایک حرف کا بھی فرق نہ پایا (پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۲۶)

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کی کتاب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں "حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ بھی حدیثیں لکھا کرتے تھے، اور ایسا نظر آتا ہے، کہ وہ خطوط وکتابت کے ذریعہ سے بھی درس دیا کرتے تھے، جیسا کہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں نظر آتا ہے (پیش لفظ ص۳۹)

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی حدیث کی کتاب حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے بھی ایک کتاب تحریر فرمائی

تھی حضرت امام حسن بصری کے پاس وہ کتاب تھی۔

انما یحدث عن صحیفۃ سمرۃ رضہ (ترمذی۔ ابواب البیوع) — اور وہ حضرت سمرہؓ کی کتاب سے حدیث سنایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں "حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے بھی حدیثیں جمع کیں، جو ان کے بیٹے سلیمان بن سمرہ کو وراثت میں ملیں، ابن حجر نے لکھا ہے، کہ سلیمان نے اپنے باپ کے حوالے ایک بڑا رسالہ (نسخۃ کبیرۃ) روایت کیا ہے" نیز ابن سیرین کہتے ہیں، کہ سمرہؓ نے اپنے بیٹوں کے لئے جو رسالہ لکھا تھا، اس میں بہت علم (علم کثیر) پایا جاتا ہے (پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۳۹)

حضرت سعد بن عبادہ کی حدیث کی کتاب

حضرت سعد بن عبادہ رضہ نے بھی ایک کتاب لکھی تھی، حضرت سعد کے بیٹے فرماتے ہیں:۔

وجدنا فی کتاب سعد ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی بالیمین مع الشاھد (ترمذی ابواب الاحکام) — یعنی ہم نے سعد کی کتاب میں دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث کی کتابیں

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کئی کتابیں لکھی تھیں، یہ کتابیں ان کی زندگی ہی میں شائع (ذائع) تھیں، عکرمہ فرماتے ہیں:۔

ان نفرا قدموا علی ابن عباس رضہ من اھل الطائف بکتاب من کتبہ فجعل یقرأ علیھم (ترمذی کتاب العلل) — یعنی طائف کے چند آدمی حضرت ابن عباس کے پاس ان کی کتابوں میں سے ایک کتاب لائے حضرت ابن عباسؓ یہ کتاب انکو پڑھ کر سنانے لگے۔

حضرت ابن عباس رضہ فرمایا کرتے تھے:۔

قیدوا العلم بالکتاب (جامع بیان العلم ج ۱ ص۷۲) — اس علم کو لکھ کر محفوظ کر لو۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں "یہ تواتر سے ثابت ہے، کہ ان کی وفات ہوئی، تو اتنی تالیفیں چھوڑیں کہ ایک اونٹ پر لادی جاتی تھیں (پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۴۰)

ڈاکٹر صاحب اس کے آگے تحریر فرماتے ہیں "جب حضرت عبداللہ بن عباس رضہ کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے علی بن عبداللہ اپنے باپ کی کتابوں کے وارث بنے، اور اس طرح اس سرچشمہ علم کی فیض رسانی کا سلسلہ ان کے بعد بھی جاری رہا" (پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۴۰)

حضرت ابن عباس رض کا حدیث کی تعلیم کا اہتمام کرنا | ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ ابن عباس جو املا کرانے تھے۔ اسے وہ لکھتے جاتے تھے"

(پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۲۱)

قید ابن عباس عکرمۃ علی تعلیم القرآن والسنن والفرائض (صحیح بخاری کتاب فی الخصومات)

یعنی حضرت ابن عباس نے عکرمہ کو قرآن و حدیث اور فرائض سیکھنے کے لئے روک رکھا تھا۔

حضرت انس رض کی کتاب | سعید بن ہلال فرماتے ہیں:۔

کنا اذا اکثرنا علی انس بن مالک رضی اللہ عنہ فاخرج الینا محالا عندہ فقال ھذہ سمعتہا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکتبتہا وعرضتہا علیہ (خالص اسلام ص۲۴ بحوالہ مستدرک حاکم)

یعنی ہم جب حضرت انسؓ سے زیادہ پوچھ گچھ کرتے تو وہ اپنے پاس سے ایک دفتر نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنی ہیں اور میں نے آپ کی حیات مقدسہ میں ان کو لکھا اور دکھا کر آپ سے تصحیح کرائی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ اور احادیث کی حفاظت کا اہتمام | دارمی میں ہے، راوی کہتا ہے:۔

رأیت ابان یکتب عند انس رض

یعنی میں نے دیکھا ابان حضرت انسؓ کے پاس بیٹھ کر لکھا کرتے۔

حضرت انس رض یہ بھی فرماتے تھے:۔

یا بنی قیدوا ھذا العلم (دارمی ص۶۸) (جامع بیان العلم ج۱ ص۷۳ نحوہ)

اے میرے بچو! اس علم کو لکھ کر محفوظ کر لو۔

انہ امرھما بکتابۃ الحدیث والاسناد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتعلمہا (شرف اصحاب الحدیث للخطیب البغدادی ص۵۲)

انسؓ نے اپنے بیٹوں نضر اور موسیٰ کو حدیث اور سند لکھنے کا حکم دیا اور اس کے سیکھنے کا بھی حکم دیا۔

حضرت جابرؓ نے بھی ایک کتاب لکھی تھی،

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی کتاب | سلیمان تیمی کہتے ہیں:۔

ذھبوا بصحیفۃ جابر بن عبد اللہ الی الحسن البصری فاخذھا (ترمذی ابواب البیوع)

یعنی حضرت جابرؓ کی کتاب کو امام حسن بصری کے پاس لے گئے تو انہوں نے اس کو یاد کر لیا۔

حضرت جابرؓ اور حفاظت احادیث کا اہتمام

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں "یہ بھی مشہور ہے، کہ مسجد نبوی (مدینہ) میں ان کا ایک حلقہ درس تھا جس میں لوگ ان سے علم حاصل کرتے تھے، چنانچہ مشہور تابعی مورخ وہب بن منبہ (ہمام بن منبہ کے بھائی) کو بھی انہوں نے حدیثیں املا کرائی تھیں، امام بخاری کی روایت ہے، کہ مشہور تابعی قتادہ کہا کرتے تھے، کہ مجھے سورہ بقرہ کے مقابلہ میں صحیفہ جابر زیادہ حفظ ہے، ان کے ایک اور شاگرد سلیمان الیشکری کہتے تھے، کہ انہوں نے بھی حضرت جابر کی روایت کردہ حدیثیں لکھی ہیں، حضرت جابرؓ سے اور لوگوں نے بھی درس لیا، اور ان کے صحیفہ کی روایت کی ہے (پیش لفظ صحیفہ ہمام بن منبہ ص۳۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حفاظت احادیث

ان کے بھانجے عروہ بن زبیرؓ نے حضرت عائشہ رضؓ کی احادیث کو جمع کیا تھا (پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۳۰)

عمرہ بنت عبد الرحمٰن اور قاسم بن محمد کی حضرت عائشہ رضؓ نے پرورش کی، اور ان کو زیور علم سے آراستہ کیا، عمرہ کی تمام احادیث کو حضرت عمر بن عبد العزیز کے حکم سے تحریر کر لیا گیا، اور وہ محفوظ ہو گئیں (پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۳۱-۳۲ ملخصًا)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حفاظت احادیث

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں "سلیمان بن موسیٰ کی روایت ہے، کہ ابن عمرؓ کے مولی یعنی نافع کو دیکھا، کہ ابن عمرؓ اسے املا کرا رہے تھے، اور نافع لکھتے جا رہے تھے... حضرت ابن عمرؓ فخر سے فرمایا کرتے تھے، کہ نافع کا وجود ہم پر اللہ کا ایک بڑا احسان ہے (پیش لفظ ص۴۱)

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی حدیث کی کتاب

حضرت ابن مسعود نے بھی ایک کتاب لکھی تھی، ان کے بیٹے عبد الرحمٰن ایک کتاب نکال کر لائے، اور قسم کھا کر کہا، یہ خود ابن مسعود کی لکھی ہوئی ہے، عربی الفاظ یہ ہیں ـ حلف لی انہ خط ابیہ بیدہ (جامع بیان العلم ج۱ ص۷۲)

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں "حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو حدیثیں جمع کی تھیں وہ ان کے بیٹے کے پاس پائی گئیں۔ (صحیفہ ہمام ص۴۲)

حضرت براء بن عازبؓ اور حفاظت حدیث کا اہتمام

حضرت براء بن عازب کے پاس بیٹھ کر لوگ ان کی احادیث

کو لکھا کرتے تھے (دارمی ص۶۹)

حضرت سعد بن الربیعؓ کی حدیث کی کتاب حضرت سعد بن ربیعؓ نے بھی ایک کتاب لکھی تھی، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے ان کی کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(پیش لفظ صحیفہ ہمام ص۱۴)

حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے صحیفے محمد بن اسحاق ندیم نے کتاب الفہرست میں لکھا ہے، کہ میں نے مدینہ کے کتب خانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی حدیث کی کتاب، اور حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین وغیرہ صحابہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صحیفے دیکھے تھے (توجیہ النظر ص۹)

حضرت رافع بن خدیجؓ کی حدیث کی کتاب نافع کہتے ہیں، کہ مروان نے خطبہ دیا، اور اس میں مکہ کے حرم ہونے کا ذکر کیا، تو حضرت رافع بن خدیج نے ان کو پکار کر کہا، کیا بات ہے کہ مکہ کی حرمت کا تم نے ذکر کیا، اور مدینہ کا ذکر نہیں کیا، پھر فرمایا

وقد حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مابین لابتیہا وذلک عندنا فی ادیم اخولانی ان شئت اقرأتکہ (صحیح مسلم، باب فضل المدینۃ ج۱ ص۴۴۰ مطبوعہ مصر)	بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سنگستانوں کے درمیانی علاقہ کو حرم قرار دیا ہے اور یہ حکم میرے پاس لکھا ہوا ہے اگر تم چاہو تو سناؤں

حضرت زید بن ثابتؓ کی کتاب توجیہ النظر میں ہے، کہ حضرت زید بن ثابت رضؓ نے ایک کتاب فرائض کے متعلق لکھی تھی (ریق اسلام ص۹۱)

صحابہ کی ایک کثیر تعداد احادیث کو قلمبند کیا کرتی تھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

بینما نحن حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکتب اذ سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای المدینتین تفتح اولا قسطنطینیۃ او رومیۃ الخ (دارمی ص۶۹)	یعنی ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے اسی اثناء میں آپ سے پوچھا گیا کونسا شہر پہلے فتح ہوگا قسطنطنیہ یا رومیہ؟ آپ نے فرمایا ہرقل کا شہر۔ یعنی قسطنطنیہ

نتیجہ مندرجہ بالا بیان سے یہ ثابت ہوا، کہ خلفائے راشدین نے حدیث کی حفاظت کا اہتمام کیا، اور کتابیں لکھیں، نیز دیگر متعدد صحابہ کرامؓ نے بھی کتابیں لکھیں، احادیث املاء کرائیں، تو پھر یہ کہنا، کہ صحابہ کرام کے احادیث نہ جمع کرنے کی فلاں فلاں وجوہ تھیں، خود بخود غلط ثابت ہو جاتا ہے

غلط فہمی برق صاحب نے آگے چل کر تحریر فرمایا ہے، کہ:-
صحابہ کرام کے احادیث جمع نہ کرنے کی بڑی بڑی دو وجوہ تھیں، اول، وہ قرآن کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے، صحیح بخاری میں مذکور ہے، کہ جب رحلت سے پہلے حضور پرنور نے فرمایا کہ لاؤ قلم، دوات، اور کاغذ، میں تمہیں ایک چیز لکھ کر دے جاؤں، کہ میرے بعد تمہاری گمراہی کا کوئی امکان باقی نہ رہے، تو حضرت عمر بن الخطاب جھٹ بول اٹھے، ہمیں کسی مزید تحریر کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ "حسبنا کتاب اللہ" ہمارے پاس کتاب الٰہی موجود ہے جس میں انسانی فلاح و نجات کے مکمل گر درج ہیں، اور یہ کتاب ہمارے لئے کافی ہے" (دو اسلام ص۳۷-۳۸)

ازالہ اس کا جواب کئی طرح سے ہے، اول یہ کہ گذشتہ اوراق میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے، کہ صحابہ کرامؓ نے بلکہ خاص طور پر حضرت عمرؓ نے احادیث کی حفاظت کا انتظام کیا، خود تعلیم دی، دوسروں کو تعلیم پر مامور فرمایا، خود احادیث کو ضبط تحریر میں لائے، دوسروں سے لکھوایا، حتیٰ کہ ان کے یہ نوشتے محدثین نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے، ان کو اپنی کتابوں میں نقل کیا، اگر وہ صرف قرآن کو کافی سمجھتے تھے تو حفاظت احادیث کا یہ اہتمام بے سود ہوتا، حقیقت یہ ہے، کہ وہ احادیث کو بھی ماخذ دین سمجھتے تھے، اور اسی وجہ سے قرآن مجید کے ساتھ اس کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے، اس کو بھی حفظ کرتے تھے، اور تحریر کرتے تھے، لہٰذا حدیث تحریر نہ کرنے کی یہ وجہ خود بخود باطل ہو جاتی ہے۔

دوم۔ یہ جملہ "حسبنا کتاب اللہ" یعنی کتاب الٰہی ہمارے لئے کافی ہے، حضرت عمرؓ کا قول ہے نہ کہ تمام صحابہ کا، اکثر صحابہؓ نے اس سے اتفاق نہیں کیا، بلکہ حدیث کے الفاظ ہیں "فاختلفوا" یعنی صحابہ کرامؓ حضرت عمرؓ کے اس کہنے پر خاموش نہیں ہوئے، بلکہ بڑی گڑبڑ ہوئی اور شدید اختلاف کیا (صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بعد کیا ہوا، حدیث کے الفاظ میں سنیئے "ذھبوا یردون عنہ" یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار پوچھتے رہے (صحیح بخاری) ظاہر ہے کہ اختلاف رائے کے باوجود صحابہ نے آپ کو تحریر لکھوانا یاد دلایا، اور بار بار یاد دلایا ہوگا، یہ جب ہی ہو سکتا ہے، کہ آپس میں اس بات پر اتفاق ہو گیا، کہ لکھنا ضروری ہے، یا کم از کم اکثریت کا فیصلہ یہی تھا، اور اقلیت نے خاموشی اختیار کر لی، لہٰذا "حسبنا کتاب اللہ" کے نعرہ کی تردید خود صحابہ کرامؓ نے کر دی، اور حضرت عمرؓ کو خاموش ہونا پڑا، صحابہ

کرام کے فیصلہ کے خلاف اب بھی اس نعرہ کو دلیل بنانا صحیح نہیں ہے۔

سوم۔ یہ جملہ "حسبنا کتاب اللہ" حضرت عمرؓ کا قول ہے، جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، حضرت عمرؓ کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ حدیث قابل حجت نہیں، اور اگر حضرت عمرؓ کے متعلق یہ فرض کر لیا جائے تو یہ ان کی ذاتی رائے تھی، جس سے انہوں نے رجوع کر لیا۔ اور حدیث کی حفاظت اور تعلیم کا انتظام کیا، حدیث کی کتابیں لکھیں، حدیث کی اشاعت کی ان تمام باتوں کا ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے، ذیل میں چند روایات مزید پیش کی جا رہی ہیں، جن سے ثابت ہوگا، کہ حضرت عمرؓ حدیث کو حجت سمجھتے تھے

(۱) حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابوبکرؓ صدیق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ سے اپنا حصہ طلب کیا، تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا:۔

لست تارکا شیئا کان یعمل بہ الا عملت بہ فانی اخشی ان ترکت شیئا من امرہ ان ازیغ (صحیح بخاری کتاب الجہاد)	یعنی میں ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑونگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے بلکہ اس ہی پر عمل کرونگا اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امر کے خلاف چلونگا تو گمراہ ہو جاؤں گا۔

حضرت ابوبکرؓ کے ان الفاظ کو پڑھیے، اور بار بار پڑھیے، شان صدیقی ملاحظہ فرمایئے، سنت چھوڑنے سے صاف انکار ہے سنت چھوڑنے سے ڈرتے ہیں، کہ کہیں گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں، حضرت ابوبکرؓ کے اس قول و فعل کو حضرت عمرؓ کے الفاظ میں سنیئے، حضرت عمرؓ نے اسی مقدمہ کے سلسلہ میں اپنی خلافت کے دور میں فرمایا تھا:۔

فعمل فیہا بما عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ یعلم انہ فیہا لصادق بار راشد تابع للحق (صحیح بخاری کتاب الجہاد)	یعنی حضرت ابوبکرؓ نے اس معاملہ میں وہی عمل کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے بیشک اللہ جانتا ہے کہ ابوبکرؓ درحقیقت سچے تھے نیک کام کرنے والے تھے ہدایت یافتہ تھے اور حق کے تابع تھے

گویا حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے قول کی تائید کردی، کہ سنت رسول کو نہ چھوڑنے والا ہی تابع الحق اور ہدایت پانے والا ہے اور اس میں ذرا سی بھی کمی کرنے والا گمراہ ہے۔ پھر حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:۔

اعمل فیہا بما عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما عمل فیہا ابوبکر واللہ یعلم انی فیہا لصادق بار راشد	میں بھی اس طرح عمل کرونگا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کیا تھا اور جس طرح ابوبکرؓ نے عمل کیا تھا اور اللہ جانتا ہے کہ

تابع للحق (صحیح بخاری کتاب الجهاد) — میں سچا ہوں نیک عمل کرنے والا ہوں، ہدایت اور حق کا تابع ہوں۔

اس جملہ میں حضرت عمرؓ نے واضح کر دیا، کہ اتباع حق اور نیکی یہی ہے، کہ سنت رسول پر چلا جائے یہی سچائی اور یہی ہدایت ہے، پھر حضرت عمرؓ فریقین مقدمہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا نورث ما ترکنا صدقۃ (صحیح بخاری کتاب الجهاد) — یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔

ڈنکے کی چوٹ تمام صحابہ کی موجودگی میں حضرت عمرؓ نے وہ حدیث پڑھ دی، جو بظاہر قرآن کے خلاف ہے اور اس کو علی الاعلان بطور حجت شرعیہ پیش کیا، نہ فریق مقدمہ حضرت علیؓ نے اس کی تردید کی نہ فریق ثانی حضرت عباسؓ نے اس کی تردید کی، نہ صحابہ کے مجمع میں سے کوئی آواز اٹھی، کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے، قرآن کی رُو سے بلا استثنا ہر شخص کا ورثہ تقسیم ہونا چاہیے، قرآن میں اس قسم کی کوئی تخصیص نہیں ہے، لہٰذا یہ حدیث حجت نہیں، تمام صحابہ نہ یہ کہ صرف خاموش ہی رہے، بلکہ اس حدیث کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں، آہ! اس خلاف قرآن حدیث کو پیش کرنے والے وہی فاروق اعظم ہیں جن کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا تھا "حسبنا کتاب اللہ" یہ وہی فاروق اعظم ہیں، کہ حدیث کو حجت میں پیش فرما رہے ہیں، اور ایسی حالت میں پیش فرما رہے ہیں کہ بظاہر وہ قرآن کی آیت کے بھی خلاف ہے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے جملہ "حسبنا کتاب اللہ" کا مطلب کچھ اور تھا، یہ مطلب نہ تھا، جو آج کل لیا جا رہا ہے، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

فو اللہ الذی باذنہ تقوم السماء والارض لا اقضی فیھا قضاء غیر ذلك (صحیح بخاری کتاب الجهاد) — یعنی قسم اس ذات پاک کی جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں میں اس فیصلہ کے علاوہ کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ میں قیامت تک اس فیصلہ کے علاوہ کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کر سکتا، ملاحظہ فرمایئے، کس طرح قسم کھا کر وہ اپنی پیش کردہ حدیث کے خلاف فیصلہ کرنے سے اپنے عجز کا اظہار فرما رہے ہیں، بلکہ وہ تو یہاں تک عقیدہ رکھتے ہیں، کہ قیامت تک فیصلہ نبوی علی حالہ قائم رہنا ضروری ہے اسے کسی حالت میں بدلا نہیں جا سکتا، اگر صرف قرآن کافی تھا، تو وہ حدیث پر عمل کرنے کے لئے کیوں مجبور تھے کیوں اس کو ہدایت سمجھتے تھے، غور کیجیے، اور انصاف فرمایئے۔

(۲) حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ حجر اسود کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ:۔

واللہ انی لا علم انك حجر لا تضر ولا — یعنی اللہ کی قسم میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر

تنفع ولولا انی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استلمک استلمک فاستلمہ (صحیح بخاری)	ہے۔ نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ اگر میں نے نبی کریم کو بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی بوسہ نہ دیتا پھر حضرت عمر نے اس کو بوسہ دیا۔

حجر اسود کو بوسہ دینا بظاہر کوئی حقیقت نہیں رکھتا، لیکن حضرت عمرؓ اس معمولی سی سنت کو بھی چھوڑنا گوارا نہیں کرتے

(۳) حضرت عمرؓ نے رمل کے متعلق فرمایا ہے:۔

فما لنا والرمل انما کنا رآینا بہ المشرکین وقد اھلکھم اللہ ثم قال شئی صنعہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلا نحب ان نترکہ (صحیح بخاری کتاب الحج باب الرمل)	یعنی رمل کرنے کی اب ہمیں کیا ضرورت ہے یہ تو ہم نے مشرکین پر اپنی قوت کے اظہار کے لئے کیا تھا اور اب مشرکین کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر دیا۔ پھر فرمایا لیکن جس چیز کو آپ نے کیا ہے۔ اس کو چھوڑنا ہم پسند نہیں کرتے۔

دیکھا آپ نے حضرت عمرؓ کس قدر سنت کے عاشق ہیں، کہ اس سنت پر بھی عمل کر رہے ہیں جس کا مقصد فوت ہو چکا ہے۔

(۴) حج تمتع کے متعلق جب آپ سے پوچھا گیا، تو فرمایا:۔

ان ناخذ بکتاب اللہ فانہ یامرنا بالتمام وان ناخذ بسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یحل حتی بلغ الھدی محلہ (صحیح بخاری کتاب الحج باب الذبح قبل الحلق)	یعنی اگر ہم کتاب اللہ کو ماخذ تسلیم کریں تو وہ ہمیں حج اور عمرہ پورا کرنے کا حکم دیتی ہے اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ماخذ تسلیم کریں تو بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام نہیں کھولا جب تک قربانی نہیں کی۔

حضرت عمرؓ نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں کو بطور حجت پیش کیا اگر کتاب اللہ کو کافی سمجھتے، تو صرف کتاب اللہ کو پیش کر دینا کافی تھا، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ سنت کو بھی حجت میں شامل کیا ان کے جواب سے پوری طرح واضح ہو رہا ہے، کہ اگر ان کو حج تمتع کے متعلق جواز کی حدیث معلوم ہوتی، تو وہ یقیناً اس کو تسلیم کرتے، اگرچہ وہ بظاہر قرآن کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتی، انہوں نے حج تمتع سے صرف اس لئے انکار کیا، کہ ان کے علم میں سنت سے اس کا ثبوت نہیں تھا۔ اگر ثبوت مل جاتا تو وہ کبھی انکار نہ کرتے۔ جیسا کہ دوسرے صحابہؓ نے جب حدیث ان کو مل گئی تو حج تمتع کو تسلیم کر لیا، کسی صحابی نے یہ نہیں کہا، کہ یہ تو

قرآن کے خلاف ہے، لہٰذا حجت نہیں، اس روایت سے ثابت ہوا کہ صحابہ حدیث کو بھی ماخذ قانون سمجھتے تھے۔

(۵) مانعین زکوٰۃ سے جب حضرت ابوبکرؓ نے قتال کا ارادہ فرمایا، تو حضرت عمرؓ ہی تھے، جنہوں نے اس کی مخالفت کی اور حجت میں حدیث پیش کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا، آپ کیسے ان سے لڑ سکتے ہیں حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فمن قال لا الہ الا اللہ عصم منی مالہ ونفسہ الا بحقہ وحسابہ علی اللہ	یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ پڑھیں پس جس نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا تو اس نے مجھ سے اپنے مال اور اپنی جان کو بچا لیا مگر اس کے حق کے ساتھ اور

حضرت ابوبکرؓ نے اسی حدیث کے آخری حصہ "الا بحقہ" سے استدلال کیا، اور فرمایا:۔

فان الزکوٰۃ حق المال

لہٰذا حدیث ہی کی رو سے حق کے لئے لڑنا جائز ہے، حضرت عمر فرماتے ہیں:۔ کہ

فعرفت انہ الحق (بخاری مسلم) پس میں سمجھ گیا۔ کہ یہی حق ہے

یعنی حضرت عمرؓ نے "الا بحقہ" سے استدلال کرنے کو صحیح مانا، غرض یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اور "حسبنا کتاب اللہ" کہنے والے صاحب یعنی فاروق اعظم نے بھی حدیث کو حجت مانا، اور اسی کے مطابق عمل کیا، کیوں حضرت عمرؓ نے قرآن کو کافی سمجھ کر قرآن کی کوئی آیت نہ پڑھی، کیوں نہ قتال کے خلاف آیت قرآنی کو پیش فرمایا، صرف اس وجہ سے کہ وہ جانتے تھے، کہ محض قرآن کافی نہیں، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حدیث بھی اسی طرح ماخذ قانون ہے جس طرح قرآن یہی وجہ ہے، کہ وہ بے دھڑک حدیث کو بطور حجت کے پیش کر دیا کرتے تھے، اور ایسی حدیث کو پیش کر دیا کرتے تھے، جو بظاہر قرآن سے ٹکراتی تھی مثلاً یہی حدیث سورہ توبہ کی ان آیات کے خلاف ہے، جن میں کہ کفار سے جنگ بند کرنے کا حکم اس وقت ہے جب وہ ایمان لے آئیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، حضرت عمرؓ کی پیش کردہ حدیث میں نماز اور زکوٰۃ کا کوئی ذکر نہیں، لیکن پھر بھی وہ اس حدیث کو پیش کرنے میں تامل نہیں کرتے، پھر حضرت ابوبکرؓ کی حالت ملاحظہ فرمائیے وہ سورہ توبہ کی آیت پیش نہیں کرتے، بلکہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور اس کو حجت شرعیہ کے طور پر پیش کرنے کے لئے کافی سمجھتے ہیں اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا، کہ حضرت عمرؓ نے حدیث ہی کی بنا پر ایک رائے قائم کی، اور پھر حدیث ہی کی بنا پر اپنی اس رائے کو غلط سمجھا اور اس سے رجوع کر لیا۔

(٦) مطلقہ عورت کی رہائش اور نفقہ کے متعلق حضرت عمر رضہ فرماتے ہیں:۔

لا نترك كتاب الله وسنة نبينا صلى الله عليه وسلم (صحیح مسلم جلد اول)

ہم اللہ کی کتاب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے۔

(٧) حضرت مسور رضہ فرماتے ہیں:۔

استشار عمر بن الخطاب في املاص المرأة فقال المغيرة بن شعبة شهدت النبي صلى الله عليه وسلم قضى فيه بغرة عبد او امة فقال عمر ائتني بمن يشهد معك قال فشهد له محمد بن مسلمة (مسلم باب دية الجنين)

یعنی حضرت عمرؓ نے عورت کے پیٹ کے بچہ کو گرا دینے کی دیت کے سلسلہ میں مشورہ کیا۔ حضرت مغیرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری موجودگی میں بطور دیت ایک غلام یا لونڈی مقرر کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تمہارے ساتھ اور کون گواہ ہے پس حضرت محمد بن مسلمہ نے شہادت دی۔

غرض یہ کہ حضرت عمر رضہ حدیث پر صرف عمل ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کی حفاظت اور توثیق کا بھی خیال رکھتے تھے، اس کے بعد حضرت عمر رضہ نے فرمایا:۔

الله اكبر لو لم اسمع بهذا لقضيت بغير هذا (ابوداؤد کتاب الديات)

اللہ اکبر اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے تو اس کے خلاف فیصلہ کر دیتے۔

یعنی حضرت عمر رضہ لاعلمی میں بھی حدیث کے خلاف فیصلہ کرنے کو برا سمجھتے تھے۔

(٨) ایک دن حضرت عمر رضہ نے خطبہ میں فرمایا:۔

ان الله قد بعث محمدا صلى الله عليه وسلم بالحق وانزل عليه الكتاب فكان مما انزل عليه آية الرجم قرأناها ووعيناها وعقلناها فرجم رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجمنا بعده فاخشى ان طال بالناس زمان ان يقول قائل ما نجد الرجم في كتاب الله فيضلوا بترك فريضة انزلها الله وان الرجم في كتاب الله حق على من

یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا اور آپ پر شریعت نازل فرمائی اس میں رجم کا حکم بھی ہے۔ ہم نے اس کو پڑھا ہے اور یاد کیا ہے۔ اور سمجھ لیا ہے آپ نے رجم کیا ہے اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا ہے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں امتداد زمانہ کے باعث کوئی کہنے والا یہ نہ کہہ دے کہ اللہ کی کتاب میں رجم کا حکم نہیں ہے پس لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ فریضہ کو چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں اور بے شک رجم کتاب اللہ میں ثابت ہے اس شخص کے لئے جو

زنی اذا احصن (صحیح بخاری و صحیح مسلم) شادی شدہ ہو کر زنا کرے۔

باب رجم الثیب)

حضرت عمرؓ حکم رجم کو نازل شدہ مان رہے ہیں، اور اس کو کتاب اللہ میں قائم اور ثابت سمجھ رہے ہیں حالانکہ رجم کا حکم قرآن میں نہیں ہے، بلکہ حدیث میں ہے اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک قرآن ہی کتاب اللہ اور منزل من اللہ نہیں ہے، بلکہ حدیث بھی کتاب اللہ اور منزل من اللہ ہے، یہاں بھی حضرت عمرؓ اس حدیث کو حجت تسلیم کر رہے ہیں، جو بظاہر قرآن کے بالکل خلاف ہے، بلکہ تمام صحابہؓ اس کو تسلیم کر رہے ہیں، کوئی ایک بھی اس کی حجت سے انکار نہیں کرتا اس اثر مذکورہ کی موجودگی میں اس بات کا قوی امکان ہے، کہ "حسبنا کتاب اللہ" سے حضرت عمرؓ کی مراد قرآن اور حدیث دونوں تھی، یعنی شریعت الٰہیہ جو منزل من اللہ ہے۔

(۹) حضرت عمرؓ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے، کہ اتنے میں حضرت عثمان تشریف لائے حضرت عمرؓ نے دیر سے آنے کا سبب پوچھا — کہنے لگے کہ میں نے اذان سنی، اور فوراً وضو کر کے چلا آیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا:

والوضوء ایضا اولم تسمعوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اذا اتی احدکم الجمعۃ فلیغتسل (ابوداؤد۔ کتاب الطہارت)

یعنی صرف وضو کر کے آنا بھی غلطی ہے کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے نہیں سنا کہ جو شخص جمعہ کی نماز پڑھنے آئے تو غسل کر کے آئے۔

حضرت عمرؓ نے حدیث کو بطور حجت پیش فرمایا، اور حضرت عثمانؓ اور تمام صحابہؓ نے سے تسلیم کیا، کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا، کہ یہ حکم نبوی عارضی تھا، اس کا مقصد ختم ہو چکا، اب نہانا ضروری نہیں، پھر حضرت عمرؓ خود مرکز ملت تھے، چاہتے تو خود حکم دے دیتے کہ نہا کر آیا کرو، لیکن نہیں وہ اپنے حکم کو حجت شرعیہ نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا اس چیز کو پیش کیا، جو حقیقۃً حجت شرعیہ تھی، فللّٰہ الحمد۔

(۱۰) حارث کہتے ہیں، کہ میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا، کہ اگر عورت نحر کے دن طواف کرے، اور پھر اس کو حیض شروع ہو جائے، تو کیا کرے، حضرت عمرؓ نے فرمایا، کہ آخری کام بیت اللہ کا طواف ہونا چاہیئے، حارث نے کہا، یہی فتویٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

اربت عن یدایک سألتنی عن شئی سألت عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ لکیما اخالف (ابوداؤد کتاب الحج)

یعنی تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں تو نے ایسی بات پوچھی جس کے متعلق تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ چکا تھا۔ کیا میں فیصلہ نبوی کے خلاف کہہ سکتا ہوں

(۱۱) حضرت عمرؓ نے چاہا، کہ وہ خزانہ جو کعبہ کے اندر مدفون ہے نکال کر تقسیم کر دیں ایک شخص نے کہا آپ ایسا نہیں کر سکتے کہنے لگے کیوں؟ اس نے کہا ہ۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا علم تھا
قد رای مکانہ وابوبکر وھما احوج	اور ابو بکر کو بھی اور وہ آپ سے زیادہ ضرورت
منک الی المال فلم یخرجاہ	مند تھے۔ لیکن انہوں نے اس کو نہیں نکالا۔
فقام فخرج (ابوداؤد کتاب المناسک)	حضرت عمر کھڑے ہوگئے اور باہر نکل آئے

حضرت عمرؓ نے یہاں بھی سنت نبوی کو حکم مانا، اور اپنے ارادہ سے باز رہے، انہوں نے یہ نہیں کہا، کہ اب میں مرکز ملت ہوں، جو چاہوں کروں۔

(۱۲) ایک عورت اپنے پوتے کی میراث میں سے حصہ لینے آئی، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:۔

مالک فی کتاب اللہ من شئی وما	یعنی نہ کتاب اللہ میں تیرا کوئی حصہ مقرر ہے
علمت لک فی سنۃ نبی اللہ صلی اللہ	نہ میرے علم کے مطابق سنت نبی اللہ صلی
علیہ وسلم شیئا	اللہ علیہ وسلم میں۔

اس کے بعد فرمایا، تم پھر آنا میں لوگوں سے پوچھوں گا، پس انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا، حضرت مغیرہؓ اور حضرت محمد بن مسلمہؓ نے کہا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دیا تھا پس حضرت ابوبکرؓ نے اس کو چھٹا حصہ دے دیا، پھر حضرت عمرؓ کے پاس متوفی کی نانی میراث مانگنے آئی حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

ما انا بزائد فی الفرائض ولکن ذلک	میں مقررہ حصہ میں زیادتی نہیں کر سکتا۔ دادی
السدس فان اجتمعتما فھو بینکما	نانی کا چھٹا حصہ ہے اگر دونوں موجود ہوں تو
(ابوداؤد۔ کتاب الفرائض)	چھٹا حصہ دونوں میں تقسیم ہوگا۔

نانی یا دادی کا حصہ قرآن میں نہیں ہے صرف حدیث میں ہے لیکن حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، کہ میں اس مقررہ حصہ میں زیادتی نہیں کر سکتا، یعنی جو کچھ حدیث میں ہے، وہی حجت ہے اسی پر عمل ہوگا، مرکز ملت کو سنت رسول کے بدلنے یا اس میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا حق نہیں ہے، اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حدیث کو حجت شرعیہ سمجھتے تھے۔

(۱۳) حضرت سعید فرماتے ہیں:۔

کان عمر بن الخطاب یقول الدیۃ	یعنی حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ دیت عاقلہ کو
العاقلۃ ولا ترث المراۃ من دیۃ	ملے گی اور بیوہ کو اس میں سے کچھ نہیں۔

زوجها شیئا حتی قال له الضحاک بن سفیان کتب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ورث امراۃ اشیم الضبابی من دیۃ زوجہا فرجع عمرؓ (ابوداؤد۔ کتاب الفرائض)	ملے گا۔ یہاں تک کہ ضحاکؓ نے ان سے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لکھ کر بھیجا تھا۔ کہ اشیم کی بیوی کو بھی دیت میں حصہ دیا جائے یہ سنکر حضرت عمرؓ نے اپنے فتوی سے رجوع کر لیا۔
(۱۴) لم یکن عمر اخذ الجزیۃ من المجوس حتی شھد عبد الرحمن بن عوف ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخذھا من مجوس ھجر (ابوداؤد کتاب الخراج)	یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجوس سے جزیہ نہیں لیتے تھے یہاں تک کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے شہادت دی کہ آپ نے ہجر کے مجوس سے جزیہ لیا تھا۔

قرآن میں صرف اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم ہے، حضرت عمرؓ اس پر عمل کرتے تھے، مجوس سے جزیہ لینے کا حکم قرآن میں نہیں ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی جزیہ لیا بظاہر یہ حدیث بھی قرآن کے خلاف تھی لیکن حضرت عمرؓ نے بغیر کسی پس وپیش کے اس کو قبول کیا، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک حدیث حجت شرعیہ ہے، خواہ وہ قرآن کے موافق ہو، یا بظاہر قرآن کے خلاف ہو،

(۱۵) ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے خطبہ میں فرمایا:۔

یا ایھا الناس ان الرای انما کان من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبا لان اللہ کان یریہ وانما ھو منا الظن والتکلف (ابوداؤد کتاب القضاء)	یعنی اے لوگو! رائے تو بس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہے آپ ہی کی رائے سچی ہوتی تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھا دیتا تھا ہماری رائے تو محض ظن وتکلف ہے۔

اس اثر سے معلوم ہوا، کہ حضرت عمرؓ کا یہ عقیدہ تھا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فتوی من جانب اللہ ہوتے تھے، اس لئے وہ صحیح ہوتے تھے۔

(۱۶) ایک پاگل عورت نے زنا کیا، حضرت عمرؓ نے حکم دیا، اس کو سنگسار کردو، حضرت علیؓ ادھر سے گذرے پوچھا کیا معاملہ ہے، لوگوں نے کہا یہ مجنون عورت ہے، اس نے زنا کیا ہے، حضرت علی نے فرمایا اس کو واپس لے چلو، پھر حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا:۔

یا امیر المومنین اما علمت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان القلم	یعنی اے امیر المومنین! آپ کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

رفع عن ثلاثة عن المجنون حتى يبرأ وعن النائم حتى يستيقظ وعن الصبي حتى يعقل قال بلى قال فما بال هذه ترجم قال لا شيء قال فارسلها قال فارسلها قال فجعل يكبر (ابوداود۔ کتاب الحدود)

تین آدمی مرفوع القلم ہیں۔ مجنون جب تک تندرست نہ ہو۔ سونے والا جب تک جاگے اور بچہ جب تک سمجھ دار یعنی بالغ ہو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھے معلوم ہے حضرت علیؓ نے کہا پھر کس لئے اس کو سنگسار کیا جا رہا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کوئی وجہ نہیں حضرت علیؓ نے کہا پھر اس کو چھوڑ

اس روایت سے معلوم ہوا، کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں حدیث کو حجت جانتے تھے، اور مرکز ملت کو اس کا تابع۔ عمرو بن میمون کہتے ہیں:۔

(۷) كنا وقوفا بجمع فقال عمر بن الخطاب ان المشركين كانوا لا يفيضون حتى تطلع الشمس فكانوا يقولون اشرق ثبير وان رسول الله صلى الله عليه وسلم خالفهم فافاض عمر قبل طلوع الشمس (ترمذی کتاب الحج)

یعنی ہم مزدلفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا! بے شک مشرکین مزدلفہ سے واپس نہ ہوتے تھے۔ جب تک سورج نہ نکل آئے۔ اور وہ کہتے تھے۔ کہ اے ثبیر روشن ہو جا! اور تحقیق آپؐ نے ان کی مخالفت کی پس حضرت عمرؓ بھی مزدلفہ سے طلوع شمس سے پہلے چلے گئے

اس مسئلہ میں بھی حضرت عمرؓ نے سنت پر عمل کیا۔ یعلی بن امیہ کہتے ہیں:۔

(۸) قلت لعمر بن الخطاب ليس عليكم جناح ان تقصروا من الصلوة ان خفتم ان يفتنكم الذين كفروا فقد امن الناس فقال عمر رضي الله عنه عجبت مما عجبت منه فسالت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ذلك فقال صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته (نسائی کتاب تقصیر الصلوة فی السفر)

یعنی میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔ تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم نماز میں کمی کرو جب تمہیں یہ خوف ہو کہ کافر تم کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے لیکن اب تو بالکل امن ہے اب نماز میں قصر کیوں کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس چیز سے تمہیں تعجب ہوا ہے مجھے بھی ہوا تھا۔ میں نے آپؐ سے پوچھا آپ نے فرمایا یہ اللہ کا احسان ہے۔ جو اللہ نے تم پر کیا ہے پس احسان کو قبول کرو (یعنی امن میں)

امن کی حالت میں قصر کرنا بظاہر قرآن کے خلاف ہے، لیکن حضرت عمرؓ بغیر چون وچرا سے تسلیم کرتے ہیں

اسے تسلیم ہی نہیں کرتے، بلکہ خلاف قرآن حدیث کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔

(۱۹) مالک بن اوس کہتے ہیں کہ میں نے کہا، کون مجھے سونے کے بدلے درہم دے گا، حضرت طلحہ نے فرمایا، ہمیں اپنا سونا دکھاؤ، پھر آنا، جب ہمارا خادم آجائے، تو ہم تم کو چاندی دے دیں گے، حضرت عمرؓ وہاں موجود تھے، آپ نے فرمایا۔

کلا واللہ لتعطینہ ورقہ او لتردن الیہ ذھبہ فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الورق بالذھب ربا الا ھاء وھاء الخ (مسلم کتاب البیوع)

یعنی ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ یا تو اس کو چاندی دو ورنہ سونا واپس کردو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ چاندی سونے کے بدلے میں سود ہے۔ اگر نقد نہ ہو۔

(۲۰) عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں :۔

سیاتی قوم یجادلونکم بشبھات القرآن فخذوھم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ (جامع بیان العلم جلد ۲ ص۱۲۳)

عنقریب ایک قوم نکلے گی جو قرآن کے شبہات کے ساتھ تم سے مباحثہ و مجادلہ کریگی۔ پس ان کو سنتوں سے پکڑنا کیونکہ بے شک سنتوں والے ہی اللہ کی کتاب کے زیادہ عالم ہوتے ہیں۔

(۲۱) عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے :۔

ایاکم و اصحاب الرای فانھم اعداء السنن اعیتھم الاحادیث ان یحفظوھا فقالوا بالرای فضلوا و اضلوا (جامع بیان العلم ج۲ ص۱۳۵)

یعنی اہل الرائے سے بچنا کیونکہ وہ سنتوں کے دشمن ہوتے ہیں احادیث نے ان کو عاجز کر دیا ہے کہ وہ اس کو حفظ کر سکیں یا محفوظ کر سکیں لہٰذا وہ رائے سے کہتے ہیں خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

الغرض اس قسم کی بیسیوں روایتیں ہیں جن سے حضرت عمرؓ کا حدیث پر عمل کرنا، حدیث کو حجت ماننا ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا، کہ حضرت عمرؓ کا حسبنا کتاب اللہ کہنے سے یہ مطلب تھا کہ حدیث حجت نہیں صرف قرآن کافی ہے، ایک ایسی بات ہے، جس کے لئے کوئی شہادت نظر نہیں آتی، بلکہ جو کچھ حضرت عمرؓ سے تبواتر ثابت ہے، وہ اس کے خلاف ہے۔

غلط فہمی | برق صاحب آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں :۔

"یہ کتاب ہمارے لئے کافی ہے" حضرت فاروق کا یہ جملہ رسالت پناہ کے حضور میں جسارت بے جا معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ مجبور تھے" (دو اسلام ص۳۸)

جواب برقی صاحب کو یہاں بھی غلط فہمی ہوئی، حضرت عمرؓ نے یہ جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تو ضرور کہا، لیکن مخاطب آپ نہیں تھے، حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم غلب علیہ	یعنی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت
الوجع وعندنا کتاب اللہ حسبنا	زیادہ تکلیف ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب
(صحیح البخاری۔ کتاب العلم)	ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے۔

دوسری روایت میں اس سے بھی زیادہ صراحت ہے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد	بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف
غلبہ الوجع وعندکم القرآن حسبنا	زیادہ ہے۔ تمہارے پاس قرآن ہے ہمارے
کتاب اللہ (بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم)	لئے کتاب اللہ کافی ہے۔

پس ثابت ہوا، کہ حضرت عمرؓ کی یہ عبارت بے جا حضور کی جناب میں نہیں تھی، بلکہ حاضرین کو ایک مشورہ تھا جس کو انہوں نے قبول نہیں کیا۔

حدیث قرطاس حدیث زیر بحث حدیث قرطاس کے نام سے مشہور ہے، عموماً لوگوں کے لئے اس میں بہت سے اشکال ہیں، لہٰذا بہتر معلوم ہوتا ہے، کہ اس کے اصل مطلب کو بھی اس جگہ واضح کر دیا جائے، ابن عباسؓ فرماتے ہیں:۔

لما اشتد بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم	یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
وجعہ قال ائتونی بکتاب اکتب	مرض نے شدت اختیار کی تو آپ نے فرمایا
لکم کتابا (صحیح بخاری کتاب العلم)	ایک کاغذ لاؤ۔ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں

اس کے بعد فرمایا:۔

لن تضلوا بعدہ ابدًا	پھر تم ہرگز نہیں بھولو گے۔

یعنی ہو سکتا ہے، کہ ویسے تم میری وصیت کو بھول جاؤ، لیکن تحریری وصیت کے بعد تو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس فرمان کے بعد ایک مکالمہ شروع ہو جاتا ہے جس کے بعض فقرے مختلف سندوں میں بیان ہوئے ہیں اور بعض بالکل محذوف ہیں، حضرت عمرؓ نے حاضرین سے کہا:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
قد غلبہ الوجع	تکلیف ہے۔

یعنی بہتر ہے، کہ اس وقت آپ کو تکلیف نہ دی جائے، پھر کہنے لگے:۔

وعندکم القرآن (بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم) اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے۔
(یعنی اس کی موجودگی میں آپ کو کیوں تکلیف دی جائے، بظاہر ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ قرآن کی موجودگی میں حدیث کی کیا ضرورت ہے، لہٰذا حضرت عمر رضؓ یا تو لوگوں کے اعتراض پر یا خود بخود چونکے، اور کہنے لگے "حسبنا کتاب اللّٰہ" ہمارے پاس اللہ کی شریعت ہے، وہ ہمارے لئے کافی ہے (کیونکہ کتاب اللہ میں قرآن اور حدیث دونوں شامل ہیں، اور حضرت عمر رضؓ اسی کے قائل تھے، جیسا کہ حدیث رجم میں اوپر گذر چکا ہے لہٰذا حضرت عمر رضؓ نے اپنے جملہ کو صحیح کر لیا) حدیث میں حضرت عمر رضؓ کے دو جملے متصل بیان ہوئے ہیں، ایک "تمہارے پاس قرآن ہے" دوسرے "ہمارے پاس کتاب اللہ ہے، وہ ہمارے لئے کافی ہے" اگر یہ دونوں جملے حضرت عمر رضؓ نے یکے بعد دیگرے کہے تھے، تو عبارت میں بڑا نقص پیدا ہو جائے گا، پہلے جملہ میں ضمیر مخاطب، دوسرے میں ضمیر متکلم، پھر دونوں جملے مل کر عجیب اور بے جوڑ سی عبارت پیدا کرتے ہیں، لہٰذا لازمی ہے کہ دونوں جملے یہ یک وقت نہ کہے گئے ہوں، بلکہ کچھ وقفہ کے بعد، اور یہ اسی وقت ممکن ہے، کہ یا تو وہ خود بخود سمجھ گئے ہوں، کہ پہلا جملہ محل اعتراض ہے، یا کسی نے اعتراض کیا ہو، جیسا کہ اسی حدیث میں ہے، کہ حضرت عمر رضؓ کے الفاظ پر کافی اختلاف ہوا، غرض یہ کہ وجہ کوئی بھی ہو، انہوں نے اپنے جملہ کی تصحیح کر لی، پھر جب قرآن کا نام لیا تو اس کے ساتھ "کافی" کا لفظ استعمال نہیں کیا، لیکن جب کتاب اللہ کہا، تو کافی ہونے کی صراحت کر دی، حضرت عمر رضؓ کے ان الفاظ پر بھی کافی اختلاف ہوا، لوگ خاموش نہیں ہوئے، بلکہ

فاختلفوا وکثر اللغط فمنہم من — یعنی اختلاف رائے ہوا اور بہت شور ہونے
یقول قربوا یکتب لکم کتابا ومنہم من — لگا۔ بعض کہنے لگے کہ قلم دوات لے ہی آؤ تاکہ
یقول غیر ذلک — آپ وصیت تحریر کر دیں بعض اس کے علاوہ کوئی

(یعنی اس وقت ہی ایسی کیا ضرورت ہے، کہ آپ کو تکلیف دی جائے، یا یہ کہ شریعت الٰہیہ کی تکمیل کے بعد اب وصیت تحریر کرانے کی ضرورت ہی کیا ہے، غرض یہ کہ مختلف باتیں کہی گئی ہوں گی، جن کو حضرت ابن عباس نے نظر انداز کر دیا) حدیث کے آئندہ آنے والے الفاظ اس بات کے متقاضی ہیں، کہ لوگ تحریر کے کام کو ملتوی کرانا چاہتے تھے، تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو، جب فوری تحریر کی موافقت کرنے والوں نے اصرار کیا، تو اس کو ملتوی کرنے والوں نے دریافت کیا۔ "فقالوا ما شانہ اھجر، استفھموہ (آخر اسی وقت لکھوانا کیوں ضروری ہے) آخر آپ کا کیا حال ہے؟ کیا آپ دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں؟ آپ ہی سے پوچھ لو (یعنی اگر آپ وفات پانے والے ہیں، تو خیر اسی وقت لکھوا لیا جائے، ورنہ پھر دیکھا جائے گا) غرض یہ کہ سب اس بات پر متفق ہو گئے، کہ آپ سے دریافت کیا جائے" فذھبوا یردون

عنہ" یعنی لوگ آپ سے پوچھنے لگے، یا آپ کے سامنے اس سوال کو پیش کرنے لگے اس سے ثابت ہوا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلم دوات لانے کا حکم احتیاطاً اور مشورۃً دیا تھا اگر یہ حکم ضروری ہوتا، تو ضرور آپ دوبارہ ارشاد فرماتے، اور صحابہ میں مشورہ اور اختلاف نہ ہوتا، حکم دے کر آپ نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی، بلکہ جب خود صحابہ کرام نے بار بار پوچھا، تو فرمایا "دعونی" رہنے دو (ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے) بلکہ اس وقت تو تم مجھے اپنی طرف متوجہ بھی مت کرو، آپ کے الفاظ یہ ہیں:۔

فالذی انا فیہ خیر مما تدعونی	کیونکہ میں جس حالت میں ہوں وہ اس حالت سے
الیہ	بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو۔

(یعنی جو قرب الٰہی اس وقت مجھے حاصل ہے، وہ میرے لئے تمہاری طرف متوجہ ہونے سے بہتر ہے، رہ گیا وصیت تحریر کرانا، تو زبانی ہی سن لو "اوصاھم بثلاث" پھر آپ نے صحابہ کو تین وصیتیں کیں پھر فرمایا:۔

قوموا عنی ولا ینبغی عندی التنازع	اچھا اب میرے پاس سے چلے جاؤ اور یاد رکھو
(صحیح بخاری)	کہ میرے پاس تم کو اتنا شدید اختلاف نہیں کرنا چاہیے

دو شبہے اور ان کا ازالہ

(۱) مندرجہ بالا تشریح میں، میں نے "لن تضلوا بعدہ" کے معنی کئے ہیں، کہ اس کے بعد تم ہرگز نہ بھولو گے" حالانکہ عام طور پر "تضلوا" کے معنی گمراہ ہونے کے کئے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:۔

فاستشھدوا شھیدین من رجالکم	یعنی لین دین کے معاملہ میں تحریر کرتے وقت۔
فان لم یکونا رجلین فرجل وامرأتان	مسلمان مردوں میں سے دو گواہ کر لیا کرو اگر دو مرد
ممن ترضون من الشھداء ان تضل	نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے
احدھما فتذکر احداھما الاخری	جن پر تم راضی ہو۔ گواہ کر لیا کرو۔ اس لئے کہ اگر ایک
(البقرہ)	عورت بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔

آیت مذکورہ میں "تضل" کے معنی بھولنے کے کئے جاتے ہیں، اس لئے کہ اس جگہ یہی مناسب ہیں، اسی طرح حدیث زیر بحث میں بھی بھول ہی کے معنی مناسب ہیں، کیونکہ مکمل شریعت کی موجودگی میں گمراہی کے معنی مناسب نہیں، ہاں بعض احکام کو بھولا جا سکتا ہے، اسی بنا پر تحریر کرنے کا آپ نے ذکر فرمایا، اگرچہ لکھوانا لازماً مقصود تو نہیں تھا، لیکن اس واقعہ سے ان وصایا کی اہمیت کو جتانا مقصود تھا، اور اس طرح ان کی حفاظت مقصود تھی، آیت اور حدیث میں ایک اور مناسبت بھی ہے، وہ یہ کہ دونوں جگہ تحریر کے ذکر میں لفظ "ضلالت" کا استعمال ہوا ہے، تحریر کا مقصد محض بھول کے دفعیہ کے لئے ہے لہٰذا "ضلالت" کے معنی

بھول جانا ہی ہر دو جگہ مناسب ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ ہیں نے کتاب اللہ کے معنیٰ اللہ کی شریعت کے کئے ہیں حالانکہ عام طور سے کتاب اللہ سے قرآن مجید مراد لیا جاتا ہے، اس کی کئی وجہیں ہیں:۔

وجہ اول۔ خود اسی حدیث میں حضرت عمرؓ نے پہلے حسبنا کو القرآن کہا تھا، پھر حسبنا کتاب اللہ کہا، اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے، کہ حضرت عمرؓ پہلے جملہ کو محل اعتراض سمجھے تھے، اسی لئے قرآن کی جگہ کتاب اللہ کر دیا، تاکہ شبہ پیدا نہ ہو۔

وجہ دوم:۔ خود حضرت عمرؓ نے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، حدیث رجم کو کتاب اللہ کہا ہے۔

وجہ سوم:۔ حضرت عمرؓ کی ساری زندگی اس بات کی شہادت دیتی ہے، کہ وہ قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی حجت سمجھتے تھے، لہٰذا "حسبنا کتاب اللہ" سے صرف قرآن مراد لینا، خود متکلم یعنی حضرت عمرؓ کی منشار کے خلاف ہے۔

حدیث کو کتاب اللہ کہا جاتا ہے حدیث کو کتاب اللہ کہنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے، صرف ایک حدیث اس کے ثبوت میں درج کی جاتی ہے، ملاحظہ فرمایئے:۔

دو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فیصلہ کے لئے حاضر ہوئے۔

فقال احدھما اقض بیننا بکتاب اللہ	ایک نے کہا کتاب اللہ سے ہمارا فیصلہ کیجئے
وقال الاخر اجل یا رسول اللہ فاقض بیننا بکتاب اللہ	دوسرے نے کہا ہاں، یا رسول اللہ کتاب اللہ سے ہمارا فیصلہ کیجئے۔

مقدمہ سننے کے بعد آپ نے فرمایا:۔

اما والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما بکتاب اللہ	یعنی قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ضرور تمہارا فیصلہ کتاب اللہ سے کرونگا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:۔

اما ابنک فعلیہ جلد مائۃ وتغریب عام واما انت یا انیس فاغد علی امراۃ فان اعترفت فارجمھا فاعترفت فرجمھا (صحیح بخاری وصحیح مسلم)	یعنی آپ نے زنا کرنے والے کے باپ سے کہا کہ تیرے بیٹے کو سو درے لگائیں جائیں گے اور ایک سال کے لئے جلاوطن کیا جائے گا اور اے انیس تم اس عورت کے پاس جاؤ، اگر وہ زنا کا اقرار کرے تو اس کو رجم کر دو اس

غلام انیس انیس کا نام اور آپ کا اونٹ

پہ حصہ جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہے، قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے پس ثابت ہوا، کہ کتاب اللہ سے مراد یہاں حدیث ہے۔

کتاب اللہ کا اطلاق نہ صرف قرآن اور نہ صرف حدیث بلکہ پوری شریعت پر بھی ہوتا ہے، اور یہ بات خود قرآن مجید سے ثابت ہے، ارشاد باری ہے :-

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ	یعنی یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کا بنایا ہوا نہیں ہے
دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ	بلکہ یہ قرآن پاک پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور کتاب کی
يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ	تفصیل کرتا ہے جس کے رب العالمین کی طرف سے
مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس)	ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اس آیت میں اگر کتاب سے قرآن مراد لیا جائے، تو معنی یہ ہوں گے، کہ قرآن قرآن کی تفصیل کرتا ہے اور یہ کسی طرح صحیح نہیں صحیح معنی یہیں کہ شریعت کی تفصیل کرتا ہے، احکام شریعت کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتا ہے اس آیت سے ثابت ہوا کہ کتاب اللہ کے معنی شریعت الٰہیہ کے بھی ہیں، اور جب قرآن و حدیث، اور حضرت عمرؓ کے قول سے یہ ثابت ہو چکا کہ حدیث بھی کتاب اللہ ہے، تو پھر حسبنا کتاب اللہ" سے حدیث کی مخالفت ایک لایعنی مشغلہ ہے

یہاں تک صحابہ کرام کے حدیث جمع نہ کرنے کی پہلی مفروضہ وجہ کا جواب تھا اب دوسری وجہ سنیئے اور جواب ملاحظہ فرمایئے :-

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"دوم، حضور نے حدیث لکھنے سے روک دیا تھا ابی سعید خدری سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قرآن کے بغیر (صحیح لفظ علاوہ ہے نہ کہ بغیر، برقؔ) میرا کوئی اور قول قلمبند نہ کرو اور اگر کوئی شخص ایسا کوئی قول لکھ چکا ہو، تو اسے مٹا دے" صحیح مسلم" (دو اسلام ص ۳۹)

جواب برق صاحب نے خود ہی اس ممانعت کی دو وجہیں لکھی ہیں، وہ فرماتے ہیں " اول کہ کہیں غلطی سے احادیث قرآن کے متن میں شامل نہ ہو جائیں " اور درحقیقت یہی اس کی اصل وجہ ہے۔ یہ وجہ ثابت اور صحیح ہے، برق صاحب نے جس حدیث کو اس سلسلہ میں نقل کیا ہے اس کا سیاق و سباق ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں :-

كنا قعودًا نكتب ما نسمع من النبي	یعنی ہم بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ رسول اللہ صلی
صلى الله عليه وسلم فقال ما هذا	اللہ علیہ وسلم سے سنتے تھے لکھتے جاتے تھے آپ
تكتبون فقلنا ما نسمع منك فقال	نے دریافت فرمایا، تم کیا لکھ رہے ہو، ہم نے عرض

أكتاب مع كتاب الله امحضوا كتاب الله واخلصوه (مسند احمد ج ۳ ص ۱۲) — کیا جو کچھ آپ سے سنتے ہیں لکھ لیتے ہیں آپ نے فرمایا کیا کتاب اللہ کے ساتھ کتاب لکھی جاتی ہے کتاب اللہ کو علیحدہ لکھو

اس حدیث سے ثابت ہوا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً حدیث لکھنے سے منع نہیں فرمایا تھا بلکہ قرآن کے ساتھ ساتھ لکھنے سے منع فرمایا تھا، اگر حدیث لکھی ہی نہ جائے، تو پھر آپ کا حکم "قرآن کو علیحدہ لکھو" بے معنی ہو جاتا ہے، اس ہی حدیث سے جس کا ایک حصہ برق صاحب نے نقل فرمایا تھا، ثابت ہوا کہ آپ نے حدیث لکھنے کی اجازت دی، مگر قرآن کے ساتھ لکھنے سے منع فرما دیا، لہٰذا یہ کہنا کہ اس حدیث کی وجہ سے صحابہ نے احادیث کو جمع نہیں کیا، صحیح نہیں، کیونکہ یہ تو جمع کرنے کی دلیل ہے، نہ کہ جمع نہ کرنے کی۔

(۲) اس کے بعد برق صاحب اس حکم امتناعی کی دوسری وجہ لکھتے ہیں:۔

غلط فہمی

"دوم۔ خود رسول کریم کی زندگی میں ان کے اقوال محرف ہو چکے تھے" (دو اسلام ص ۳۹)

جواب

یہ وجہ قطعاً صحیح نہیں، اولاً اس لئے کہ کسی روایت میں یہ منقول نہیں، کہ خود آپ کی زندگی میں آپ کی احادیث محرف ہو چکی تھیں۔

ثانیاً، پہلی وجہ جو اوپر بیان ہوئی، وہ صحیح ہے، لہٰذا یہ وجہ باطل ہے۔

ثالثاً۔ یہ وجہ عقلاً بھی محال ہے، کسی شخص کے اقوال میں تحریف یا اختلاف اس وقت رونما ہوتا ہے جب وہ موجود نہ ہو، اور جب وہ موجود ہو، تو تحریف کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا، اس لئے کہ یہ فوراً گرفت میں آنے والی بات ہے، اور کہنے والا خود اس کی تکذیب کر سکتا ہے، اور جب ہاتھ میں حکومت ہو، تو پھر سزا بھی دے سکتا ہے، اسی طرح اختلاف لفظی یا معنوی کا وقوع بھی محال ہے، اور اگر بالفرض محال ایسا ہو بھی جائے، تو اس اختلاف کو فوراً رفع بھی کیا جا سکتا ہے، غرضیکہ قائل کی زندگی میں اس کے قول کے مفہوم میں جو اختلاف پیدا ہوگا، وہ عارضی ہوگا، دائمی نہیں، لہٰذا برق صاحب کا یہ کہنا، کہ خود آپ کی زندگی میں آپ کے اقوال محرف ہو چکے تھے، عقلاً و نقلاً کسی طرح صحیح نہیں۔

اس کے بعد برق صاحب لکھتے ہیں:۔

غلط فہمی

"فرض کرو ایک محفل میں چھ آدمی گھنٹہ بھر گفتگو کرتے رہے، کیا یہ ممکن ہے، کہ اختتام مجلس تک وہ تمام گفتگو بالفاظہ دہرا سکیں، ناممکن ہے" (دو اسلام ص ۳۹)

جواب

برق صاحب جو چیز آپ کے لئے ناممکن ہے، ضروری نہیں کہ وہ ہر شخص کے لئے ناممکن ہو، اسلامی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں، کہ ایک دفعہ کتاب پڑھی اور پوری کتاب یاد ہو گئی

مثلاً امام شافعی، امام بخاری، امام ابن تیمیہ وغیرہ، محدثین کے حافظہ کے متعدد واقعات ہیں، بخوف طوالت نظر انداز کر رہا ہوں، براہ کرم اپنے حافظہ کے پیمانہ سے دوسرے لوگوں کے حافظہ کی پیمائش مت کیجئے پھر عام گفتگو کو درس وتدریس سے کیا نسبت! درس وتدریس میں سننے والا اسی لئے ہے، کہ اس کو محفوظ رکھے، پھر عام درس وتدریس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ سے کیا نسبت! صحابہ کرام بڑے شوق سے ارشادات نبوی کو سنتے تھے، بلکہ عورتیں تک درخواست کرتی تھیں، کہ ہمارے لئے بھی کوئی دن مقرر کر دیا جائے، اور ان کی درخواست پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دن مقرر کر دیئے تھے (بخاری کتاب العلم)

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر خاموش رہا کرتے تھے، بلا ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے تھے (رحمۃ للعالمین جلد اول ص۳۵۱) پھر صحابہ کرام آپ سے سوال بھی نہیں کرتے تھے اس لئے کہ قرآن میں اس کی ممانعت تھی، حضرت انس رضہ کہتے ہیں، ہم کو قرآن میں سوال کرنے سے منع کر دیا گیا تھا، لہٰذا ہم اس بات کے منتظر رہتے تھے، کہ کوئی سمجھدار دیہاتی آکر سوال کرے (بخاری کتاب العلم) ایسے حالات میں ارشادات کی قلت ہوگی، اور جتنی قلت ہوگی، اتنی ہی حفاظت زیادہ ہوگی، پھر صحابہ کرام نے آپ کے ارشادات کے جستہ جستہ فقرے بیان کئے ہیں، نہ کہ مسلسل ڈھائی گھنٹہ کی تقریر، اور جستہ جستہ اہم فقروں کا یاد کر لینا کیا مشکل ہے، پھر مسائل کی نوعیت اور بھی مختلف ہے، اس لئے کہ مسئلہ سنتے ہی یاد ہو جاتا ہے، پھر اگر کسی سائل کے جواب میں بیان کیا جائے، تو کم از کم سائل کو تو وہ حفظ ہو ہی جائے گا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طویل تقریر کے عادی نہیں تھے، متوسط قسم کا خطبہ دیا کرتے تھے (صحیح مسلم) الفاظ ایسی ترتیب سے ادا فرمایا کرتے تھے، کہ سننے والا چاہے، تو الفاظ شمار کر سکتا تھا (رحمۃ للعالمین جلد ۱ ص۱۳۵ بحوالہ زاد المعاد) پھر اکثر اوقات ایک ایک بات کو تین تین مرتبہ دہرایا کرتے تھے (صحیح بخاری کتاب العلم) بھلا ان حالات میں ایک مخلص دین سیکھنے والے کے لئے کیا مشکل ہے، کہ وہ ارشادات عالیہ کو حفظ کر سکے، یہ ایک فطری چیز ہے اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "ایک واقعہ کو پچاس آدمی دیکھتے ہیں، اگر آپ ان کے پاس علیحدہ علیحدہ جا کر اس واقعہ کی تفصیل قلمبند کریں، تو آپ کو ان تفاصیل میں کافی اختلافات نظر آئیں گے" (دو اسلام ص۳۹)

جواب بات یہاں یہ نہیں ہے، جو برق صاحب نے لکھی ہے، یہاں تو یہ بات ہے کہ حدیث کو پچاس آدمی سنتے ہیں، اور پچاس کے پچاس ایک ہی مفہوم روایت کرتے ہیں، اور اگر بالفرض محال ایک

دو آدمی غلطی کر بھی جائیں، تو اکثریت کے مقابلہ میں ان کی بات ناقابل رد ہو گی

غلط فہمی پھر برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر چھ ماہ یا سال بھر بعد انہی لوگوں کے پاس جا کر اسی واقعہ کی تفصیل دوبارہ قلم بند کریں، تو اختلاف اور نمایاں ہو گا" (دو اسلام ص۴۲)

جواب حدیث کے سلسلہ میں یہ بات بھی صحیح نہیں، اس کی آزمائش بھی ہو چکی ہے سال سال بھر بعد ان سے بغیر ان کے علم کے ان کی بیان کردہ احادیث کو دہروایا گیا، اور سرمو فرق نہیں آیا برق صاحب علم حدیث کا مطالعہ کیجیئے، محدثین کے حالات کو غور سے پڑھیئے، پھر برق صاحب احادیث کو واقعات سے تشبیہ دینا بھی تو صحیح نہیں، احادیث مسائل ہیں، اور مسائل کا یاد کر لینا، اور ان کے بیان پر متفق ہونا کوئی مشکل نہیں، اگر کسی حدیث میں کوئی واقعہ بھی مذکور ہو، تو واقعہ اصل چیز نہ ہو گی، بلکہ وہ مسئلہ جو اس واقعہ کے اختتام پر بصورت حدیث واقع ہو گا، اصل چیز ہو گی، اور صرف اس مسئلہ کی حفاظت کافی ہو گی، نہ کہ پورے واقعہ کی، واقعہ کی نوعیت بالکل شان نزول کی سی ہو گی، جس طرح شان نزول کی عدم حفاظت سے آیات قرآنی مشکوک نہیں ہوتیں، اسی طرح اگر کسی واقعہ کی تفصیل پوری طرح محفوظ نہ ہو، تو اصل مسئلہ مشکوک نہ ہو گا۔

غلط فہمی پھر برق صاحب فرماتے ہیں۔

"مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ تفاصیل یوں بدلتی جائیں گی کہ ان کا تعلق حقیقت سے بالکل منقطع ہو جائے گا" (دو اسلام ص۴۲)

جواب حدیث کے سلسلہ میں یہ بھی غلط ہے، صحابہ کرام اور بعد کے محدثین نے احادیث قلم بند کر لی تھیں، ان پر عمل کرتے تھے، مذاکرہ کرتے تھے، درس و تدریس جاری تھا، لہٰذا تفصیل کا بدلنا ناممکن ہے، اور اگر بالفرض محال بدل بھی جائے، تو وہ مضطرب المتن کہلائیں گی، اور ضعیف سمجھی جائینگی لیکن اس ضعیف کی وجہ سے جو صحیح ہوں گی، ان پر اس ضعف کا کیا اثر پڑے گا، ضعیف کو رد کیا جائے گا نہ کہ صحیح کو، برق صاحب پھر گذارش کرتا ہوں، کہ فنون حدیث کا گہرا مطالعہ کیجیئے گا، جب کوئی حدیث محدثین کے نزدیک صحیح ہوتی ہے، تو وہ ان تمام شکوک سے بالاتر ہوتی ہے، جو آپ وارد کر رہے ہیں، بلکہ ان سے بہت زیادہ معیاروں اور مزعومہ شکوک کو عبور کرتی ہوئی درجہ صحت کو پہنچتی ہے۔

مزید غلط فہمی اور اس کا ازالہ پھر برق صاحب نے مسٹر محمد علی جناح کی تقاریر کی مثال دی ہے یہ مثال بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادات اور ایک لیڈر کے اقوال میں زمین و آسمان کا فرق ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک لفظ بیش قیمت قانون اور شریعت اسلامیہ کا ماخذ ہے، علم و عمل کا سرمایہ، اور توشہ آخرت ہے، لیڈر کے اقوال کو یہ اہمیت حاصل نہیں، پھر کہاں تین تین گھنٹہ کی تقریر اور کہاں معلم کتاب و حکمت، مزکی و مدبر کی تعلیم، درس و تدریس، دونوں میں بعد المشرقین ہے، نبی کی بات اس لئے سنی جاتی ہے، کہ یاد رکھی جائے، عمل کیا جائے عمل کرایا جائے، لیڈر کی بات کو محض دماغی عیاشی کے لئے سنا جاتا ہے اور الا ماشاء اللہ کوئی اس سے فیض حاصل نہیں کرتا، نہ وہ حفظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، پھر نبی کی مجلس ایک تربیت گاہ ہوتی ہے، جہاں صبح و شام، بلکہ ہر وقت ہر شخص کے اعمال و اقوال پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے، اس کو مبلغ بنایا جاتا ہے، اور دیگر مقامات پر بھی بھیجا جاتا ہے، لیڈر کی تقریر میں لفاظی اور سحر بیانی ہوتی ہے، وہ جذبات سے کھیلتا ہوا کچھ کا کچھ کہتا چلا جاتا ہے، اس کے بعض بیان اور بعض مفرد ضے بالکل سیاسی حربے ہوتے ہیں، برخلاف اس کے نبی کی ہر بات حقائق پر مبنی ہوتی ہے، وہاں نہ لفاظی ہوتی ہے نہ سحر بیانی، وہ جستہ اور جامع فقرے استعمال کرتا ہے، جو قلوب میں پیوست ہو جاتے ہیں اور جوارح سے عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، بھلا کہاں لیڈر اور کہاں نبی، برق صاحب کچھ تو غور کر کے لکھا ہوتا۔

غلط فہمی پھر برق صاحب لکھتے ہیں، کہ:-

"حضرت فاروق کے زمانہ میں عراق کا قرآن حجاز سے مختلف ہو گیا تھا .... حضرت فاروق نے اس کا علاج یہ کیا کہ قرآن کے کافی نسخے لکھوا کر قلمرو کے مختلف حصوں میں بھیجدیئے" (دو اسلام صفحہ ۔)

جواب اس واقعہ کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف صحیح نہیں، صحیح بخاری میں ہے، کہ یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں پیش آیا تھا، حضرت انسؓ کے الفاظ ہیں "افزع حذیفۃ اختلافھم فی القرأۃ" یعنی حضرت حذیفہؓ کو لوگوں کے قرأت میں اختلاف کرنے سے اندیشہ ہوا، پھر حضرت انس فرماتے ہیں "ان حذیفۃ بن الیمان قدم علی عثمان" یعنی حضرت حذیفہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے، اور اس اندیشہ کا اظہار کیا، انہوں نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے قرآن شریف منگو لیا، اور نقلیں کرا کے مختلف ممالک کو روانہ فرمائیں، حضرت عثمانؓ نے حکم دیا تھا "اکتبوہ بلسان قریش" یعنے قرآن کو قریش کی زبان میں لکھا جائے، غرض یہ کہ اختلافِ لب و لہجہ اور اس کی وجہ سے بعض مقامات پر رسم الخط میں اختلاف کا جو اندیشہ تھا، اس کا سدباب حضرت عمرؓ نے نہیں کیا تھا، بلکہ حضرت عثمانؓ نے کیا تھا۔

اسی سلسلہ میں برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

غلط فہمی "صحابہ کرام عشق خدا میں ڈوبے ہوئے تھے ..... اگر ان عاشقان خدا کو قرآن کی آیات بھول گئی تھیں، تو حدیث کے بھولنے پر انہیں کون ملامت کر سکتا ہے" (دو اسلام ص۱۱۰)

جواب صحابہ رض کا قرآن کی آیات بھلا دینا خلاف واقعہ ہے، اور صحیح نہیں معلوم نہیں برق صاحب کس حوالہ سے ایسا لکھ رہے ہیں، اختلاف لب و لہجہ اور چیز ہے، اور بھلا دینا اور چیز ہے، پھر وہ آیت زیر بحث میں جو اختلاف مذکور ہے، وہ صحابہ کے متعلق نہیں ہے، بلکہ عام لوگوں کا اختلاف مراد ہے، برق صاحب کو غلط فہمی ہو گئی، صحابہ نہ آیات بھولے نہ احادیث، اگر انفرادی طور پر بھول ہو بھی جائے، تو اکثریت کے مقابلہ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں، احادیث کے سلسلہ میں انفرادی بھول کا تدارک کر لیا گیا ہے۔

اس کے بعد برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

غلط فہمی "حضور کا مقصد بھی یہی تھا، کہ قرآن حکیم کے بغیر کوئی اور کتاب ہدایت باقی نہ رہے" (دو اسلام ص۱۱۱)

جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ مقصد نہیں تھا نہ اس کا آپ نے کوئی ثبوت دیا، بلکہ اس کے خلاف ثبوت ملتا ہے، سنیئے :۔

(۱) عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی خطبۃ حجۃ الوداع ..... ایھا الناس انی قد ترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا ابداً کتاب اللہ وسنۃ نبیہ (مستدرک حاکم ج۱ ص۹۳)	یعنی ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا اے لوگو! میں تم میں ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر اس کو پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت۔
(۲) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی قد ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما کتاب اللہ وسنتی (مستدرک حاکم ج۱ ص۹۳)	یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ان کے ہوتے ہوئے تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے اللہ کی کتاب اور میری سنت۔
عن مقدام عن رسول اللہ صلی اللہ	یعنی مقدام کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علیہ وسلم انہ قال الا انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ الا لا یحل لکم الحمار الاھلی (ابوداؤد، کتاب السنۃ)	نے فرمایا مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اسی کے مثل ایک اور بھی چیز دی گئی ہے خبردار عنقریب ایک پیٹ بھرا شخص چھپر کھٹ پر بیٹھ کر کہے گا کہ بس قرآن کو لازم سمجھو۔ جو اس میں حلال ہے اس کو حلال مانو۔ اور جو اس میں حرام ہے اس کو حرام مانو۔ خبردار تمہارے لئے شہری گدھا حلال نہیں.....

بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا تھا۔

الا وان ماحرم رسول اللہ مثل ما حرم اللہ (ابن ماجہ جلد اول باب تعظیم حدیث)	خبردار جو چیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کی وہ اللہ کی حرام کردہ چیز کے مثل ہے۔

حضرت ابورافع کہتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

(۴) لا الفین احدکم متکئا علی اریکتہ یاتیہ الامر من امری مما امرت بہ او نھیت عنہ فیقول لا ندری ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ (ابوداؤد، جلد ۲۔ کتاب السنۃ)	یعنی میں تم سے کسی کو نہ پاؤں کہ اپنے چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو۔ جب میرا کوئی حکم اس کو پہنچے یا میری ممانعت اس کو پہنچے تو وہ کہے ہم نہیں جانتے ہم تو جو کچھ کتاب اللہ تعالےٰ میں ہے اسی کا ہی اتباع کرتے ہیں۔

عرباض بن ساریہ کہتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

(۵) ایحسب احدکم متکئا علی اریکتہ یظن ان اللہ لم یحرم شیئا الا ما فی ھذا القرآن الا وانی واللہ قد امرت ووعظت ونھیت عن اشیاء انھا لمثل القرآن او اکثر وان اللہ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن (ابوداؤد مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)	کیا تم میں کوئی شخص چھپر کھٹ پر تکیہ لگائے ہوئے یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے کوئی چیز حرام نہیں کی سوائے اس کے جو قرآن پاک میں ہے اس ذات پاک کی قسم میں نے حکم دیئے ہیں اور نصیحت کی ہے۔ اور بہت سی چیزوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور یہ احکام تعداد میں قرآن حکیم کے مثل ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ.....

غلط فہمی برق صاحب اس سے آگے فرماتے ہیں "حضرت صدیق اور حضرت فاروق نے احادیث اس لئے جمع نہیں کیں کہ اقوال رسول میں تحریف ہو چکی تھی" (دو اسلام صفحہ ۴۲)

جواب برق صاحب اس جملہ کی تحریر کے وقت آپ نے کچھ غور بھی فرمایا، کہ آخر تحریف کرنے والے کون تھے، اس لئے کہ حضرت صدیق یا حضرت فاروق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی راوی تو تھا ہی نہیں پھر تحریف کرنے والے صدیق یا فاروق ہی ہو سکتے ہیں، اور اگر بالفرض محال چند حدیثیں ایسی ہوتیں جو دوسرے صحابی سے سنکر قلمبند کرتے، تو کیا اس صحابی نے تحریف کی تھی۔

غلط فہمی پھر برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"حضرت ابوبکر صدیق نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت صدیق کے مجموعے سے زیادہ قابل اعتماد اور کون سا مجموعہ ہو سکتا تھا، لیکن ایک صبح اٹھ کر اسے جلا دیا" (دو اسلام صفحہ ۴۲)

جواب برق صاحب کو اعتراف ہے، کہ یہ مجموعہ سب سے زیادہ قابل اعتماد تھا لیکن پھر بھی حضرت ابوبکر رضہ نے اسے جلا دیا، برق صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ کیوں جلا دیا، سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے، کہ برق صاحب کا منشا یہی ہے، کہ احادیث میں تحریف ہو چکی تھی لہذا حضرت صدیق اکبر اس کی صحت پر مطمئن نہیں تھے، لیکن یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے، کہ تحریف کرنے والے تھے کون؟ کیا پانچ سو احادیث بھی ایسی نہ تھیں، کہ وہ خود براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوں، کیا ان روایات میں کوئی سلسلہ اسانید تھا جس میں کذاب و وضاع راویوں کی بھرمار تھی؟ کیا حضرت صدیق کو صحابہ کرام میں کوئی صادق القول راوی دستیاب نہ ہو سکا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ برق صاحب کیسے اس بے سروپا خلاف قیاس و عقل روایت کو اپنے ثبوت میں پیش فرما رہے ہیں۔

(۲) یہ روایت جس طرح عقلاً باطل ہے، اسی طرح نقلاً بھی سرتاپا کذب اور جھوٹ ہے، اس کی سند میں دو راوی علی بن صالح اور مفضل مجہول ہیں، اور تیسرا راوی موسیٰ بن عبداللہ کذاب ہے۔ (برق اسلام صفحہ ۹۱-۹۲) برق صاحب کو بڑی غلط فہمی ہوئی، کہ ایسی جھوٹی روایت کو اپنے ثبوت میں پیش فرما دیا، واضح رہے، کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی حدیث کی کتاب کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔

غلط فہمی پھر برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"حضرت فاروق کے متعلق مذکور ہے، کہ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کا اسوہ لکھوانے کا ارادہ کیا، مہینہ بھر استخارہ کرتے رہے، اور پھر فرمایا، تم سے پہلے ایسی قومیں گذر چکی ہیں، جنہوں نے کتابیں لکھیں، اور خدائی کتاب کو چھوڑ کر انہی پر جھک پڑیں، خدا کی قسم میں قرآن کے راستے میں کسی اور کتاب کو قطعاً نہیں آنے دوں گا" (دو اسلام صفحہ ۴۲-۴۳)

حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کردہ قول کے آخری حصہ کے الفاظ یہ ہیں "واللہ لا اشوب

جواب کتاب اللہ بشئی ابداً" (دو اسلام صفحہ ۴۳) برق صاحب نے اس کا ترجمہ صحیح نہیں کیا صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ میں کتاب اللہ میں کسی قسم کی آمیزش نہیں کروں گا" اور اس کے تو سب ہی قائل ہیں، کہ متن قرآن میں ملاوٹ ممنوع ہے، بہر حال ترجمہ کچھ بھی ہو، یہ روایت ہی باطل ہے، سنداً غیر متصل اور منقطع ہے (برق اسلام صفحہ ۹۳) لہٰذا ایسی جھوٹی روایت سے مدعا ثابت نہیں ہو گا، یہاں کھرا سکہ چلتا ہے، کھوٹا سکہ نہیں چلتا۔

غلط فہمی پھر برق صاحب فرماتے ہیں :۔

"جب حضرت صدیق مسند خلافت پر جلوہ آرا ہوئے، تو آپ نے ایک دن ایک مجمع عام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا" تم لوگ آج احادیث میں اختلاف رکھتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ آئندہ یہ اختلاف بڑھتا جائے گا، اس لئے تم آنحضرتؐ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو، اور اگر کوئی پوچھے، تو کہو، کہ ہمارے پاس قرآن ہے، جو اس نے جائز قرار دیا ہے، اسے جائز، اور جسے ناجائز قرار دیا ہے، اسے ناجائز سمجھو" (دو اسلام صفحہ ۴۳)

جواب برق صاحب یہ روایت بھی جھوٹی ہے، اس کی سند منقطع ہے متصل نہیں، توجیہ النظر میں ہے واما لروایۃ عن ابی بکرؓ فمن قطعۃ لا تصلح" یعنی اس روایت کا سلسلہ سند منقطع ہے، لہٰذا صحیح نہیں (برق اسلام صفحہ ۳۱) برق صاحب ایسی ضعیف روایتیں آپ کیوں پیش فرماتے ہیں، دیکھئے حضرت ابوبکر صدیق سے تو صحیح سند سے یہ مروی ہے، جو درج ذیل ہے حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں۔

لست تارکا شیئا کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعمل بہ الا عملت بہ فانی اخشی ان ترکت شیئا من امرہ	یعنی میں ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑ سکتا جو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے تحقیق میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں کوئی چیز بھی آپ کے

ان ازیغ (صحیح بخاری کتاب الجہاد) قول فعل میں سے چھوڑ دوں گا تو گمراہ ہو جاؤں گا۔

اور وہ چھوڑ بھی کیسے سکتے تھے، جب کہ وہ سمجھتے تھے، کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہ اللہ کا فرمان ہے۔ حضرت ابوبکر اپنی کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذہ	بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ زکوٰۃ کے یہ وہ فرائض ہیں
فریضۃ الصدقۃ التی فرض رسول	جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المسلمین	پر فرض کیا ہے اور اسی کا اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول
والتی امر اللہ بھا رسولہ فمن سئلھا	صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے پس جس سے اس
من المسلمین علی وجھھا فلیعطھا	کے مطابق مانگا جائے تو اسے دے دینا چاہیے اور
ومن سئل فوقھا فلا یعط	جو اس سے زیادہ مانگا جائے تو نہ دے۔

(صحیح بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ)

یہ ہے حضرت ابوبکرؓ صدیق کی کتاب کا تمہیدی بیان۔ اس کے بعد حضرت صدیق اکبر نے فرائض بیان کئے ہیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس تمہیدی بیان سے ثابت ہوا، کہ:۔

(۱) جو کچھ حدیث میں ہے، اسی کے موافق عمل کیا جائے۔

(۲) جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض کیا ہے، وہ من جانب اللہ فرض ہے، گویا حدیث بھی من جانب اللہ نازل ہوئی ہے۔

(۳) اگر کوئی حاکم حدیث کی مقرر کردہ شرح سے زیادہ مانگے، تو نہ دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرح کو اپنی رعایا پر فرض نہیں فرمایا، بلکہ مسلمانوں پر مقرر فرمایا ہے یعنی حدیث کے احکام وقتی نہیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ میں بھی اس کو نافذ کیا، اور آیندہ کے لئے بھی ہدایت چھوڑ گئے کہ اس سے زیادہ مانگا جائے، تو نہ دیا جائے، یعنی حاکم وقت مختار نہیں ہے، کہ اس میں حالات زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی کر سکے۔ یہ ہیں ابوبکر صدیقؓ، اور یہ ہے ان کا بیان ان کی اپنی کتاب میں۔

غلط فہمی اس کے آگے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ حضرت فاروق نے تمام صحابہ سے فرمایا، کہ گھر جاؤ اور احادیث کا تمام ذخیرہ اٹھا لاؤ جب یہ ذخیرہ جمع ہو گیا، تو آپ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے جلا دیا" (دو اسلام ص۱۲۳-۱۲۴)

جواب یہ روایت بھی منقطع ہے متصل نہیں (برق اسلام ص۹۵) یہ روایت نہ سنداً صحیح ہے، اور نہ عقلاً، سنداً اس لئے کہ منقطع ہے، عقلاً اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے خود حدیث کی کتاب

لکھوائی جو ان کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی، امام مالک نے اس کتاب کو خود پڑھا تھا (موطا امام مالک) حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس کی نقل کرا کر اس پر عمل کرایا تھا (دار قطنی) اس کتاب کا مفصل حال اوپر گذر چکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں، پھر حضرت عمرؓ کے علاوہ اور صحابہ کے پاس بھی کتابیں تھیں، ان کا تذکرہ بھی اوپر گذر چکا ہے، یہ کتابیں ان کی اولاد کے پاس باقی رہیں، حضرت عبداللہ بن عمرو کی کتاب صادقہ بڑی مشہور و معروف کتاب ہے، جو ان کے پڑپوتے پڑھایا کرتے تھے، تفصیل کے لئے گذشتہ صفحات ملاحظہ ہوں، اگر سب کتابیں جلا دی گئی تھیں، تو یہ کتابیں کہاں سے آگئیں، حضرت علی تو اپنی خلافت کے زمانہ میں اپنی کتاب کا مظاہرہ مجمع عام میں فرمایا کرتے تھے، اس کا مضمون سنایا کرتے تھے (صحیح بخاری) لہٰذا یہ جلانے کی روایت کسی دشمن اسلام کی گھڑی ہوئی ہے، حضرت صدیق اور حضرت فاروق اور دیگر صحابہ ہی کی یہ کتابیں ہیں، جن کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں جمع کر دیا، اور برق صاحب کے الفاظ میں ہم سب نے مل کر نعرہ لگایا :-

ھذا اصح الکتب بعد کتاب اللہ (دو اسلام ص۳۲) یعنی قرآن کریم کے بعد صحیح بخاری صحیح ترین کتاب ہے

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"وہ صحابہ جن کی دیانت اور سچائی پر کچھ بھروسہ کیا جا سکتا تھا، فوت ہو چکے تھے، اور بعد میں آگئے تھے ہم جیسے لوگ، امام حسین کے قاتل، حضرت علی کے باغی، کعبہ ڈھا دینے والے، حاکم شرابی امراء راشی، غنی عیاش، فقیر پست کردار، کیا ایسے ماحول (امیہ کا دور) میں کسی حدیث کا اپنی اصلی حالت میں رہنا ممکن تھا" (دو اسلام ص۴۴-۴۵)۔

جواب برق صاحب کا خیال ہے، کہ محدثین یہی لوگ تھے، افسوس! نہ محدثین کا ان لوگوں سے کوئی تعلق تھا، نہ وہ ان کی روایتوں کو قابل اعتماد سمجھتے تھے، اگر کوئی راوی کسی روایت میں آ بھی گیا، تو اس روایت سے بیزاری کا اظہار کیا گیا، اسے منکر کہا گیا، پھر برق صاحب نے خلافت بنوامیہ کا جو نقشہ کھینچا ہے، سرتاپا لغو ہے، سنداً بالکل نامعتبر ہے، اس کی حیثیت محض سیاسی فریب سے زیادہ نہیں جو بنوامیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے وضع کیا گیا تھا، برق صاحب کچھ تو تحقیق کر لیا ہوتا، اس سلسلہ میں محمود احمد عباسی صاحب کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" ملاحظہ فرمائیں، پھر برق صاحب کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں، کہ بنی امیہ کا دور صحابہ کے فوت ہو جانے کے بعد شروع ہوا، بلکہ حقیقت یہ ہے، کہ خلافت بنوامیہ کا اکثر دور صحابہ کے زمانہ میں گذرا۔

اعتراض :- برق صاحب فرماتے ہیں :-

"بعض صحابہ سے بھی اخلاقی لغزشیں سرزد ہوتی رہتی تھیں، بخاری میں مذکور ہے، کہ ایک صحابی روزے کی حالت میں جماع کر بیٹھے تھے" (دو اسلام ص۵۱)

جواب برق صاحب لغزش اور چیز ہے، اور قصداً جھوٹ بولنا اور چیز ہے، لغزش ایک ہنگامی چیز ہوتی ہے، اور ایسے وقت سرزد ہوتی ہے، کہ دل و دماغ ساتھ نہیں دیتا، عقل بے کار ہو جاتی ہے لیکن جھوٹ بولتے وقت کسی ایسی چیز کا غلبہ نہیں ہوتا، پھر لغزش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا کرنے سے کیا نسبت! کسی صحابی پر اس قسم کی تہمت نہیں ہے، نہ ایسا ہوا، نہ ایسا ہو سکنا قرین قیاس ہے، پھر دو ایک صحابہ کی منفرد لغزش سے تمام صحابہ کیسے ناقابل اعتماد ہو گئے

اعتراض برق صاحب لکھتے ہیں :-

"وفات رسول کے بعد بعض مرتد ہو گئے اور بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا" (دو اسلام ص۵۲)

جواب برق صاحب! یہ صحابہ نہیں تھے، بلکہ عہد رسالت کے وہ مسلمان تھے، جنہوں نے فتوحات اسلامی سے خائف ہو کر کلمہ پڑھ لیا تھا، اور ابھی ایمان نے قلوب میں جگہ نہیں پکڑی تھی، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور یہ مال کے بندے دوسری طرف جھک گئے، ان لوگوں کو حضور کی صحبت میں رہنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا،

اعتراض برق صاحب فرماتے ہیں :-

حضرت علی رضؓ اور حضرت عائشہ رضؓ کی جنگ میں دونوں طرف صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد تھی، اور ظاہر ہے، کہ دونوں راستی پر نہیں ہو سکتے تھے، ان حالات میں بالکل ممکن ہے، کہ کسی صحابی رضؓ نے عمداً حدیث کے الفاظ بدل دیئے ہوں" (دو اسلام ص۵۲)

جواب برق صاحب اگر آپ کا یہ خیال ہے، کہ صحابہ کرام ایسے بددیانت تھے، تو پھر اللہ ہی حافظ ہے نہ اسلام پہلے تھا، اور نہ اب ہے، شکایت ہی بے کار ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آئے بھی، اللہ نے کتاب بھی نازل فرمائی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جماعت تیار کی وہ بددیانت تھی، جب اپنے رسول پر افترا پردازی سے نہ چوکتی تھی، تو پھر ظاہر ہے، کہ دوسرے معاملات میں اور بھی زیادہ بددیانت ہو گی، تو پھر تو ان لوگوں کی بات بھی کافی وزنی ہے، جو کہتے ہیں، کہ بعض صحابہ نے قرآن میں تحریف کر کے چالیس پاروں کے تیس کر دیئے، جن میں سے اصلی صرف دس ہیں، باقی بیس الحاقی ہیں، اور وہ دس بھی ان بیس کے ساتھ مخلوط ہیں علیحدہ نہیں، لہٰذا پورا قرآن ناقابل اعتماد ہے، خلاصہ یہ ہوا، کہ صحابہ آپس میں لڑتے تھے، جھوٹ بولتے تھے، بددیانت تھے، قرآن کی آیات اور احادیث گھڑتے

تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو مزکی اور معلم حکمت بنا کر بھیجے گئے تھے، وہ دنیا سے قطعاً ناکام گئے العیاذ باللہ
برق صاحب سنئے! حضرت علی رضؓ اور حضرت عائشہ رضؓ میں کوئی جنگ نہیں ہوئی، یہ چند سبائی منافقین کا بلوہ تھا، صحابہ ہرگز بلوہ میں شریک نہیں ہوئے، بلکہ فوراً بلوہ کو روک دیا گیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا جنگ کرنا از سرتاپا لغو ہے، سنداً بالکل غیر معتبر ہے۔ مورخین نے بغیر جرح و تعدیل کے اس کو نقل کیا ہے، اور ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے، پھر صحابہ کا لڑنا قرآن کے بھی خلاف ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اشداء علی الکفار رحماء بینھم (الفتح) یعنی صحابہ کفار پر سخت ہیں، اور آپس میں بڑے رحیم ہیں

پھر بد دیانتی کا الزام بھی غلط ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

الزمھم کلمۃ التقوی وکانوا احق بھا واھلھا (الفتح) اللہ نے ان کے ساتھ پرہیزگاری کی بات کو لازم کر دیا اور وہ اس کے حقدار ہیں اور اہل بھی،

یہ ہیں، وہ صحابہ، جن سے اللہ تعالیٰ نے راضی ہونے کا اعلان فرمایا ہے، کیا ایسے لوگ بد دیانت ہو سکتے ہیں

اعتراض برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"دو سو پچاس برس تک یہ حدیثیں کروڑوں زبانوں پر جاری رہیں، ہر نیک و بد کے پاس پہنچیں، الفاظ بدلے، مفہوم بدلا، اضافے ہوئے" (دو اسلام ص۲۵)

جواب برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ احادیث دو سو پچاس برس بعد لکھی گئیں، حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے، صحابہ کرام کی کتابوں کا حال اوپر گذر چکا ہے، پھر تابعین کے دور میں تو بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ کا صحیفہ جو ان کے شاگرد ہمام کے نام سے مشہور ہے چھپ چکا ہے حضرت امام مالک کی کتاب بھی موجود ہے، جو تقریباً صرف سو سال بعد لکھی گئی، ان کی اکثر روایتوں میں یہ دو راوی ہیں، نافع اور حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ بتلایئے ان میں سے کون سے راوی نیک ہیں، اور کون سے بد؟ موطا میں دوسری مشہور سند یہ ہے، امام محمد بن شہاب، سالم بن عبداللہ، عبداللہ بن عمر رضؓ ہے کوئی راوی جس کو ان میں سے بد کہا جا سکے، حضرت عائشہ رضؓ کی سند میں یہ دو راوی ہیں، ہشام بن عروہ، اور عروہ بن زبیر، حضرت انس رضؓ کی روایت میں صرف امام زہری راوی ہیں، حضرت ابوہریرہ رضؓ کی سند میں امام ابو الزناد، اور امام اعرج ہیں، حضرت عمر رضؓ کی حدیث کی سند میں امام زہری اور حضرت سعید بن مسیب ہیں، غرض یہ کہ اس قسم کی صدہا سندیں ہیں، جن میں صحابی اور امام مالک کے درمیان ایک یا دو راوی ہیں، اور سب زبردست امام ہیں، امام مالک سے یہ کتاب بڑے بڑے ائمہ نے نقل کی، اور

ان سے امام بخاری نے نقل کرلی، بتایئے جھوٹ، تحریف اور غلط بیانی کہاں سے داخل ہوئی۔

اعتراض برق صاحب لکھتے ہیں:۔
"ان مشتبہ، گوش بریدہ، اور خود تراشیدہ احادیث کا سیلاب عظیم جب حضرت امام بخاری کے دور میں داخل ہوا، تو آپ نے چھ لاکھ احادیث میں سے جو آپ کو یاد تھیں صرف ۲۷۵، ۷ انتخاب کیں، اور باقی تمام کوردی کی ٹوکری میں پھینک دیا" (دو اسلام ص ۴۵-۴۶)

جواب برق صاحب کی عبارت کا خلاصہ یہ ہوا، کہ:۔
(۱) امام بخاری نے خود تراشیدہ احادیث میں سے احادیث کا انتخاب کیا، اور صحیح بخاری میں درج کیں
(۲) امام بخاری سے پہلے حدیث کی کتاب ہی نہ تھی، اور انہوں نے اس کو زبانی حاصل کیا تھا، یہ دونوں باتیں قطعاً صحیح نہیں، جواب سلسلہ وار ملاحظہ فرمایئے (۱) امام بخاری فرماتے ہیں:۔

ما ادخلت فی کتابی الجامع الا ما صح وترکت کثیرا من الصحاح حتی لا یطول الکتاب	یعنی میں نے اپنی جامع میں کوئی ایسی حدیث نقل نہیں کی جو صحیح نہ ہو۔ اور بہت سی صحیح احادیث کو کتاب کی طوالت کے خوف سے چھوڑ دیا۔

(مقدمہ ابن صلاح وغیرہ)

اس قول سے معلوم ہوا، کہ جو احادیث امام بخاری نے چھوڑ دیں، ان میں بھی بہت سی حدیثیں صحیح تھیں، امام بخاری فرماتے ہیں:۔

احفظ مائۃ الف حدیث صحیح	یعنی مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث یاد ہیں۔

(مقدمہ ابن صلاح)

علامہ عینی لکھتے ہیں:۔

نقل عن البخاری انہ صنف کتابا اورد فیہ مائۃ الف حدیث صحیح (نصرۃ الباری صفحہ ۷، بحوالہ عمدۃ القاری)	یعنی امام بخاری نے ایک کتاب ایسی بھی لکھی تھی جس میں ایک لاکھ صحیح حدیثیں تھیں۔

غرض یہ کہ امام بخاری نے ایک لاکھ صحیح احادیث یعنی ایک لاکھ صحیح سندوں میں سے کم و بیش صرف سات ہزار صحیح سندیں نقل کیں، اس سے معلوم ہوا، کہ یہ سندیں غایت درجہ کی صحیح تھیں، جو صحیح سندوں میں سے چھانٹ کر لکھی گئیں، نہ کہ خود تراشیدہ احادیث میں سے چھانٹ کر لکھی گئیں، محدثین کی اصطلاح

ہیں ہر سند کو حدیث کہتے ہیں، لہٰذا ایک لاکھ یا اس سے زیادہ احادیث سے مراد احادیث کی سندیں ہیں، نہ کہ ایک لاکھ متن، برق صاحب کی تحریر کے مطابق صحیح بخاری میں ۷۲۷۵، احادیث ہیں، حالانکہ ۷۲۷۵، سندیں ہیں نہ کہ متن، متن تو تقریباً اس تعداد کا نصف ہیں، ایک ہی حدیث امام بخاری کو متعدد اسناد سے پہنچی، ان میں سے جو بہترین سند تھی، اس کو انہوں نے اپنی جامع میں نقل کیا۔

(۲) امام بخاری کے دور سے پہلے بے شمار کتابیں لکھی جا چکی تھیں

(الف) امام بخاری فرماتے ہیں، کہ سولہ سال کی عمر میں حضرت عبداللہ بن مبارک اور امام وکیع وغیرہ کی کتب حدیث میں نے حفظ کر لی تھیں" (نصرۃ الباری ص۲۱ بحوالہ مقدمہ فتح الباری)

(ب) امام بخاری کے استاد امام داخلی حدیث پڑھا رہے تھے، کہ سند میں ایک راوی کا نام غلط لے دیا، امام بخاری نے شیخ کو متوجہ کیا، شیخ نے اپنی کتاب دیکھی، اور فرمایا تم نے سچ کہا (نصرۃ الباری ص۲۱)

(ج) امام بخاری کے استاد اسمٰعیل بن ابی اویس کی کتاب سے امام بخاری نے چند احادیث کا انتخاب کر لیا، تو ان منتخب احادیث کو امام اسمٰعیل نے علیحدہ لکھ لیا، اور ان پر یہ الفاظ لکھے "یہ وہ حدیثیں ہیں جن کو محمد بن اسمٰعیل (بخاری) نے میری حدیثوں میں سے منتخب کر لیا ہے (نصرۃ الباری ص۲۷)

(د) امام بخاری کے شیخ عبداللہ بن یوسف نے امام بخاری سے فرمایا تھا۔

یا ابا عبداللہ انظر فی کتبی واخبر بما فیھا من السقط (نصرۃ الباری ص۳۱)	یعنی آپ میری کتابوں کو دیکھیے اور اس میں جو کچھ لغزشیں ہوں ان سے مطلع فرمایئے

(ہ) امام بخاری کے استاد شیخ محمد بن سلام نے بھی فرمایا تھا:۔

انظر فی کتبی فما وجدت فیھا من خطأ فاضرب علیہ (نصرۃ الباری)	یعنی میری کتب کو دیکھیے اور جہاں خطا ہو گئی ہو وہاں نشان لگا دیجئے۔

الغرض جب امام بخاری نے ہوش سنبھالا تو بے شمار کتب حدیث تھیں، مثلاً صحیفہ ابوہریرہؓ المشہور بہ صحیفہ ہمام بن منبہ، صحیفہ صادقہ، مولفہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ، صحیفہ معمر، موطا امام مالک، موطا امام محمد، کتاب الآثار، کتاب الخراج، مسند شافعی، کتاب الام، مسند امام احمد، مسند اسحٰق بن راہویہ، سنن ابن القطان، کتب وکیع، کتب عبداللہ بن مبارک، مسند حمیدی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، کتب علی بن مدینی، وغیرہ وغیرہ ان میں سے اکثر کتابیں طبع ہو چکی ہیں، اور آج بھی موجود ہیں، اور آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ امام بخاری سے پہلے احادیث مکتوب نہ تھیں، قطعاً صحیح نہیں

اعتراض برق صاحب فرماتے ہیں :-

"امام بخاری اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تقریباً اڑہائی سو سال کا طویل زمانہ حائل تھا" (دو اسلام ص ۲۶)

جواب اس جملے سے پھر وہی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ ڈھائی سو سال تک احادیث قلمبند ہی نہیں ہوئی تھیں، غیر محفوظ تھیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، ہر دور میں حدیث کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں ائمہ دین نے حدیث کی حفاظت کا بے مثل نظام قائم کیا، ان بے شمار کتب حدیث، ائمہ حدیث، اور اہتمام درس و تدریس سے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا ڈھائی سو سال کا طویل زمانہ پاٹ دیا گیا ہے، اور مختلف ائمہ دین اور کتب کے ذریعہ ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ امام بخاری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھے حدیث نقل کر رہے ہیں، جس طرح آج ہم صحیح بخاری پڑھتے ہیں، تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ گویا امام بخاری درس دے رہے ہیں محض اس لئے کہ یہ گیارہ بارہ سو سال کا زمانہ صحیح بخاری کے راویوں سے پٹا ہوا ہے، اور صحیح بخاری اپنے مصنف تک متواتر ہے۔

اعتراض برق صاحب فرماتے ہیں :-

"چھ لاکھ حدیث، ہر حدیث کے کم از کم چھ چھ راوی یعنی چھتیس لاکھ راوی جن میں سے تیس چھتیس لاکھ لازماً مر چکے ہوں گے، نہ ان کے حالات محفوظ، نہ انہیں کوئی جاننے والا موجود، امام بخاری کو کیسے پتہ چل گیا کہ اس کے تمام راوی سچے تھے" (دو اسلام ص ۲۶)

جواب برق صاحب آپ نے غالباً صحیح بخاری کا غور سے مطالعہ نہیں فرمایا، صحیح بخاری کی سند میں کم سے کم تین راوی ہوتے ہیں، نہ کہ چھ، اور یہ حدیثیں ثلاثیات بخاری کہلاتی ہیں، اگر آپ زیادہ سے زیادہ چھ چھ راوی کہتے تو بھی غنیمت تھا، اس لئے کہ چند حدیثوں میں چھ چھ راوی ہیں، لیکن اکثر سندوں میں چار سے زیادہ راوی نہیں ہوتے، یہ برق صاحب کی پہلی غلط فہمی تھی، دوسری غلط فہمی یہ ہوئی کہ ان کے خیال میں ایک راوی سے ایک ہی حدیث منقول ہے، لہٰذا چھ لاکھ حدیثوں میں ۳۶ لاکھ راوی ہو گئے حالانکہ یہ بھی قطعاً غلط ہے، ایک راوی سے دس، دس، بیس بیس، سو سو، بلکہ ہزار ہزار احادیث مروی ہیں لہٰذا راویوں کی تعداد چند ہزار سے زاید نہیں، اور پھر ان میں سے صحیح بخاری کی اسناد کے راوی چند سو سے زاید نہیں، لہٰذا اس قلیل تعداد راویوں کے حالات کا مفصل تذکرہ لکھنا اور اس کا محفوظ ہونا کچھ مشکل امر نہیں، پھر اگر بالفرض محال کسی راوی کا حال معلوم نہ ہو تو وہ مجہول الحال ہو گا، اس کی روایت صحیح بخاری میں آنے ہی کیوں لگی، لہٰذا صحیح بخاری کی احادیث پر یہ اعتراض کالعدم ہے، تیسری غلط فہمی یہ کہ امام بخاری

کو ان راویوں کے حالات کیسے پہنچے، جب کہ وہ مر چکے تھے، سنیئے! ان کے حالات کا علم اس طرح ہوا، جس طرح حدیث کا علم ہوا۔ جس طرح حدیث ان تک سنداً پہنچی، اسی طرح راوی کے ہم عصر علماء کی جرح و تعدیل بھی سنداً ساتھ پہنچی، آخر اس میں اشکال ہی کیا ہے، امام بخاری نے اپنے اساتذہ کو خود دیکھا تھا، ان استادوں نے اپنے اساتذہ کا حال بیان کیا، ان استادوں نے اپنے اساتذہ کا حال بیان کیا، اور اس طرح ہر زمانہ کے راویوں کا حال امام بخاری تک سنداً پہنچ گیا، پھر جس طرح حدیث کی کتابیں امام بخاری سے پہلے تصنیف ہو چکی تھیں، جرح و تعدیل کی بھی کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں، اسماء الرجال کا فن باقاعدہ منضبط ہو چکا تھا، اور یہ سب تحریری مواد تھا جو امام بخاری کے سامنے موجود تھا۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"علاوہ ازیں ہمارے سوانح نگاروں میں ایک خاص نقص یہ بھی تھا، کہ وہ کسی کردار پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے عادی نہیں تھے، ہمیشہ حسن ظن سے کام لیتے تھے، اور مبالغہ آمیز مدح سرائی پر اتر آتے تھے، اس وقت ذہبی کا تذکرۃ الحفاظ میرے سامنے پڑا ہے، جس میں ہزارہا بڑے بڑے راویان و حفاظ حدیث کے حالات مرقوم ہیں، میں ایک ہی دور کے چند راوی لے کر ذہبی کی زبانی ان کی کہانی سناتا ہوں، جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے، کہ ہمارے بزرگوں کا انداز کردار نویسی میں کیا تھا" (دو اسلام ص ۲۴۳)

ازالہ برق صاحب آپ کو پھر غلط فہمی ہو گئی، امام ذہبی کا تذکرۃ الحفاظ، اسماء الرجال کی کتاب نہیں ہے، بلکہ بقول آپ کے بڑے بڑے راویان و حفاظ حدیث کے حالات پر مشتمل ہے، یہ لوگ ائمہ دین تھے مرجع انام تھے، متقی تھے، حافظ تھے، ضابط تھے، اگر آپ کو جرح دیکھنی ہو، تو انہی امام ذہبی کی کتاب "میزان الاعتدال" ملاحظہ فرمائیے، کتاب آپ وہ دیکھتے ہیں، جس میں حفاظ کا حال ہے، تو جرح آپ کو وہاں کیسے ملے گی، وہ کتاب تذکرۃ الضعفاء نہیں، کہ وہاں آپ کو جرح مل سکے، رہا یہ کہ مبالغہ آمیزی تو یہ سوانح نگار کا قصور نہیں ہے، بلکہ انہوں نے ہر واقعہ کو سند کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اب یہ جس کا قول ہے، اس کا مبالغہ ہے، پہلے سند کو دیکھئے کہ صحیح ہے یا نہیں، پھر قائل کو دیکھئے کون ہے اگر ہر طرح سے وہ ثابت ہو جائے، تو بے شک وہ مدح ممدوح کے حق میں صحیح ہو گی، اس میں امام ذہبی کا کوئی قصور نہیں، سند پیش کر کے وہ بری الذمہ ہو گئے، پھر انہی حفاظ میں سے اگر کسی پر جرح ہے، تو وہ بھی امام ذہبی نے میزان میں نقل کر دی ہے، وہاں ملاحظہ فرما لیجئے، جرح و تعدیل کے لئے وہی کتاب مخصوص ہے، اور تاریخی حالات کے لئے تذکرہ۔

غلط فہمی:- برق صاحب لکھتے ہیں:-

"علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب کے متعلق لکھتے ہیں، آپ رات دن میں ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے، اگر سونے، کھانے، ضروری حاجات اور وضو کے لئے کم از کم آٹھ گھنٹے الگ کر لئے جائیں تو باقی سولہ گھنٹے بچتے ہیں، اگر ہر رکعت پر اوسطاً دو منٹ صرف ہوں، تو یہ تینتیس گھنٹے اور بیس منٹ بنتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ سولہ گھنٹوں میں تینتیس گھنٹوں کا کام سرانجام نہیں دیا جاسکتا (دو اسلام ص۴۸)

ازالہ برق صاحب یہ صحیح ہے، کہ یہ مبالغہ ہے، مگر مغالطہ آپ کو بھی ہوا، وہ یہ کہ اوسطاً ہر رکعت پر ایک منٹ شمار کرتے، تو یہ کام آپ کے حساب سے بھی سولہ، سترہ گھنٹے میں ہو سکتا ہے، اور پھر یہ ممکن تھا، بلا وجہ آپ نے ۲ منٹ فی رکعت حساب میں لگا کر اس کو ناممکن بنا دیا۔

غلط فہمی چند اکابر کے متعلق تذکرۃ الحفاظ سے مدحیہ جملے نقل فرمانے کے بعد برق صاحب لکھتے ہیں :-

"دیکھا آپ نے سوانح نویسی کا انداز، یہ سب محدثین ہم عصر تھے، ذہبی ہر ایک کو بے مثال، سب سے بڑا عالم، سردار قرار دے گیا ہے، ظاہر ہے کہ ایک ہی زمانہ اور تقریباً ایک ہی ملک کے سب لوگ بے نظیر و بے مثال نہیں ہو سکتے" (دو اسلام ص۴۹)

ازالہ برق صاحب آپ کو پھر غلط فہمی ہو گئی، امام ذہبی نے یہ کہاں لکھا ہے، کہ "سب لوگ بے نظیر و بے مثال تھے" ہاں چند محدثین کے متعلق بے نظیر یا بے مثال کے لفظ ضرور استعمال کئے ہیں مگر یہ قصیدہ گوئی امام ذہبی کی نہیں ہے، بلکہ وہ دوسرے اماموں کے اقوال نقل کر رہے ہیں، کسی امام نے شعبی کو سب سے بڑا عالم کہدیا، اور کسی نے عطا کو، یہ تضاد نہیں ہے حقیقت صرف اتنی ہے، کہ شعبی اور عطاء دونوں بہت بڑے عالم ہیں، کسی کے نزدیک کوئی زیادہ ہے، کسی کے نزدیک کوئی زیادہ ہے، ہر ایک کا اپنا اندازہ ہے، اگر ایک ہی شخص کے یہ جملے ہوتے تو تضاد کا شبہ ہو سکتا تھا، حالانکہ ہونا اس وقت بھی نہیں چاہیئے، اس لئے کہ جب دو عالم برابر درجے کے ہوں، تو پھر کسی ایک کے متعلق زیادہ بڑا ہونے کا فیصلہ مشکل ہوتا ہے، اور ایسی ہی حالت میں دونوں کو سب سے بڑا عالم کہدیا جاتا ہے۔

اچھا برق صاحب قرآن کی ایک آیت سنئے، ارشاد باری ہے :-

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (المائدۃ ع۲)	یعنی کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ناانصافی کرو۔ بلکہ انصاف ہی کرو۔ یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

برق صاحب کیا اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ ناانصافی بھی تقویٰ کے قریب ہے، لیکن انصاف زیادہ قریب ہے، ہرگز نہیں، تو پھر اقرب کا صیغہ جو استعمال ہوا، اس کی کیا تاویل ہوگی، اقرب

تفضیل بعض یا تفضیل کل کا صیغہ ہے، لیکن یہاں تفضیل کا مفہوم ادا نہیں کرتا، اسی طرح کسی عالم کے متعلق "اعلم" کا لفظ تفضیل کل کا مفہوم ادا نہیں کرتا، بلکہ اس سے اس کے علم کی انتہائی عظمت مراد ہوتی ہے، کاش ان معنوں میں اگر آپ ان مدح سرائیوں کا مطالعہ فرماتے، تب بھی کوئی غلط فہمی نہ ہوتی

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"امام مالک نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ حدیث لکھی، نو سو اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اور سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر درس دینا شروع کر دیا..... جب مؤطا لکھ چکے، تو اسے پانی میں پھینک کر کہنے لگے، کہ اگر اس میں سچی احادیث ہیں تو یہ نہیں بھیگے گی، چنانچہ وہ نہ بھیگی، ایک دن حدیث پڑھا رہے تھے، کہ بچھو کپڑوں میں گھس گیا، اس نے سولہ مرتبہ امام صاحب کو کاٹا، لیکن امام صاحب نے درس ختم کر کے ہی اس کی طرف توجہ دی....."

اتنا لکھنے کے بعد برق صاحب فرماتے ہیں:۔

"نو سو اساتذہ سے پڑھا بھی، اور پھر سترہ برس میں فارغ التحصیل بھی ہو گئے، کوئی پوچھے کہ اس زمانہ میں نو سو اساتذہ عرب میں جمع کہاں سے ہو گئے تھے؟ اگر بالفرض ہو ہی گئے تھے، تو یہ نہ بتایا کہ امام مالک ہر استاد کے پاس کتنا عرصہ رہے تھے، اگر ایک استاد کے پاس صرف ایک مہینہ بھی بسر کیا تھا، تو بھی ان کا زمانہ تعلیم پچھتر برس بنتا ہے" (دو اسلام ص ۴۵)

برق صاحب کو پھر غلط فہمی ہوئی، آپ اس خیال میں ہیں، کہ ہر استاد کے پاس جانے کے لئے

ازالہ علیحدہ زمانہ مقرر تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں، ایک ہی مہینہ میں مختلف استادوں کے پاس حاضری دی جا سکتی ہے، بلکہ ایک ہی دن کے مختلف اوقات میں مختلف استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا جا سکتا ہے، پھر یہ بھی ضروری نہیں، کہ ہر استاد کے پاس کم از کم ایک مہینہ ہی صرف ہوا، ہو سکتا ہے کہ بعض کے پاس صرف ایک دن یا صرف ایک گھنٹہ ہی صرف ہوا ہو، بلکہ اگر کسی استاد سے صرف ایک ہی حدیث سنی ہو گی، تو صرف چند منٹ صرف ہوئے ہوں گے، پھر نو سو اساتذہ کا ایک جگہ جمع ہونا ضروری نہیں، ایک ہی شہر میں متعدد استاد ہوتے تھے، اور ان کے پاس سفر کر کے جانا کوئی مشکل نہ تھا، پھر نو سو اساتذہ کا ایک جگہ جمع ہونا بھی ناممکن نہیں، مثلاً حج کے موقعہ پر ہزارہا شیوخ جمع ہوتے تھے، اور اگر اس وقت ان کی صحبت سے کوئی شخص فیضیاب ہو جائے، اور کئی سال ایسا ہوتا ہے تو اس کے استادوں کی تعداد کا ہزاروں تک پہنچ جانا کیا مشکل ہے

غلط فہمی :- برق صاحب پھر فرماتے ہیں:۔

"اس گپ کے علاوہ، وہ کتاب نہ بھیگنے، اور بچھو کاٹنے کا گپوڑہ بھی قابل داد ہے۔ (دو اسلام ص۵۰)

ازالہ برق صاحب یہ واقعات امام مالک کی کرامات میں سے ہیں، آخر آپ حضرت مریم کی کرامتوں کے تو معترف ہیں، اس لئے کہ قرآن میں بیان ہوئی ہیں، مثلاً فرشتہ ان کے پاس تنہائی میں آتا ہے اور کہتا ہے۔ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا "میں تجھ کو پاک لڑکا بخشنے آیا ہوں" پھر جو کچھ ہوا، وہ آپ کو معلوم ہے، عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے، گہوارے میں بات کرنے لگے، اپنی والدہ کی بریت ثابت کی، کیوں صاحب جو کچھ قرآن میں ہے، اس پر تو ایمان ہے، اور جو کچھ قرآن میں نہ ہو، اور ہو سکتا ہے کہ صحیح ہو اس پر اعتراض! یہ کہاں کا انصاف ہے، پھر اگر یہ واقعہ صحیح نہیں تو آپ کو چاہیئے تھا، کہ اس کا اصل ماخذ تلاش کرتے، اور سنداً اس کو لغو ثابت کرتے، اگر محض عقل سے پرکھنا ہے، تو پھر ہر واقعہ کو پرکھیئے خواہ وہ قرآن میں ہو یا غیر قرآن میں۔

غلط فہمی "تو یہ تھے وہ سوانح نگار جن کی تحریرات کو ہم وحی سمجھ کر بعض ملدیوں کو سچا اور بعض کو جھوٹا قرار دیتے تھے، اور پھر ان سچے ملدیوں کی احادیث ایک کتاب میں جمع کر کے اس کا نام رکھ دیتے تھے صحیح بخاری، صحیح مسلم" (دو اسلام ص۵۱)

ازالہ برق صاحب کو پھر غلط فہمی ہوئی سوانح نگاروں کی یہ مبالغہ آمیز تعریفیں محدثین کے فن جرح و تعدیل پر اثر انداز نہ ہوئیں، کسی شخص کا صادق، عابد، متقی، عالم ہونا اور بات ہے، اور ثقہ ہونا اور بات ہے، اگر یہ تمام محاسن بھی ایک شخص میں جمع ہو جائیں، تب بھی ضروری نہیں کہ وہ شخص ثقہ ہو، اور اگر ثقہ ہو بھی جائے، تب بھی لازمی نہیں، کہ اس کی روایت کردہ تمام احادیث صحیح ہوں، غلطی کا امکان موجود ہے غلطی پر گرفت کرنا یہ ایک مستقل فن ہے جس کی بنیاد پر احادیث کو صحیح یا ضعیف کہا جاتا ہے، کسی شخص کا امام وقت ہونا، محدثین کو مرعوب نہیں کرتا، بہت سے اہل زہد اور اہل خیر حضرات کی غلط بیانی پر محدثین نے گرفت کی، غرض یہ کہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر پکڑ کی گئی، اور اس طرح احادیث کی تنقیح عمل میں آئی۔

غلط فہمی برق صاحب فرماتے ہیں:۔

حضرت عبداللہ بن یسار فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت علیؓ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے حکم دیا کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد ہر شخص پہلا کام یہ کرے کہ اپنے ذخیرہ احادیث کو جلا ڈالے۔ (دو اسلام ص۵۱)

ازالہ برق صاحب نے اس اثر کا مطلب غلط سمجھا، عربی عبارت میں اصل الفاظ "احادیث علماءہم" یعنی علماء کی باتیں ہیں یعنی علماء کے فتوے اور اقوال کو جلانے کا حکم دیا نہ کہ احادیث رسول اللہ کو۔ احادیث علماء

سے احادیث رسول آپ نے کیسے سمجھ لیا۔

(۲) دوم یہ کہ حضرت علی رضہ تو خود احادیث لکھتے تھے، ان کے صحیفہ کا ذکر صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر گذر چکا ہے، لہذا عقلاً یہ روایت باطل ہے

(۳) قطع نظر اصل مفہوم کے یہ روایت بالکل جھوٹ اور سرتاپا کذب ہے، اس کی سند میں بقیہ راوی قابل وثوق نہیں، اور عبداللہ بن یسار جس کو آپ نے حضرت لکھا ہے مجہول ہے (برق اسلام ۳۵)

غلط فہمی برق صاحب لکھتے ہیں :۔

ایک مرتبہ حضرت عمرہ ابی بن کعب جیسے جلیل القدر صحابی کو روایت احادیث کی بنا پر پیٹنے پر تل گئے، اور اس جرم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ حضرت ابوذر اور حضرت ابو درداء جیسے عظیم المرتبت اصحاب کو قید کر دیا تھا" (دو اسلام ص۵۱)

یہ روایت بھی بالکل جھوٹ ہے، عقلاً بھی اور سنداً بھی۔

ازالہ (۱) عقلاً اس وجہ سے، کہ حضرت عمر رضہ نے ابو درداء اور عبادہ بن صامت کو شام بھیجا تھا، اور لوگوں کو بھی تاکید کر دی تھی، کہ ان کی احادیث سے تجاوز نہ کریں، ایسے ہی دوسرے لوگوں کو دوسرے مقامات پر بھیجا اور لوگوں کو وہی تاکید کی (برق اسلام ص۳۵)

عمار بن یاسر اور ابن مسعود کو کوفہ روانہ فرمایا تھا، حضرت عمر رضہ کا خط اہل کوفہ کے نام تھا، اس میں لکھا تھا، کہ عمار کو تمہارا امیر بنا کر بھیجا ہے، اور ابن مسعود کو وزیر اور معلم، یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ اصحاب اور اہل بدر سے ہیں، تم ان دونوں کی پیروی کرنا، اور ان کی سننا (برق اسلام ص۳۸) لہذا ان اصحاب کو قید کرنے کی روایت باطل ہے

(۲) سنداً یہ روایت باطل ہے، توجیہ النظر میں ہے :۔

ھذا مرسل و مشکوک فیہ من شعبۃ	یہ روایت مرسل ہے (یعنی سند متصل نہیں)
فلا یصح ولا یجوز الاحتجاج بہ فھو	شعبہ سے مشکوک ہے لہذا صحیح نہیں۔ اس
فی نفسہ ظاہر الکذب	سے احتجاج جائز نہیں بلکہ درحقیقت اس کا جھوٹا
(برق اسلام ص۳۷)	ہونا بالکل ظاہر ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

• (عبداللہ بن مسعود رضہ) کہا کرتے تھے، جب تمہیں حصول علم کی ضرورت پیش آئے، تو قرآن پڑھو، اس لئے کہ اس میں اولین و آخرین کا علم موجود ہے (دو اسلام ص۵۲)

برق صاحب اگر آپ اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ابن مسعود حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے، تو

ازالہ: یہ تو قطعاً صحیح نہیں، وہ تو فرمایا کرتے تھے :۔

لو ترکتم سنۃ نبیکم لضللتم	اگر تم اپنے نبی کی سنت چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے

پھر فرماتے ہیں :۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علمنا سنن الھدی	بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سنن ہدیٰ کی تعلیم دی۔

بلکہ ابن مسعود تو یہاں تک عقیدہ رکھتے ہیں، کہ تمام سنتیں من جانب اللہ ہیں، وہ فرماتے ہیں :۔

ان اللہ شرع لنبیکم صلی اللہ علیہ وسلم سنن الھدی (مسلم باب صلوٰۃ الجماعۃ)	بے شک اللہ تعالےٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سنن ہدیٰ مقرر فرمائی تھیں۔

بلکہ ابن مسعود کا تو یہ عالم تھا، کہ وہ حدیث کو کتاب اللہ سمجھتے تھے، ام یعقوب حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس آئیں، اور کہا :۔

بلغنی عنک انک لعنت الواشمات و المستوشمات والمتنمصات و المتفلجات للحسن المغیرات لخلق اللہ۔	یعنی مجھے خبر ملی ہے کہ تم گودنے والی۔ گدوانے والی۔ چہرہ پر سے بال اکھیڑنے والی۔ خوبصورتی کے لئے دانتوں پر سوہن کرنے والی اللہ تعالےٰ کی پیدائش میں تغیر کرنے والی عورت پر لعنت کرتے ہو

حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا :۔

ومالی لا العن من لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو فی کتاب اللہ۔	یعنی میں کیوں نہ اس پر لعنت کروں۔ جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو اور کتاب اللہ

اس عورت نے کہا :۔

لقد قرأت ما بین اللوحی المصحف فما وجدتہ	میں نے پورا قرآن پڑھا ہے مگر اس میں تو یہ نہیں ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا :۔

لئن کنت قرأتیہ لقد وجدتیہ قال اللہ عزوجل ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا	اگر تو نے قرآن پڑھا ہوتا تو تجھے یہ بات مل جاتی اللہ عزوجل فرماتا ہے۔ جو رسول حکم دے اس پر عمل کرو اور جس سے منع کرے باز رہو۔

اس عورت نے کہا، تمہاری بیوی میں بھی یہ بات موجود ہے، انہوں نے کہا جاؤ اور دیکھو، وہ گئی، اور اس کو ان کی بیوی میں اس قسم کی کوئی بات نظر نہیں آئی، پھر واپس آئی اور کہا مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی، ابن مسعودؓ نے کہا!

اما لو کان ذلک لو نجامعھا یعنی اگر ایسا ہوتا تو ہم اس کو اپنے ساتھ کیسے رکھ سکتے تھے۔ (مسلم باب تحریم فعل الواصلۃ)

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ تو ہر حدیث کو کتاب اللہ سمجھتے تھے، اور اس پر خود بھی عمل کرتے تھے، اور عمل کراتے تھے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

۰ ایک شخص نے ابی بن کعب سے کہا مجھے کوئی نصیحت کیجیے، فرمایا کتاب اللہ کو ہاتھ میں لو، اور صرف اسی کے فیصلوں پر عمل کرو (دو اسلام ص ۵۳)

ازالہ اولاً۔ حضرت ابی بن کعب کا مطلب وہ نہیں، جو برق صاحب سمجھے ہیں، قرآن تو خود اتباع رسول اور اسوہ رسول اور اطاعت رسول کی طرف دعوت دیتا ہے، بلکہ یہاں تک فرماتا ہے:۔

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک یعنی تیرے رب کی قسم لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک تیرے فیصلہ کو تسلیم نہ کریں (سورہ نساء)

لہٰذا صرف کتاب اللہ کو پکڑ لینے کے یہ معنی ہوئے، کہ جو کچھ کتاب اللہ میں ہے اس پر عمل کیا جائے، اور کتاب اللہ میں فیصلہ رسول ماننے کا حکم موجود ہے، لہٰذا بنیادی طور پر کتاب اللہ کافی ہے اور اس کے ذریعہ سے اسوہ رسول کا اتباع لازمی ہے۔

ثانیاً۔ ابی بن کعب کی اصل عبارت میں لفظ "صرف" نہیں ہے، یہ ترجمہ میں برق صاحب نے اضافہ کر دیا

ثالثاً۔ کتاب اللہ سے مراد صرف قرآن ہی نہیں ہوتا، بلکہ قرآن اور حدیث دونوں ہوتے ہیں، اور یہ گذشتہ اوراق میں ثابت کیا جا چکا ہے۔ اور ابن مسعود کی حدیث مذکورہ بالا بھی اس پر شاہد ہے، لہٰذا ابی بن کعب رضہ کے الفاظ سے حجیت حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا، متعدد احادیث سے ثابت ہے، کہ وہ احادیث کو حجت سمجھتے تھے، اور ان پر عمل کرتے تھے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

حضرت عبداللہ بن عباس سینکڑوں احادیث کے راوی ہیں، لیکن علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ رحلت رسول کے وقت آپ کی عمر صرف ۱۳ برس کی تھی، تیرہ برس کا بچہ بے حد غیر ذمہ دار ہوتا ہے، اسے کیا خبر کہ نبی دنیا میں کیوں آتا ہے، اس کے اقوال کو کیا اہمیت حاصل ہوتی ہے، اور اگر ان اقوال میں رد و بدل کر دیا جائے،

تو کیا قبائح پیدا ہوتے ہیں، اس طرح کے غیر ذمہ دار بچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اسناد کی کوئی کڑی قائم نہ کرنا، اور خود انہیں عاقل، بالغ اور ثقہ سمجھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ روایت کے قابل قرار دینا درست نہیں (دو اسلام صـ۵۳)

ازالہ برق صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے، کہ نبی دنیا میں ایک عظیم الشان مقصد کے لئے آتا ہے اس کے اقوال کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے، اور اگر ان اقوال میں رد و بدل کر دیا جائے تو بڑے بڑے قبائح پیدا ہوتے ہیں، برق صاحب جب بات یہ ہے، تو نبی کے اقوال لازماً دین ہونے چاہئیں، ورنہ اہمیت ختم ہو جائے گی، اور رد و بدل سے قبائح پیدا نہیں ہوں گے۔

برق صاحب تیرہ سال کا بچہ اس زمانہ میں جب کہ حافظہ کا قحط ہے، چھ چھ، سات سات مضامین میں میٹرک کا امتحان پاس کر سکتا ہے، ریاضی، سائنس وغیرہ کے بڑے بڑے دقیق مسئلے اور مشکل سوالات حل کر سکتا ہے، بڑی بڑی ضخیم کتابیں پڑھ کر امتحان دے سکتا ہے، بلکہ چھ، سات سال کی عمر میں پورا قرآن حفظ کر سکتا ہے، تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحبت یافتہ تیرہ سال کا بچہ اتنا بھی نہیں کر سکتا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو حفظ کر سکے، یہ بتا سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح وضو کرتے تھے، کس طرح نماز پڑھتے تھے، کس طرح یہ کام کرتے تھے، وہ کام کرتے تھے، یہ تو بہت آسان بات ہے، اس پر تعجب کیوں ہے یہ تو وہ بچہ ہے، جس کی قدر و منزلت کے فاروق اعظم معترف تھے، مشیر خاص کی حیثیت سے ارکان شوریٰ میں جگہ دیتے تھے، لوگوں نے اعتراض بھی کیا، تو حضرت عمر رضنے عملاً اس بچہ کی علمی قابلیت کو ان پر ثابت کر دیا، تمام لوگوں کا امتحان لیا، لیکن کوئی صحابی صحیح جواب نہ دے سکا، صحیح جواب دیا، تو اسی تیرہ سالہ بچہ نے، جہاں ان بزرگوں کی سمجھ کی رسائی نہ ہو سکی وہاں اس بچہ کے فہم کی رسائی ہوئی، اور وہ معترض بھی معترف ہو گئے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ صحیح بخاری تفسیر اذا جاء نصر اللہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابن عباس نے تحصیل علم میں کبھی پہلو تہی نہیں کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زیادتی علم کے لئے دعا کی، وہ خود صحابہ کے گھر پر جاتے، اور ان سے احادیث حاصل کرتے تھے، اور پھر ان ہی سے روایت کرتے تھے، لہٰذا ان کی روایت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر کرتے ہیں:-

"ایک مرتبہ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت معاویہ کے دربار میں گئے، انہوں نے احادیث کی فرمائش کی، آپ نے چند احادیث سنائیں، اور منشی دربار ساتھ ساتھ لکھتا گیا، آپ نے وہ کاغذ لے کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا، کہ رسول اللہ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ (دو اسلام صـ۵۳)

ازالہ: یہ روایت صحیح نہیں، اس کا راوی کثیر بن عبداللہ ضعیف ہے (تذکرۃ الموضوعات ص۲۸۶ لابن طاہر فتنی) دوسرا راوی مطلب بن عبداللہ ہے، وہ بھی ضعیف ہے (برق اسلام ص۹۱) بھلا جس سند میں دو راوی ضعیف ہوں، وہ کس طرح قابل اعتماد ہو سکتی ہے، مزید براں توجیہ النظر میں ہے، کہ حضرت زید بن ثابت نے خود فرائض کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی (برق اسلام ص۹۱) لہٰذا یہ روایت جو برق صاحب نے نقل فرمائی ہے بالکل گھڑنت ہے۔

غلط فہمی: اسود بن ہلال کہتے ہیں، کہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس ایک بیاض یا کتاب لے کر گیا، جس میں کچھ احادیث درج تھیں، آپ نے پانی منگوا کر پہلے اس کتاب کو دھویا اور پھر جلا دیا (دو اسلام ص۵۳)

ازالہ: یہ روایت بالکل کذب و افتراء ہے، امام عبدالبر نے اس کو ابن ابی شیبہ سے روایت کیا ہے، اور ان دونوں کے درمیان کئی واسطے گم ہیں (برق اسلام ص۱۰۲) پھر ابن ابی شیبہ سے اوپر بھی دو جگہ لفظ "عن" سے روایت ہے، لہٰذا دو مزید مقامات پر شبہ انقطاع ہے (برق اسلام ص۱۰۲) عقلاً بھی یہ محال ہے، اس لئے کہ عبداللہ بن مسعود نے خود ایک کتاب لکھی تھی (جامع بیان العلم لابن عبدالبر ص۱۷)

غلط فہمی: برق صاحب تحریر کرتے ہیں:۔
ضحاک بن مزاحم فرمایا کرتے تھے، وہ زمانہ جلد آرہا ہے، جب احادیث کی کثرت ہو جائے گی لوگ کتاب الٰہی کو ترک کر دیں گے، مکڑیاں اس پر جالے تنیں گی (دو اسلام ص۵۴)

ازالہ: برق صاحب آج تک تو ایسا ہوا نہیں سنیئے، یہ روایت سراپا جھوٹ ہے، بہتان عظیم ہے، اس کی سند میں سیف بن ہارون برجمی ضعیف، متروک الروایات ہے، امام ابن حبان کہتے ہیں، یہ جھوٹی روایتیں نقل کرتا ہے، دوسرا راوی احمد بن ہارون کذاب ہے (برق اسلام ص۶۲)

غلط فہمی: برق صاحب نے ص۵۵ پر ابن مسعودؓ کا وہ واقعہ دوبارہ نقل فرمایا ہے، جس میں کہ انہوں نے احادیث کو دھو ڈالا تھا۔

ازالہ: اس کا جواب پہلے گذر چکا ہے، یہ روایت جھوٹ ہے، اس کی سند میں سے کئی راوی غائب ہیں۔

غلط فہمی: برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
جریر بن عبدالحمید کہتے ہیں کہ منصور، مغیرہ اور الاعمش جیسے محدثین کتابت حدیث کو گناہ سمجھتے تھے (ص۵۵)

ازالہ: یہ روایت بھی بالکل جھوٹی ہے، اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن یحییٰ اور عمر بن محمد حجی مجہول اور نامقبول ہیں، علی بن عبدالعزیز اور اسحاق بن اسمٰعیل طالقانی مجروح ہیں (برق اسلام ص۱۰۷) ظلمات بعضہا فوق بعض۔

غلط فہمی ۔ قرظہ بن کعب کہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ ہم عراق کو روانہ ہوئے حضرت فاروق مقام صرار تک ہمارے ساتھ آئے وہاں ناشتہ کیا، پھر فرمایا دیکھو میں ایک نہایت اہم بات کہنے کے لئے تمہارے ہمراہ یہاں آیا ہوں، اور وہ یہ کہ عراق کی سرزمین سے تلاوت قرآن کی سریلی آوازیں اٹھ رہی ہے جیسے چھتے کے ارد گرد شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں، خدا کے لئے انہیں احادیث میں پھنسا کر قرآن سے دور نہ پھینک

(دو اسلام ص ۳۵)

ازالہ :۔ حضرت عمرؓ کے اصل الفاظ عربی میں اس طرح منقول ہیں:۔

لھم دوی بالقران کدوی النحل فلا	یعنی عراق کے لوگ اس طرح قرآن پڑھنے میں
تصدوا وهم بالاحادیث فتشغلوهم	مشغول ہیں جس طرح شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں
جردوا القران واقلوا الروایۃ عن رسول	ان کو باتوں میں مشغول نہ کرنا قرآن مجید کو علیحدہ
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا شریککم	رکھنا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تھوڑی
(برق اسلام ص ۳۵ - ابن ماجہ ص ۱۶ نحوہ)	تھوڑی بیان کرنا اور اس میں میں بھی تمہارا شریک ہوں

غالباً برق صاحب نے پوری عبارت ملاحظہ نہیں فرمائی، ورنہ غلط فہمی نہ ہوتی، احادیث سے مراد یہاں محض باتیں قصہ کہانیاں ہیں، جیسا کہ قرآن میں ہے "وجعلنا ھم احادیث" یعنی ان تباہ شدہ قوموں کو ہم نے کہانیاں بنا دیا، احادیث سے مراد یہاں کہانیاں ہیں، اس پر یہ قرینہ ہے، کہ اس ہی عبارت میں آگے فاروق اعظم نے یہ فرمایا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تھوڑی تھوڑی بیان کرنا یعنی احادیث رسول اللہ کو بیان کرنے کا حکم دیا تھا مگر تھوڑی تھوڑی، اور اس معاملہ میں حضرت عمرؓ نے حدیث ہی پر عمل کیا، خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، اور منبر پر کھڑے ہو کر فرماتے ہیں:۔

ایاکم و کثرۃ الحدیث عنی فمن قال	یعنی خبردار مجھ سے کثرت سے حدیث مت بیان کرو
علی فلیقل حقا او صدقا (ابن ماجہ	پھر جو کوئی حدیث بیان کرے تو بالکل ٹھیک اور
باب التغلیظ فی تعمد الکذب)	سچ اور صحیح بیان کرے۔

جو حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، حضرت عمرؓ نے اس پر عمل کیا، اور کرایا، اور اس میں یہ مصلحت ہے کہ تھوڑا تھوڑا بیان کرنے سے باتیں حافظہ میں جڑ پکڑ لیتی ہیں، مثلاً پورا قرآن ایک مرتبہ نازل نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے اس کی مصلحت خود بیان فرمائی ہے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ	یعنی کافر کہتے ہیں کہ پورا قرآن اس پر ایک ہی دفعہ
جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ	میں کیوں نہ نازل کر دیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس
فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔ (الفرقان)	کو آپ کے دل پر نقش کریں اور ہم نے تھوڑا تھوڑا ہی پڑھ کر سنایا

یہاں تک تو اس روایت کا جواب اسی روایت سے دیا گیا، اب سنیے:۔

(۲) یہ روایت حضرت عمرؓ پر بہتان ہے، اس کی سند منقطع ہے، شعبی اور قرظہ بن کعب کی ملاقات نہیں ہوئی، اور شعبی نے اس کو قرظہ سے روایت کیا ہے، لہٰذا روایت ہی سر اسر بہتان ہے (برق اسلام ط ۳۶)

(۳) عقلاً بھی یہ محال ہے، اس لئے کہ عراقی برائے نام مسلمان تھے، نہ انہیں قرآن سے محبت تھی نہ حدیث سے، وہ فتنہ پرور اور دین کے دشمن تھے (ملاحظہ ہو کتب حدیث و کتب تاریخ)

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "رحلت حضور سے صرف تین برس پہلے حضرت ابو ہریرہؓ مشرف باسلام ہوئے تھے لیکن روایات احادیث میں سب سے بازی لے گئے" (دو اسلام ص ۵۶)

ازالہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اس کا جواب انہوں نے خود دے دیا ہے، وہ فرماتے ہیں، کہ مہاجرین و انصار اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے، اور میں ہمہ اوقات حضور کے ساتھ رہتا تھا، لہٰذا جو کچھ وہ نہ سن سکے، میں نے سن لیا (صحیح بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ کے متعلق برق صاحب لکھتے ہیں:۔

غلط فہمی "ایک مرتبہ پٹے بھی لیکن روایت سے باز نہ آئے، واقعہ یوں ہے، کہ آپ رسول اکرم صلعم کے ہاں تشریف لے گئے، حضور نے فرمایا، کہ اے ابو ہریرہ جا، اور ہر اس شخص کو جنت کی بشارت دے دے جس نے زبان سے لا الٰہ کہہ دیا ہو، ابو ہریرہ باہر نکلے، تو سب سے پہلے حضرت عمر بن الخطاب سے ملاقات ہوئی، اور یہ بشارت سنائی، عمرؓ نے ابو ہریرہ کو ایک زور کا تھپڑ رسید کیا، ابو ہریرہ روتے ہوئے دربار رسالت میں پہنچے، پیچھے پیچھے عمرؓ بھی پہنچ گئے، حضور نے پوچھا، اسے کیوں پیٹا ہے، کہا کیا آپ نے صرف لا الٰہ کہنے پر جنت کی بشارت دی ہے، فرمایا ہاں، عمرؓ نے کہا از راہ نوازش ایسا نہ کیجیے، ورنہ تمام لوگ اعمال ترک کر دیں گے فخلھم یعملون (آپ لوگوں کو کام کرنے دیں) حضور نے فرمایا بہت اچھا، لوگوں کو کہہ دو، کہ کام کریں (دو اسلام ص ۵۶-۵۷)

ازالہ برق صاحب اصل واقعہ تو اس طرح نہیں، جس طرح آپ نے نقل فرمایا ہے، آپ نے صحیح مسلم کا حوالہ دیا ہے، اور اسی سے میں اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ہریرہ سے فرمایا

من یشھد ان لا الٰہ الا اللہ مستیقنا بھا قلبہ فبشرہ بالجنۃ (مسلم)	یعنی جو شخص اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم و معبود نہیں اور اس پر اسے دلی یقین ہو۔ تو اس کو جنت کی بشارت دو۔

یعنی صرف زبان سے کہنا کافی نہیں، بلکہ دلی یقین ہونا بھی شرط ہے، برق صاحب! حدیث کا یہ ٹکڑا بالکل قرآن کے مطابق ہے، قرآن میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	یعنی جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اسی پر جمے
تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا	رہے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں
تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ	نہ ڈرو۔ نہ غم کرو۔ اور تم کو خوشخبری اس جنت کی جس
تُوْعَدُوْنَ (سورۃ فصلت)	کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

لہٰذا برق صاحب کا یہ فرمانا کہ کتنی دلچسپ حدیث ہے، صرف دو لفظ لا الٰہ منہ سے نکالو، اور جنت لے لو، نہ صوم وصلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدان جہاد میں لہو بہانے کی حاجت" (دو اسلام ۵۵) دراصل قرآن پر اعتراض ہے، کیونکہ قرآن میں بھی یہی ہے کہ صرف دو لفظ "ربنا اللہ" منہ سے نکالو، اور جنت لے لو، آیت میں جو کلمہ "ثم استقاموا" ہے، وہ بالکل حدیث کے الفاظ "مستیقنا بہا قلبہ" کے قائم مقام ہے، یعنی دل میں یہ چیز بیٹھ گئی، کہ اللہ ہی الٰہ ہے، دوسرا کوئی الٰہ نہیں، تو پھر جنت مل گئی، استقامت اور ایقان قلبی یہی وہ چیزیں ہیں جو خود اعمال کی طرف دعوت دیتی ہیں، اور ان ہی چیزوں کی موجودگی میں عمل کا موجود ہونا لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا نہ حدیث میں عمل کی نفی ہے، نہ آیت میں، ہاں غلط فہمی ہو سکتی ہے۔

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہ کو اس خوشخبری کا اعلان کرنے کے لئے روانہ کیا، جب حضرت ابوہریرہ رض روانہ ہوئے تو سب سے پہلے حضرت عمر رض سے ملاقات ہوئی، انہوں نے وہ بشارت سنائی، حضرت عمر رض نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا، جس سے وہ گر پڑے پھر فرمایا اے ابوہریرہ واپس چلو، برق صاحب نے ان الفاظ سے یہ سمجھا ہے، کہ حضرت ابوہریرہ رض پٹ گئے۔ حالانکہ سینہ پر ہاتھ مارنے کی غرض مارنا نہیں تھی، بلکہ واپس چلنے کے لئے تنبیہ تھی، یہ دوسری بات ہے، کہ وہ اس قوت کو برداشت نہ کر سکے، کیونکہ اکثر اوقات بھوکا رہنے کی وجہ سے وہ بہت کمزور تھے، انہوں نے فاقہ کشی اور اس کی وجہ سے اکثر اوقات خود بخود گر جانے کو خود ہی بیان کیا ہے (کتب حدیث)، حضرت عمر رض کی نیت ان کو گرانے یا زدوکوب کرنے کی نہ تھی، اور اسی وجہ سے دربار رسالت میں اس بات پر جواب طلب نہ ہوا، نہ قصاص لیا گیا، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں مذکور ہے، کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک تھپڑ مار کر ایک قبطی کو قتل کر دیا، موسیٰ علیہ السلام کی نیت قتل کرنے کی نہ تھی، لیکن یہ اتفاق کی بات ہے، کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے تھپڑ کی تاب نہ لا سکا اور مر گیا، اور اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں، کہ حضرت عمر رض ابوہریرہ کو احادیث کی روایت پر مارا کرتے تھے، تو پھر یہ قصور حضرت عمر رض کا ہوا، نہ کہ حضرت ابوہریرہ کا اس لئے کہ

حضرت عمرؓ نے اس حدیث کی روایت پر مارا، جو حقیقۃً صحیح تھی، اور صحیح بات کے بیان پر مارنا مارنے والے کا قصور ہے، نہ کہ بیان کرنے والے کا، لیکن برق صاحب اس کو حضرت ابوہریرہؓ کے قصور کے اثبات میں نقل فرما رہے ہیں، اور یہی غلط فہمی ہے۔

الغرض حضرت ابوہریرہ واپس ہوئے اور حضرت عمرؓ کی شکایت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، اے عمرؓ تم انہیں کیوں لے آئے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ کیا آپ نے اس بشارت کا اعلان کرنے ابوہریرہ کو بھیجا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا ایسا نہ کیجیے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں لوگ اس پر بھروسہ نہ کریں آپ انہیں چھوڑ دیجیے تاکہ عمل کرتے رہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا انہیں چھوڑ دو (صحیح مسلم)

یہ حدیث حضرت عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ دونوں نے سنی، لیکن ان میں سے کسی نے نہ نماز چھوڑی نہ جہاد، اس لئے کہ وہ اس حدیث کی صداقت کے ساتھ اس کی منشا سے بھی واقف تھے، بلکہ اسی مضمون کی حدیث متعدد صحابہ سے مروی ہے، ان میں سے کوئی بھی تارک الصلوٰۃ تھا نہ تارک الجہاد، ان کو اس حدیث نے غلط فہمی میں مبتلا نہ کیا تھا، بلکہ وہ اس کی رمز سے واقف تھے، برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، اور وہی غلط فہمی ہوتی جس کا اندیشہ حضرت عمرؓ کو ہوا تھا، حضرت عمرؓ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی سعی کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مشورہ کو قبول فرما کر اصل غلط فہمی کے انسداد کے لئے اشاعت عام سے روک دیا، تاکہ نا اہل اور نافہم لوگ گمراہ نہ ہو جائیں۔

اس حدیث پر مزید اعتراض کرتے ہوئے برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "مذہب کے معاملہ میں حضرت فاروق سرور کائنات کی راہ نمائی فرما رہے ہیں" (دو اسلام ص ۵۷)

ازالہ برق صاحب ہر کام کی ایک مصلحت ہوا کرتی ہے، ہو سکتا ہے کہ ہماری عقل کی رسائی وہاں تک نہ ہو اس حدیث کی اشاعت اور پھر اس کی روک تھام میں کیا مصلحت تھی، اللہ ہی جانتا ہے، مشورہ آپ نے اس لئے قبول فرمایا، گر اس کی مصلحت کو آپ بھی جانتے تھے، مشورہ کو قبول کرنے سے ایک چھوڑ دو دینی سنتوں کا قائم کرنا مقصود تھا۔

(۱) اگر کسی خبر کی اشاعت سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا، اور اس کی وجہ سے گمراہ ہونے کا خوف ہو، تو اس خبر کی اشاعت خلاف سنت ہوگی،

(۲) دوسرے یہ کہ اگر کوئی کم درجہ کا آدمی بھی کوئی صحیح مشورہ دے، تو اس کے مشورہ کو قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرنا چاہیئے، اور اگر ایسے موقع پر کوئی شخص صحیح مشورہ قبول نہ کرے، تو وہ سنت کا مخالف ہوگا

بلکہ اس کا یہ فعل تکبر اور ہٹ دھرمی کی تعریف میں آئے گا

غرض یہ کہ کم از کم دو سبق تو ہمیں اس حدیث سے ملتے ہی ہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث کو بیان ہی نہ کرتے، تو نہ یہ حدیث علماء راسخین کو ملتی نہ یہ اسباق حاصل ہوتے۔ اب رہا یہ اعتراض کہ حضرت عمرؓ جس نتیجہ پر پہنچے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس تک نہ پہنچ سکے، یہ بھی صحیح نہیں، ہم یہ نہیں کہتے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو نہ جانتے تھے، ضرور جانتے تھے، لیکن مشورہ کی سنت کو قائم کرنا بھی ضروری تھا، اور یہ معاملہ اسی طرح مقدر تھا، اور اسی طرح اللہ کو منظور تھا، اس کی مثال قرآن سے سنیئے اللہ تعالےٰ جانتا ہے، کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں کیا ہے، لیکن پھر بھی پوچھتا ہے

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ	اے موسیٰ۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

یہاں موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے کہلوانا مقصود تھا، اس سے اللہ تعالیٰ کی لاعلمی ثابت نہیں ہوتی، ہاں اس میں کوئی مصلحت ضرور تھی، جس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، ہمیں اختیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں دخل دیں، اور اس کی مصلحتوں کی بے ضرورت چھان بین کریں، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید کی مزید چند آیات درج ذیل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے، اس قصہ میں ہے کہ حضرت خضر نے ایک معصوم بچے کو قتل کر ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بطور اعتراض فرمایا۔

أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا	یہ آپ نے کیا کیا؟ کہ ایک معصوم لڑکے کو بغیر کسی قصاص کے قتل کر دیا یہ تو آپ نے بہت ہی برا کام کیا

انہوں نے اس اعتراض کا جو کچھ جواب دیا، اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں سنیئے:۔

أَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا (سورہ کہف)	اس لڑکے کو اس لئے قتل کیا گیا۔ کہ اس کے ماں باپ مومن تھے پس ہم ڈرے کہ کہیں وہ ان دونوں کو سرکشی میں مبتلا نہ کر دے۔

ان قرآنی آیات پر بھی طرح طرح کے اعتراض وارد ہوتے ہیں، مثلاً بے جرم کسی معصوم بچے کو قتل کرنا انتہائی ظلم ہے، اور اللہ تعالےٰ خود فرماتا ہے

وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ۔	اور اللہ تعالےٰ اپنے بندوں پر ظالم نہیں ہے

لہٰذا ایسا نہیں ہو سکتا کہ بغیر جرم کے اللہ تعالےٰ ایک معصوم بچے کو قتل کرا دے، ابھی جرم واقع نہیں ہوا تھا اور آئندہ ہونا بھی یقینی نہیں تھا، بلکہ محض اندیشہ تھا، جو "خشینا" کے لفظ سے ظاہر ہے، لہٰذا ایک موہوم

غیر یقینی جرم کے عوض قتل کرنا کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا، اور یہ اللہ تعالیٰ رحیم وکریم کی شان سے بعید ہے حضرت خضر کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے "وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي" میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ حکم الٰہی اسی طرح تھا سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اس کو زندہ رکھ کر ماں باپ کو کفر سے نہیں بچا سکتا تھا، کیا اس بچہ میں اتنی زبردست طاقت تھی، کہ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں اس کو ہلاک کر دیا کہ کہیں جوان ہو کر قابو سے باہر ہو جائے پھر آخر اس میں مصلحت کیا ہے، کہ پہلے اس کو پیدا کیا، اور پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کو قتل کرا دیا، اور اپنے محبوب بندوں یعنی اس کے ماں باپ کو صدمہ پہنچایا، اور پھر قتل بھی خفیہ طریقہ پر کرایا گیا، نہ اس کے ماں باپ کو خبر نہ عزیز واقارب کو، اگر اللہ تعالیٰ کو یہ اندیشہ تھا، کہ وہ گمراہی کا سبب بنے گا، تو اس کو پیدا ہی کیوں کیا تھا، آخر اللہ تعالیٰ کو وہ دونوں ماں باپ اتنے عزیز کیوں تھے، کہ ان کی گمراہی کے خوف سے ان کے بے گناہ بچے کو قتل کرا دیا، پھر وہ ماں باپ بھی ایمان میں اتنے کمزور تھے، کہ آزمائش میں پورے نہ اتر سکتے تھے، اتنی بھی استقامت نہیں تھی، کہ وہ اس بچہ کے فتنہ سے بچ جاتے، اتنے ضعیف الایمان ماں باپ آخر اللہ کو کیوں اتنے پیارے تھے، دنیا میں سینکڑوں نیک ماں باپ اپنے بچوں کی وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کبھی بھی ان کی خاطر ان کی اولاد کو قتل نہیں کراتا، یہ کہاں کا انصاف ہے اللہ تعالیٰ کبھی ناانصافی نہیں کرتا، اس کا قانون سب کے لئے یکساں ہے، پھر ایسا کیوں ہوا، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، برق صاحب غور فرمائیں، اللہ کی مصلحت اللہ ہی جانتا ہے، ہماری عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی، حدیث زیر بحث کی اشاعت کو حضرت عمرؓ کے مشورہ سے روکنا منظور تھا، اور لڑکے کو پیدا کر کے ہی قتل کرانا مقدر تھا، مصلحت وہ جانے ہم تو یہ کہتے ہیں "آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا"

مندرجہ بالا آیات تو میں نے اللہ تعالیٰ کی مصلحت اور ہمارے ظاہری اعتراض کی وضاحت کے لئے پیش کی تھیں، اب میں بتاتا ہوں، کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ مشورہ قبول فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ	اے موسیٰ فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکشی میں مبتلا ہے

موسیٰ علیہ السلام مشورہ دیتے ہیں:-

وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۔ هَارُونَ أَخِي اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي (سورہ طٰہٰ)	اے اللہ میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے اور مجھے اس کے ذریعہ قوت عطا فرما اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے۔

بلکہ موسیٰ علیہ السلام یہاں تک کہہ گئے:-

يَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنطَلِقُ لِسَانِي	یعنی میرا سینہ تنگ ہوتا ہے میری زبان رکتی ہے

فَاَرْسِلْ اِلٰی ھَارُوْنَ (شعراء) — اس لئے ہارون کو بھی منصب رسالت دیدے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی (طٰہٰ) — اے موسیٰ تمہاری خواہش پوری کی جاتی ہے۔

اب اس قصہ پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے، کہ کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم نہیں تھا، کہ یہ کام تنہا موسیٰ علیہ السلام کے بس کا نہیں، اس میں ہارون علیہ السلام کی وزارت اور رسالت کی بھی ضرورت ہے، جب موسیٰ علیہ السلام نے توجہ دلائی اور مشورہ دیا، تو اللہ تعالیٰ کو بھی خیال آیا کہ ہاں ٹھیک ہے، ایسا ہی ہونا چاہیئے ہمارا یہ اعتراض محض ظاہری ہے، باطنی مصلحت کو اللہ ہی جانتا ہے، کہ ہارون علیہ السلام کو رسول بنانا موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ پر کیوں موقوف تھا، اور حدیث زیر بحث کی اشاعت کو حضرت عمر رضؓ کے مشورہ سے روکنا کیوں ضروری تھا، جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے صحیح مشورہ کو قبول فرما لیتا ہے، تو نبی پر کیا اعتراض ہے، اگر وہ اپنے ایک امتی کے مشورے کو قبول فرما لے، لاعلمی کا اعتراض نہ اللہ تعالیٰ پر صحیح ہے نہ اس کے رسول پر (صلی اللہ علیہ وسلم)

خلاصہ حدیث زیر بحث پیش کر کے برق صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت عمر رضؓ نے حضرت ابوہریرہ رضؓ کو حدیث بیان کرنے پر مارا تھا کسی طرح صحیح نہیں، نہ یہ صحیح ہے، کہ حضرت ابوہریرہ حضرت عمر کے خوف سے حدیث بیان نہیں کرتے تھے، بلکہ حضرت عمر رضؓ تو خود حدیث کے متلاشی رہتے تھے، اور حضرت ابوہریرہ رضؓ حضرت عمر رضؓ کی موجودگی میں، اور بقول برق صاحب "اکڑ کر اور چھاتی تان کر" (دو اسلام ص۸۰ املاء) بیان کرتے تھے، سنیئے:۔

اُتی عمر بامرأۃ تشم فقال انشد کم باللہ ھل سمع احد منکم من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ابو ھریرۃ فقمت فقلت یا امیر المؤمنین انا سمعتہ قال فما سمعتہ قلت سمعتہ یقول لا تشمن ولا تستوشمن (نسائی۔ کتاب الزینۃ جلد دوم)	حضرت عمر رضؓ کے پاس ایک عورت لائی گئی جو بدن گودتی تھی۔ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں۔ کیا تم میں کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سلسلہ میں کچھ سنا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں میں (چھاتی تان کر) کھڑا ہو گیا اور میں نے کہا اے امیر المومنین میں نے سنا ہے حضرت عمر رضؓ نے فرمایا تم نے کیا سنا ہے حضرت ابوہریرہ نے کہا آپ کو یہ فرماتے

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرا مطلب یہ نہیں، کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ اس قسم کی احادیث تراشا کرتے تھے، بلکہ یہ ہے، کہ

یار لوگ گھڑ کر ان کا نام جڑ دیتے تھے" (ردِّ اسلام ص۵۷، ۵۸)

ازالہ یہ یار لوگ کون تھے؟ اگر واقعی یہ یار لوگ تھے، تو محدثین نے ان کو گرفت میں لے لیا، اور ان کی پوری قلعی کھول دی ہے، اور اگر یہ ائمہ دین تھے، تو پھر اعتراض ہی کیا ہے؟

غلط فہمی برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

۱۰۔ اور یہ بھی ممکن ہے، کہ ابو ہریرہ خود بھی روایت میں قدرے غیر محتاط واقع ہوئے ہوں، علامہ ذہبی نے ان کا یہ نقرہ نقل کیا ہے، ابو ہریرہ فرماتے ہیں، کہ" میں نے ایسی ایسی احادیث بیان کی ہیں، کہ اگر عمر بن خطاب کے زمانے میں بیان کرتا تو وہ مجھے درے سے پیٹ ڈالتے" کیوں پیٹ ڈالتے؟ سرورِ کائنات کا اسوہ بیان کرنے پر کیا کوئی مسلمان ایسا کر سکتا ہے، نہیں، بلکہ مشتبہ احادیث کی روایت پر (ردِّ اسلام ص۵۸)

ازالہ یہ بالکل غلط ہے، کہ حضرت ابو ہریرہ قدرے غیر محتاط تھے، ان کو تمام احادیث حفظ تھیں، اور پھر ان کو لکھ بھی رکھا تھا، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، وہ حدیث سناتے تھے، اور پھر بتاتے تھے، کہ دیکھو یہ اسی طرح میرے پاس لکھی ہوئی بھی ہے، مروان نے ان کا امتحان لیا، ان سے احادیث سنیں، اور ان کی لاعلمی میں ان کو قلمبند کرا لیا، پھر ایک سال کے بعد وہی احادیث سنیں، اور ایک شوشہ کا فرق نہ پایا، لہٰذا یہ کہنا، کہ وہ قدرے غیر محتاط تھے، قطعاً صحیح نہیں، حضرت ابو ہریرہ کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

لو کنت احدث فی زمان عمر مثل ما احدث کم لضربنی بمخفقۃ	اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کثرت سے حدیث روایت کرتا، جتنی اب کرتا ہوں تو وہ مجھے دُرّے سے مارتے

(برقِ اسلام ص۳۶)

مطلب یہ ہے، کہ حضرت عمرؓ بموجب فرمان نبوی کثرت روایت سے روکتے تھے، اس لئے کہ سننے والے کو یاد نہیں رہتیں، نہ یہ کہ مطلقاً حدیث کی روایت سے روکتے تھے یہ تو کسی طرح صحیح نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ یا دیگر صحابی مشتبہ احادیث روایت کرتے تھے، مشتبہ کہنے کی آخر کوئی وجہ تو ہونی چاہیئے، آخر صحابہ کرام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی اور راوی تھے، جن کی وجہ سے روایتیں مشتبہ تھیں، کیونکہ یہ چیز عقلاً محال ہے، لہٰذا حضرت عمرؓ کا مشتبہ حدیثوں کی بنا پر تشدد کرنا صحیح نہیں، ہاں یہ ضرور ہے، کہ وہ کسی شخص میں یہ جرأت پیدا نہیں ہونے دیتے تھے، کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو چاہے منسوب کر دے، اور اسی وجہ سے وہ صحابہ کے ساتھ بھی سختی کرتے تھے، تاکہ منافقین یا اور لوگوں کو افتراء کا موقع نہ ملے اور وہ عبرت پکڑیں، اور یہ سب کچھ حدیث کی تخلیص کے لئے تھا، نہ کہ حدیث دشمنی کی خاطر، اس کی مثال کے

لئے مندرجہ ذیل واقعہ ملاحظہ ہو(اس واقعہ کو برنی صاحب نے بھی اعتراضات ص۲۵ پر نقل فرمایا ہے)

حضرت ابوموسٰی اشعری حضرت عمرؓ کے مکان پر گئے، تین دفعہ سلام کیا لیکن اجازت نہ ملی تو واپس چلے آئے، حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، اس لئے اجازت نہ دے سکے، جب کام سے فارغ ہوئے تو کہا بلاؤ، حضرت ابوموسی کو واپس بلایا گیا، حضرت عمرؓ نے ان سے واپس چلے جانے کا سبب پوچھا، انہوں نے کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

"اذا استاذن احدکم ثلاثا فلم یؤذن له فلیرجع"	جب تم میں سے کوئی تین دفعہ اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے تو واپس چلا آئے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

اقم علیه البینة والا اوجعتك	اس پر گواہ پیش کرو۔ ورنہ تمہیں سزا دونگا۔

حضرت ابوموسیٰؓ وہاں سے پریشان حالت میں انصار کی ایک مجلس میں پہنچے، اور ان سے اس کی تصدیق چاہی، حضرت ابی بن کعب نے فرمایا، ان کے ساتھ ہماری قوم کا سب سے چھوٹا آدمی جائے گا (مطلب حضرت ابی بن کعب کا یہ تھا کہ بچہ بچہ کو یہ حدیث حفظ ہے، اس میں تعجب کی کونسی بات ہے) الغرض حضرت ابوسعید خدری ان کے ساتھ آئے اور گواہی دی، اس وقت حضرت عمرؓ نے بطور افسوس کے فرمایا:۔

خفی علی هذا من امر رسول الله صلی الله علیه وسلم الهانی عنه الصفق بالاسواق	یہ حدیث مجھ پر پوشیدہ رہی مجھے بازاروں میں خرید فروخت نے غافل رکھا۔

حضرت ابی بن کعبؓ نے اس موقعہ پر حضرت عمرؓ سے کہا، یہ حدیث میں نے بھی سنی ہے، پھر فرمایا اے ابن خطاب

فلا تکونن عذابا علی اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر عذاب مت ہو۔

حضرت عمرؓ نے معذرتاً فرمایا:۔

سبحان الله انما سمعت شیئا فاحببت ان اتثبت (صحیح مسلم باب الاستیذان) لا اکون عذابا علی اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم (ابوداؤد)	سبحان اللہ! میری نیت سختی کی نہیں تھی میں نے ایک حدیث سنی تھی تو میں نے چاہا اس کی تصدیق بھی کرلوں۔ میں اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سخت نہیں ہوں۔

یعنی میری منشا کچھ اور ہی ہے، حضرت عمرؓ کی منشا کیا تھی، وہ حضرت عمرؓ ہی کے الفاظ میں سنیئے، حضرت عمرؓ نے اسی موقعہ پر حضرت ابوموسیٰ سے معذرتًا اور ان کی دلجوئی کی خاطر فرمایا تھا:۔

انی لم اتہمک ولکن الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ولکن خشیت ان یتقول الناس علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابوداؤد۔ کتاب الادب)	یعنی اے ابوموسیٰ میں تم پر تہمت نہیں لگاتا کہ تم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف غلط منسوب کرتے ہو بلکہ بات یہ ہے کہ آپ کی حدیث بیان کرنا بڑا اہم مسئلہ اور بڑی بھاری بات ہے۔ (میں نے تو تم پر سختی کرنے کی) دھمکی اس لئے دی تھی کہ مجھے یہ خوف ہوا کہ دوسرے لوگ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جھوٹ بات بنا کر منسوب کردیں

یعنی لوگ جرأت پکڑیں گے، کہ جب صحابہ کرام پر اس معاملہ میں سختی ہوتی ہے، تو ہمارا تو نہ معلوم کیا حال ہوگا، کیا سزا ملے گی، اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ حضرت عمرؓ کیوں سختی کرتے تھے، اس لئے نہیں، کہ وہ حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس لئے کہ جو بات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہو، وہ پورے طریقہ سے ثابت شدہ اور قطعی ہو، ایسا نہ ہو، کہ کسی ڈھیل کی بنا پر ہر کس وناکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ بات منسوب کردے، اور اسے یہ خیال ڈر بھی نہ ہو کہ گواہی کی ضرورت پیش آئے گی، اور ثبوت مہیا کرنا پڑے گا، اس حدیث کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں، کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ تک کسی شخص کو حدیث بنانے کی جرأت نہیں ہوئی، لہذا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں گھڑی ہوئی حدیث کا وجود یا مشتبہ احادیث کا پایا جانا محض وہم ہے، اور بعد میں بلکہ بہت بعد میں جن لوگوں نے حدیثیں بنائیں، وہ بچ کر نہیں نکل سکے فن حدیث نے پوری طرح ان کا تعاقب کیا، اور ان کو اپنی گرفت میں لے لیا برق صاحب یہ ہیں صحیح احادیث جن کو ادپر نقل کیا گیا، اور یہ ہے حضرت عمرؓ کا طرز اور اہتمام تحفظ حدیث، ہم تو صحیح احادیث پیش کرکے آپ کی غلط فہمی کو دور کرتے ہیں، اور آپ محض تاریخی اقتباسات پیش کرتے رہتے ہیں، جن کا کوئی اعتبار نہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے ہر حوالہ کو موضوع اور جھوٹ ثابت کردیا، بخاری ومسلم کی احادیث کے مقابلہ میں تذکرۃ الحفاظ یا اسی قسم کی دوسری کتابوں کے حوالے، جن کی سند میں مفتری ومجہول راوی ہوں کسی طرح زیبا نہیں، اب آپ سمجھ گئے ہوں گے، کہ حضرت ابوہریرہؓ نے (بشرطیکہ یہ قول ان کا تسلیم کرلیا جائے) کیوں یہ گمان کیا، کہ حضرت عمرؓ مجھے مارتے، اس لئے کہ ان کے سامنے یہ واقعہ موجود تھا، اور وہ ڈرتے تھے، کہ کہیں حدیث بیان کروں، اور گواہ نہ ملے، تو ممکن ہے کہ سزا ملے، حالانکہ حضرت عمرؓ کا منشا مارنا نہیں تھا، بلکہ حدیث کی حفاظت کے لئے لوگوں کو ہوشیار کرنا تھا، جیسا کہ حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابوموسیٰ کو جو مذکورہ بالا

جوابات انہوں نے دیئے ان سے ظاہر ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمارے موجودہ علما میں، ایک دو خرابیاں بھی ہیں ۔اول، کہ ملکہ تنقید سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے وہ صحیح و غلط میں تمیز نہیں کر سکتے دوم وہ اسلاف پرستی اور اندھی تقلید کے امراض میں مبتلا ہیں (دو اسلام ص۵۹)

ازالہ یہ غلط ہے، کہ ملکہ تنقید سے علماء بالکل بے بہرہ ہیں، ماضی قریب میں ایسے لوگ گذر چکے ہیں جن کو فن تنقید میں کافی مہارت تھی، مثلاً امام شوکانی، سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی مولانا شمس الحق صاحب مصنف عون المعبود مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری وغیرہ وغیرہ، اور خود برق صاحب کے ہم عصر مشہور محدث احمد محمد شاکر، احمد عبدالرحمٰن البنار الشہیر بالساعاتی، اور مولانا شرف الدین صاحب محدث دہلوی، مؤخر الذکر محدث نے آپ جیسے ایک صاحب کی پیش کردہ تمام روایتوں کو ناقدانہ نظر سے دیکھ کر ان کی حقیقت سے لوگوں کو روشناس کرایا، ان کی مایہ ناز کتاب "برق اسلام" اس کا زندہ ثبوت ہے، اور بھی بہت سے علماء جو ابھی موجود ہیں سندوں پر ناقدانہ نظر ڈال سکتے ہیں، بلکہ ڈالتے رہتے ہیں، یہ دوسری بات ہے، کہ برق صاحب کو ان کا علم نہ ہو،

یہ بھی غلط ہے کہ ہمارے تمام علماء اسلاف پرستی اور اندھی تقلید کے امراض میں مبتلا ہیں، بلکہ ایسے بہت سے علماء موجود ہیں، اور موجود رہے ہیں، جو اندھی تقلید سے کلیتہً بیزار ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"شیخ عبدالحق دہلوی لاکھ چلائیں، کہ صحاح میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے" (دو اسلام ص۵۹)

ازالہ یہ کس نے کہا ہے، کہ صحاح میں صرف احادیث ہیں، نہیں بلکہ دوسروں کے اقوال بھی ہیں، مگر اس کے یہ معنی نہیں، کہ صحیح احادیث کے متن میں اقوال کی آمیزش ہے، یہ قطعاً غلط ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"علامہ ابن حجر ہزار کہیں، کہ صحیح بخاری کی چالیس احادیث جھوٹی ہیں" (دو اسلام ص۵۹)

ازالہ یہ بالکل جھوٹ ہے، علامہ ابن حجر نے یہ کہیں نہیں کہا، جس شخص نے ایسی عبارت نقل کی ہے اس نے یا تو دھوکہ دیا ہے، یا دھوکا کھایا ہے، ابن حجر کا حاشا وکلا ایسا کوئی قول نہیں، ابن حجر تو صحیح بخاری کی ہر حدیث کو قطعی الصحت سمجھتے ہیں (فیض الباری شرح صحیح بخاری جلد اول ص۴۵)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"شیخ حمید الدین فراہی بے شک کہتے پھریں، میں نے صحاح میں ایسی احادیث دیکھیں، جو قرآن کا

صفایا کر دیتی ہیں، ہم اس عقیدہ سے پناہ مانگتے ہیں، کہ کلام رسول، کلام خدا کو منسوخ کر سکتا ہے (دو اسلام صفحہ)

فراہی صاحب نے جو کچھ لکھا، وہ بالکل غلط ہے، وہ حدیث کو سمجھے ہی نہیں، اور اسی لئے انہوں نے

ازالہ اس کو قرآن کے خلاف سمجھا، پھر فراہی صاحب خود محدث ہیں، نہ صحیح العقیدہ، لہٰذا ان کا قول ساقط الاعتبار ہے، صحاح میں کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں جو قرآن کے خلاف ہو، یا قرآن کی کسی آیت کو منسوخ کرتی ہو، مزید براں فراہی صاحب کا کلام رسول اور کلام خدا کو علیحدہ سمجھنا بھی غلطی ہے، کلام رسول بھی اصل میں حکم خدا ہی ہے، حکم خدا سے حکم خدا کا منسوخ ہونا کوئی مستبعد امر نہیں،

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"ایک مرتبہ صحابہ کرام نے رسول اللہ سے التجا کی حدثنا (کوئی حدیث بیان فرمایئے) تو جھٹ یہ آیت نازل ہوئی اَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا، اللہ نے قرآن نازل کیا ہے، اور یہی بہترین حدیث ہے، دوبارہ کہا حدثنا شیئا دون القران (قرآن کے بغیر کوئی اور بات سنایئے) تو سورہ یوسف اترنے لگی (دو اسلام صفحہ ۶۰)

ازالہ یہ قصہ سنداً صحیح نہیں، پھر اصل الفاظ بھی یہ نہیں، بلکہ اس طرح ہیں حدثنا فوق الحدیث ودون القران "یعنی حدیث (قرآن) کے علاوہ کچھ سنایئے (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۶۷) اس روایت کے کذب ہونے پر اور بھی چند وجوہ ہیں :۔

اول۔ سورہ یوسف مکی سورہ ہے، اس زمانہ میں حدیث بیان کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس زمانہ میں تو شرک و توحید، کفر و ایمان کی ہنگامہ خیز کشمکش جاری تھی، کسے ہوش تھا، کہ توحید کے علاوہ کسی اور چیز کی معلومات کا مطالبہ کرتا، رفاعہ بن رافع کہتے ہیں، کہ میں مکہ ہی میں مسلمان ہوا تھا، اور یہ سورت میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہاں ہی سنی تھی لوگ مجھے اسلام لانے کی وجہ سے دیوانہ سمجھنے لگے (احسن التفاسیر)

دوم۔ اس قصہ کے جھوٹ ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہے، کہ سورہ یوسف کا شان نزول ہی یہ نہیں جو اس قصہ میں بیان ہوا ہے، بلکہ یہود کے بہکانے سے کفار مکہ نے سوال کیا، کہ یعقوب علیہ السلام تو ملک شام میں رہا کرتے تھے، پھر ان کی اولاد مصر میں کیسے پہنچ گئی، اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورہ یوسف نازل فرمائی (تفسیر احسن التفاسیر)

غلط فہمی برق صاحب نے حضرت سفیان ثوری، امام سفیان بن عیینہ، اور بکر بن حماد شاعر کے اقوال نقل کئے ہیں جن کا مضمون واحد ہے، اور وہ یہ ہے، کہ "حدیث اچھی چیز نہیں، اگر اچھی چیز ہوتی، تو اچھی چیزوں کی طرح کم ہوتی جاتی لیکن یہ تو بڑھ رہی ہے لہٰذا بری چیز ہے" (دو اسلام ملخصاً صفحہ ۶۱)

ازالہ (۱) حضرت سفیان ثوری کی طرف جو قول منسوب ہے، وہ بالکل کذب وافترا ہے، اس کی سند میں ابراہیم بن نعمان مجہول ہے، دوسرا راوی محمد بن علی بن مروان بھی مجہول ہے، تیسرا راوی علی بن جمیل رقی کذاب ہے، جو جھوٹی روایتیں نقل کیا کرتا تھا (برق اسلام ص۶) سفیان ثوری سے حدیث اور اصحاب الحدیث کی تعریف میں متعدد اور باسند اقوال منقول ہیں، جن کا نقل کرنا طوالت سے خالی نہیں، تفصیل کے لئے برق اسلام ملاحظہ فرمائیں، سفیان ثوری بہت بڑے محدث ہیں، اور حدیث ہی کی وجہ سے ان کی عزت ہے

(۲) امام سفیان بن عیینہ کی طرف جو قول منسوب ہے، وہ بھی کذب وافترا ہے، اس کی سند میں عبداللہ بن محمد بن یوسف اور یحییٰ بن مالک مجروح ہیں، محمد بن سلیمان بن ابی الشریف اور زکریا قطان مجہول غیر معتبر ہیں اور محمد بن موسیٰ کئی ہیں، معلوم نہیں یہ کون سے ہیں، گویا تمام سلسلہ رواۃ ہی واہی تباہی ہے (برق اسلام ص۷) سفیان بن عیینہ بھی بہت بڑے محدث ہیں، اور حدیث کے ائمہ میں سے ہیں۔

(۳) بکر بن حماد شاعر کے قول کی ہمیں پرواہ نہیں اگر وہ صحیح بھی ہو، تو بفحوائے آیت کریمہ

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ. أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ (الشعراء) — شعراء کی پیروی کرنے والے گمراہ ہیں۔ شعراء ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

گمراہی اور ضلالت ہے، پھر یہ قول کہ "خیر کم ہوتی جاتی ہے، اور برائی بڑھتی رہتی ہے" کلیۃً صحیح نہیں اللہ فرماتا ہے

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل) — کہہ دیجئے کہ حق آگیا باطل مٹ گیا۔ اور باطل مٹنے ہی کے لئے ہے

جو خیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نازل ہوئی، وہ بڑھتے بڑھتے کمال کو پہنچ گئی، صحابہ کرام رضہ کے ایمان کا زیادہ ہوتے رہنا خود قرآن سے ثابت ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

• بشر بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے ابو خالد الاحمر الکوفی (وفات ۱۹۶ھ) کو یہ فرماتے ہوئے سنا، کہ "ایسا زمانہ بھی آ رہا ہے کہ لوگ قرآن شریف کو ایک طرف رکھ دیں گے، اور احادیث کی تلاش میں نکل پڑیں گے" (دو اسلام ص۳۷)

ازالہ یہ قول بھی جھوٹ اور بہتان ہے، اس کی سند میں دو راوی مجروح ہیں، ایک عبداللہ بن محمد عبدالمومن اس کا ضبط روایت بھی نہایت خراب تھا، اس کی ہجو بھی کہی گئی ہے، دوسرا راوی عبدالباقی ہے اس نام کے دو شخص ہیں، ایک ضعیف خطاکار، دوسرا زندیق، بدمعاش (برق اسلام ص۶۳)

غلط فہمی آگے چل کر برق صاحب اوراد و وظائف اور اللہ کے ذکر کے فضائل پر اعتراض کرتے ہوئے ایک حدیث نقل فرماتے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہے:۔

"جو شخص دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ کا ورد کرے گا، اس کی تمام سیاہ کاریاں معاف ہو جائیں گی، خواہ وہ سمندر کے جھاگ سے بھی زیادہ ہوں" (دداسلام ص ۶۳)

ازالہ:۔ اس غلط فہمی کے کئی جواب ہیں۔

پہلا جواب:۔ اللہ تعالے فرماتا ہے:۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (ذاریات) ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں

یعنی اچھے اور برے، اگر زہر پیدا کیا ہے، تو ساتھ ہی تریاق بھی پیدا کیا ہے، اگر ہمارے دشمن جراثیم پیدا کئے ہیں، تو ساتھ ہی ان کی مدافعت کرنے والے اور ان کو فنا کے گھاٹ اتارنے والے جراثیم بھی پیدا کئے ہیں، کروڑوں نقصان رساں جراثیم ہمارے جسم پر ہر لحظہ حملہ کرتے رہتے ہیں، لیکن ہمارے جسم کے نفع بخش جراثیم ان کو لپسپا کر کے ہلاک کر دیتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ضرر رساں جراثیم کا غلبہ ہوتا ہے، اور ہم بیمار ہو جاتے ہیں، پھر ان ضرر رساں جراثیم کے غلبہ کو توڑنے کے لئے دوا استعمال کرنی پڑتی ہے، غرض یہ کہ ساری کائنات میں یہی چیز کار فرما ہے، ایک ضد دوسری ضد کو فنا کرتی رہتی ہے، یہی حال خیر و شر کا ہے، کبھی شر کا غلبہ ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم) یعنی لوگوں کی بداعمالی کی وجہ سے بحر و بر میں فساد کا غلبہ ہو گیا۔

اسی طرح حدیث میں ہے، حضرت حذیفہ پوچھتے ہیں:۔

انا کنا فی جاھلیۃ وشر فجاءنا اللہ بھذا الخیر فھل بعد ھذا الخیر من شر، قال نعم۔ (متفق علیہ) یعنی اے اللہ کے رسول، ہم جاہلیت اور شر میں تھے پھر اللہ نے یہ خیر بھیج دی تو کیا اس خیر کے بعد بھی شر ہو گی فرمایا ہاں"۔

اور کبھی خیر کا غلبہ ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث بالا میں ہے، اور جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (بنی اسرائیل) کہدے حق آگیا باطل مٹ گیا۔

بالکل یہی حالت گناہ اور ثواب کی ہے، گناہ بھی ہوتے رہتے ہیں، اور ثواب بھی ہوتا رہتا ہے، اور ان دونوں کا تصادم شائع و ذائع ہے، کبھی گناہ کا غلبہ ہو جاتا ہے، اور نیکیاں لپسپا ہو جاتی ہیں، اور کبھی نیکیاں غالب ہوتی ہیں، اور برائیاں دفع ہو جاتی ہیں، ایک، دوسرے کی ضد ہے، اور ایک، دوسرے کے فنا کا سبب، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے، کہ ایک گناہ سارے نیک اعمال ختم کر دیتا ہے، مثلاً اللہ تعالی فرماتا ہے:۔

لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ یعنی اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے سارے اعمال ضائع ہو

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ (محمد) — اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اور اپنے اعمال کو ضائع مت کرو۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ اللہ اور رسول کی نافرمانی سارے نیک اعمال کا خاتمہ کر دیتی ہے، اسی طرح حدیث میں ہے

من ترك صلوة العصر فقد حبط عمله (صحیح بخاری) — جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

ان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب (ابوداؤد) — بے شک حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔

مندرجہ بالا آیات و حدیث سے ثابت ہوا، کہ بعض گناہ تمام نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں۔

بعض گناہ ایسے بھی ہیں، جو خاص قسم کی نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (بقرہ) یعنی احسان (منت) اور اذیت سے اپنے صدقات کو ضائع (مت کرو)

مطلب یہ کہ جو شخص کسی کو کچھ خیرات دے، اور پھر اس پر احسان بھی رکھے یا اس خیرات کی وجہ سے خیرات لینے والے کو کسی قسم کی تکلیف پہنچائے، تو اس کا خیرات کرنا اس کے لئے مفید نہ ہوگا، بلکہ اس کی خیرات ضائع کر دی جائے گی، اس آیت سے معلوم ہوا، کہ احسان اور اذیت سے صدقات کالعدم ہو جاتے ہیں۔

جس طرح گناہ نیکیوں کو ضائع کرتے رہتے ہیں، اسی طرح نیکیاں بھی گناہوں کو فنا کرتی رہتی ہیں، جیسا کہ برق صاحب کی وارد کردہ حدیث میں ہے، اور یہ چیز قرآن سے ثابت ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا. يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (احزاب) — اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچی بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح کر دے گا۔ اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔

اس آیت میں صرف اللہ سے ڈر کر سچ کہہ دینے کو مغفرت ذنوب کا سبب بنا دیا۔

نیکیاں گناہوں کو فناہ کر دیتی ہیں، قرآن کا اٹل قانون:۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ہود) — بے شک نیکیاں برائیوں کو فنا کر دیتی ہیں۔

دوسری آیت:۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ — اگر تم علانیہ خیرات کرو تو یہ بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر

وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ (البقرۃ)

فقراء کو دو تو یہ بہتر ہے اللہ تعالےٰ تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔

تیسری آیت :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (الانفال)

اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرو تو اللہ تمہارے لئے ایک فرقان مقرر کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دیگا اور تم کو بخش دیگا بے شک اللہ بڑے فضل والا ہے

چوتھی آیت :-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ (عنکبوت)

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ہم ان کے گناہ معاف کر دیں گے۔

پانچویں آیت :-

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ (الاحقاف)

ہم مسلمانوں کے نیک کاموں کو قبول کرتے ہیں اور گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں یہ جنت والوں میں سے ہیں۔

چھٹی آیت :-

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ (الصف)

تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔ اللہ کے راستہ میں جان و مال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اللہ تعالےٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تمہیں جنت میں داخل کر دے گا۔

ساتویں آیت :-

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا (طلاق)

اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا اور اس کو بہت بڑا اجر دے گا

آٹھویں آیت :-

مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (نمل)

جس نے گناہ کیا اور گناہ کے بعد اس کی جگہ نیکی کی تو میں معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہوں

گناہ کون سے معاف ہوتے ہیں

حدیث مذکور جس کو مورد اعتراض سمجھا گیا ہے، اس میں جن گناہوں کی مغفرت کا ذکر ہے، وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں صغیرہ گناہ ہیں، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّکَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَۃِ (نجم)

جو لوگ بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں سوائے اس کے کہ کچھ ہلکے ہلکے گناہ سرزد ہو جائیں تو بے شک تیرا رب بڑی وسیع مغفرت والا ہے

دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ (نساء)

اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہے تو اللہ تعالےٰ تمہارے سب گناہ معاف کر دیگا

دیکھئے اس آیت میں تمام گناہوں کی مغفرت کا بیان ہے، خواہ وہ سمندر کے جھاگ سے بھی زیادہ ہوں، پھر یہ کہ ان آیات میں صرف بڑے گناہوں سے بچنے کو صغائر کی مغفرت کا سبب بتایا ہے، اور جہاں بڑے گناہوں سے بچ کر کوئی نیکی بھی کر لی جائے مثلاً روزانہ سو مرتبہ "سبحان اللہ وبحمدہ" پڑھ لیا جائے، تو کیا تعجب ہے کہ تمام صغیرہ گناہ معاف ہو جائیں، غالباً اب حدیث کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا، قرآن تو بغیر نیکی کے سب گناہ معاف کرنے کی خوشخبری سناتا ہے، اور حدیث میں اس سے کچھ زاید ہی ہے یعنی تسبیح و تحمید، اگر حدیث پر اعتراض ہو سکتا ہے، تو قرآن پر نعوذ باللہ اس سے زیادہ اعتراض ہونے کی گنجائش ہے، لیکن یہ صرف غلط فہمی ہوتی ہے حقیقت کچھ اور ہے، اور قرآن و حدیث کو صحیح طور پر نہ سمجھنا ہی ایسی غلط فہمیوں کا باعث ہوا کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، پانچوں نمازیں، جمعہ اور رمضان درمیانی عرصہ کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں

اِذَا اجْتُنِبَتِ الْکَبَائِرُ (صحیح مسلم) بشرطیکہ بڑے گناہوں سے بچا جائے۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا، کہ اگر بڑے گناہوں سے بچا جائے، تو مذکورہ بالا نیکیاں خود بخود چھوٹے گناہوں کو فنا کر دیتی ہیں، پس قرآن و حدیث سے ثابت ہوا کہ بعض نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں، اور وہ گناہ بڑے گناہ نہیں ہوتے بلکہ صغائر ہوتے ہیں، لہٰذا حدیث پر جو اعتراض کیا گیا ہے، وہ مدفوع ہے۔

بغیر نیکی کے گناہ کا معاف ہونا

اور ہم ایک آیت نقل کر چکے ہیں، کہ صرف کبائر سے پرہیز ہی تمام خطاؤں کو معاف کرنے کا سبب بن جاتا ہے ہی نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ ویسے ہی بہت سے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، اور معافی کے لئے کوئی سبب بھی بیان نہیں کرتا، ارشاد باری ہے

وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ

جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمال ہی کے

اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ (شوری) — سبب سے پہنچتی ہے اور اللہ تو بہت سے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

یعنی وہ مصیبت کا سبب نہیں بنتے، بلکہ ویسے ہی معاف ہو جاتے ہیں۔

تعجب خیز بات اور قرآن

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی، یہ بہت بڑا گناہ تھا، اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:۔

هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (نور) — اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ تھا۔

یہ اتنا بڑا گناہ تھا کہ تہمت لگانے والوں پر سخت عذاب نازل ہوتا، لیکن تعجب پر تعجب ہے، کہ اتنے بڑے گناہ کو کس آسانی کے ساتھ معاف کر دیا گیا، اور کوئی سزا نہیں دی گئی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (نور)

یعنی اگر تم پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل نہ ہوتا تو اس گناہ کی وجہ سے تم پر زبردست عذاب نازل ہوتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنے زبردست عذاب کو یونہی ٹال دیا، ایسے تہمت تراش گنہگار لوگوں پر رحمت و فضل کی بارش ہو گئی

گناہ کی مغفرت عقل کی کسوٹی پر

اگر شبہ ہو، کہ معمولی نیکی سے اتنے گناہوں کی مغفرت کیسے ہو سکتی ہے۔ تو یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں، ایک ہی گناہ سارے اعمال کے حبوط کا سبب بن سکتا ہے، اور ایک ہی نیکی ساری چھوٹی چھوٹی بداعمالیوں کے خاتمہ کا سبب بن سکتی ہے جیسا کہ اوپر قرآن و حدیث کی تصریحات گذر چکی ہیں اور یہ دونوں باتیں ایک ساتھ جاری و ساری ہیں، ہماری روزمرہ زندگی میں اس کی تائید میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ انجیکشن کے چند قطرات کروڑوں ضرر رساں جراثیم کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ یہ انجیکشن کے ان قطرات کی قوت ہے۔ جو ان جراثیم کو ختم کر دیتی ہے یہاں مقدار کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کا دارومدار قوت پر ہوتا ہے۔ انجیکشنوں کی مختلف قوتیں ہوتی ہیں۔ اور ان قوتوں پر ہی ان کے اثر کا دارومدار ہوتا ہے حالانکہ مقداریں سب ہی انجیکشن برابر ہوتے ہیں لیکن اثر و نفوذ کے لحاظ سے برابر نہیں ہوتے۔ کیمیائی تجربہ گاہ میں غالباً آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کسی محلول کی قوت کی پیمائش کی جاتی ہے تو تیزاب کا قطرہ الکلی کے بہت بڑے محلول کے اثر کو زائل کر دیتا ہے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یہاں قطرہ کی مقدار کارفرما نہیں ہوتی بلکہ اس قطرہ کی قوت کارفرما ہوتی ہے جو بڑی مقدار کے محلول کی طاقت کو فنا کر دیتی ہے ظاہر بین انسانوں کو یہ ایک عجیب چیز معلوم ہوگی، لیکن جاننے والے جانتے ہیں، کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، اسی طرح ایٹمی قوت کو ملاحظہ کیجیے، ایٹم کتنا چھوٹا

ذرہ ہوتا ہے لیکن کتنی بڑی بڑی قوتوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے، یہاں بھی مقدار ہیچ نظر آتی ہے، اور وہ قوت جو اس ذرہ میں پنہاں ہوتی ہے کارفرما ہوتی ہے، ہماری ظاہری نظر میں یہ چیزیں عجوبہ ہیں، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے، اسی طرح کسی نیکی میں کتنی قوت پنہاں ہے، اسے کون جانتا ہے، اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔

مزید توضیح ہومیوپیتھی کا کرشمہ ملاحظہ فرمائیے، ایک گولی جس میں ذرا سا دوا کا اثر ہوتا ہے، کتنی طاقت رکھتی ہے، اور جتنی دوا کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے، اسی قدر قوت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہ دوا کئی کئی سال تک اپنا اثر بھی رکھتی ہے، اور نقصان رساں اثرات کو زائل کرتی رہتی ہے، یہاں بھی دوا کی قوت کارفرما ہے، مقدار کی کوئی اہمیت نہیں، اگر سو گولیاں بھی یہ یک۔ قت کھائی جائیں، تو ان کے اثر و قوت میں ایک گولی کے مقابلہ میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی، دوا کی معمولی سی مقدار بڑے بڑے مخالف امراض کا مقابلہ کرتی ہے، اور ان کو ملیا میٹ کر دیتی ہے، یہی حال نیکی کا ہے، یہاں نیکی کی مقدار نہیں دیکھی جاتی، بلکہ وہ قوت خلوص اور قوت ایمانی دیکھی جاتی ہے، جو اس نیکی کے اندر مضمر ہوتی ہے، جب یہ قوت خلوص اور قوت پنہاں زیادہ ہوتی ہے، تو معمولی سی نیکی گناہوں کی کثیر تعداد کو زائل کر دیتی ہے، اس قوت پنہاں کا جاننے والا، اور اس قوت خلوص کا ناپنے والا اللہ تعالیٰ ہے، ہم ان قوتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

کیا یہ قرآن پر اعتراض ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا (انعام) جو شخص نیکی کرے گا تو اس کو دس گنا ثواب ملے گا۔

وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا — اور برائی، گناہ اسی کے مثل ہوگا

اب بتلائیے کیا قرآن پر اعتراض ہو سکتا ہے، کہ نیکی کے ساتھ یہ رعایت کیوں ہے؟ کیا یہ ظلم ہے، دوسری جگہ ہے

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً (بقرہ) — جو شخص اللہ کو قرض حسنہ دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا ثواب دے گا۔

اللہ ہی جانتا ہے، کہ اس کے نزدیک کثیر کتنا ہوگا، بہر حال نیکی کم اور ثواب بہت زیادہ، اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے ظلم نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا (نساء) — بے شک اللہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ اگر نیکی ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا کر دیگا۔

قرآن کی ان آیات سے ثابت ہوا، کہ نیکی کئی گنا ہو جاتی ہے، اور بدی صرف ایک ہی رہتی ہے اب جب کہ نیکی کی قوت کا یہ عالم ہے، کہ اپنے سے کئی گنا ہو جاتی ہے، تو پھر گناہ کی کیا حقیقت کہ اس کا

مقابلہ کر سکے، ایک ہی نیکی جب لاکھ گنا ہو جائے، تو کیا وہ ہزار ہا گناہوں کا مقابلہ نہ کر سکے گی، اور اگر نیکیوں کی یہی فراوانی رہی، تو گناہ اگرچہ سمندر کے جھاگ سے زیادہ ہوں فنا ہو جائیں گے، اس لئے کہ نیکیاں گناہوں سے کئی گنا زیادہ ہوں گی، غالباً اب حدیث کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا، اب رہی یہ بات کہ ایسا کب ہوتا ہے، تو اس کے لئے کچھ شرائط ہوتے ہیں، دوا کے خواص کا بیان کرنا اور بات ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان خواص کا ظہور ہمیشہ ہو، دوا کے اثر کے لئے چند شرائط ہوتے ہیں، اسی طرح دعا کے اثر کے لئے بھی چند شرائط ہوتے ہیں، جب وہ شرائط پورے ہوتے ہیں، تو دعا اپنا کام کرتی ہے، حدیث مذکور میں دعا کی خاصیت مذکور ہے، یہ نہیں کہ ہمیشہ ہر حالت میں ایسا ہوتا ہے، خاصیت کا ہونا اور بات ہے، اثر کا ہونا اور بات ہے، یہ بات اللہ ہی جانتا ہے، کہ شرائط پورے ہوئے یا نہیں، وہ دعا مقبول ہوئی یا نہیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں وضو سے تمام گناہوں کی معافی کا اعلان فرمایا، تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:۔

وَلَا تَغْتَرُّوْا (ابن ماجہ کتاب الوضوء) اس بشارت سے دھوکا مت کھانا۔

اب جو شخص احادیث سے بخوبی واقف ہے وہ دھوکا نہیں کھاتا، یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ایسی چیزوں کو عوام کے سامنے بیان کرنے سے روک دیا ہے، تاکہ وہ غلط فہمی کی وجہ سے گمراہ نہ ہو جائیں۔

کیا یہی قرآن پر اعتراض ہے؟ اللہ تعالٰی فرماتا ہے:۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ (بقرہ)	اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے کہا تھا۔ کہ اس شہر میں جاؤ اور بافراغت کھاؤ پیو لیکن دروازہ میں داخل ہوتے وقت جھک جانا اور "حطۃ" کہنا۔ ہم تمہارے سارے گناہ معاف کر دیں گے

جھکتے ہوئے داخل ہونا، اور "حطۃ" کہنا، اتنی معمولی سی نیکی سے سارے گناہ معاف کرنے کا وعدہ کیا جا رہا ہے، اب وہ گناہ خواہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں، خواہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں، یا اس سے بھی زیادہ، اور پھر گناہ بھی کیسے کیسے۔ اللہ کی پناہ۔ ان کے گناہوں کے تذکرہ سے قرآن معمور ہے، بہرحال تمام گناہوں کے معاف کر دینے کا وعدہ ہے، اور کتنی سی بات پر کہ ایک مرتبہ جھک کر حطۃ پڑھ لینا چاہیئے اگر ایک مرتبہ حطۃ پڑھنے سے تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں، تو کیا اللہ تعالٰی ہم پر اتنا بے رحم ہو گیا ہے، کہ اگر ہم "استغفر اللہ" پڑھیں، تو ہمارے گناہوں کو معاف نہیں کرے گا، ضرور کرے گا، وہ ظلم نہیں کرتا، قرآن تو اتنی اتنی سی نیکیوں سے سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، تو اگر حدیث میں بھی اس قسم کی باتیں پائی جائیں تو تعجب

کی آخر کون سی بات ہے، جب قرآن پر اعتراض نہیں، تو حدیث پر اعتراض کیوں؟

خلاصہ تحریر بالا میں ان تمام احادیث کا جواب ہے، جن میں معمولی سی نیکی پر بہت زیادہ ثواب کی بشارت دی گئی ہے، اور محض اس بنا پر کہ معمولی سی نیکی پر اتنا اجر نہیں مل سکتا حدیث کو موضوع کہہ دینا غلط ہے، اور یہ معیار ہی باطل ہے، سطحی نظر سے حدیث کا مطالعہ غلط فہمی اور گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے، ورنہ حقیقت بین نگاہیں اس کے رموز کو پا لیتی ہیں، سطحی نظر سے تو قرآن کا مطالعہ بھی گمراہ کن ہو سکتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا" (بقرہ ۵) "اللہ تعالیٰ قرآن کے ذریعہ سے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے" تو کیا قرآن ذریعہ گمراہی ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں، لیکن بہرحال ظاہری معنوں سے تو یہی نکلتا ہے، اور یہ بڑا زبردست اعتراض بن سکتا ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"ابی الدرداء (صحابی) کہتے ہیں، آؤ میں تمہیں بتاؤں، کہ سب سے بہتر عمل جس سے تمہارے مدارج بہت بلند ہو جائیں، کون سا ہے؟ ایسا عمل جو سونے اور چاندی کی قربانی اور جہاد سے بھی بہتر ہو، وہ جہاد جس میں تم دشمن کا سر کاٹتے ہو، اور وہ تمہارا، لوگوں نے کہا، فرمائیے، کہا "اللہ کا ذکر" ہر صاحب علم جانتا ہے، کہ حدیث کی دنیا میں مؤطا کا درجہ کتنا بلند ہے، اس بلند کتاب میں اس حدیث کو پڑھنے کے بعد کسی کو کیا پڑی کہ وہ ملک و ملت کی حفاظت یا اپنی مستورات کی عزت و عفت بچانے کے لئے سر دیتا پھرے وہ غلام رہے یا آزاد اس کی بلا سے، ساری دنیا جنت کے لئے مرتی ہے، اور یہ نعمت اس کو زبانی یاد خدا سے مل سکتی ہے، پھر وہ خواہ مخواہ دکھ کیوں اٹھائے" (دو اسلام ص ۶۳-۶۴)

ازالہ اس حدیث کا عام جواب تو اوپر گذر ہی چکا ہے، تاہم مزید تشفی کے لئے کچھ عرض کئے دیتا ہوں کہ اس حدیث میں "ذکر اللہ" کو تمام اعمال سے افضل بتایا گیا ہے، اور یہ بالکل قرآن کے مطابق ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ" اور در حقیقت اللہ کا ذکر سب سے بڑا عمل ہے (قرآن) اب اگر ذکر سے مراد تسبیح و تحمید ہے، تو پھر حدیث پر کیا اعتراض ہے، قرآن پر بھی وہی اعتراض ہوگا، اور اگر کچھ اور ہی مطلب ہے، تو پھر جو قرآن کا مطلب ہے وہی حدیث کا بھی ہوگا، بہرحال اعتراض کا کوئی موقع نہیں، اور اگر ذکر اللہ میں تبلیغ دین بھی شامل ہے، تو پھر یہ حقیقت ہے، کہ انفاق فی سبیل اللہ اور جنگ و جدال کی اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں، جنگ و جدال میں ایک ہنگامی کوفت اور محض جسمانی تکلیف ہوتی ہے لیکن تبلیغ میں ایسے ایسے کٹھن مرحلے آتے ہیں، کہ جنگ اس کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتی ہے، تبلیغ میں ان روحانی و جسمانی صدمات سے دو چار ہونا پڑتا ہے، کہ سینکڑوں جنگیں اس کا مقابلہ

نہیں کر سکتیں، اور پھر وہ صدمات مسلسل ہوتے ہیں، آناً فاناً میں ختم ہونے والے نہیں، جنگ کی نوبت بھی اس تبلیغ کے پیچھے پیچھے آتی ہے، بغیر تبلیغ کے حزب اللہ کہاں سے آئے گا، جو میدان کارزار میں سر دھڑ کی بازی لگائے، پس ثابت ہوا کہ تبلیغ ہر حالت میں جنگ فی سبیل اللہ سے افضل ہے، اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں، یہی وجہ ہے، کہ قرآن نے بھی صدیقین کو شہداء پر مقدم کیا ہے۔

برق صاحب مؤطا سے آپ نے یہ حدیث تو نقل کر دی لیکن یہ خیال نہیں فرمایا، کہ مؤطا میں یہ حدیث موقوف ہے، پھر منقطع ہے، مؤطا کا درجہ بے شک بہت بلند ہے، لیکن صرف اسی صورت میں جب کہ مؤطا میں کوئی حدیث متصل سند کے ساتھ بیان کی گئی ہو اور یہ حدیث مؤطا میں متصل السند نہیں ہے رہا ترمذی وغیرہ کا حوالہ تو اس میں ایک راوی عبداللہ بن سعید ضعیف ہے (تذکرۃ الموضوعات) برق صاحب حدیث یا روایت پیش کرتے وقت یہ تو دیکھ لیا کیجئے، کہ اہل حدیث کا اس کے متعلق کیا خیال ہے، یہ تو نہیں ہونا چاہیئے، کہ کھری کھوٹی ہر چیز پر اعتراض کیا جائے

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"امام داؤد طائی سے کسی نے پوچھا، کہ آپ احادیث کی روایت کیوں نہیں کیا کرتے، فرمایا، میں بچوں کا کھلونا نہیں بننا چاہتا" (دو اسلام ص ۶۴)

ازالہ

اس روایت سے یہ ثابت ہوا، کہ طلباء حدیث ان کی غلطیاں پکڑتے تھے، اور وہ اس سے بچنا چاہتے تھے، اور یہ عبارت خود ان سے مروی ہے، جو اس کے آگے ہے، کہ جب اس راستہ میں میری غلطیاں نکلیں، تو پھر غلط راستہ پر چلنا مجھے پسند نہیں" (برق اسلام ص ۶۴) لہذا اس قول میں کوئی اعتراض تو ہے نہیں، تاہم یہ بات واضح کر دینی مناسب ہے، کہ یہ روایت بھی جھوٹ و افتراء ہے، اس کی سند میں تین راوی مجہول ہیں (۱) اسحٰق بن ابراہیم بن نعمان (۲) محمد بن علی بن مروان (۳) ابو عبدالرحمٰن الضریر (برق اسلام ص ۶۳)

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ چند طلبہ حدیث حضرت فضیل بن عیاض کے ہاں درس لینے کے لئے آئے، آپ نے انہیں ان الفاظ میں ڈانٹ پلائی، تم لوگوں نے اللہ کی کتاب کو ضائع کر دیا ہے، اگر تم کتاب الہٰی کی تلاش کرتے، تو اس میں تمہیں شفا مل جاتی" (دو اسلام ص ۶۵-۶۶)

ازالہ

یہ روایت بھی ناقابل اعتبار ہے، اکٹھے تین راوی اس کی سند میں ناقابل وثوق ہیں (۱) ابراہیم بن نصر ابو اسحٰق السرقطی مجہول ہے (۲) احمد بن مندرس بھی مجہول ہے (۳) عثمان بن عبدالرحمٰن ابو عمرو متروک و کذاب ہے (برق اسلام ص ۶۴) لہذا یہ روایت سر تا پا کذب و بہتان ہے، برق صاحب یہاں صرف

تاریخی حوالہ کافی نہیں، یہاں فن حدیث ہے، جو ان تاریخی حوالوں کے پرخچے اڑا دیتا ہے (دیکھا آپ نے ان تاریخی حوالوں میں کوئی جان ہے؟ ان بے جان چیزوں کو آپ جاندار سمجھ کر دھوکا کھا گئے، کاش آپ تحقیق کرنے کے بعد لکھتے۔

غلط فہمی | برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"سفیان ثوری کا قول ہے" انا فی الحدیث منذ ستین سنۃ وددت ان خرجت منہ کفافا لا علی ولا لی" میں گذشتہ ساٹھ برس سے حدیث کی دلدل میں پھنسا ہوا ہوں، اور اب اس اس حالت میں نکلنا چاہتا ہوں، کہ اس کے فائدہ اور نقصان ہر دو سے محفوظ ہوں" (دو اسلام ص ۶۶)

ازالہ | یہ روایت معنًا بالکل صحیح ہے، برق صاحب نے جو ترجمہ اس کا کیا ہے، وہ صحیح نہیں، صحیح مطلب اس کا یہ ہے، کہ میں ساٹھ برس سے حدیث کی درس و تدریس میں مشغول ہوں، اور یہ کام اتنا مشکل ہے، کہ اگر برابر سرابر ہی چھوٹ جاؤں، اور اللہ تعالےٰ کے ہاں کوئی پکڑ نہ ہو تو بھی غنیمت ہے، گویا سفیان ثوری حدیث کی عظمت بیان کر رہے ہیں، اور برق صاحب نے غلط فہمی سے غلط ترجمہ کر کے اس کا منشا کچھ سے کچھ بنا دیا۔ سنداً یہ روایت بالکل ناقابل اعتبار ہے، اس کی سند میں ایک راوی قطبہ بن علاء بن منہال غنوی غیر معتبر کثیر الخطاء ہے، اس کے علاوہ احمد بن زہیر، احمد بن صالح مقری بن منادی، احمد بن محمد بن عبد الخالق سب مجہول نامقبول ہیں، دوسری سند میں علی بن قادم شیعہ، منکر الحدیث ہے، تیسری سند میں خضر بن ابان ہاشمی اور کئی راوی مجروح ہیں، چوتھی سند میں محمد بن حسین اور علیج بن احمد مجہول نامقبول ہیں (برق اسلام ص ۶۷-۶۸)

غلط فہمی | برق صاحب موت بن المزرع کا مندرجہ ذیل قول نقل کرتے ہیں :۔

"اذا رأیت شیخا یعدو فاعلم ان اصحاب الحدیث خلفہ۔ جب تم کسی عالم کو سرپٹ بھاگتے دیکھو، تو سمجھ لو، کہ طلبہ حدیث اس کا پیچھا کر رہے ہیں" (دو اسلام ص ۶۶)

ازالہ | اس قول کا اصل مطلب یہ ہے، کہ جب تم کسی شیخ الحدیث کو جاتے دیکھو، تو سمجھ لو کہ طلبا حدیث بھی اس کے پیچھے ہوں گے یعنی شیخ الحدیث کی یہ شان ہے، کہ ہمیشہ ان کے پیچھے طلبا حدیث کا جمگھٹ ہوتا ہے، وہ کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔

اگر وہی مطلب لیا جائے جو برق صاحب نے لیا ہے، یعنی علماء درس حدیث سے گھبرا کر بھاگا کرتے تھے، لیکن طلبا ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے اور تنگ کرتے تھے، تو آخر اس میں اعتراض ہی کیا ہے، پھر میں یہ پوچھتا ہوں، کہ آخر یہ موت بن المزرع کون صاحب ہیں، کہ ان کے کسی قول کی وقعت بھی ہماری نگاہ میں

نام سے ظاہر ہے کہ یہ گیا ہیں ایک مجہول غیر معروف شخص کے قول سے دلیل لانا کوئی اچھا کام نہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"محمد بن سلام حضرت فاروق کے اس قول کے راوی ہیں کہ میں نے حدیث سے بہتر کوئی علم اور اہلحدیث سے زیادہ ذلیل کوئی مخلوق نہیں دیکھی" (دو اسلام ص ۶۶-۶۷)

ازالہ اول تو اس قول کی سند معتبر نہیں، پھر یہ عقلاً بھی محال ہے، کہ جس چیز کو اشرف کہا جائے، اس کے حاملین کو ذلیل کہا جاتے، پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اہلحدیث خود صحابہ کرام تھے، کیا وہ ذلیل ترین مخلوق تھے، یہ بھی غلط ہے کہ علم حدیث علم قرآن سے بھی بہتر ہو، اگر یہ قول اہلحدیث کے خلاف ہے تو قرآن کے بھی خلاف ہے، اس قول سے قرآن کا استخفاف ہوتا ہے، غرض یہ کہ یہ قول سراسر باطل ہے، اور بہتان عظیم ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"سفیان بن عیینہ مسعر سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے کہا "خدا میرے دشمن کو محدث بنا دے" ایک اور موقعہ پر فرمایا "کاش علم حدیث میرے سر پہ شیشوں کا ایک ٹوکرا ہوتا جو گر کر چور چور ہو جاتا (دو اسلام ص ۶۷)

ازالہ یہ اقوال بھی بہتان ہیں، ان کی سند میں خلف بن قاسم مجہول ہے، اور علی بن سعید رازی مجروح ہے (برق اسلام ص ۳۳)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"ایک دفعہ چند طلباء حدیث سفیان بن عیینہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا "تم میری آنکھ کی جلن ہو" اور ساتھ ہی کہا "اگر آج عمر بن خطاب زندہ ہوتے، اور ہم سب کو دیکھ پاتے، تو مار مار کر ہمارا بستر بگاڑ دیتے" (دو اسلام ص ۶۷)

ازالہ یہ بھی کذب و بہتان ہے، اس کی سند میں محمد بن مسلمہ بن قاسم، احمد بن عیسیٰ اور ابراہیم بن سعید اکھٹے تین راوی مجروح ہیں (برق اسلام ص ۳۳)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"امام شعبہ نے فرمایا "ایک زمانہ تھا کہ میں اصحاب حدیث سے مل کر خوش ہوتا تھا لیکن آج لیس شئ ابغض الی من ان اری واحداً منھم میرے ہاں جب سے زیادہ قابل نفرت یہی لوگ ہیں (دو اسلام ص ۶۷)

ازالہ یہ قول بھی سرتا پا کذب ہے، اس کی سند میں احمد بن محمد بن احمد متہم ہے یعنی روایتیں گھڑا کرتا تھا، دوسر

راوی احمد بن المفضل منکر الروایت ہے، تیسرا راوی محمد بن عبداللہ الدورقی مجہول ہے (برق اسلام ص۵) لہذا یہ روایت بالکل باطل ہے، اور احمد بن محمد کی بنائی ہوئی ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"ایک مرتبہ چند طلبہ امام شعبہ کے پاس درس حدیث لینے کے لئے آئے، آپ نے کڑک کر فرمایا "یہ حدیث تمہیں اللہ کے ذکر سے روکتی ہے، کیا تم باز نہیں آؤ گے" (دو اسلام ص۶۸)

ازالہ اس کی سند میں عبدالوارث مجہول ہے، دوسری سند میں احمد بن محمد بن غالب روایتیں گھڑنے والا ہے (برق اسلام ص۷) لہذا یہ روایت بھی باطل اور جھوٹ ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"ایک مرتبہ امام اعمش نے طلبہ حدیث سے کہا، مجھے حدیث حنظل سے بھی زیادہ کڑوی معلوم ہوتی ہے تم جس شخص کے قریب جاتے ہو اسے جھوٹ بولنے (یعنی احادیث پڑھنے) کی ترغیب دیتے ہو" (دو اسلام ص۶۸)

ازالہ:۔ امام اعمش کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

لقد رددتموہ حتی صار فی حلقی امر	یعنی تم نے اس بات کو رد کر کے میرے حلق کو اندرائن
من العلقم ما عطفتم علی احد الا	سے بھی زیادہ تلخ بنا دیا ہے تم جس شخص کا رخ کرتے
حملتموہ علی الکذب (برق اسلام ص۴۵)	ہو اسے جھوٹ بلوا کر ہی چھوڑتے ہو۔

یعنی اصحاب الحدیث نے ان کی وہ روایت جس میں انہوں نے تدلیس کی تھی رد کر دی، تو انہوں نے کہا، کیا تحدیث کر کے جھوٹ بولوں، تم تو مجھ سے جھوٹ بلوانا چاہتے ہو، یہ بات مجھے بہت کڑوی معلوم ہوتی ہے، بہر حال اہلحدیث نے تدلیس کی وجہ سے امام اعمش پر اعتراض کیا، تو اس وقت انہوں نے یہ فرمایا، کہ جو کچھ ہے وہ یہ ہے، میں جھوٹ تو بول نہیں سکتا، کہ اپنی بات کی خاطر تحدیث کر دوں، اور تم ضد لا کر ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہو (نوٹ:۔ مدلس کی روایت بغیر تحدیث کے ناقابل اعتبار ہوتی ہے) پھر اس کی سند میں احمد بن فضل منکر الحدیث ہے (جامع بیان العلم جلد ۲ ص۱۳۲) لہذا یہ روایت ہی جھوٹی ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"سعید القطان نے اپنے بیٹے سے کہا، کہ یہ صوفی و زاہد لوگ احادیث کے معاملہ میں سب سے بڑے جھوٹے واقع ہوئے ہیں" (دو اسلام ص۶۹)

ازالہ یہ تو فن حدیث کی کرامت ہے کہ ان صوفی اور زاہد لوگوں کو بھی نہ چھوڑا، ان کے زہد نے محدثین کو مرعوب نہیں کیا، بلکہ محدثین نے ان کو پوری طرح جکڑ لیا، یہ لوگ زہد و تقوامی کی وجہ سے مرجع انام ہو سکتے تھے

اوران کی طرف مشکل سے تحریف کا گمان ہو سکتا تھا لہذا یہ لوگ دین کے لئے بڑے خطرناک تھے۔

غلط فہمی ابوبکر بن عیاش نے فرمایا تھا (جس کو برق صاحب نے اعتراضاً نقل کیا ہے): ۔
"خدا کی قسم مجھے فساق سے اتنا خطرہ محسوس نہیں ہوتا، جتنا اہلحدیث سے" (دو اسلام ص ۶۹)

ازالہ یہ مغیرہ کا قول ہے، اس قول کی سند صحیح نہیں، اس کا راوی اسحٰق بن ابراہیم دجال ہے (تذکرۃ الموضوعات ص ۲۳) لہذا یہ روایت جھوٹی ہے

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں: ۔
"امام احمد بن حنبل کا قول ہے، کہ تین قسم کی احادیث میں بری طرح تحریف ہو چکی ہے، پیش گوئیاں جنگیں اور تفسیری احادیث" (دو اسلام ص ۶۹)

ازالہ یہ قول تو کسی طرح ہمارے مخالف نہیں، یہ تو فن حدیث اور تدوین حدیث کی تائید کرتا ہے، محدثین نے مفسرین اور مورخین کی بیان کردہ احادیث کو ذرا بھی وقعت نہیں دی، بلکہ ان کو فن حدیث سے پرکھا تو معلوم ہوا، کہ اس میں اکثر محرف اور موضوع ہیں، محدثین کسی سے بھی مرعوب نہیں ہوئے، بلکہ احادیث صحیحہ کی تخلیص میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

باب اول کا خلاصہ اس باب میں ائمہ دین کے جو اقوال برق صاحب نے نقل فرمائے ہیں ان میں سے اکثر گھڑے ہوئے اور ان پر بہتان ہیں، اور جو صحیح ہیں ان کی وضاحت اوپر کردی گئی ہے برق صاحب نے ان موضوعہ اقوال کو صحیح سمجھا اس لئے نقل فرمایا، بہر حال یہ برق صاحب بھی مانتے ہیں، کہ یہ اقوال احادیث صحیحہ کی مخالفت میں نہیں ہیں، بلکہ احادیث موضوعہ کے متعلق ہیں، مثلاً تمہید میں ص ۲ پر وہ لکھتے ہیں: ۔
"اسلام دو ہیں، ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے اور دوسرا وضعی احادیث کا اسلام" اور پہلے باب میں ص ۵۹ پر لکھتے ہیں "حاشا و کلا مجھے حدیث سے بغض نہیں، بلکہ ان انسانی اقوال سے ضد ہے، جنہیں یہودیوں زندیقوں اور ہمارے فرقہ باز راہنماؤں نے تراش کر مہبط وحی صلعم کی طرف اس لئے منسوب کر دیا تھا کہ خدا، رسول اور قرآن کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہ رہے" برق صاحب ہم نے تو ان اقوال کو صحیح نہیں مانا، اور اگر آپ مانتے ہیں، اور اس سے گھڑی ہوئی احادیث مراد لیتے ہیں، تو خیر ہمارا اس میں حرج بھی کیا ہے، صحیح احادیث کو تو آپ بھی مانتے ہیں، بلکہ آپ کی کتاب کے آخری باب کا عنوان ہی یہ ہے "صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا" الغرض صحیح احادیث اور موضوع احادیث کے متعلق تو ہمارا آپ کا ایک ہی عقیدہ ہے، لہذا ہم میں اور آپ میں اختلاف ہی کہاں ہے محدثین نے یہی کارنامہ انجام دیا، کہ ہر قسم کے کھوٹ سے صحیح احادیث کی تخلیص کردی، اور یہودیوں، زندیقوں اور فرقہ باز راہنماؤں نے جو حدیثیں وضع کی تھیں، ان کی حقیقت کو واشگاف کر دیا۔ فللہ الحمد۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ۲

"تدوین حدیث"

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"صحابہ کرام رضہ جمع احادیث کے خلاف تھے" (دو اسلام صث)

ازالہ صحابہ کرام جمع احادیث کے خلاف نہیں تھے مفصل جواب باب اول میں دیا جا چکا ہے، اور متعدد صحابہ کرام کے صحائف کا تذکرہ بھی اسی باب میں کر دیا گیا ہے، وہیں ملاحظہ فرمائیں، اتنا تو برق صاحب بھی اعتراف کرتے ہیں، کہ تین صحابہ کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں، یہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"صحابہ کرام میں سے صرف تین بزرگ یعنی انس بن مالک رضہ ابو ہریرہ رضہ اور عبداللہ بن عمر رضہ ایسے نظر آتے ہیں، جن کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں (دو اسلام صث)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"ابوداؤد میں یہ حدیث ملتی ہے، کہ عبداللہ بن عمر رضہ نے رسول اکرم صلعم سے دریافت کیا، کہ کیا میں آپ کے اقوال لکھ سکتا ہوں، تو حضور نے فرمایا نعم انی لا اقول الا حقا بیشک لکھ لیا کرو، اس لئے کہ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں، حیرت ہے کہ جس ہستی نے کتابت احادیث سے منع فرمایا تھا (مسلم) اور جس کے جلیل القدر جانشین آپ کے ارشاد کی تعمیل میں نہ صرف اپنے مجموعے بلکہ ہر صحابی کے مجموعے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جلاتے رہے، اسی ہستی نے عبداللہ بن عمرو رضہ کو کتابت کی اجازت کیسے دیدی، مزید حیرت اس امر پر کہ جب حضرت عمر رضہ اور حضرت علی رضہ نے احادیث جلانے کا حکم دیا تھا، تو ابن عمر رضہ نے کیوں تعمیل نہ کی، کیا قرآن کی رو سے اولی الامر کی اطاعت فرض نہیں، یا تو ہم یہ تسلیم کریں کہ صحیح مسلم کی حدیث جھوٹی ہے اور یا ابن عمر رضہ کو رسول خدا اور خلفائے اسلام کی حکم عدولی کا ملزم ٹھہرائیں، حضور کے خلفاء کے عمل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحیح مسلم کی حدیث صحیح ہے، اور اگر مسلم کی حدیث کو صحیح قرار دیں، تو ابوداؤد والی حدیث وضعی ثابت ہوتی ہے، اور اس لئے ابن عمر رضہ پر جمع احادیث کا الزام غلط ہے" (دو اسلام صث۱۰)

ازالہ :۔ قرآن میں ہے :۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ آپ کہدیجئے کہ اگر زمین پر فرشتے اطمینان سے

مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (سورۃ ۱۷ اسراء)	چلتے پھرتے ہوتے یعنی رہتے ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان پر بھیجتے۔

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے:۔

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ (الانبیاء)	اور آپ سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے وہ آدمی ہی تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔

ان ہر دو آیات سے ثابت ہوا کہ فرشتہ رسول بن کر نہیں آتا، اب مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمایئے:۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (حج)	اللہ تعالٰے فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول کو منتخب فرماتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا (فاطر)	سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو رسول بنانے والا ہے

دنیا کی تاریخ گواہ ہے، کہ کبھی کوئی فرشتہ رسول بن کر نہیں آیا، لہٰذا ماننا پڑے گا، کہ پہلی دو آیتیں صحیح ہیں اور اگر وہ صحیح ہیں، تو غلط فہمی سے کہا جا سکتا ہے، کہ آخری دو آیتیں صحیح نہیں، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے چاروں آیات صحیح ہیں، اور موقع و محل کے لحاظ سے ہر ایک ثابت و سچی ہے، بالکل یہی حالت ان ہر دو احادیث کی ہے، جن کو برقی صاحب نے بطور تضاد پیش کر کے ایک کو سچی اور ایک کو جھوٹی کہا ہے، حالانکہ اگر وہ جھوٹی کو سچا کہتے، تو زیادہ مناسب تھا، اس لئے کہ مسلمانوں کی متواتر تاریخ اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ احادیث ہر زمانہ میں لکھی جاتی رہیں، یہ ساری خرابیاں غلط فہمی کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت احادیث سے منع نہیں فرمایا تھا، بلکہ قرآن کے ساتھ ملا کر لکھنے سے منع فرمایا تھا مفصل جواب کے لئے باب اول ملاحظہ فرمائیں، باب اول میں یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے، کہ صحابہ کرام کے احادیث جلانے کی روایت موضوع یعنی بناوٹی ہے)

قرآن کی رو سے اولی الامر کی اطاعت فرض ضرور ہے لیکن اختلاف کی حالت میں قرآن ہی حکم دیتا ہے کہ اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو، یعنی غلط بات میں اولی الامر کی اطاعت فرض نہیں، اللہ ہی نے حکم دیا ہے طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ (النور) یعنی معروف بات ہی میں اطاعت کی جائے، اور یہ چونکہ غیر معروف بات تھی لہٰذا تعمیل نہ کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں، پھر یہ بھی غلط ہے، کہ اولو الامر میں سے کسی نے احادیث جلانے کا حکم دیا ہو، یہ روایت ہی جعلی ہے، تو اولو الامر کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں، کہ ابن عمرو رضؓ پر جمع احادیث کا الزام غلط ہے، اور خود ہی اس سے پہلے تحریر فرما چکے ہیں، کہ تین بزرگوں کے پاس احادیث محفوظ تھیں، ان تین بزرگوں میں انہوں نے ابن عمرو کا نام بھی شامل کیا ہے، معلوم نہیں دونوں باتوں میں سے کون سی بات صحیح ہے اور کونسی غلط، برق صاحب کا پہلا کلام تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ابن عمرو رضؓ کا صحیفہ صادقہ مشہور ہے، جو ان کے پڑپوتے تک منتقل ہوتا ہوا محدثین کو ملا، ان کے پڑپوتے عمرو بن شعیب اس صحیفہ کو سامنے رکھ کر احادیث بیان کرتے تھے، اس صحیفہ کا ذکر متواتر ہے، اور اس کا انکار غلط فہمی ہے بالاعلمی۔

خلاصہ صحیح مسلم کی حدیث سے قرآن و حدیث کو یکجا لکھنے کی ممانعت ہے، اور سنن ابو داؤد کی حدیث میں احادیث کو علیحدہ لکھنے کی اجازت۔ لہٰذا دونوں میں کوئی تضاد نہیں، اور دونوں صحیح ہیں، مزید برآں کتابت حدیث کی احادیث متواتر ہیں، اور اس لحاظ سے قطعی الصحت ہیں۔

انتباہ:- دو اسلام میں غالباً کتابت کی غلطی سے بار بار "ابن عمر رضؓ" طبع ہو گیا ہے، حالانکہ صحیح "ابن عمرو رضؓ" ہے

غلط فہمی ترمذی کے مجموعہ میں حضرت ابو ہریرہ رضؓ کے متعلق لکھا ہے، کہ آپ احادیث لکھ لیا کرتے تھے لیکن صحیح بخاری میں خود ابو ہریرہ رضؓ کی یہ روایت موجود ہے، کہ

تمام صحابہ میں صرف عبد اللہ بن عمرو کی روایات مجھ سے زیادہ تھیں، اس لئے کہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے، اور میں نہیں لکھا کرتا تھا۔

چونکہ امام بخاری کی صحیح ترمذی سے زیادہ قابل اعتماد ہے، اس لئے ترمذی کے بیان کو ہم صحیح قرار نہیں دے سکتے دو اسلام ص۳۱

ازالہ برق صاحب کو یہاں دو غلط فہمیاں ہوئیں:-

اول:- ترمذی میں ہے، کہ "آپ احادیث لکھ لیا کرتے تھے"۔ حالانکہ ترمذی میں ایسی کوئی عبارت نہیں ہے، دوسری کتابوں میں ضرور ہے۔

دوم:- برق صاحب نے صحیح بخاری کی حدیث کو، ابو ہریرہ کی کتابت حدیث کی روایت کے خلاف سمجھا ہے، حالانکہ دونوں روایتوں میں مختلف زمانوں کا ذکر ہے، عبد اللہ بن عمرو رضؓ عہد رسالت میں لکھا کرتے تھے، اور ابو ہریرہ رضؓ عہد رسالت میں نہیں لکھتے تھے، یہ ہے بخاری کی روایت کا مفہوم لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابو ہریرہ بھی لکھنے لگے تھے، یہ ہے دوسری روایت کا مفہوم (حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی تحریر کردہ کتب احادیث کی مفصل معلومات کے لئے باب اول ملاحظہ فرمائیں)

برق صاحب کی عبارتوں میں یہاں بھی تضاد ہے، پہلے آپ لکھ چکے ہیں، کہ ابو ہریرہ کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں، اور یہاں فرماتے ہیں، کہ ترمذی کے بیان کو ہم صحیح قرار نہیں دے سکتے، یعنی ابو ہریرہ رضؓ

احادیث نہیں لکھتے تھے، معلوم نہیں، یہ صحیح وغلط کی آمیزش ان کی کتاب میں کس طرح آگئی، غالباً غلط فہمی اور عدم تحقیق کی بنا پر ایسا ہوا ہے، یہ صحیح ہی ہے، کہ ابوہریرہ رضہ کے پاس احادیث محفوظ نہ مکتوب تھیں، جیسا کہ برق صاحب نے صلا پر تسلیم کیا ہے۔

غلط فہمی حضرت انس رضہ کے متعلق برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ سرور کائنات صلعم کے خادم خاص تھے، اور عمر میں بہت چھوٹے، یعنی جب حضور مدینہ میں تشریف لائے تھے، تو انس رضہ کی عمر صرف ساڑھے نو برس تھی، اور رحلت رسول کے وقت قریباً بیس برس، اپنے اردگرد نظر ڈال کر دیکھئے اور اندازہ لگائیے، کہ کیا کوئی لڑکا اٹھارہ انیس برس کی عمر تک کسی قسم کی کوئی ذمہ داری محسوس کر سکتا ہے؟ حضرت انس رضہ کا کام تھا، حرم نبوی اور ذات نبوی کی خدمت، دن کا بیشتر حصہ خرید و فروخت، لین دین، جھاڑ پھونک میں گذر جاتا تھا، کچھ فرصت ملتی، تو قرآن شریف یاد کیا کرتے تھے وہ ارشادات نبوی ضرور سنتے ہوں گے، لیکن لڑکپن کا زمانہ تھا، انہیں کیا پڑی تھی کہ ہر ارشاد اور ہر آئمہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد کرتے پھرتے، واقعہ سامنے آیا، اور گذر گیا، کچھ یاد رہا، اور کچھ بھول گیا، کوئی بات کان سے ٹکرائی، اور پھر کام میں لگ گئے، لیکن جب حضور کی رحلت کے بعد لوگ قرآن کو چھوڑ کر احادیث کے پیچھے پڑ گئے، اور راویان حدیث کی منزلت بڑھ گئی، تو آپ نے بھی بھولے بسرے واقعات اور گوش گذشتہ ارشادات کا جائزہ لینا شروع کیا، ممکن ہے کوئی ارشاد بالفاظہ یاد رہا ہو، اور بعض دیگر کا خاکہ خود مکمل کر لیا ہو"، (دو اسلام صلا)

ازالہ اس کا جواب برق صاحب نے خود آگے چل کر دے دیا ہے، برق صاحب فرماتے ہیں:۔

"گذشتہ ۴۷ برس میں مجھے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا، جو رنگ آمیزی مبالغہ اور دیگر سخن گسترانہ عیوب سے پاک ہو، میں خود ان عیوب سے مبرا نہیں، اور آج کہ میری عمر ۴۷ سے کچھ اوپر ہو چکی ہے، علم کی کئی منازل طے کر چکا ہوں، متانت، حقیقت اور واقعیت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں، پھر بھی داستان سرائی مبالغہ اور رنگ آمیزی سے پوری طرح نہیں بچ سکا، (دو اسلام صلا ۱۲۱)

الغرض حضرت انس کے متعلق برق صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا اس میں عبارت آرائی اور رنگ آمیزی کے سوا کچھ نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں نہ کوئی خرید و فروخت ہوتی تھی، نہ لین دین، نہ جھاڑ پھونک آپ کی زندگی بہت سادہ تھی، نہ آپ تاجر تھے نہ ساہوکار، نہ آپ کے پاس کوئی محل تھا جس کی جھاڑ پھونک کے لئے کافی وقت درکار ہوتا۔ برق صاحب صحابہ کرام کے متعلق اس قسم کی رکیک عبارت مناسب نہیں، آپ اپنے زمانہ کے نوجوانوں پر عہد رسالت کے نوجوانوں کو قیاس نہ کیجیے، اگر مقابلہ ہی کرنا ہے، تو ان کی شان

اسلام اور قوت ایمان کا مقابلہ ہماری شان اسلام اور قوت ایمان سے کیجیئے، پھر دیکھیئے کتنا بڑا فرق نظر آئے گا اور اس وقت آپ کو محسوس ہوگا، کہ ان نوجوانوں کے ایمان کے مقابلہ میں ہمارے بڑے سے بڑے بزرگ عالم باعمل متقی پرہیزگار کا ایمان ہیچ ہے، آپ کی یہ عبارت "یاد کرتے پھرنے" کس قدر نامناسب ہے آپ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ "انہیں کیا پڑی تھی کہ یاد کرتے" "پھر انہیں کیا پڑی تھی" یہ جملہ بھی ایک صحابی جلیل کے متعلق قطعاً نازیبا ہے، اس کا مطلب یہ ہے، کہ گویا وہ علوم دینی سے بے پرواہ تھے، دینی علوم کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں تھی، کہ صحبت رسول میں وہ کر لیے حاصل کرتے، پھر یہ واقعہ کے بھی خلاف ہے انہوں نے احادیث یاد ہی نہیں کیں، بلکہ ان کو محفوظ تک کر لیا تھا، اور صرف محفوظ ہی نہیں کیا تھا بلکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے ان کی توثیق بھی کر لی تھی، سعید بن ہلال کا بیان ہے:۔

كنا اذا اكثرنا على انس بن مالك رضى الله عنه فاخرج الينا محالا عنده فقال هذه سمعتها من النبى صلى الله عليه وسلم فكتبتها وعرضتها عليه۔	ہم جب حضرت انس سے زیادہ پوچھ گچھ کرتے تو وہ اپنے پاس سے ایک دفتر نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آپ سے میں نے سنی ہیں اور میں نے آپ کی حیات مقدسہ میں ان کو لکھا اور لکھ کر آپ پر پیش کیا۔
(مستدرک حاکم)	(خالص اسلام مصنفہ مولانا محمد داؤد راز ص۲۷)

برق صاحب نے اپنی کتاب کے ص۳ پر خود بھی تسلیم کیا ہے، کہ انس رضہ کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں۔

برق صاحب! آپ ہمیں اندازہ لگانے کی دعوت دیتے ہیں، لیکن خدارا آپ بھی تو اندازہ لگائیے، اس زمانہ میں جب کہ لوگوں کی قوت حافظہ بہت کم ہو گئی ہے، بیس سال کی عمر میں، ایم، اے، اور ایم، ایس سی پاس کرنے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، اور ایف اے، اور بی اے کرنے والوں کی تعداد شمار سے باہر ہے لیکن اس عہد مبارک میں جب کہ حافظے بہت قوی تھے، بیس سال کی عمر میں حضرت انس کا اپنے محبوب، جان ایمان، جان ملت، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو محفوظ کرنا اتنا بعید ہے، کہ آج اس پر تعجب ہی کا اظہار نہیں ہو رہا، بلکہ اسے ناممکن سمجھا جا رہا ہے۔

غلط فہمی

"بہر حال جو احادیث آپ (حضرت انس رضہ) سے مروی ہیں، ان کی تعداد ۱۲۸۶ ہے، جن میں سے ۱۶۸ کی صحت پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے، اور باقی ۱۱۱۸ کو ناقابل توجہ سمجھا جاتا ہے، امام بخاری نے ان متفقہ احادیث میں سے صرف ۸۳ نقل کی ہیں، مسلم نے ۷۱ اور باقی کو مشکوک سمجھ کر نظر انداز کر دیا" (دو اسلام ص۳۲)

ازالہ اس ضمن میں دو غلط فہمیاں برق صاحب سے ہوئی ہیں :۔

اول :۔ برق صاحب کا خیال ہے، کہ جو احادیث مشکوک ہیں، ان میں شک کی وجہ خود حضرت انس ہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں، جن احادیث کی صحت مشکوک ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ حضرت انس نے غلط احادیث بیان کیں" حاشا و کلا" ضعف کی وجہ نیچے کے راوی ہیں، نہ کہ حضرت انس رضہ۔

دوم :۔ برق صاحب کی دوسری غلط فہمی یہ ہے، کہ انہوں نے حضرت انس رضہ کی صحیح احادیث کی تعداد ۱۶۸ بتائی ہے، حالانکہ یہ ان احادیث کی تعداد ہے، جو بخاری اور مسلم میں مشترک ہیں اصل الفاظ ملاحظہ ہوں

لہ الف وماتنا حدیث وستۃ وثمانون	یعنی حضرت انس کی روایت کردہ احادیث کی
اتفقا علی مائۃ وثمانیۃ وستین و	تعداد ۲۲۸۶ ہے جن میں سے ۱۶۸ بخاری و مسلم
انفرد البخاری بثلاثۃ وثمانین و	کی متفق علیہ احادیث ہیں ۸۳ صرف بخاری میں ہیں
مسلم باحدی وسبعین	اور ۷۱ صرف مسلم میں۔

(نسائی رحیمی دھلی برحاشیہ ص۲۵ ج ۱)

اس عبارت سے واضح ہوگیا کہ امام بخاری نے ۱۶۸ میں سے ۸۳ نقل نہیں کی ہیں بلکہ ۱۶۸ × ۸۳ = ۲۵۱ نقل کی ہیں، اسی طرح امام مسلم نے ۱۶۸ × ۷۱ = ۲۳۹ ½ گویا بخاری و مسلم میں حضرت انس کی احادیث کی تعداد = ۱۶۸ × ۸۳ × ۷۱ = ۳۲۲ ہے، پھر امام بخاری و امام مسلم نے جن احادیث کو اپنی کتاب میں درج نہیں کیا، اس کی وجہ یہ نہیں، کہ وہ سب مشکوک ہیں، بلکہ اس کی دو بڑی وجہیں حسب ذیل ہیں :۔

اول :۔ بعض احادیث صحیح ہوتی ہیں، لیکن امام بخاری و امام مسلم کے سخت شرائط کی متحمل نہیں ہوتیں۔

دوم :۔ بعض صحیح احادیث کو کتاب کی طوالت کے خیال سے نظر انداز کر دیتے ہیں، امام بخاری فرماتے ہیں

وترکت کثیرا من الصحاح حتی	یعنی میں نے کتاب کے طویل ہو جانے کے خیال
لا یطول الکتاب	سے بہت سی صحیح احادیث کو چھوڑ دیا۔

(نصرۃ الباری ص بحوالہ مقدمہ فتح الباری ومقدمہ ابن صلاح وغیرھا)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"اتنی کانٹ چھانٹ کے بعد آپ کی بعض احادیث بدستور محل نظر ہیں، مثلاً عتبان بن مالک کہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ میں نے حضور سے التماس کی، کہ وہ میرے گھر میں آکر نماز پڑھیں، آپ نے یہ التجا قبول فرمائی، آپ کے ہمراہ چند صحابہ بھی تشریف لائے، صحابہ نے منافقین کا ذکر چھیڑ دیا وہ کہنے لگے، کتنا اچھا ہو، اگر حضور مالک بن دخشم (منافق) کی ہلاکت کی دعا کریں، حضور نے فرمایا کیا

وہ کلمہ نہیں پڑھتا؟ صحابہ نے کہا زبان سے تو پڑھتا ہے لیکن اس کا دل بے ایمان ہے، فرمایا، جو شخص کلمہ پڑھتا ہے، وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث عجیب معلوم ہوئی، چنانچہ میں نے اپنے بیٹے کو کہا کہ لکھ لے، اور اس نے لکھ لی (صحیح مسلم کتاب الایمان)"

اگر ابن دخشم واقعی منافق تھا، اور اتنے صحابہ کی شہادت کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، اور نہ حضور نے بھی اس کی تردید نہیں فرمائی، تو پھر اس کی مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" (دو اسلام ص ۲-۱۳۱)

ازالہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، کاش وہ حدیث کا گہرا مطالعہ کرتے، حدیث میں تو موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے منافق ہونے کی تردید فرمائی، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

فقال بعضھم ذلک منافق لا یحب اللہ ورسولہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تقل ذلک الا تراہ قد قال لا الہ الا اللہ یرید بذلک وجہ اللہ قال اللہ ورسولہ اعلم قال فانا نری وجھہ ونصیحتہ الی المنافقین قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فان اللہ قد حرم علی النار من قال لا الہ الا اللہ یبتغی بذلک وجہ اللہ (بخاری باب المساجد فی البیوت)	ایک شخص نے کہا مالک بن دخشم منافق ہے اللہ اور رسول سے محبت نہیں کرتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ مت کہو، کیا تم کو نہیں معلوم کہ اس نے اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کی خاطر لا الہ الا اللہ پڑھا ہے (آپ کا یہ جملہ اس کے نفاق کی صریح تردید ہے کیونکہ منافق کا کلمہ پڑھنا اللہ کی خوشنودی کے لئے نہیں ہوتا) اس شخص نے کہا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے (یعنی ہم نے تو اپنے علم کی بنا پر کہا تھا۔ اور وہ یہ کہ) ہم دیکھتے ہیں کہ وہ منافقین سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی خیرخواہی کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے اللہ کو خوش کرنے کے لئے لا الہ الا اللہ کہا وہ

دوزخ پر حرام ہے (یعنی صرف ظاہری باتوں سے اس کے قلبی ایمان کی نفی نہیں ہو سکتی۔)

الغرض حضرت انس رض کی یہ حدیث بالکل صحیح ہے، اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

دوسری غلط فہمی برق صاحب کو یہ ہوئی، کہ وہ حضرت انس رض کو اس حدیث کا براہ راست راوی سمجھ بیٹھے، حالانکہ انہوں نے خود یہ روایت عتبان بن مالک سے سنی تھی۔

تیسری غلط فہمی یہ ہوئی، کہ انہوں نے "اعجبنی" کے معنی مجھے عجیب معلوم ہوئی کئے، حالانکہ اس کے صحیح معنی یہ ہیں، کہ مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی یعنی مجھے بہت پسند آئی۔

انتباہ حضرت انس نے اپنے بیٹے سے کہا، اس حدیث کو لکھ لو، اس سے یہ ثابت ہوا، کہ صحابہ کرام رضہ کے زمانہ میں احادیث لکھی جاتی تھیں، اور وہ اپنے بیٹوں کو لکھنے کا حکم دیتے تھے (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ فرمائیے)۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک اور حدیث ملاحظہ ہو۔ انس بن مالک رضہ سے روایت ہے، کہ رسول کریم بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، کہ آپ کے پاس جبریل آیا، آپ کو پکڑا، زمین پہ گرایا، سینہ چیر کر دل نکالا، پھر دل کو چیرا، اور ایک ٹکڑے کے متعلق کہا، کہ یہ شیطان والا حصہ ہے، اس حصہ کو سونے کے طشت میں آب زمزم سے دھویا، پھر دوسرے ٹکڑے کے ساتھ جوڑ کر دوبارہ سینہ میں رکھ دیا"۔ . . . . یہ حدیث کئی طرح سے مشکوک ہے:۔

اول جب بچپن میں حضور بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، تو حضرت انس کہاں تھے؟ آپ ایک ایسے واقعہ کے عینی شاہد بنے ہوئے ہیں، جو آپ کی پیدائش سے قریباً چھتیس برس پہلے ہوا تھا (دو اسلام ص۷۵)

ازالہ حضرت انس نے یہ کہاں کہا ہے، کہ میں اس واقعہ کو دیکھ رہا تھا، آخر یہ کن الفاظ کا ترجمہ یا مفہوم ہے، انہوں نے اس واقعہ کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو، یا کسی صحابی سے سنا ہو، ہر دو صورت میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"دل کے دو حصے ہیں . . . دل ایک پمپ ہے . . . یہ صرف گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جو ہاتھ پاؤں کی طرح لذت والم کا احساس نہیں کرتا، نہ ہی وہ خیر و شر کا محرک، تمام افکار، جذبات، خیالات اور تصورات کا مرکز دماغ ہے، خیر و شر کی تحریک یہیں پیدا ہوتی ہے، اور ارادے یہیں بندھتے ہیں، اگر جبریل کا مقصد منبع شر کو مٹانا تھا، تو دماغ کو چیرتا نہ کہ دل کو . . . اور دماغ کا مسکن کھوپری ہے، نہ کہ سینہ" (دو اسلام ص۷۵-۷۶)

ازالہ ڈاکٹر سید محمد جمیل اور محمد فاروق قریشی لکھتے ہیں:۔

"دل انسانی جسم میں سرمایہ حیات ہے، اگر کسی چوٹ کی وجہ سے دل کی حرکت بند ہو جائے، تو فوراً موت واقع ہو جاتی ہے" (علم الابدان ص۱۹۲)

ایسا کبھی نہیں ہوتا، کہ دل کی حرکت بند ہو جائے، اور انسان زندہ رہے، اور اس کا دماغ رنج والم، غصہ و گھبراہٹ وغیرہ کا احساس کرتا رہے، ہاں ایسا ہوتا ہے، کہ دماغ بے کار ہو جائے، لیکن دل اپنا

کام کرتا ہے، اور انسان ایک عرصہ تک زندہ رہے۔

قرآن مجید کی تائید برقی صاحب نے قرآن شریف کو غور سے پڑھا ہوتا، تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرۃ)

کون شخص جبریل کا دشمن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جبریل تو وہ ہے جس نے یہ قرآن تیرے دل پر اللہ کے حکم سے نازل کیا۔

بتائیے جب تمام افکار، جذبات، خیالات اور تصورات کا مرکز دماغ ہے، تو قرآن کا نزول دماغ پر ہونا چاہیئے تھا، نہ کہ دل پر، جب دل کو لذت والم کا احساس نہیں ہوتا، نہ وہ خیر و شر کا محرک ہے، اور محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، تو اس پر قرآن کا نزول کیا معنی رکھتا ہے، جو اعتراض حدیث پر تھا، وہی قرآن پر ہو گا ہاں اگر تاویل کر کے آیت میں دل کے معنی دماغ کئے جائیں، تو پھر انصافاً بتائیے، کیا اس قسم کی تاویل حدیث میں نہیں ہو سکتی، لیکن اس تاویل سے حقیقت کو نہیں بدلا جا سکتا، کیونکہ دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت ہے، ارشاد باری ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (آل عمران)

اللہ سینوں کی پوشیدہ باتوں سے واقف ہے

ایک اور آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ (نمل)

اور بے شک تیرا رب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

اس قسم کی آیات قرآن مجید میں بیسیوں مقامات پر بیان ہوئی ہیں، ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ افکار اور خیالات کا مرکز سینہ ہے، اب بتلایئے سینہ میں دل ہے یا دماغ، ظاہر ہے کہ سینہ میں تو دل ہی ہے، تو پھر مرکز خیال دل ہوا، نہ کہ دماغ، کیونکہ دماغ تو کھوپری میں ہے، ایک اور آیت سنیئے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا (الاعراف)

ان کے پاس دل ہیں لیکن وہ ان کے ذریعہ سمجھتے نہیں۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا، کہ افکار و تفقہ کا مرکز دل ہے نہ کہ دماغ، اب بتایئے، جو اعتراض حدیث پر ہے، وہی قرآن پر ہو گا، قرآن میں اس قسم کی آیات بار بار آتی ہیں، لیکن کہیں بھی دماغ کا لفظ استعمال نہیں ہوا، پھر اس دل کی جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے اتنے واضح طریقہ پر متعین فرما دی، کہ جس سے تمام تاویلات کا سد باب ہو گیا، سنیئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (حج)	یہ لوگ زمین کی سیر و سیاحت کیوں نہیں کرتے تاکہ ان کے دل ایسے ہوجائیں کہ اس کے ذریعہ عقل حاصل کرسکیں یا کان ایسے ہوجائیں جن سے سن سکیں کیونکہ نہ سمجھنے والوں کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہوتے ہیں

کتنی واضح آیت ہے، اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا، کہ عقل و افکار کا مرکز دل ہے، نہ کہ دماغ اور یہ کہ دل سینہ میں ہے، نہ کہ کھوپڑی میں، اس آیت کی موجودگی میں حدیث پر اعتراض لایعنی ہے کیا ان آیات کو پڑھ کر نعوذ باللہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ خدا رسول اور جبریل ہر سہ دل و دماغ کی ساخت اور ان کے اعمال سے ناآشنا تھے، ہرگز نہیں در حقیقت بات یہی ہے، اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ہمارا ایمان بھی یہی ہے، کہ دل ہی عقل و سمجھ، جذبات و تصورات کا مرکز ہے، جدید سائنس نے جو کچھ کہا ہے، اس پر ہمارا ایمان نہیں، اس یقینی علم کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں، کہ وہ صحیح نہیں، کیونکہ بارہا ایسا ہوچکا ہے، کہ سائنس کی دنیا میں اصول بنے، اور بگڑے، ایک عرصہ تک تسلیم کئے گئے، اور پھر مسترد کر دیئے گئے، اگر سائنس کا بیان صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے، تب بھی ہم کہہ سکتے ہیں، کہ دماغ محض ذریعہ اور آلہ ہے، جس طرح کان، آنکھ، ناک دماغ کے لئے آلات کا کام دیتے ہیں، بالکل اسی طرح دماغ دل کے لئے آلہ کا کام کرتا ہے، دماغ کے ذریعہ احساسات دل کی طرف منتقل ہوتے ہیں، اور دل کے اندر جو روحانی قوت موجود ہوتی ہے، وہ ان کا ادراک کرتی ہے، اگر بظاہر دل ایک لوتھڑا ہے، تو دماغ بھی بظاہر ایک گودے کے سوا اور کچھ نہیں، اگر وہ ادراک نہیں کرسکتا، تو یہ کیسے کرسکتا ہے، اور اگر یہ کر سکتا ہے، تو اس کے کرنے پر تعجب کیوں؟ دل کی روحانی قوت دماغی آلات پر حکومت کرتی ہے اور غالباً اسی وجہ سے دل کو تمام اعضاء کا بادشاہ تسلیم کیا گیا ہے، اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے ہوسکتا ہے مستقبل قریب میں سائنس کے ذریعہ اس سلسلہ میں مزید انکشافات ہوں، اور اصل حقیقت سامنے آجائے، سائنس کے مزعومات سے فوراً مرعوب ہوجانا شکست خوردہ ذہنیت ہے، سائنس تو خود سرگردانی کے عالم میں پھر پھرا کر بالآخر شریعت کی مطابقت کرتی ہے، اور آئندہ بھی انشاءاللہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

حدیث مذکور اور مزید غلط فہمیاں

اس حدیث پر برق صاحب نے تین مادی اعتراض کئے ہیں، ان کا جواب اتنا ہی کافی ہے کہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ

اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، روحانی باتوں کو مادی ترازو میں تولنا، کوئی مناسب فعل نہیں، بہر حال برق صاحب کا پہلا اعتراض یہ ہے، کہ جب خطا کاری کی استعداد ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محروم کر دیا گیا، تو پھر آپ کی تقدس مآب زندگی کوئی قابل فخر چیز نہیں" میں کہتا ہوں، کہ حدیث میں جس چیز کو شیطان کا حصہ بتایا گیا ہے، اس کو دل میں واپس نہ لانے کا حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا اعتراض کالعدم ہے، اب ذرا قرآن کا مطالعہ کیجئے، ارشاد باری ہے:۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف)	اور بے شک اس عورت نے یوسف علیہ السلام سے بد فعلی کا ارادہ کیا تھا۔ اور اگر وہ رب کی برہان کو نہ دیکھتے تو وہ بھی اس عورت سے بد فعلی کا ارادہ کر لیتے۔ یہ اس لئے ہوا کہ ہمیں یوسف علیہ السلام کو برائی اور بے حیائی سے بچانا ہی مقصود تھا بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کسی ذریعہ سے بچا لیا، اور جب بے حیائی سے بچانے کا ذریعہ خود اللہ تعالیٰ نے مہیا فرمایا، تو پھر یوسف علیہ السلام کی مقدس و مطہر با عصمت زندگی کوئی قابل فخر چیز نہیں رہی، اسی سورت میں آگے ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (یوسف)	بے شک نفس برائی کا حکم دیتا ہے مگر جس پر میرے رب کا رحم و کرم ہو جائے

گویا برائی سے بچنا بھی اللہ کے رحم و کرم پر موقوف ہے، اب اگر کوئی شخص برائی سے بچ جائے، تو اس آیت کی رو سے اس نے کون سا کمال کیا، کہ جس پر فخر کیا جائے۔

برق صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے، کہ اللہ ماں کے پیٹ ہی میں ایسی ساخت بنا سکتا تھا کہ گناہ کا ارادہ ہی پیدا نہ ہو" میں کہتا ہوں، شق صدر سے ساخت میں تبدیلی ہی کہاں ہوئی، لہٰذا اعتراض مندفع ہے، اب قرآن کی سنیئے، وہ کیا کہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر کے ذریعہ ایک لڑکے کو محض اس لئے قتل کرا دیا، کہ کہیں بڑا ہو کر اپنے نیک ماں باپ کو سرکشی میں مبتلا نہ کر دے۔ آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا (کہف)	اور لڑکے کو اس لئے قتل کیا کہ اس کے ماں باپ مومن تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں مبتلا نہ کر دے۔

کیا اس واقعہ پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا، کہ ایسے بچے کو پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی، جس کو قتل کرانا مقصود تھا، پھر ان ماں باپ کی مقدس زندگی کس طرح قابل فخر و ستائش سمجھی جا سکتی ہے، جب کہ گناہ میں مبتلا کرنے والی چیز ہی کو نیست و نابود کر دیا گیا، گناہ کا سبب ہی باقی نہ رہا، تو پھر ماں باپ کا گناہ نہ کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں، نہ معلوم بغیر آزمائش کے اللہ تعالیٰ ان پر ایسا مہربان کیوں تھا، کہ ان کے معصوم بچے کو قتل کرا دیا، اللہ ایسے اعتراضات سے محفوظ رکھے، کہ جن کی زد سے نہ قرآن بچ سکے، نہ حدیث، نعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔

برق صاحب کا تیسرا اعتراض یہ ہے، کہ پانی سے مرکز گناہ کو دھونا بھی عجیب و غریب ہے، دھونے سے گناہ کیسے ختم ہو جائیں گے، اس کا جواب اوپر دے چکا ہوں، کہ روحانیات میں مادی اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں، پھر حدیث میں یہ کہاں ہے، کہ وہ حصہ اس لئے دھویا گیا، کہ آئندہ اس سے گناہ سرزد نہ ہوں، یا گذشتہ گناہ مٹ جائیں، حدیث میں اس شیطانی حصہ کو دھونے کا ذکر نہیں ہے، بلکہ دل کو دھونے کا ذکر ہے، حدیث کی اصل عبارت اور اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

شق عن قلبه فاستخرج منه علقة فقال هذا حظ الشيطان منك ثم غسله في طست من ذهب بماء زمزم ثم لامه و اعاده في مكانه (صحيح مسلم)	حضرت جبریل نے آپ کے دل کو ایک جانب سے چیرا اور اس میں سے ایک علقہ نکالا اور کہا یہ آپ کے دل میں شیطان کا حصہ ہے۔ پھر دل کو سونے کے لگن میں آب زمزم سے دھویا پھر اس کو شگاف سے ملا دیا، پھر اس کو اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

یہی وہ دل ہے، جس کو مستقبل میں مہبط وحی بننا تھا، لہٰذا اس کی نورانیت کے لئے پہلے سے انتظامات ہو رہے تھے، ان انتظامات سے اللہ کی کیا مصلحت تھی، اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

مغیرہ، شعبی، اعمش اور قاسم جیسے علمائے تابعین جمع احادیث کو ناجائز سمجھتے رہے (دو اسلام ص ۸۰)

ازالہ یہ روایتیں سراسر باطل اور افترا ہیں:۔

امام شعبی کی روایت کے دو طریق ہیں، اول میں عبد اللہ بن یحییٰ اور عمر بن محمد جمحی مجہول ہیں، اور علی بن عبد العزیز اور محمد بن فضیل مجروح ہیں، اور ابو غسان کئی ہیں بعض نامقبول اور لاپتہ ہیں، دوسرے طریق میں عبد الوارث بن سفیان مجہول ہے، اور محمد بن فضیل جو پہلے طریق میں بھی ہے مجروح ہے (برق باسلام ص ۱۰۷)

مغیرہ اور اعمش کی روایت میں عبد الرحمٰن بن یحییٰ اور عمر بن محمد جمحی مجہول ہیں، اور علی بن عبد العزیز

مجروح ہے (برق اسلام مصنفہ ابو سعید شرف الدین صاحب محدث دہلوی ص۱۰۷)
قاسم کی روایت میں احمد بن عبداللہ بن محمد بن علی اور عبداللہ بن یونس مجہول ہیں (برق اسلام ص۱۰۷)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔
"جن احادیث کو مشتبہ سمجھ کر فاروق و صدیق جلا رہے تھے، وہ اڑھائی سو برس بعد کیسے صحیح بن سکتی تھیں" (دو اسلام ص۷۹)

ازالہ صدیقی اور فاروقی دور میں ہرگز ایسا نہیں ہوا، جو روایت بیان کی جاتی ہے، وہ سراسر کذب و افترا ہے، تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو:۔

غلط فہمی "علامہ محمد طاہر گجراتی نے اپنی مشہور تصنیف "قانون الاخبار الموضوعہ والرجال الضعفاء" میں تقریباً دو ہزار ایسے اشخاص کے نام دیئے ہیں، جو زندگی بھر احادیث گھڑتے رہے" (دو اسلام ص۷۹)

ازالہ دو ہزار کی تعداد صحیح نہیں، کتاب مذکور میں تقریباً ایک ہزار راویوں کا حال ہے، جن میں سے اکثر ضعیف ہیں، اور صرف چند ایسے ہیں، جو احادیث گھڑتے تھے، کتاب کا نام جو برق صاحب نے تحریر فرمایا ہے اس سے بھی ظاہر ہے، کہ اس میں ضعیف راویوں کا حال بھی ہے، یعنی ایسے راویوں کا بھی حال ہے، جو صادق تو تھے، لیکن کمزور حافظہ تھے، برق صاحب نے نہ تو راویوں کو گنا، نہ یہ دیکھا، کہ اس میں گھڑنے والوں ہی کا حال نہیں ہے، بلکہ اوروں کا بھی تذکرہ ہے، ایک ہزار کے دو ہزار سمجھ لئے، اور ضعفاء کو وضاع سمجھ لیا۔

غلط فہمی برق صاحب نے چند واضعین حدیث کے نام لکھ کر یہ شبہ وارد کیا ہے کہ ان کی وضع کردہ احادیث صحاح ستہ میں داخل ہو گئیں (دو اسلام ص۷۹)

ازالہ جن واضعین کے نام برق صاحب نے لکھے ہیں، ان سے کوئی روایت صحاح ستہ میں نہیں ہے اور اگر بالفرض محال ہوتی بھی، تو اس متن کے ساتھ اس کی سند میں اس واضع کا نام بھی موجود ہوتا، تو پھر بتایئے، دھوکا کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کا نام آتے ہی، وہ حدیث حدیث نہیں رہتی جن کتب میں ایسی احادیث جمع کی گئی ہیں، وہاں ان گھڑنے والوں کے نام بھی موجود ہیں، لہٰذا کوئی شخص ان کی جعل سازی سے دھوکا نہیں کھا سکتا، برق صاحب یاد رکھئے محدثین اس حدیث پر فنی بحث ہی نہیں کرتے، جو موضوع ہوتی ہے، محدثین تو صحیح سند سے ثابت شدہ متن کی تحقیق میں اپنا سارا زور خرچ کرتے ہیں، موضوع حدیث کا تو مقام ہی علیحدہ ہے، آپ دونوں کو خلط ملط کیوں کر رہے ہیں۔

غلط فہمی :۔ برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"صحاح ستہ میں بعض ایسی احادیث راہ پاچکی ہیں، جو نہ صرف قرآن سے متصادم ہوتی ہیں، بلکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند علم عظیم المرتبت شخصیت، اور بے مثال کردار کے سخت منافی ہیں (دو اسلام ص۹)

ازالہ صحاح ستہ میں ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں اگر غلط فہمی سے کسی صحیح حدیث کا ایسا مطلب لے لیا جائے تو پھر یہ تو قرآن کی آیات سے بھی ممکن ہے، جہاں برق صاحب تفصیل کریں گے، وہیں ہم بھی اس قسم کی آیات کی مثالیں دیں گے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"مولانا عبید اللہ سندھی نے فرمایا تھا، ہم ایک یوروپین نو مسلم کو کتاب بخاری کیوں نہیں پڑھا سکتا، اس کیو ہم مجلس عام میں نہیں پڑھا سکتا" (دو اسلام ص۷۹-۸۰)

ازالہ اول تو معلوم نہیں، کہ مولانا عبید اللہ سندھی کا یہ قول ان کی کس کتاب میں ہے، صرف رسالہ الفرقان کا حوالہ اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں، دوم مولانا عبید اللہ سندھی کا شمار ذی علم ستیوں میں نہیں لہٰذا اگر وہ صحیح بخاری کو نہ سمجھ سکے ہوں، تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لئے ان کا قول کوئی وقعت نہیں رکھتا، ہاں اگر آپ علامہ ابو الحسن سندھی یا علامہ محمد حیات سندھی کا کوئی قول پیش فرماتے، تو وہ کسی حد تک قابل اعتنا ہو سکتا تھا۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"احادیث تراشی میں بڑے بڑے "بزرگان قوم" شامل تھے" (دو اسلام ص۸۰،۸۱)

ازالہ برق صاحب! ان کو بزرگان قوم کون کہتا ہے، عوام جو چاہیں کہیں، کسی کو علامہ کہدیں، اور کسی کو قاضی کہدیں، مگر محدثین کی فہرست میں یہ لوگ بزرگان قوم میں شمار نہیں ہوتے، بلکہ مشہور کذابین کی فہرست میں داخل ہیں، لہٰذا صحیح احادیث ان کے وجود سے پاک ہیں۔

باب ۳

چند عجیب راوی وصحابہ

غلط فہمی برق صاحب نے صفحہ ۸۷ پر ایک موضوع حدیث جماع کے بعد غسل کرنے کی فضیلت میں نقل کی ہے، اور صفحہ ۸۸ پر ایک موضوع حدیث کلمہ پڑھنے کی فضیلت میں نقل کی ہے، اور ان دونوں احادیث پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔

ازالہ برق صاحب! آپ کو تعجب کس پر ہے، گھڑنے والے پر یا محدثین پر، اگر گھڑنے والے پر ہے تو ہم بھی آپ کے شریک ہیں، اور اگر محدثین پر ہے، تو میں آپ کو بتاتا ہوں، کہ محدثین نے تو بہت پہلے ان کو جعلی کہدیا تھا آپ تو آج ان کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن محدثین نے بڑی متانت سے پہلے ہی دن ان کی حقیقت کا انکشاف کردیا تھا، لہذا محدثین پر تعجب کرنا خود تعجب خیز ہے

غلط فہمی آگے چل کر برق صاحب نے چند جھوٹوں کا تذکرہ کیا ہے، کہ ان لوگوں نے کئی سو سال بعد صحابی ہونے کا دعویٰ کیا مثلاً قیس بن تمیم، سرباتک، جبیر بن حرب، ابوعبداللہ محمد الصقلی، جعفر بن نسطور بابا رتن ہندی، ان لوگوں کا ذکر کرنے سے پہلے برق صاحب لکھتے ہیں:۔

"اب ذرا سوانح میں ان کی حقیقت نگاری کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے" (دو اسلام صـ۸۸)

آگے چل کر سرباتک کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"حیرت ہے، کہ جب اسحاق بن ابراہیم ۳۰۷ھ کے قریب سرباتک سے ملاقی ہوا تھا، تو اس کی عمر سات سو ستر برس تھی، اور ۳۳۳ھ یعنی ۲۶ برس پہلے اس کی عمر ۷۴۹ سال تھی، ریاضی کے ان محدثانہ نکات کو ہم جیسے بے علم کیا سمجھیں" (دو اسلام صـ۹۰)

ازالہ برق صاحب یہ حقیقت نگاری محدثین کی نہیں ہے، بلکہ دجالین وکذابین کی ہے، محدثین نے تو بہت پہلے ہی ان کو کذابین کی فہرست میں شمار کیا ہے، ان سب لوگوں کا مفصل حال آپ کو تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱۰۲ تا صفحہ ۱۰۸ میں ملے گا، ریاضی کی یہ غلطیاں افسوس ہے کہ آپ ان کو محدثین کی طرف منسوب کر رہے ہیں، حالانکہ محدثین کا ان سے کوئی تعلق نہیں، ریاضی اور ان جیسی دیگر غلطیوں کا ذکر خود محدثین نے کیا ہے، لیکن ان کے علاوہ محدثین کے پاس ایسا زبردست معیار ہے، جس کی بنیاد پر وہ آنکھ

ہند کے ان مدعیان صحبت نبوی کے کذب پر قسم کھا سکتے ہیں، اور اسی معیار پر رکھ کر محدثین نے ان کے کذاب ہونے کی صراحت کی ہے

دوم۔ ایک بات اور یاد رکھیئے، وہ یہ کہ یہ دجال سب کے سب تدوین حدیث کے دور کے بعد ظاہر ہوئے، لہذا حدیث کے معتبر دواوین ان کی من گھڑت خرافات سے معرا ہیں۔ محدثین کا وہ زبردست معیار جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، یہ صحیح حدیث ہے، جو درج ذیل ہے، وفات سے کچھ دن پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ارأیتکم لیلتکم ھذہ فان رأس مائۃ سنۃ منھا لا یبقی ممن ھو علی ظھر الارض احد (صحیح بخاری)

یعنی آج کی رات سے سو سال ختم ہونے تک روئے زمین پر جتنے انسان اس وقت موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔

پس اس معیار پر مدعیان صحبت نبوی پورے نہیں اترتے، لہذا محدثین نے فوراً انہیں کذاب کہہ دیا۔

غلط فہمی برق صاحب لکھتے ہیں:۔

"علامہ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں، کہ بابا رتن ہندی کی وفات ۶۳۲ھ ـ ۱۲۳۵ء میں ہوئی تھی لیکن محدثین کی ایک خاص تعداد اسے صحابی سمجھ کر اس کی احادیث روایت کرتی ہے، جب علامہ ذہبی نے بابا رتن کی روایات کو جھوٹا قرار دیا، تو قاموس کے مصنف علامہ مجدالدین فیروزآبادی (وفات ۸۱۶ھ) کو اس قدر صدمہ پہنچا، کہ انہوں نے علامہ ذہبی سے تمام تعلقات توڑ لئے" (دو اسلام ص ۹۱)

ازالہ یہ بات قطعاً صحیح نہیں، کہ محدثین کی ایک خاص تعداد بابا رتن کو صحابی سمجھ کر اس کی احادیث روایت کرتی ہے، ہاں ملفوظات خواجگان کو اگر آپ کتب حدیث سمجھ بیٹھے ہیں، تو پھر بات ہی دوسری ہے محدثین کے نزدیک تو یہ ملفوظات بھی خرافات سے مملو ہیں، پھر یہ ملفوظات بہت بعد کی پیداوار ہیں محدثین سے ان کا کوئی تعلق نہیں، بابا رتن خود دور تدوین حدیث کے بہت عرصہ بعد ظاہر ہوا تھا، لہذا اس سے محدثین کا حدیث روایت کرنا عقلاً محال ہے، متاخرین نے جہاں ان لوگوں کی تردید کی ہے، وہیں سے برق صاحب یہ افسانے نقل فرما رہے ہیں، اور حیرت ہے، کہ تردید کرنے والوں کو ان چیزوں کا ماننے والا سمجھ رہے ہیں، پھر یہ بھی غلط ہے، کہ علامہ مجدالدین نے علامہ ذہبی سے تمام تعلقات توڑ لئے تھے، برق صاحب نے بے حوالہ اس کو نقل کیا ہے، یہ بھی صحیح نہیں، کہ علامہ مجدالدین نے بابا رتن کو صحابی تسلیم کیا، ایک طرف تو برق صاحب جامعین حدیث کا تذکرہ کرتے ہیں، اور نام لیتے ہیں علامہ مجدالدین کا، حالانکہ علامہ مجدالدین جامعین حدیث میں سے نہیں ہیں، اور نہ تدوین حدیث سے ان کا کوئی تعلق ہے، اصل واقعہ صرف

صرف اتنا ہے، کہ علامہ ذہبی نے رتن کے وجود پر تردد کا اظہار کیا، تو علامہ مجدالدین نے اس تردد کا انکار کیا، اور کہا ایسا شخص یقیناً ہوا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں، کہ علامہ مجدالدین نے اس کے دعوی صحابیت میں اس کو سچا سمجھا، تذکرۃ الموضوعات میں جہاں سے برق صاحب نے یہ چیزیں نقل کی ہیں، اس چیز کی وضاحت موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

قال ابن حجر رأیت شیخنا مجد الدین	علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ ہمارے استاد مجدالدین نے
صاحب القاموس ینکر علی الذھبی	علامہ ذہبی کے رتن کے وجود کا انکار کی تردید کی ہے
انکارہ وجود رتن وذکر انہ دخل فی	وہ کہتے تھے کہ میں ہندوستان کی ایک بستی میں گیا
ضیعۃ فی الھند ووجد فیھا من لا	تو مجھے لاتعداد ایسے آدمی ملے جو اپنے آباء و اسلاف
یحصی کثرۃ ینقلون قصۃ رتن	سے رتن کا قصہ روایت کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں۔
عن آباءھم واسلافھم قلت ھو	علامہ ذہبی نے رتن کے وجود کا انکار نہیں کیا بلکہ
لم یجزم بعدمہ بل تردد قال واظنہ	تردد کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا ظاہر ہوتا ہے کہ
انہ کان طویل العمر فادعی وتمادی	اس کی عمر طویل تھی لہٰذا اس نے صحابی ہونے کا دعوی
علیہ حتی اشتھر ولو کان صادقا	کر دیا۔ حتی کہ وہ مشہور ہو گیا۔ اگر وہ سچا ہوتا تو دوسری
لاشتھر فی المائۃ الثانیۃ او الثالثۃ	یا تیسری صدی ہجری میں ہی مشہور ہوتا۔ لیکن اس
ولکن لم ینقل عنہ شیٔ الا فی اخر	سے کوئی چیز نقل نہیں ہوئی۔ مگر چھٹی صدی کے آخر
المائۃ السادسۃ ثم فی اوائل	میں پھر ساتویں صدی کے شروع میں اس کی
السابعۃ قبیل موتہ (تذکرۃ الموضوعات ص۱۰۸)	موت سے کچھ عرصہ پہلے۔

عبارت بالا سے ظاہر ہے، کہ علامہ ذہبی نے ایک زبردست معقول دلیل سے بابا رتن کے کذاب ہونے کا ثبوت دیا، علامہ مجدالدین کو غلط فہمی ہوئی، کہ وہ یہ سمجھ گئے، کہ علامہ ذہبی اس کے وجود کے منکر ہیں، لہٰذا انہوں نے تردیداً کہا، کہ وجود تو ضرور تھا اس لئے کہ لاتعداد لوگ اس کے وجود کی شہادت دیتے تھے۔

خلاصہ باب سوم

الغرض بعض جاہل ملاؤں نے ان مدعیان صحابیت کے دعوی کو سچ سمجھ لیا ہو، تو دوسری بات ہے، شارحین حدیث یا متاخرین محدثین نے ان کی تکذیب کی، اور ان پر سخت تنقید کی، اور یہ برق صاحب کو بھی تسلیم ہے، برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"بحمد اللہ کہ اسلام میں کچھ محققین بھی ہو گذرے تھے، جنہوں نے ایسے تمام واقعات پر سخت تنقید کی ہے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء" (دو اسلام ص۹۰)

باب ۴

"کچھ ائمہ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق"

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت عائشہ فرماتی ہیں، حضرت انس اور حضرت ابوسعید خدری حدیث رسول سے محض ناواقف ہیں اس لئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے" (دو اسلام ص ۹۴)

ازالہ یہ قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر افتراء محض ہے، اس کی سند منقطع ہے (جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۵۴) پھر یہ عقلاً بھی محال ہے، اس لئے کہ ان ہر دو صحابیوں کی عمر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یقیناً زیادہ تھی، لہٰذا وہ کم سنی کا اعتراض نہیں کر سکتیں

دوم یہ کہ ان دونوں صحابیوں کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ۲۰ سال سے کچھ زاید ہی تھی، اور یہ عمر اتنی کم نہیں ہے، کہ احادیث کی حفاظت نہ ہو سکے، اس عمر میں تو آج کل ایم اے، اور ایم ایس سی پاس کر لیتے ہیں، اور سات سات، آٹھ آٹھ برس کے بچے پورا قرآن حفظ کر لیتے ہیں، تو اس زمانہ میں جب کہ حافظہ کئی گنا تھا، احادیث کو محفوظ کر لینا کیا بعید ہے، یہی ابوسعید خدری ہیں، جن کو صحابہ کرام نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ حدیث کی تصدیق کرنے کے لئے حضرت عمر رضہ کی خدمت میں روانہ کیا تھا، اور یہ کہہ کر روانہ کیا تھا، کہ ہماری قوم کا سب سے چھوٹا آدمی اس کی تصدیق کرنے جائے گا، اس نوجوان کو وہ حدیث معلوم تھی، جو حضرت عمر رضہ کو معلوم نہ تھی، یہ وہ نوجوان ہے، جس پر حضرت عمر رضہ نے اعتماد کیا تھا، اور اس کی شہادت کو تسلیم کیا تھا (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو) اور حضرت انس وہ نوجوان صحابی ہیں، جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تحصیلدار بنا کر بحرین روانہ کیا تھا (صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ) ان نوجوان صحابیوں پر حضرت ابوبکر رضہ اور حضرت عمر رضہ تو اعتماد کریں، اور آپ ان پر اعتماد نہ کریں، یہ کس قدر حیرت کا مقام ہے

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک آدمی نے وتر کے متعلق حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ حدیث پڑھی، ابن عمر رضہ نے فرمایا

كَذَبَ اَبُوْهُرَيْرَةَ (ابوہریرہ جھوٹا ہے)" (دو اسلام ص ۹۵)

ازالہ:۔ کذب کے معنی اگر "جھوٹ" کے ہی لئے جائیں تو "کذب ابو ہریرہ" کے صحیح معنی یہ ہوں گے، کہ ابوہریرہ

نے جھوٹ کہا" اس کے یہ معنی ہرگز نہیں، کہ "ابوہریرہ جھوٹا ہے" محاورے کے لحاظ سے ان دونوں جملوں میں بہت فرق ہے "ابوہریرہ جھوٹا ہے" یہ بہ نسبت "ابوہریرہ نے جھوٹ کہا" کے زیادہ قبیح ہے، معلوم نہیں غلط اور پھر زیادہ قبیح معنی کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی، ہوسکتا ہے کہ غلط فہمی ہوگئی ہو۔

صدق اور کذب کا استعمال محض سچ اور جھوٹ ہی کے لئے نہیں ہوتا، بلکہ صدق کا استعمال صحیح نتیجہ پر پہنچ جانے کے لئے بھی ہوتا ہے اور کذب کا استعمال غلطی کر جانا، خطا کر جانا کے معنوں میں بھی ہوتا ہے، عرب کا محاورہ ہے، کہ اگر تیر نشانہ پر بیٹھ جائے، تو "صدق" استعمال کرتے ہیں، اور اگر خطا کر جائے، تو "کذب" استعمال کرتے ہیں، لہٰذا "کذب ابوہریرہ" کے صحیح معنی یہ ہوئے، کہ "ابوہریرہ سے خطا ہوگئی" علامہ احمد عبدالرحمٰن البنا الشہیر بالساعاتی لکھتے ہیں:۔

"معنی قولہ کذب ای اخطاء وھو لغۃ	کذب کے معنی خطا کی "اور یہ اہل حجاز کی لغت
اھل الحجاز یطلقون الکذب علی ما ھو	ہے۔ وہ کذب کو قصد اور خطا سے بھی زیادہ
اعم من العمد والخطاء"	عام معنوں پر محمول کرتے ہیں۔

(بلوغ الامانی علی فتح الربانی (مسند احمد) جزء ۳ ص ۳۰۲)

امام باجی لکھتے ہیں:۔

ای وھم وغلط (بلوغ الامانی جزء ۴ ص ۲۷۶)	یعنی وہم ہوگیا غلطی ہوگئی۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب حضرت عائشہ رضہ کے سامنے حضرت عبداللہ بن عمر رضہ کی یہ حدیث پڑھی گئی "صلوۃ اللیل مثنی مثنی واذا خشیت الصبح فواحدۃ" یعنی رات کی نماز دو رکعت ہے، اور جب صبح قریب آجائے، تو ایک رکعت (یعنی وتر) ادا کرو، تو آپ نے فرمایا "کذب ابن عمر" ابن عمر جھوٹا ہے (دو اسلام ص ۹۵)

ازالہ یہاں بھی ترجمہ غلط کیا گیا ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ "ابن عمر رضہ سے خطا ہوگئی" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے شایان شان یہی معنی ہیں، ایک اور موقعہ پر حضرت عائشہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضہ کے بارے میں فرمایا تھا:۔

یغفر اللہ لابی عبد الرحمن اما انہ	یعنی اللہ تعالےٰ ابوعبدالرحمٰن (یعنی ابن عمر) کی مغفرت
لم یکذب ولکنہ نسی او اخطاء (صحیح مسلم	فرمائے۔ جھوٹ تو وہ نہیں بولتے لیکن وہ بھول
باب المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ)	گئے یا ان سے خطا ہوگئی۔

یہ حدیث بالکل صحیح ہے، اس میں حضرت عائشہ رضہ حضرت عبداللہ بن عمر رضہ کے جھوٹ نہ بولنے کی صراحت کر

رہی ہیں، لہذا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ وہ کسی دوسرے موقع پر انہیں جھوٹا سمجھیں، لہذا برق صاحب کی وارد کردہ روایت محل نظر ہے

خود حضرت عائشہ صدیقہ رضہ سے بھی یہ حدیث انہی معنوں میں مروی ہے، وہ فرماتی ہیں :۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم یصلی . . . احدی عشرۃ رکعۃ یسلم بین کل رکعتین و یوتر بواحدۃ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے آپ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے اور ایک رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اس حدیث کی موجودگی میں کیسے یقین کیا جا سکتا ہے، کہ انہوں نے عبد اللہ بن عمر کی بیان کردہ حدیث کو غلط سمجھا لہذا برق صاحب کی بیان کردہ روایت باطل ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

جب حضرت عمر بن الخطاب کی یہ حدیث "ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ" کہ میت پر بد مزنے سے میت کو سزا ملتی ہے، حضرت عائشہ رضہ کے سامنے بیان کی گئی، تو آپ نے فرمایا، اللہ عمر پر رحم کرے، کیا اس نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی کہ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا (بخاری و مسلم) مسلم نے یہ حدیث چھ مرتبہ، چھ صحابہ سے روایت کی ہے ... حضرت عائشہ رضہ نے گویا سب کی تردید فرمادی" (دو اسلام ص ۹۵-۹۶)

ازالہ :۔ حضرت عائشہ رضہ نے تردید تو بے شک کی، لیکن کتنے پیارے انداز میں :۔

لما بلغ عائشۃ قول عمر و ابن عمر قالت انکم لتحدثونی عن غیر کاذبین ولکن السمع یخطی (صحیح مسلم)	جب حضرت عائشہ کو حضرت عمر اور حضرت ابن عمر کی روایت کردہ حدیث پہنچی تو انہوں نے کہا تم ایسے آدمیوں سے حدیث بیان کررہے ہو جو نہ جھوٹے ہیں نہ جھٹلائے جا سکتے ہیں مگر سننے میں غلطی ہو سکتی ہے

پھر فرماتی ہیں "یرحم اللہ عمر" اللہ عمر رضہ پر رحم فرمائے، عبد اللہ بن عمر رضہ کے متعلق فرمایا "یغفر اللہ لابی عبد الرحمٰن" اللہ ابن عمر رضہ کو معاف فرمائے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضہ نے تردید میں صرف قرآن کی آیت ہی پیش نہیں فرمائی، بلکہ حدیث بھی پیش کی، انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا

ان اللہ یعذب المؤمن ببکاء احد	کہ اللہ مومن پر کسی کے رونے کی وجہ سے عذاب کرتا ہے

بلکہ یہ فرمایا تھا:۔

ان اللہ یزید الکافر عذابا ببکاء اھلہ علیہ (صحیح مسلم)

بے شک اللہ کافر پر نوحہ کی وجہ سے عذاب زیادہ کردیتا ہے۔

حضرت عائشہ رضہ نے جو کچھ سنا تھا، اس کو اپنی دلیل میں پیش فرمایا اور پھر قرآن کی آیت تلاوت فرمائی، کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، لیکن حضرت عائشہ نے جو حدیث پیش کی، وہ بھی اس آیت کے خلاف ہے اور حضرت عمر رضہ کی حدیث بھی اس آیت کے خلاف ہے، حدیث دونوں نے پیش کی، اور ایسی حالت میں پیش کی، کہ وہ بظاہر قرآن کی آیت سے ٹکراتی تھی، ان میں سے کسی نے بھی صرف قرآن کی مخالفت کی وجہ سے حدیث کو مسترد نہیں کیا، اور نہ یہ صحابہ کرام رضہ کا دستور تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کیا سمجھیں اور انہوں نے کیوں تردید کی، امام نووی لکھتے ہیں:۔

وقالوا کان من عادۃ العرب الوصیۃ بذلک ومنہ قول طرفۃ بن العبد اذا مت فانعینی بما انا اھلہ وشقی علی الجیب یا ابنۃ معبد

یعنی جمہور نے کہا ہے کہ یہ اہل عرب کی عادت تھی کہ وہ اس کی وصیت کرتے تھے طرفہ بن عبد کا قول بھی اسی تفعیل سے ہے وہ کہتا ہے "جب میں مرجاؤں تو مجھ پر ایسا نوحہ کرنا جسکا میں اہل ہوں اور

(بلوغ الامانی علی فتح الربانی جزء صفحہ ۱۲۶)

غرض یہ کہ حضرت عائشہ یہ سمجھیں کہ کافر کے متعلق تو میں نے یہ حدیث سنی ہے، کیونکہ ان کے ہاں رسم ہے اور وہ اپنے اہل کو اس کی ترغیب دیتے ہیں، لہٰذا اس ترغیب کا عذاب ان کو ہوگا، لیکن مومن تو ایسا نہیں کرسکتا لہٰذا اس پر دوسروں کا بوجھ کیسے پڑے گا، مگر حضرت عمر رضہ کی حدیث عام ہے، مومن ہو یا کافر جو شخص بھی اپنے ہاں نوحہ کی رسم کو جاری رکھے، اس سے روکے نہیں، تو پھر مومن اور کافر دونوں پر عذاب ہوگا، نہ حضرت عائشہ کی حدیث حقیقۃً قرآن کے خلاف ہے، نہ حضرت عمر رضہ کی حدیث، ہاں حضرت عائشہ صدیقہ رضہ نے جو مطلب سمجھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی منشار کے مطابق نہ تھا، وہ یہ سمجھتی رہیں، کہ مومن ایسا کر نہیں سکتا، اس کو عذاب کیوں ہوگا، انہوں نے اس غلطی کو حضرت عمر رضہ کی طرف منسوب کیا، اور حضرت عمر رضہ و دیگر صحابہ اس کے حقیقی منشار کو سمجھ کر اس کو روایت کرتے تھے، اور یہ دلالت ان صحابہ کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ میں موجود ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان المیت لیعذب ببعض بکاء اھلہ (صحیح مسلم)

بے شک میت پر اس کے اہل کے بعض نوحوں کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔

یعنی میت پر ہر حالت میں عذاب نہیں ہوتا، بلکہ بعض حالات میں ہوتا ہے، اور وہ بعض حالات یہی ہیں، کہ اس میت کے ہاں نوحہ کی رسم ہو، اور اس نے اس رسم کو بند کرنے کی کوشش نہ کی ہو، یا اس رسم کی ترغیب دی ہو، تو پھر اس رسم کی وجہ سے جو نوحہ کیا جائے گا، اس کا عذاب میت پر بھی ہوگا۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی | اسی طرح جب حضرت عائشہ رضہ کے سامنے ابن عمر رضہ کی یہ حدیث بیان کی گئی کہ حضور نے مقتولین جنگ کی لاشوں کو جو ایک گڑھے میں پڑی تھیں دیکھ کر فرمایا، کیا اللہ تعالیٰ نے وہ مواعید پورے کر دیئے ہیں، جو تم سے کئے گئے تھے، کسی نے کہا، آپ مردوں کو پکار رہے ہیں؟ فرمایا تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے، فرق یہ ہے، کہ وہ جواب نہیں دے سکتے، تو آپ نے فرمایا، حضور نے ان لاشوں کو دیکھ کر صرف اتنا فرمایا تھا "انھم لیعلمون الآن ان ما کنت اقول حق" ان لوگوں کو اب معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ میں کہا کرتا تھا، وہ درست ہے، اور پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی "اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى" تم مردوں کو کوئی بات نہیں سنا سکتے" (دو اسلام ص۹۶)

ازالہ | حضرت عائشہ رضہ نے حدیث مذکور کے جو الفاظ سنے تھے، ان کے مطابق ابن عمر رضہ کی حدیث کو نہ پایا، مزید برآں انہوں نے ابن عمر رضہ کی حدیث کو بظاہر قرآن کی آیت کے خلاف سمجھا، لہٰذا اس پر شبہ کا اظہار فرمایا، انہوں نے فرمایا:۔

قد وھل (صحیح مسلم کتاب الجنائز) یعنی ابن عمر سے خطا ہو گئی وہ بھول گئے۔

پھر یہ کہا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف اتنا فرمایا تھا:۔

انھم لیعلمون الآن ان ما کنت اقول حق۔ یعنی ان لوگوں کو اب معلوم ہو جائے گا۔ کہ میں جو کچھ کہتا تھا وہ صحیح تھا۔

گویا حضرت عائشہ صدیقہ رضہ نے حدیث کے صرف اتنے ہی الفاظ سنے تھے، یعنی انہوں نے صرف وہی الفاظ سنے تھے، جو آپ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمائے تھے، اور وہ الفاظ نہیں سنے، جو اس کے بعد لاشوں کو مخاطب کر کے فرمائے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضہ نے وہ الفاظ روایت کئے ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لاشوں کو مخاطب کر کے فرمائے تھے، لہٰذا حضرت عائشہ رضہ نے اپنی سنی ہوئی حدیث اور پھر قرآنی آیت سے استشہاد کرتے ہوئے ابن عمر رضہ کی حدیث کو صحیح نہیں سمجھا، لیکن یہ ضروری نہیں، کہ جو کچھ انہوں نے سمجھا، وہ صحیح بھی ہو، حضرت عائشہ صدیقہ رضہ میں تحقیق کی عادت زیادہ تھی، اگر وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے بھی یہ الفاظ سنتیں، تو خاموش نہ رہتیں، بلکہ اس کی تشریح کی طالب ہوتیں، اور

تعارض ہیں قرآن کی آیت بھی پیش کر دیتیں، مثلاً ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ — جس کا حساب لیا گیا اس پر عذاب ہوگا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضنے فوراً عرض کیا، کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن میں یہ فرماتا ہے:۔

فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا (الشقاق) یعنی جنتی لوگوں کا حساب آسان ہوگا۔

حضرت عائشہ رض کا مطلب یہ تھا، کہ یہ حدیث تو قرآن کے خلاف معلوم ہوتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آیت میں جس حساب کا ذکر ہے، وہ محض سرسری پیشی ہے، لیکن جس کی چھان بین کی گئی، تو اس پر عذاب ہونا لازمی ہے (صحیح بخاری) الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی غلط فہمی کو اس طرح دور فرمایا، کہ آیت میں حساب سے مراد سرسری پیشی ہے، اور حدیث میں حساب سے مراد چھان بین ہے، اگر اتفاقاً یہ تعارض اس وقت رفع نہ ہوگیا ہوتا، اور یہ حدیث کسی دوسرے صحابی کی روایت سے حضرت عائشہ رض کو پہنچتی، تو وہ اپنی سمجھ کے مطابق تعارض میں آیت کو پیش فرما دیتیں، اور بعد میں آنے والوں کے لئے یہ واقعہ غلط فہمی کا ایک سبب بن جاتا، بعد والے یہ سمجھتے، کہ انہوں نے حدیث کو آیت کے خلاف سمجھ کر رد کر دیا، حالانکہ ان کی غلط فہمی سے بعد والوں کا حدیث کو مسترد کر دینا کسی طرح بھی صحیح نہ ہوتا، اگر کوئی حدیث بظاہر قرآن کے مخالف بھی ہو، اور ہمیں کوئی صورت تطبیق کی بھی معلوم نہ ہو تب بھی ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا، کہ ہم حدیث کو مسترد کر دیں، ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں یا تو حدیث کا مطلب نہیں آیا، یا ہم آیت کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکے، اور یہ ہماری کم فہمی ہے الغرض اگر کوئی صحابی یا صحابیہ یا کوئی اور آیت و حدیث میں تعارض سمجھے، تو اس کی غلط فہمی کی وجہ سے یہ لازمی نہیں، کہ وہ تعارض حقیقۃً بھی ہو، اور نہ ہم پر یہ لازم ہے، کہ جو کچھ انہوں نے سمجھا، وہی ہم بھی سمجھیں، اور اپنی کم فہمی کی وجہ سے یا محض تقلیداً حدیث کو مسترد کر دیں، حدیث کو پرکھنے کا یہ کوئی ٹھوس معیار نہیں، وہ حدیث جس کو برقی صاحب نے پیش فرمایا ہے، اس کے سلسلہ میں ہم صرف اتنا بتائے دیتے ہیں، کہ آیت میں مردوں کو سنانے کی نفی رسول کے لئے ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو سنا سکتا ہے، اگر بطور معجزہ کے صرف اسی وقت آپ کی باتوں کو اللہ تعالیٰ نے ان مردوں کو سنا دیا تو یہ بالکل ممکن ہے، یہ معجزہ آیت کے حکم عام کا مخصص ہوگا، نہ کہ متعارض۔

غلط فہمی برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"عروہ بن زبیر مدنی (وفات ۹۴ھ) سے کسی نے کہا، کہ بقول ابن عباس رسول کریم صلعم نبوت کے بعد تیرہ برس مکہ میں رہے تھے، تو عروہ بولے، ابن عباس جھوٹ کہتا ہے" (دو اسلام ص ۹۰)

ازالہ:۔ عروہ بن زبیر کے قول کے صحیح معنی تو یہی ہیں، کہ "ابن عباس سے خطا ہو گئی"، لیکن بہر حال اس کے

معنی وہی کئے جائیں جو برق صاحب نے کئے ہیں، تو پھر یہ بتلائیے، کہ واقعی ابن عباس رضؓ جھوٹے تھے؟ کیا یہ جھوٹ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد تیرہ برس مکہ میں رہے، ابن عباس رضؓ نے تو سچ بیان کیا، اور وہ سچے ہی تھے، تو اب کوئی شخص غلط فہمی سے سچ کو جھوٹ کہہ دے، تو یہ اس کہنے والے کا قصور ہے، نہ کہ سچ کہنے والے کا، عروہ بن زبیر رضؓ بھی ایک حد تک معذور ہیں، اس لئے کہ انہوں نے ابن عباس کی بات محض تقلیداً ماننے سے اعراض کیا، اور جو کچھ ان کو معلوم تھا اس کی بنا پر ابن عباس کی بات کو تسلیم نہیں کیا، یہ آزادی رائے، اور تحقیق و تنقید ایک مستحسن فعل ہے، لیکن یہ بعد والے دیکھیں گے، کہ تنقید صحیح بھی ہے یا نہیں، کون حق پر ہے، کون غلطی پر، اس روایت میں ابن عباس ہی حق بجانب تھے اور عروہ بن زبیر رضؓ سے خطا ہو گئی، لیکن نہ ابن عباس رضؓ پر اس سلسلہ میں کوئی حرف آتا ہے، نہ ابن زبیر رضؓ پر، ہاں "خطا" کو جھوٹ کا جامہ پہنانے سے بے شک معاملہ بگڑ جاتا ہے، اور یہاں برق صاحب کی غلط فہمی کا یہی موجب ہوا۔

برق صاحب کی پیش کردہ روایت صحیح مسلم کتاب الفضائل میں موجود ہے، اس میں یہ لفظ نہیں ہیں کہ ابن عباس رضؓ جھوٹ کہتا ہے" بلکہ صرف یہ لفظ ہے "فغفرہ" یعنی ابن زبیر رضؓ نے ابن عباس کے لئے مغفرت کی دعا کی، اس صحیح روایت کی موجودگی میں برق صاحب کی پیش کردہ روایت باطل ہے، جامع بیان العلم میں یہ قول بے سند منقول ہے (جامع جلد ۲ صفحہ ۱۵۵) لہٰذا اس کے جھوٹ ہونے میں کیا شبہ ہے

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

• حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالب رضؓ سے کسی نے وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ کی تفسیر پوچھی، جب آپ بیان کر چکے، تو سائل نے کہا، کہ ابن عمر رضؓ اور ابن زبیر رضؓ کی تفسیر کچھ اور ہے، فرمایا "قد کذبا" انہوں نے جھوٹ بولا ہے (دو اسلام صفحہ ۹۷)

ازالہ

• "قد کذبا" کا صحیح مطلب یہ ہے، کہ ان دونوں سے خطا ہو گئی، دوم یہ کہ لفظ "کذبا" مشکوک ہے، اس لئے کہ تفسیر ابن جریر میں یہ لفظ نہیں ہے (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۴۹۲) سوم یہ کہ جامع بیان العلم میں یہ قول بے سند منقول ہے (جلد ۲ صفحہ ۱۵۵) لہٰذا یہ روایت باطل ہے۔

غلط فہمی

• حضرت علی رضؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مغیرہ بن شعبہ، عبادہ بن الصامت، اور ابو محمد مسعود بن اوس انصاری بدری کی سب روایات جھوٹی ہیں (دو اسلام صفحہ ۹۷)

ازالہ

یہ روایت جھوٹی ہے، اور حضرت علی پر اتہام ہے، جامع بیان العلم جہاں سے برق صاحب نے یہ اقوال نقل کئے ہیں، اس میں یہ قول بھی بے سند ہے (جامع جلد ۲ صفحہ ۱۵۵)

غلط فہمی:- • محمد بن جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ میں نے امیر معاویہ کو عبداللہ بن عمر رضؓ کی ایک حدیث سنائی جس

پر معاویہ کو سخت غصہ آیا، اور لوگوں کو جمع کر کے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ ایسی احادیث بیان کر رہے ہیں، جو نہ رسول اللہ صلعم سے منقول ہیں، اور نہ تعلیمات قرآن کے مطابق، خبردار تم ان جاہلوں سے بچو، اور گمراہ کن آرزوؤں سے دور رہو" (صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۷۱) اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے زمانہ ہی میں احادیث کا چشمہ مکدر ہو چکا تھا، اقوال رسول کو مسخ کیا جا رہا تھا، اور اہل نظر صحابہ کا اعتماد اٹھ چکا تھا، ورنہ امیر معاویہ ابن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو جاہل کیوں کہتے (دو اسلام صفحہ ۹۷-۹۸)

ازالہ برق صاحب نے امیر معاویہ رضہ کا پورا بیان نقل نہیں کیا، حضرت امیر معاویہ نے اس کے بعد فرمایا:۔

انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان ھذا الامر فی قریش لا یعادیھم احد الا کبہ اللہ علی وجھہ ما اقاموا الدین (صحیح بخاری)	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ حکومت قریش میں رہے گی جو شخص ان کی مخالفت کرے گا اللہ تعالے اس کو ذلیل کرے گا۔ جب تک قریش دین کو قائم رکھیں گے (یہ بات جاری رہے گی)

اس حدیث کی بنا پر امیر معاویہ یہ سمجھے، کہ حکومت قریش ہی میں رہے گی، لہٰذا عبد اللہ بن عمرؓ کی اس بات پر انہیں یقین نہ آیا، کہ کسی وقت ایک بادشاہ قحطانی بھی ہوگا، کیونکہ عبد اللہ بن عمر کی یہ بات ان کی سنی ہوئی حدیث سے ٹکراتی تھی، لہٰذا انہیں اس پر تعجب ہوا، انہوں نے کہا، کہ یہ بات اس لئے غلط ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی نہیں، نہ یہ کتاب اللہ میں ہے، اور پھر اس حدیث کے بھی خلاف ہے، کہ خلافت قریش ہی میں رہے گی، امیر معاویہ رضہ کے یہ الفاظ، کہ:۔

لا توثر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کہ یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان نہیں فرمائی۔

اس بات پر دلالت کرتے ہیں، کہ امیر معاویہ یہ سمجھے، کہ یہ عبد اللہ بن عمرو کا قول ہے، لہٰذا انہیں غصہ آیا، کہ عبد اللہ بن عمرو ایسی بات کیوں کہتے ہیں جو حدیث میں نہیں، اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا، کہ عبد اللہ بن عمرو رضہ اپنی طرف سے نہیں کہتے، بلکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے ہی سنا ہے، تو پھر وہ اس قسم کی تردید نہ کرتے، بے شک یہ حدیث عبد اللہ بن عمرو نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی، کیونکہ یہ حدیث صحیح بخاری کتاب الفتن میں مذکورہ بالا حدیث سے کچھ پہلے ان الفاظ میں موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

لا تقوم الساعة حتی یخرج رجل من قحطان یسوق الناس بعصاہ	قیامت قائم نہ ہوگی جب تک قحطان سے ایک شخص نہ نکلے گا وہ لوگوں کو اپنی لاٹھی سے ہانکے گا۔ یعنی سختی کے ساتھ حکومت کرے گا۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوگیا، کہ اس میں غلطی امیر معاویہ کی تھی، نہ کہ عبداللہ بن عمرو کی، امیر معاویہ نے بغیر تحقیق کے عبداللہ بن عمرو کی بات پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ انہوں نے خود اپنی بیان کردہ حدیث پر بھی غور نہیں فرمایا، ان کی حدیث میں بھی یہ چیز موجود تھی، کہ حکومت قریش میں اس وقت تک رہے گی، جب تک وہ دین کو قائم رکھیں گے، اور جب وہ دین کو قائم نہیں رکھیں گے، تو پھر غیر قریشی بادشاہ ہوں گے، ان میں سے ایک قحطانی بھی ہوگا، امیر معاویہ رض نے بغیر کسی وجہ کے دونوں کو متعارض سمجھ لیا، بہر حال ان کی نیت بہت اچھی تھی، انہوں نے حدیث کے خلاف ایک بات سنی، تو فوراً اس کی تردید کر دی، اگر عبداللہ کی بات بھی حدیث کی شکل میں ان کے پاس پہنچتی، تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے، بلکہ تطبیق کی کوشش کرتے۔

امیر معاویہ کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا، کہ صحابہ کے زمانہ میں احادیث کا چشمہ مکدر ہو چکا تھا، کسی طرح صحیح نہیں، اس لئے کہ صحابہ اپنی سنی ہوئی احادیث بیان کرتے تھے، نہ کہ غیر صحابی سے سنی ہوئی، پھر یہ بھی صحیح نہیں، کہ اقوال رسول کو مسخ کیا جا رہا تھا، آخر مسخ کرنے والے کون تھے؟ خود صحابہ کرام! صحابہ کرام کے متعلق برق صاحب یہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"صحابہ میں کافی تعداد ایسے حضرات کی موجود تھی، جو محرف احادیث بیان کرنے کے خوگر تھے" (دو اسلام ص۹۵)

معاذاللہ اس غلط فہمی کی بھی کوئی حد ہے، صحابہ کرام اور جھوٹ!! اور وہ بھی اس ہستی پر جس کا وہ کلمہ پڑھتے تھے، مزید برآں برق صاحب نے یہ بھی نتیجہ نکالا ہے، کہ "اہل نظر صحابہ کا اعتماد اٹھ چکا تھا" گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ امیر معاویہ رض بمقابلہ عبداللہ بن عمرو رض اہل نظر تھے، یہ بھی قطعاً صحیح نہیں، امیر معاویہ خلیفہ اور سیاستدان تھے لیکن عبداللہ بن عمرو رض کی شخصیت بہت بلند و بالا ہے، یہ تو ہو سکتا ہے، کہ اہل نظر حضرات کی فہرست میں عبداللہ کو شامل کیا جائے، اور امیر معاویہ اس میں شامل نہ ہوں، لیکن اس کا عکس تو کسی طرح صحیح نہیں۔ برق صاحب کو کتنی بڑی غلط فہمی ہوئی، کہ صحابہ کرام کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے، حالانکہ اللہ تعالے ان کی تعریف میں فرماتا ہے:۔

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ	صحابہ کفار پر سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں اے رسول آپ دیکھتے ہیں کہ وہ رکوع کرتے ہیں سجدہ کرتے ہیں اللہ کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے رہتے ہیں ان

فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ (فتح)	کی علامت یہ ہے کہ یہ سجدوں کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑ گیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کے تذکار جلیلہ توریت میں بھی ہیں اور انجیل میں بھی۔

برق صاحب کچھ تو بتائیے، کیا ایسے ناقابل اعتماد، محرف احادیث بیان کرنے والوں، اپنے رسول کی طرف جھوٹ منسوب کرنے والوں کا ذکر تورات میں ہے، انجیل میں ہے، کیا ایسے ہی لوگوں کی تعریف اللہ تعالٰے کر رہا ہے! برق صاحب اللہ تعالٰے تو یہ فرماتا ہے

الزمهم كلمة التقوى وكانوا احق بها واهلها (فتح)	تقوے کی بات کو ان سے چمٹا دیا ہے۔ اور وہ اس کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

اللہ تعالٰے تو یہ فرمائے، کہ ان کے ہاتھ سے تقویٰ کا دامن نہیں چھوٹتا، اور آپ یہ سمجھیں، کہ وہ جھوٹی احادیث بیان کرتے تھے، وہ ناقابل اعتماد ہو گئے تھے، وہ جاہل تھے، یہ کہاں تک صحیح ہے، اگر کسی صحابی نے بفرض محال کسی دوسرے صحابی کو جوش میں آ کر یہ کہہ دیا، کہ وہ غلط کہتے ہیں، یا وہ جاہل یعنی نادان ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ وہ حقیقت میں بھی ایسے ہی ہیں، برق صاحب آپ نے تو صرف یہی کہا ہے کہ صحابہ کرام ناقابل اعتماد تھے، محرف احادیث بیان کرتے تھے کہنے والے تو یہاں تک کہہ گئے ہیں، کہ صحابہ کرام مرتد ہو گئے تھے، قرآن میں تحریف کرتے تھے، حتی کہ موجودہ قرآن انہی کا تحریف شدہ قرآن ہے، اصل قرآن نہیں ہے، نعوذ باللہ! برق صاحب پھر سوچئے، کہ آپ نے صحابہ کرام کے متعلق جو رائے قائم کی ہے، کیا وہ قرآن کی روشنی میں صحیح ہے

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"جب سمرہ کی یہ حدیث" کانت للنبی سکتتان عند قرأته فی الصلوٰة" حضور ترات نماز میں دو مرتبہ سکتہ (ٹھہرنا۔ وقفہ کرنا) فرمایا کرتے تھے" حضرت عمران بن الحصین (وفات ۵۲ھ) نے سنی تو کہا" کذب سمرة" سمرہ جھوٹا ہے" (دو اسلام ص ۹۸)

ازالہ یہاں بھی" کذب سمرہ" کا ترجمہ" سمرہ جھوٹا ہے" صحیح نہیں، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ سمرہ سے خطا ہو گئی" کذب کے معنی ہر جگہ جھوٹ کرنا ہی تو اصلی غلط فہمی ہے، پھر اس حدیث کے صحیح الفاظ نقل نہیں کئے گئے، صحیح الفاظ درج ذیل ہے:۔

ان سمرة بن جندب وعمران بن حصين تذاكرا فقال سمرة بن جندب	حضرت سمرہؓ اور حضرت عمرانؓ میں مذاکرہ ہوا سمرہؓ نے کہا مجھے یاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حفظت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سکتتین فی الصلوٰۃ سکتۃ اذا کبر الامام حتی یقرأ و سکتۃ اذا فرغ من فاتحۃ الکتاب و سورۃ عند الرکوع فانکر عمران بن حصین فکتبوا فی ذلک الی ابی بن کعب فصدق سمرۃ (ابوداؤد ملخصا ج ۱ ص ۱۲)

دو سکتہ کرتے تھے۔ ایک تکبیر تحریمہ کے بعد اور دوسرا فاتحہ اور سورت کے بعد تو حضرت عمران نے اس کا انکار کیا۔ پھر انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھا حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصدیق کی۔

اصل واقعہ تو اس طرح ہے، اور اس میں کوئی اعتراض بھی نہیں ہے، اگر حضرت عمران نے یہ کہہ بھی دیا کہ سمرہ تم غلط کہتے ہو، تو کیا ہوا، غلطی پر ایک ضرور تھا، اور یہاں غلطی پر وہ نکلے، جو دوسرے کو غلطی پر سمجھ رہے تھے لہٰذا یہ ہو سکتا ہے، کہ کوئی صحابی کسی دوسرے صحابی کو غلطی پر سمجھے، اور وہ خود غلطی پر، اس قسم کے اقوال سے کسی صحابی کی تکذیب نہیں ہوتی، نہ یہ کوئی دلیل ہے کسی شخص کی غلط فہمی کی بنا پر حق والے کو ناحق سمجھنا تحقیق کا خون کرنا ہے۔

غلط فہمی برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"حضرت امام مالک بن انس رض کے متعلق محمد بن اسحاق کہا کرتے تھے، کہ وہ جھوٹا ہے، اور امام مالک فرمایا کرتے تھے، کہ ابن اسحاق دجال ہے" (دو اسلام ص ۹۹)

ازالہ یہ دونوں قول جھوٹ ہیں، ثابت نہیں، علامہ ابن الہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں: "ابن اسحاق کے متعلق امام مالک کا قول ثابت نہیں (بلاغ المبین مصنفہ مولانا محی الدین صاحب ص ۱۵۱) امام بخاری نے بھی اس کی صحت کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ لکھتے ہیں "ولو صح" اگر صحیح ہو، پھر صحیح فرض کر کے اس کا جواب دیا ہے مولانا شرف الدین صاحب لکھتے ہیں: "اول تو اس روایت کی شروع سے سند مذکور نہیں . . . تا وقتیکہ سند مذکور ہو کر صحت نہ ہو قابل وثوق نہیں (برق اسلام ص ۱۲۹) الغرض یہ کہ یہ قول بے سند ہے۔

غلط فہمی برقی صاحب فرماتے ہیں:۔
"امام ابو حنیفہ سے کسی نے پوچھا کہ جابر جعفی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، فرمایا، کذاب۔ وہ بہت بڑا جھوٹا ہے (دو اسلام ص ۹۹)

ازالہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بے شک صحیح فرمایا، جابر الجعفی واقعی کذاب تھا، حدیثیں گھڑتا تھا برقی صاحب نے شاید اس کو بھی محدث سمجھا۔

غلط فہمی:۔ برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

• الاعمش حدیث کا امام تھا، علی بن خشرم المروزی (وفات ۲۵۷ھ) فضل بن موسی السینانی المروزی سے روایت کرتا ہے، کہ ایک مرتبہ الاعمش بیمار پڑ گئے، تو فضل بن موسی اور امام ابوحنیفہ اس کی عیادت کو گئے امام ابوحنیفہ نے فرمایا، اگر میرا آنا آپ کو ناگوار نہ گذرتا، تو میں ہر روز آتا۔ اعمش نے جھٹ کہا مجھے تو تیرا اپنے گھر میں بھی رہنا گوارا نہیں"

• الاعمش کے متعلق امام ابوحنیفہ کی رائے یہ تھی، کہ وہ نہ روزے رکھتا ہے، اور نہ جنابت کے بعد غسل کیا کرتا ہے، یعنی ایک فاسق اور نجس سا آدمی ہے" (دو اسلام ص۹۹)

ازالہ اول تو ترجمہ غلط کیا گیا ہے لیکن ہم ترجمہ کی صحت اور عدم صحت پر تو بحث جب کریں، کہ یہ روایت ثابت بھی ہو، یہ روایت سرتا پا جھوٹ اور افترا محض ہے، اس کی سند میں ایک تو سلمہ بن قاسم ثقہ نہیں، دوسرے محمد بن احمد بن فیروز مجہول ہیں، پھر احمد بن عبداللہ احمد بن عیسی نام کے کئی آدمی ہیں، نہ معلوم یہ کون صاحب ہیں، اور کیسے ہیں (برق اسلام ص۱۵۲) غرض یہ کہ پوری سند واہی تباہی ہے

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

• سعید بن مسیب بن المدنی (وفات ۱۰۵ھ) اور حسن بصری، عکرمہ (وفات ۱۰۵ھ) کو جھوٹا کہا کرتے تھے، اور یہ ان کو کذاب سمجھتا تھا" (دو اسلام ص۹۹)

ازالہ یہ روایت بھی جھوٹی اور افترا محض ہے، جامع بیان العلم میں اس کی کوئی سند منقول نہیں (جامع جلد۲ ص۱۵۶) معلوم نہیں برق صاحب ایسی بے سند باتیں کیوں نقل کرتے ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

• قتادہ (وفات ۱۱۸ھ) یحیی بن ابی کثیر (وفات ۱۲۹ھ) کو جھوٹا سمجھتا تھا، اور یہ اسے (دو اسلام ص۱۰۰)

ازالہ یہ روایت بھی ثابت نہیں، جامع بیان العلم میں، اول تو یہ الفاظ نہیں، دوم اس کی سند بھی منقطع ہے (جامع جلد۲ ص۱۵۷)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

• اصمعی کہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ سلیمان التیمی (وفات ۱۴۳ھ) کے ہاں ابن عروبہ کا ذکر چل پڑا، تو اصمعی نے کہا، کہ ابن ابی عروبہ اور اس کا استاد قتادہ دونوں جھوٹے ہیں" (دو اسلام ص۱۰۰)

ازالہ یہ روایت بالکل گھڑنت ہے، اس کا پہلا ہی راوی خلف بن قاسم ہے، اور وہ مجہول ہے (جامع بیان العلم جلد۲ ص۱۵۸ دبرق اسلام ص۷۷)

غلط فہمی: • یحیی بن معین پہلا محدث ہے، جس نے راویوں کے حالات قلمبند کئے تھے، آپ امام شافعیؒ کے

متعلق فرماتے ہیں: ھو لیس بثقۃ" آپ کی روایات قابل اعتماد نہیں" (دو اسلام ص۲۰۰)

ازالہ: ابن معین نے ابراہیم بن محمد شافعی کو غیر ثقہ کہا ہے، نہ کہ امام محمد بن ادریس شافعی کو، برق صاحب کو شافعی کے لفظ سے بڑی زبردست غلط فہمی ہوئی (برق اسلام ص۱۶۰) جس راوی سے ابن معین کا قول شافعی کے غیر معتبر ہونے کے متعلق نقل کیا گیا ہے، اسی راوی نے اپنی کتاب میں ابن معین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ امام شافعی ثقہ ہیں (جامع بیان العلم (جلد ۲ ص۱۶۰)

غلط فہمی: برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت امام مالک پر ابن ابی ذئب، ابراہیم بن سعد اور ابراہیم بن ابی یحییٰ نے سخت نکتہ چینی کی ہے" (ص۲۰۰)

ازالہ:۔ یہ روایت بھی باطل ہے، اس لئے کہ بے سند ہے (برق اسلام ص۱۵۹)

غلط فہمی: برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"الساجی کتاب العلل میں لکھتا ہے کہ عبدالعزیز بن سلمہ، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ابن اسحاق، ابن ابی یحییٰ اور ابن ابی الزناد، امام مالک کی حدیث کو اس لئے قابل اعتماد نہیں سمجھتے کہ آپ نے ثور بن یزید اور سعد بن ابراہیم جیسے جھوٹے راویوں سے بھی احادیث روایت کی ہیں" (دو اسلام ص۲۰۱)

ازالہ: یہ روایت بھی جعلی ہے، امام مالک نے مؤطا کو تمام ائمہ کے سامنے پیش فرمایا تھا، اور سب نے موافقت کی تھی، اس لئے اس کا نام مؤطا رکھا گیا، اگر یہ ائمہ دین امام مالک کی حدیث کو قابل اعتماد نہ سمجھتے، تو پھر یہ مؤطا کی صحت کی تائید بھی نہ کرتے۔

غلط فہمی: برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"امام ابوحنیفہ کے استاد حماد بن سلیمان سے کسی نے پوچھا، کہ حجاز کے محدثین عطاء، طاؤس اور مجاہد کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ تو کہا "صبیانکم اعلم منھم" تمہارے نادان بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں" (دو اسلام ص۲۰۱-۲۰۰)

ازالہ: یہ روایت بھی باطل ہے، اس کی سند میں احمد بن فضیل بن عباس جھوٹا ہے، دوسری سند میں عبدالوارث بن سفیان مجہول ہے (برق اسلام ص۱۶۷)

غلط فہمی: برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"امام شعبی کوفی کے ہاں امام ابراہیم نخعی کی وفات (۹۵ھ) کا ذکر آیا، تو کہنے لگا، یہ یک چشم رات کے وقت ہر مسئلہ مجھ سے پوچھ جاتا ہے، اور دن کے وقت لوگوں پر اپنی علمیت کا رعب گانٹھتا ہے، نخعی کو یہ بات پہنچی، تو اس نے کہا "ھو کذاب" وہ بہت جھوٹا ہے" (دو اسلام ص۲۰۱)

ازالہ یہ روایت بھی جھوٹی ہے، اس کی سند میں احمد بن فضیل جھوٹا ہے، دوسرا راوی قاسم بن محمد بن ابی شیبہ بھی مجروح و متروک ہے (دو اسلام ص۱۴۹)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"جابر بن یزید کا قول ہے، کہ میرے پاس ستر ہزار احادیث ایسی ہیں جن کا راوی صرف ابو جعفر ہے" (فتح الملہم ص۱۳۵) (دو اسلام ص۱۰۱)

ازالہ محدثین نے ابو جعفر کو کذاب کہا ہے (قانون الموضوعات لابن طاہر) لہٰذا جس حدیث کی سند میں وہ موجود ہوگا، وہ موضوع ہوگی، ایسی حدیثیں ستر ہزار کیا ستر کروڑ بھی ہوں، تو صحیح احادیث پر ان کا کیا اثر پڑے گا۔

غلط فہمی برق صاحب لکھتے ہیں:۔

"ابو جعفر الہاشمی المدنی کی رائے یہ تھی، کہ عمرو بن عبید جھوٹا ہے" (دو اسلام ص۱۰۱ بحوالہ فتح الملہم ص۱۳۷)

ازالہ:۔ یہ قول حضرت ابو جعفر پر افتراء ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"عبید اللہ بن زیاد عنبری کہتے ہیں، کہ میں نے شعبہ (وفات ۱۶۰ھ) کو لکھا، کہ واسط کے قاضی ابی شیبہ کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ جواب میں لکھا اس کی کوئی حدیث مت لکھو، اور میرا یہ خط ضائع کردو" (دو اسلام ص۱۰۱ بحوالہ فتح الملہم ص۱۳۸)

ازالہ قاضی ابی شیبہ واقعی کذاب ہے، وہ ائمہ حدیث میں سے نہیں ہے، برق صاحب نے بلا وجہ اس کو نقل کیا، ان کا مقصد تو محدثین پر جرح کرنا ہے، نہ کہ کذابین پر، اور یہاں وہ منجملہ اور مقامات کے ایک کذاب پر جرح نقل کر گئے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"عفان کہتے ہیں کہ میں نے صالح المری کے سامنے حماد بن سلمہ بصری (وفات ۱۶۷ھ) کی بیان کردہ احادیث پیش کیں، تو اس نے کہا وہ جھوٹا ہے" (فتح الملہم ص۱۳۸) (دو اسلام ص۱۰۲)

ازالہ صالح المری خود ناقابل اعتماد بلکہ متروک ہیں (قانون الموضوعات ص۲۶۳) لہٰذا ان کی بات کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"یزید بن ہارون بیان کرتا ہے کہ زیاد بن میمون نے ایک ہی حدیث مجھے تین مختلف موقعوں پر

سنائی، اور ہر مرتبہ نئے راوی جڑ دیئے، چنانچہ میں نے قسم کھائی کہ آئندہ اس کی کوئی حدیث بیان نہیں کروں گا
(فتح الملہم ص۱۳۹، دو اسلام ص۱۰۲)

ازالہ زیاد بن میمون کذاب ہے (قانون الموضوعات لابن طاہر ص۲۵۷) لہٰذا اس پر جرح کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، نہ معلوم محدثین کی فہرست میں برق صاحب ان لوگوں کو کیوں لے آتے ہیں جو محدثین کے نزدیک کذاب ہیں، غالباً غلط فہمی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"علی بن مسہر کوفی کہتا ہے، کہ میں نے اور حمزۃ الزیات نے ابان بن ابی عیاش سے تقریباً ایک ہزار احادیث سنی تھیں، حمزہ بیان کرتا ہے، کہ ایک رات خواب میں حضور علیہ السلام کے دیدار نصیب ہوئے میں نے وہ تمام احادیث آنحضرتؐ کو سنائیں، حضور نے صرف پانچ یا چھ کو صحیح قرار دیا، اور باقی کے متعلق فرمایا، کہ میں انہیں نہیں پہچانتا" (دو اسلام ص۱۰۲)

ازالہ ابان بن ابی عیاش بے حد ضعیف، متروک، بلکہ کذاب ہے (قانون الموضوعات لابن طاہر ص۲۳۱) لہٰذا برق صاحب کا ابان بن ابی عیاش کو محدثین کی ذیل میں پیش کرنا زبردست غلط فہمی ہے، ان کے باب کی سرخی یہ ہے "کچھ ائمہ حدیث اور معتبر راویوں کے متعلق" لیکن اکثر وہ ان راویوں پر جرح نقل کرتے ہیں، جو ائمہ حدیث تو کجا معتبر بھی نہیں ہوتے، بلکہ کذاب و وضاع ہوتے ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"ابو اسحٰق الفزاری فرماتے ہیں، کہ صرف مشہور اور معتبر راویوں کی احادیث بیان کرو، لیکن اگر اسماعیل بن عیاش مشہور راویوں سے بھی کوئی حدیث روایت کرے تو مت مانو، لیکن یحییٰ بن معین کہتے ہیں، کہ اسماعیل ثقہ (قابل اعتماد) ہے (دو اسلام ص۱۰۱)

ازالہ اسماعیل بن عیاش شام کے محدث ہیں، علمائے شام کی احادیث انہوں نے بہت اچھی طرح محفوظ کر لی تھیں اور اس میں غلطی نہیں کرتے تھے، اسی لئے امام بخاری فرماتے ہیں "حدیثہ عن الشامیین صحیح" یعنی ان کی شامیوں سے بیان کردہ احادیث صحیح ہیں، اور انہی معنوں میں یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ کہا ہے، حجازی محدثین کی روایت کو وہ اچھی طرح محفوظ نہ کر سکے، لہٰذا اس میں ان سے غلطی ہو جایا کرتی تھی، یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے ان کی اہل حجاز سے روایت کردہ احادیث کو صحیح نہیں سمجھا (قانون الموضوعات ص۲۴۱) ان ہی معنوں میں ابو اسحاق فزاری نے ان کو ناقابل اعتماد قرار دیا، برق صاحب آپ کو تو محدثین کو داد دینی چاہئے تھی، کہ ایک معتبر راوی کو بھی انہوں نے بعض حالات میں غیر معتبر قرار دیا، اور باریک بینی کی انتہا کر دی

اپنے کو دھوکہ سے محفوظ رکھا، اور حدیث کی حفاظت پر آنچ نہ آنے دی۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی محمد بن عبد الرحمٰن کے متعلق امام مالک کی یہ رائے ہے، کہ وہ ثقہ نہیں لیکن ابوزرعہ اسے ثقہ سمجھتے ہیں" (دو اسلام ص ۱۰۲-۱۰۳)

اس کے بعد برق صاحب نے چار نام اور دیئے ہیں، جن کو کسی نے ثقہ کہا، اور کسی نے غیر ثقہ، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"کہاں تک گنوں سینکڑوں ایسے راوی ہیں جنہیں ایک جماعت سچا سمجھتی ہے، اور دوسری جھوٹا ....

کس کی سنیں اور کس کی نہ سنیں" (دو اسلام ص ۱۰۳)

ازالہ محدثین اگر کسی شخص کی توثیق میں اختلاف کرتے ہیں، تو یہ مختلف حالات کے ماتحت ہوتا ہے، مثلاً:

(۱) ایک امام نے کسی راوی کو جوانی کی حالت میں دیکھا، حفظ و اتقان میں معتبر سمجھا، لہٰذا اس کو ثقہ کہدیا، دوسرے امام نے اس راوی کو بڑھاپے کی حالت میں دیکھا، حافظہ کمزور ہوچکا تھا، غلطی کرنے لگے تھے، لہٰذا اس امام نے اس کو غیر ثقہ کہدیا، اب اس کی جوانی کے ایام میں روایت کردہ حدیث قابل اعتماد ہوگی اور بڑھاپے کی نہیں، تاوقتیکہ دوسرے قرائن سے اس کا ضعف دور نہ کر دیا جائے۔

(۲) ایک امام نے کسی راوی کے متعلق کہا، کہ فلاں شخص کے حق میں ثقہ ہے، دوسرے امام نے اس کو کسی دوسرے شیخ کے حق میں غیر ثقہ قرار دیا، وجہ اس کی یہ ہے، کہ پہلے شیخ کے پاس وہ باقاعدگی سے احادیث حاصل کرتا رہا، برخلاف اس کے دوسرے شیخ کے پاس وہ کافی عرصہ نہ رہ سکا، جو کچھ اس سے حاصل کیا، وہ سرسری مطالعہ تھا۔

(۳) بعض راوی ایسے بھی ہیں، جن کا حافظہ ان کی کتابیں جل جانے کے صدمہ سے خراب ہوگیا، اب اگر ایک محدث اس کو ثقہ کہتا ہے، تو اس کے یہ معنی ہیں، کہ کتابیں جلنے سے پہلے وہ بالکل قابل اعتماد تھا اور اس زمانہ میں اس کی روایت کردہ احادیث صحیح تھیں، اور اگر کسی محدث نے اس کو ضعیف کہا، تو اس کے یہ معنی ہیں، کہ کتابیں جلنے کے بعد وہ قابل اعتماد نہیں رہا، اس کی روایت کردہ احادیث مشکوک ہوگئیں یہ اختلاف بھی کوئی وقیع اختلاف نہیں، تحقیق کرنے سے ہر بات کھل کر سامنے آجاتی ہے، اور کسی قسم کا دھوکا نہیں ہوتا۔

(۴) اگر کسی امام نے کسی راوی کو صادق کہا، دوسرے نے غیر ثقہ کہا، یہ بھی اختلاف نہیں ہے، اس لئے کہ محض صادق ہونے سے ثقہ ہونا لازم نہیں آتا، اس قسم کے اختلافات سے فن حدیث پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا، اگر ہم فرض بھی کرلیں، کہ یہ اختلاف وقیع ہے، تو اس صورت میں تحقیق سے اس کا فیصلہ ہوگا کہ کس امام سے اس کی جرح یا تعدیل میں غلطی ہوئی محض اس امام کی غلط فہمی یا غلط اطلاع پر فیصلہ نہ ہوگا

اگر فیصلہ کرنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، (حالانکہ یہ بھی مفروضہ ہے) تو پھر وہ حدیث ضعیف تصور کی جائے گی اس کے ضعف سے صحیح، ثابت شدہ احادیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، دین کے لوازمات اسی حدیث سے ثابت ہوں گے، جو صحیح و ثابت شدہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، لہٰذا جو چیز صحیح و ثابت ہوگی، وہی عند اللہ محفوظ ہوگی، اور جو چیز ضعیف ہوگی، وہ گویا غیر محفوظ ہوگی، اور عند اللہ دین میں شامل نہ ہوگی، برق صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا، کہ اگر بعض خبریں غلط ہوں، تو گویا سب ہی غلط ہیں، کسی طرح صحیح نہیں، اگر یہ مان لیا جائے، تو دنیا کا انتظام درہم برہم ہو جائے، جو غلط ہوگی وہ اس لئے غلط ہوگی، کہ اس کا جھوٹ ہونا ثابت ہو جائے گا، اور جو صحیح ہوگی، وہ اس لئے صحیح ہوگی کہ اس کی صحت کے لئے شواہد ہوں گے، دونوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا خلاف عقل و تجربہ ہے

خلاصہ باب چہارم

برق صاحب نے بعض ائمہ دین پر بعض ائمہ دین کی جرح نقل کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نہ ائمہ کا اعتبار ہے، نہ ان کی جرح و تعدیل کا، یہ سارا علم ہی بے کار ہے نہ کوئی عالم ہے نہ کوئی علم وہ لکھتے ہیں :۔

> ٭ ائمہ حدیث، اور صحابہ کرام کے فتوے ایک دوسرے کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں، تو جو احادیث ان صحابہ، ان ائمہ، اور ان دلچسپ راویوں سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں انہیں وحی سمجھ کر شور مچانا، کہ یہ اسوۂ رسول ہے، یہ مفصل ہے، اور قرآن مجمل، یہ شارح ہے، اور قرآنی متن، کہاں تک جائز ہے" (دو اسلام ص ۱۰۴)

صحابہ تو صحابہ ہیں، ان پر اعتماد نہ کرنا، یا ان کو کاذب، محرف احادیث بیان کرنے والا سمجھنا، قرآن کی تصریحات کے خلاف ہے، قرآن کی یہ تصریحات اس باب میں اوپر گذر چکی ہیں، اوپر ہم یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ ائمہ دین کی ائمہ دین پر جرح کے جتنے اقوال ہیں، وہ سب جھوٹ ہیں، یہ بھی پہلے لکھا جا چکا ہے، کہ ان میں سے بعض کو برق صاحب نے ائمہ حدیث شمار کیا ہے، حالانکہ وہ ائمہ حدیث نہیں، بلکہ دشمنان دین، کذاب و وضاع ہیں، تمام روایتیں جو ائمہ دین کے متعلق بیان ہوتی ہیں، وہ ان لوگوں کی مخترعہ ہیں، جو حدیث اور ائمہ حدیث یعنی اسلام کے دشمن تھے، اور ائمہ حدیث کو بدنام کرکے دین کو بگاڑنا چاہتے تھے، برق صاحب نے ان تمام خرافات کو جمع کر دیا، اور یہ تحقیق نہیں کی، کہ ان اقوال کی سندوں میں کیسے کیسے دجال پوشیدہ ہیں، کاش برق صاحب نے لکھنے سے پہلے تحقیق کر لی ہوتی

مذکورہ بالا نتیجہ نکالنے کے باوجود برق صاحب نے اسی باب میں اعتراف کیا ہے، کہ :۔

> ٭ ائمہ حدیث میں ایسے بزرگ بھی پائے جاتے ہیں، جن پر ملت اسلامیہ کو ہمیشہ ناز رہا ہے، ان کا علمی مقام اتنا بلند اور ان کے ثقافتی کارنامے اتنے عظیم ہیں، کہ ہمیں ان پر تنقید کی جرأت ہی نہیں

ہو سکتی" (دو اسلام ص۹۴)

برق صاحب یہی وہ ائمہ حدیث ہیں، جو ہمارے نزدیک بھی ائمہ حدیث ہیں، اور یہ دلچسپ بلادی نہیں ہیں، ان ہی کی روایت کردہ احادیث ہیں، جن کو ہم سنت سمجھتے ہیں، اور ان ہی ائمہ کے واسطے سے جو دین پہنچا، اس کے متعلق اعلان کرتے ہیں، کہ یہ وحی ہے، اسوہ رسول ہے، یہ مفصل ہے، اور قرآن مجمل ہے شارح ہے، اور قرآن متن، اب بتایئے، ہمارا یہ کہنا، صحیح ہے یا نہیں؟ آپ یہی جواب دیں گے کہ بے شک صحیح ہے، اس لئے کہ آپ کو خود اعتراف ہے

"حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں" (دو اسلام ص۳۴۱)

"اس طرح کی ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت صلعم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں" (دو اسلام ص۳۴۲)

"یہ تمام تفاصیل حدیث میں ملتی ہیں، اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے، جس پر ہم نازاں ہیں، اور جس سے اب تک کروڑوں غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں (دو اسلام ص۳۴۳)

باب ۵

"حدیث پر ایک مکالمہ"

اس باب میں برق صاحب نے ایک مکالمہ تحریر فرمایا ہے، برق صاحب نے اس مکالمہ میں اپنے لئے حرف "ب" استعمال کیا ہے، اور جن مولانا سے یہ مکالمہ ہوا ان کے لئے حرف م استعمال کیا ہے، معلوم نہیں، یہ مکالمہ فرضی ہے یا واقعی، اگر فرضی ہے تو پھر ظاہر ہے، کہ مولانا کے جوابات بھی فرضی ہیں، اور ان کا کمزور ہونا لازمی ہے، اور اگر مکالمہ فرضی نہیں، تو پھر جو مولانا برق صاحب کے ہاں تشریف لائے تھے، وہ برق صاحب کی اصطلاح میں ملا ہوں گے، نہ کہ عالم دین۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

برق:۔ وحی کے اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

م:۔ پیغام خدا

ب:۔ بہت اچھا! جب قرآن بھی پیغام خدا ہے، اور حدیث بھی تو پھر کیا وجہ ہے، کہ رسول اکرم صلعم اور آپ کے صحابہ نے قرآن کو لکھنے اور محفوظ رکھنے کے لئے تمام تر انسانی وسائل اختیار کئے، لیکن حدیث کو نہ صرف نظر انداز کر دیا، بلکہ حضور نے احادیث لکھنے سے منع فرما دیا، اور صدیق و فاروق نے احادیث کو مٹانے اور جلانے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، حدیث اللہ کا پیغام ہوا اور صحابہ اسے جلاتے پھریں، یعنی چہ؟" (دو اسلام ص ۱۰۴-۱۰۵)

ازالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے حدیث کو لکھنے اور محفوظ رکھنے کے لئے بھی تمام انسانی وسائل اختیار کئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود احادیث تحریر فرمائیں، صحابہ کو لکھنے کا حکم دیا (مفصل جواب، باب اول میں ملاحظہ فرمائیں)، احادیث کی حفاظت کے لئے احکام دیئے مثلاً ایک موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

احفظوھن واخبروھن من ورائکم ان کو محفوظ کر لو اور اپنے پیچھے رہنے والوں کو بھی مطلع کر دو۔
(صحیح بخاری۔ کتاب الایمان)

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:۔

لیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسیٰ ان یبلغ من ھو اوعیٰ لہ منہ (صحیح بخاری۔ کتاب العلم)

حاضر غائب کو یہ احکام پہنچا دے کیوں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جس کو پہنچایا جائے۔ وہ پہنچانے والے سے زیادہ محفوظ کر لیتا ہے۔

شاید بعض لوگوں نے احادیث لکھنے سے منع کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی، تو ارشاد فرمایا۔

اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا حق (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸)

ضرور لکھا کرو۔ اس لئے کہ اللہ کی قسم اس منہ سے حق کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احادیث لکھنے کا حکم دیا کرتے تھے، برق صاحب کو ایک روایت کی بنا پر یہ غلط فہمی ہوئی، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا، حالانکہ آپ نے قرآن کے ساتھ مخلوط کر کے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو) یہ بھی صحیح نہیں، کہ صحابہ کرام احادیث جلایا کرتے تھے (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ فرمائیں)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"م:۔ فلاں عالم، فلاں مجتہد، اور فلاں امام نے حدیث کو وحی خفی کہا ہے، آپ کون ہیں، انکار کرنے ہیں"۔ (دو اسلام ص ۱۰۵)

ازالہ مولانا کا یہ جواب مقلدانہ جواب ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ وہ مولانا جن سے برق صاحب کا مباحثہ ہوا عالم نہیں تھے، بلکہ مقلد محض تھے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ب:۔ مجھے سچائی سے معاندت نہیں، بات کو واضح کیجیئے، اور میں ابھی آپ کا ہم خیال بن جاتا ہوں، اگر حدیث وحی تھی، تو اسے قرآن کے متن میں کیوں شامل نہ کیا گیا، وہ بھی اللہ کا پیغام، یہ بھی اللہ کا پیغام، پھر فرق کیا تھا؟" (دو اسلام ص ۱۰۵)

ازالہ قرآن متن ہے، اور حدیث شرح ہے، متن اور شرح کو ایک ہی متن میں شامل کرنا مضحکہ خیز ہے کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں، کہ تمام قوانین اور فرامین Acts and ordinances کو دستور (Constitution) میں شامل کر دیا جائے، پھر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہوگی کہ تمام ذیلی قواعد و ضوابط (Rules and Regulations.) کو جو کسی قانون (Act) یا فرمان (Ordinance.) کے ماتحت وضع کئے جائیں دستور میں شامل کر دیا

جانے، نہ ایسا ہوا ہے نہ ہوگا، قرآن کی حیثیت بنیادی اصول کی ہے، اور حدیث اس کی عملی تشریح اور توضیح ہے، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

غلط فہمی برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
ب۔ اللہ نے یہ دو قسم کے پیغامات کا سلسلہ کیوں شروع کیا تھا، کیا اللہ کے خزانے میں الفاظ کی کمی ہوگئی تھی، یا کوئی خاص مصلحت اس دو رنگی کی متقاضی تھی۔ (دو اسلام ص ۱۰۵-۱۰۶)

ازالہ اس کی مصلحت تو اللہ ہی جانتا ہے، بہر حال کسی کتاب کی عملی تشریح کے لئے تشریح کے الفاظ کا مخصوص و متعین ہونا کسی کے نزدیک بھی ضروری نہیں، بس صرف اتنا کافی ہے کہ جو تشریح نبی کرے وہ صحیح ہو، اور یہ کام اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے لیا تھا، ارشاد باری ہے

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء)	ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے۔ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان حکم کریں اس چیز کی روشنی میں جو اللہ آپ کو سمجھائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران)	وہ اللہ ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اس کتاب میں بعض آیات محکم ہیں اور بعض متشابہ۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیات کے پیچھے پڑتے ہیں جو متشابہ ہیں تاکہ اس کے ذریعہ فتنہ برپا کریں اور خود ان کے معانی متعین کریں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات کے معانی سوا اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ ہاں جن لوگوں کو علم میں رسوخ ہے۔ وہ تو صرف اس طرح کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ ہر دو قسم کی آیات ہمارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ اور عقلمندوں کے علاوہ دوسرے لوگ نصیحت حاصل کرتے بھی نہیں۔

مندرجہ بالا آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن میں دو قسم کی آیات ہیں محکم اور متشابہ، محکم کے معنی لوگ جانتے ہیں لیکن متشابہ کے معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جو شخص ان آیات کے معانی کی جستجو کرتا ہے، وہ فتنہ پرور ہے اس کے دل میں کجی ہے، یہاں بھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ کا ان دو رنگی آیات

بھیجنے سے کیا مقصد تھا؟ کیا اللہ تعالےٰ کے خزانہ میں آیات محکمات کی کمی تھی؟ آخر کیا بات تھی، جو اس قسم کی آیات نازل فرما دیں، جو انسانوں کے مطلب کی نہیں، انسان ان کا مطلب نہیں سمجھتے، لہٰذا وہ ان کے لئے بیکار ہیں، تو پھر ان کے نزول سے فائدہ؟ ان سوالات کا جواب بس ایک ہی ہے، کہ "ہم ان پر ایمان لائے، سب اللہ کی طرف سے ہیں" ہم نہیں جانتے، کہ ان کے نزول میں کیا مصلحت ہے، مصلحت اللہ ہی جانتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں، کہ قرآن وحی جلی ہے، اور حدیث وحی خفی، ہم دونوں پر ایمان لائے، دونوں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں، ہم نہیں جانتے، کہ جلی اور خفی کی تقسیم میں کیا مصلحت ہے مصلحت اللہ ہی جانتا ہے، اور بس۔ اگر اب بھی ہم مصلحت کی جستجو کے درپے ہوں گے، تو پھر جو اعتراض حدیث پر ہے، وہی قرآن پر ہوگا (نعوذ باللہ)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"قرآن کے متعلق اللہ کا یہ ارشاد موجود ہے" اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ " یہ ذکر اور یہ ہدایت ہم نے نازل کی، اور ہم اس کی حفاظت کریں گے" (دو اسلام ص)

ازالہ یہ ارشاد قرآن کے متعلق نہیں، بلکہ ذکر کے متعلق ہے، ذکر کے معنی ہیں نصیحت، کیونکہ نصیحت میں حدیث بھی شامل ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ حدیث کا بھی محافظ ہے

غلط فہمی "قرآن کی ایسی حفاظت ہوئی، کہ تمام عالم نے ہماری کتاب کی صحت پر شہادت دی، لیکن حدیث تو بہ ہی بھلی، اس کا آلودہ ستیاناس ہوا، کہ اس سے زیادہ محرف، بعیدہ، تراشیدہ اور مسخ شدہ لٹریچر دنیا کے صفحے پر موجود نہیں" (دو اسلام ص۱۰۱)

ازالہ حدیث کی بھی ایسی ہی حفاظت ہوئی، اور تمام عالم نے اس کی صحت کی شہادت دی، ہاں اگر برق صاحب چند لوگوں کے اقوال سے معارضہ کریں، تو پھر چند لوگوں کے اقوال سے ہم بھی معارضہ کر سکتے ہیں، معاندین کو چھوڑیئے، خود مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت قرآن میں تحریف کی قائل ہے، ملاحظہ ہو کتاب فصل الخطاب فی اثبات تحریف کلام رب الارباب ص۳۰ الفاظ یہ ہیں:۔

قد اطبقوا علی صحۃ الاخبار المستفیضۃ بل المتواترۃ الدالۃ بصریحھا علی وقوع التحریف فی القرآن۔	یعنی تواتر سے ثابت ہے۔ کہ قرآن حمید میں تحریف ہوئی ہے۔

اصول کافی میں ہے:۔

ان القرآن الذی جاء بہ جبرئیل علیہ	یعنی وہ قرآن جس کو جبریل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ

السلام الیٰ محمد صلعم سبعۃ عشرۃ الف آیۃ (باب النوادر، ص۹۷) وآلہٖ وسلم کے پاس لائے تھے سترہ ہزار آیتوں پر مشتمل تھا۔

اور اب موجودہ قرآن میں سات ہزار سے کچھ زائد آیتیں ہیں، الغرض یہی مضمون تحریف قرآن، کتاب احتجاج طبرسی، تفسیر قمی، تفسیر عیاشی وغیرہ میں موجود ہے (برق اسلام ص۱۶ ملخصاً)

احادیث کے اولین محافظ خود صحابہ کرام ہیں، پھر ائمہ دین ہیں، احادیث کی حفاظت بالکل قرآن کی طرح ہوتی رہی، بلکہ جن احادیث کا تعلق عمل سے ہے ان کی حفاظت تو قرآن سے بھی زیادہ ہوئی اور وہ قرآن سے زیادہ محفوظ ہیں، اس موضوع پر تمہید میں مفصل لکھا جا چکا ہے، وہیں ملاحظہ فرمائیں:۔

مولانا محمد علی جوہر نے سچ فرمایا تھا، کہ:۔

"قرآن پاک تو قرآن پاک ہے، دوسرے صحائف ہماری کتب حدیث کی تحقیق اور صحت و حفاظت کا مقابلہ نہیں کر سکتے" (خالص اسلام ص۱۴۵)

محدثین نے اس سلسلہ میں اس درجہ دیانتداری، حق گوئی، اور تحقیق سے کام لیا، کہ یہ کارنامہ آج اسلام کے مفاخر میں سے ہے، ولیم میور جیسا متعصب شخص بھی اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا، جان ڈیون پورٹ، اپنی کتاب "اپولوجی فور محمدؐ" میں لکھتا ہے:۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ تمام مقننین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں، جس کے وقائع عمری محمدؐ کے وقائع عمری سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں"

ریورنڈ اسمتھ لکھتا ہے:۔

"کوئی شخص نہ اس میں دھوکا کھا سکتا ہے، نہ دوسرے کو دھوکا دے سکتا ہے، یہاں پورے دن کی روشنی ہے، جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے، اور ہر ایک تک پہنچ رہی ہے" (تاریخ جمع القرآن والحدیث، مولفہ مولینا ابوالقاسم صاحب سیف بنارسی)

چونکہ ایک عالم گواہ ہے کہ احادیث محفوظ ہیں، اور اس عالم میں ہمارے برق صاحب بھی شامل ہیں، برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

(۱) "صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا" (دو اسلام ص۳۴۱)

(۲) "دوم۔ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو اور ان معنوں میں ہزارہا احادیث صحیح ہیں" (دو اسلام ص۳۴۱)

(۳) "اس طرح کی ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں بلکہ وہ آنحضرت صلعم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں" (دو اسلام ص۳۴۲)

(۲۴) "یہ تمام تفاصیل حدیث ہی میں ملتی ہیں، اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے، جس پر ہم نازاں ہیں" (دو اسلام ص۲۴۳)

برق صاحب! جس بیش بہا سرمایہ پر آپ نازاں ہیں، اسی پر ہم نازاں ہیں، کیا یہ بیش بہا سرمایہ محرف ہے، ہرگز نہیں، فللہ الحمد۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"اللہ نے رسول کریم کو جو کتاب بذریعہ وحی عطا کی تھی، اس کا نام قرآن ہے، نہ کہ صحیح بخاری ملاحظہ ہوں یہ آیات:۔ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ (یوسف) ہم نے جو کتاب بذریعہ وحی تم کو عطا کی ہے، اس کا نام قرآن ہے" (دو اسلام ص۱۰۸)

ازالہ سورہ یوسف کی مذکورہ بالا آیت آپ نے پوری نقل نہیں فرمائی، نہ ترجمہ ہی صحیح کیا ہے، پوری آیت اس طرح ہے:۔

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ (یوسف) — ہم آپ کو ایک بہترین قصہ سناتے ہیں اس وحی کے ساتھ جو اس قرآن کی صورت میں بھیجی گئی ہے۔

یعنی یہ قصہ قرآن کے علاوہ ہے، اور قرآن کے ساتھ اس کو بھی نازل کر دیا گیا ہے، غالباً اسی وجہ سے فرقہ میمونیہ، سورہ یوسف کو قرآن میں شمار نہیں کرتا، اس کے باوجود برق صاحب لکھتے ہیں، کہ ایک عالم اس کی صحت پر گواہ ہے، اگر بایں ہمہ قرآن کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے، تو حدیث کے متعلق بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے، کہ "صحیح بخاری" کی صحت پر ایک عالم گواہ ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ قرآن بذریعہ وحی نازل ہوا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے علاوہ وحی نہیں آتی تھی۔ نیز مذکورہ بالا آیت کا یہ مفہوم ہے۔ "قرآن وحی ہے" اور "قرآن ہی وحی ہے" ان دونوں میں بڑا فرق ہے قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ "قرآن ہی وحی ہے" اور جب یہ نہیں تو پھر قرآن بھی وحی ہے اور دوسری چیز بھی وحی ہو سکتی ہے۔

غلط فہمی "کیا سارے قرآن میں حدیث کا ضمناً بھی کہیں ذکر ہے اگر نہیں تو آپ اسے ہمارے ایمان کا جزو کیسے بنا رہے ہیں" (دو اسلام ص۱۰۹)

ازالہ:۔ حدیث کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ (آل عمران) — کہہ دیجئے کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو

(۲) وَمَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَةَ الَّتِىۡ كُنۡتَ عَلَيۡهَاۤ — اور جس قبلہ پر آپ ہیں وہ ہم نے اس لئے مقرر کیا ہے

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ (البقرۃ) کہ ہم یہ معلوم کریں کہ اتباع رسول کون کرتا ہے۔

پہلے قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم سارے قرآن میں کہیں نہیں، پھر بھی اللہ تعالیٰ اس حکم کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے، اس آیت میں حدیث کے من جانب اللہ ہونے کا کھلا ثبوت ہے، تحویل قبلہ کا حکم اس لئے دیا جا رہا ہے، کہ متبعین ممتاز ہو جائیں، آیت سے اتباع رسول کی اہمیت ظاہر ہے، یہی اتباع رسول ہے، جس کو سنت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۳) لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

اگر یہ نمونہ قرآن ہے، تو پھر رسول اللہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے، کہ اللہ تعالےٰ نے بھول سے قرآن کی جگہ رسول اللہ کر دیا، نعوذ باللہ منہ

(۴) فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (نساء) آپ کے رب کی قسم لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام اختلافات میں آپ کو حاکم نہ مان لیں پھر جو فیصلہ آپ کریں اس سے اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کو بسر و چشم قبول کریں۔

اتباع سنت اور اطاعت رسول کا اس سے زیادہ واضح حکم اور کیا ہو سکتا ہے کیا یہاں بھی ضمیر مخاطب سے مراد قرآن ہے؟ اگر ہے، تو پھر یہ کہنا حق بجانب ہے، کہ اللہ تعالےٰ صاف صاف حکم دینے کے بجائے الجھن میں مبتلا کرتا ہے؟ نعوذ باللہ

(۵) اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (النور) مومنین کا تو یہ قول ہونا چاہیئے کہ جب انہیں اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ فیصلہ کرے ان کے معاملات میں تو کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

(۶) وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا (نساء) اور جب ان سے کہا جائے آؤ اللہ کی نازل کردہ شریعت کی طرف اور رسول کی طرف تو آپ دیکھیں گے کہ منافق آپ سے منہ پھیر لیں گے۔

اگر اس آیت میں "اِلٰی مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ" اور "اِلَی الرَّسُوْلِ" کے درمیان واؤ تفسیری ہے، تو معاملہ صاف ہے، کہ "مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ" سے مراد رسول ہے، یعنی جو کچھ رسول کہے، وہ سب "ما انزل اللہ" (اللہ کی طرف سے نازل شدہ) ہے، اور اگر واؤ محض عطف کے لئے ہے، تو پھر "مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ" کی طرف

بلانے کے ساتھ ساتھ رسول کی طرف بلانا یہی ہے، کہ جو کچھ رسول فیصلہ کرے، وہ بھی ماننا ہوگا، اور اسی کا نام اتباع حدیث ہے۔

(۷) وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ (الاعراف)

میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور رحمت کو میں ان لوگوں کے لئے لکھ دونگا جو تقوی اختیار کرتے ہیں زکوۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں یعنی وہ لوگ جو رسول۔ نبی امی کی پیروی کرتے ہیں۔

اتباع سنت کی اس آیت میں کتنی واضح دلیل ہے

(۸) وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (نساء)

اور اللہ نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اور حکمت نازل کی اور وہ باتیں سکھائیں جو آپ نہیں جانتے تھے۔

اس آیت میں کتاب کے علاوہ ایک اور چیز کے نزول کی خبر ہے، اور یہ حکمت یعنی سنت ہے، جو لوگ یہاں "واو" کو تفسیری کہتے ہیں، وہ صحیح نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے "کہ اللہ نے آپ پر کتاب نازل کی یعنی حکمت نازل کی یعنی وہ باتیں سکھائیں، جو آپ نہیں جانتے تھے" بار بار واو تفسیری کا آنا بلاغت کے منافی ہے، لہذا یہاں "واو" برائے عطف ہے، ابراہیم علیہ السلام دعا کرتے ہیں:-

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرۃ)

اے ہمارے رب ان لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے بے شک تو عزیز و حکیم ہے۔

اس آیت میں اگر واو کو تفسیری مانا جائے، تو یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالی بھی تفسیر کا محتاج ہے، اور یہ کہ اللہ تعالی کو ابراہیم علیہ السلام کا منشا سمجھنے میں دھوکا ہو سکتا تھا، لہذا انہوں نے تفسیر کر دی، اور یہ باطل ہے پس ثابت ہوا، کہ کتاب و حکمت دو چیزیں ہیں، اور دونوں نازل ہوئی ہیں

پرویز صاحب بھی جو بہت زیادہ واو تفسیری کی طرف مائل ہیں، اس آیت میں واو کو تفسیری شمار نہیں کرتے، ان کا ترجمہ درج ذیل ہے:-

"اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل کر دی ہے، اور وہ باتیں سکھا دی ہیں، جو تم نہیں جانتے تھے"

(معارف القرآن ج ۴ صفحہ ۱۸۴)

اگر بالفرض محال کتاب و حکمت ایک ہی چیز ہے، تو پھر "وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" کے دوسری چیز ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، اور یہی چیز حدیث ہے۔

(۸) وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (الاعراف) — رسول ان کے لئے پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر خبیث چیزوں کو حرام کرتا ہے

اس آیت میں تحریم و تحلیل کو رسول کا فعل بنایا گیا ہے، نہ کہ قرآن کا۔ گائے کے پیشاب کو بعض لوگ اب بھی پاک سمجھتے ہیں، اسے پیتے ہیں، کیا ایسے لوگوں کو اگر وہ مسلمان ہو جائیں، پیشاب پینے کی اجازت ہو گی، اگر نہیں تو کیا قرآن سے ثابت کیا جا سکتا ہے، کہ پیشاب حرام ہے، ہرگز نہیں، یہ رسول ہی ہے، جس نے حکم دیا "استنزھوا عن البول" یعنی پیشاب سے بچو، اور اس طرح پیشاب کو حرام کر دیا، گدھے، کتے، بلی وغیرہ مختلف جانوروں کو حرام قرار دیا، ورنہ قرآن کی رو سے تو یہ سب چیزیں حلال کی جا سکتی ہیں۔

(۹) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا (الاحزاب) — کسی مومن مرد یا عورت کو حلال نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اس معاملے میں اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

---

(۱۰) آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (الاعراف) — اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر ایمان لاؤ جو خود بھی اللہ اور اللہ تعالیٰ کے کلمات پر ایمان لاتا ہے۔ اور اس کا اتباع کرو تاکہ تمہیں ہدایت مل جائے۔

اتباع رسول کی کتنی واضح آیت ہے، اسی اتباع رسول کا نام سنت یا حدیث ہے۔

(۱۱) قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (النور) — آپ کہدیجئے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر تم منہ موڑو تو رسول اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے اور تم اپنے فرائض کے ذمہ دار ہو۔ اور اگر تم اس کی اطاعت کرو گے۔ تو تمہیں ہدایت مل جائے گی اور رسول کے ذمہ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ علی الاعلان پہنچا دینا

یہ آیت کتنی واضح ہے، کہ ہدایت کا کوئی راستہ نہیں، سوائے اطاعت رسول کے، اطاعت رسول

کروگے، تو ہدایت یاب ہوگے، ورنہ نہیں، پھر شروع آیت میں اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے، کہ آیت میں اللہ اور رسول کی اطاعت سے مرکز ملت کی اطاعت مراد نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ جہاں اللہ و رسول کے الفاظ ساتھ ساتھ آتے ہیں، وہاں ان سے مراد مرکز ملت ہوتا ہے، پھر آیت مذکورہ میں آگے چل کر اطاعت الٰہی کو اڑا کر پورا زور اطاعت رسول پر دیا جا رہا ہے، اور کیوں نہ ہو جب کہ اطاعت رسول ہی اطاعت الٰہی کی بنیاد ہو، اگر اطاعت رسول نہیں، تو اطاعت الٰہی بھی نہیں، اسی لئے فرمایا:۔

وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی

اگر رسول کی اطاعت سے مراد قرآن کی اطاعت ہے یا مرکز ملت کی اطاعت ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہ کیا اللہ تعالیٰ کو یہ دونوں الفاظ معلوم نہیں تھے کہ بار بار رسول کا لفظ تو استعمال کرتا ہے اور جو اصل مطاع ہے اس کے نام کو ترک کر دیتا ہے۔ الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن سے اتباع رسول لازمی ثابت ہوتا ہے اور یہ چیز ضمناً نہیں بلکہ صراحتاً ہے۔ اطاعت رسول فرض ہے۔ اور اطاعت اور اتباع کے لئے رسول کے اقوال اور افعال کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ بغیر اقوال اور افعال رسول کے اطاعت اور اتباع ناممکن ہے پس ثابت ہوا کہ اقوال اور افعال رسول یعنی احادیث کی اطاعت و پیروی از روئے قرآن فرض ہے۔

اب برق صاحب ہمیں بتائیں کہ اتباع رسول یعنی احادیث کو جزو ایمان ہم بنا رہے ہیں یا اللہ تعالیٰ اور تواور خود برق صاحب بھی احادیث کے جزو ایمان ہونے کے قائل و معترف ہیں لہٰذا اس بحث کا خاتمہ ان ہی کے الفاظ پر کیا جاتا ہے۔

برق صاحب فرماتے ہیں:۔

اقوال رسول کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے۔ اگر اقوال رسول مل جاتے تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا اور قرآن پہ ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں داخل ہو جاتے (دو اسلام)

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ اقوال رسول کو جزو ایمان بنانے میں برق صاحب بھی ہمارے ہمنوا ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے نزدیک اقوال رسول کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے اور ہمارے نزدیک بے حد آسان۔ اب ہم بتاتے ہیں کہ اقوال رسول ﷺ دستیاب ہونا کس طرح آسان ہے اور وہ کہاں ملینگے۔ برق صاحب یہ اقوال رسول جن کو آپ جزو ایمان بنانے کی فکر میں ہیں آپ سے دور نہیں۔ بلکہ آپ کے بہت ہی قریب ہیں۔ آپ ہی تحریر فرماتے ہیں۔

کہ صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا (دو اسلام)

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں، کہ یہ صحیح احادیث آپ کو کہاں سے مل گئیں، ان کا کوئی وجود تھا جب ہی تو آپ کو دستیاب ہوگئیں، اور جب دستیاب ہوگئیں، تو اب ان کو جزو ایمان بنانے سے کیا امر مانع ہے صحیح احادیث کے وجود کو آپ نے آگے چل کر بھی تسلیم کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں" (دو اسلام ص۲۴۱)

لیجیے اب تو فیصلہ ہوگیا، صحیح احادیث کے وجود کے آپ بھی معترف ہیں، لہٰذا یہ صحیح احادیث تو یقیناً بقول آپ کے دائرہ ایمان میں شامل ہوگئی ہوں گی، اس کے آگے برق صاحب رقمطراز ہیں

"صحیح حدیث کے دو مفہوم ہیں، اول یہ کہ کسی حدیث کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح ہو یعنی ہم بہ دلائل ثابت کر سکیں، کہ یہ قول حضور کی زبان مبارک سے واقعی نکلا، ان معنوں میں کوئی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں، البتہ ظن غالب یہ ہے، کہ بعض اقوال صحیح ہوں گے، دوم۔ کہ احادیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں" (دو اسلام ص۲۴۱)

اس عبارت میں برق صاحب نے صحیح احادیث کے وجود کو تسلیم کیا ہے، بعض کو ظن غالب سے اور بعض کو یقیناً۔ اگرچہ اصل مطلوب (مقصود) تو مفہوم ہی ہے، جب مفہوم ثابت ہوگیا، تو وہ مفہوم قرآن کریم کی تشریح ہوگیا، اور اس اعتبار سے قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ مفہوم دائرہ ایمان میں شامل ہوگیا برق صاحب نے مذکورہ بالا عبارت میں بعض احادیث کو باعتبار الفاظ یقیناً صحیح تسلیم نہیں کیا، بلکہ ظن غالب کے طور پر صحیح تسلیم کیا۔ اس چیز سے ہمیں تھوڑا سا اختلاف ہے، بعض نہیں بلکہ بہت سی احادیث باعتبار الفاظ کے بھی یقیناً صحیح ہیں، اور ان کے صحیح ہونے پر فن حدیث میں کافی دلائل موجود ہیں

خلاصہ مذکورہ بالا بیان کا خلاصہ یہ ہے، کہ قرآن اور خود برق صاحب کی تحریر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ صحیح احادیث جزو ایمان ہیں، فللہ الحمد

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر حدیث پر ایمان لانا ایسا ہی ضروری تھا، تو جس خدا نے لاکھوں انبیاء، سینکڑوں صحائف اور کروڑوں ملائکہ پر ایمان لانے کا بیسیوں مرتبہ حکم دیا تھا، کیا وہ حدیث پر ایمان لانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا اگر اللہ نے اس چیز کو قابل ایمان نہیں سمجھا، تو آپ کون ہیں ہمیں حدیثوں پر ایمان لانے کا حکم دینے والے" (دو اسلام ص۱۰۹)

ازالہ اللہ تعالےٰ نے کتاب پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے، اور کتاب میں قرآن اور حدیث یعنی پوری شریعت شامل ہے، ان تمام آیتوں میں جن میں کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے، قرآن کا نام نہیں ہے

بلکہ کتاب یا ما انزل اللہ کے الفاظ ہیں، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں۔

دوم۔ حدیثوں پر ایمان لانے کا حکم دینے والے ہم نہیں ہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہے، اور آپ خود اس کے معترف ہیں، یہ آپ ہی کے الفاظ ہیں:۔

"قرآن پہ ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جاتے" (دو اسلام ص۱۱۱)

اب آپ کیلئے صرف ایک ہی الجھن باقی رہ جاتی ہے، کہ ایسے اقوال ملیں کہاں سے، تو یہ مشکل آپ نے خود ہی حل کر دی ہے۔ اور ان احادیث کی نشاندہی فرما دی ہے، تفصیل کے لئے ازالہ ماتبیں ملاحظہ فرمایئے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

م۔ اور آپ کے پاس "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى" ۔۔۔۔۔ کا کیا جواب ہے؟

ب۔ آیت کا مفہوم نہایت صاف ہے، کہ قرآن رسول کی خواہشات کا آئینہ دار نہیں، بلکہ وہ اللہ کا پیغام ہے مطلب یہ کہ قرآن رسول کی تصنیف نہیں، کہ جو جی میں آیا اس کے مطابق آیات تیار کر لیں (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى) بلکہ وہ ہمارا پیغام ہے، جو ہماری مشیت کی ترجمانی کر رہا ہے، (اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى) (دو اسلام ص۱۰۹)

ازالہ

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر اقوال رسول مل جاتے، تو مجھے یقین ہے، کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا، اور قرآن پہ ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جاتے" (دو اسلام ص۱۱۱)

اس عبارت سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔

اول۔ قول رسول قرآن حکیم کی تشریح ہوتا ہے۔

دوم۔ رسول کا قول دائرہ ایمان میں شامل ہے

اب سوال یہ ہے، کہ ایک بشر کے اقوال کو یہ اہمیت کیوں؟ کہ اس کا قول قرآن حکیم کی تشریح ہو، اور ایسا ہر قول دائرہ ایمان میں شامل ہو؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے، اور وہ یہ کہ وہ بشر اللہ کا رسول ہے، اور جو کچھ تشریح کرتا ہے، من جانب اللہ وحی ہوتی ہے، یہ تشریح بھی اس کی طرف سے نہیں ہوتی، بلکہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، اور اسی لئے اس پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے

لہٰذا برق صاحب کے تحریر کردہ اصول کی روشنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوا، کہ قرآن کی تشریح رسول کی خواہشات کی آئینہ دار نہیں، بلکہ وہ اللہ کا پیغام ہے، مطلب یہ کہ تشریح قرآن رسول کی طرف سے نہیں، کہ جو جی میں آیا اس کے مطابق آیات کی تفسیر گھڑ دی (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى) بلکہ وہ تشریح

ہمارا پیغام ہے، جو ہماری مشیت کی ترجمانی کر رہی ہے (اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی) مثلاً قرآن میں ہے کہ نماز پڑھو، رسول اس کی تشریح میں فرماتا ہے، کہ پانچ وقت کی نماز تم پر فرض ہے، فلاں وقت اتنی رکعات ہیں، ہر رکعت میں ایک رکوع ہے، دو سجدے ہیں، وغیرہ وغیرہ، تو یہ تشریح رسول کی طرف سے متصور نہیں ہوگی، بلکہ من جانب اللہ متصور ہوگی، اور اس پر اسی طرح ایمان لانا ہوگا جس طرح قرآن پر، اب اگر کوئی شخص نماز کی فرضیت کا تو اقرار کرے، اور پانچ وقت کا انکار کرے، تو وہ اسی طرح کافر ہوگا جس طرح نماز کی فرضیت کا انکار کرنے والا کیونکہ منشار حکم خداوندی کا انکار خود اس حکم کا انکار ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی) اس آیت میں "ھُوَ" کا مرجع ہے قرآن، جو وہاں محذوف ہے آپ کہیں گے، محذوف کے لئے کوئی قرینہ چاہیئے۔ بھائی صاحب! سینکڑوں آیات اس حذف کے لئے بطور قرینہ موجود ہیں" (دو اسلام ص۱۰۹)

ازالہ

ھُوَ کا مرجع قرآن نہیں ہے بلکہ نطق رسول یعنی قول رسول ہے جو اس سے پہلے کی آیت میں موجود ہے "وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی" یعنی رسول اپنی خواہش سے نہیں بولتا اس کا قول وحی ہوتا ہے، قریب ترین آیت میں "ھُوَ" کا مرجع موجود ہوتے ہوئے دور دراز کی آیتوں سے مرجع تلاش کرنا قرین انصاف نہیں، یہ غلط فہمی صرف اس لئے پیدا ہوئی، کہ آپ نے یہ سمجھ لیا، کہ "قرآن وحی ہے، لہٰذا ہر وحی قرآن ہے" بے شک پہلا جملہ "قرآن وحی ہے" بالکل صحیح ہے لیکن "ہر وحی قرآن ہے" صحیح نہیں، اور نہ اس کا کوئی قائل ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب رقمطراز ہیں:۔

"حدیث کا باطل نے وہ پلستر بگاڑا ہے، کہ لاکھوں آفتاب ماہتاب لے کر بھی ڈھونڈو تو حقیقت کا سراغ نہ مل سکے، الا ماشاء اللہ" (دو اسلام ص۱۱۰)

ازالہ

اس کے جواب میں برق صاحب کی مندرجہ ذیل عبارت ہی کافی ہے:۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں ...... حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزارہا احادیث صحیح ہیں ...... اس طرح کی ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے ...... اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے، جس پر ہم

ناناں ہیں (دو اسلام ص۳۱۱ و ص۳۲۳)

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

۰ م ۔ لیکن حدیث کی حجیت پر ایک اور آیت موجود ہے۔

ب ۔ فرمائیے :۔

م ۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت کرو) اللہ نے قرآن دیا ہے اور رسول نے حدیث، اس لئے دونوں پر ایمان لانا فرض ہے۔

ب ۔ آپ نے پوری آیت نہیں پڑھی " واولی الامر منکم " چھوڑ گئے ہیں، ساری آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہوا (اللہ ۔ رسول اور حاکم وقت (جو تم میں سے ہو) کو مانو) اگر رسول کی اطاعت کا یہی مطلب ہے، کہ آپ کے تمام اقوال پر ایمان لاؤ، تو پھر حاکم وقت کے اقوال پر بھی ایمان لانا پڑے گا کیونکہ اللہ نے اس کی اطاعت کا بھی ویسے ہی حکم دیا ہے (دو اسلام ص۱۱۰-۱۱۱)

ازالہ

جی نہیں ! اللہ نے حاکم وقت کے اقوال پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیا، بلکہ اس کے آگے فرمایا ہے، کہ :۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔

اگر تم کسی معاملہ میں اختلاف کرو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یعنی امت کو حاکم وقت سے اختلاف کا اختیار دیا، اس کے قول پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیا بلکہ اختلاف کر کے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا، گویا قول رسول خود سند ہے، اس سے اختلاف کرنے کا نہ اختیار ہے، نہ کسی دوسری طرف رجوع کا حکم ہے، بلکہ صاف ارشاد ہے

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء)

جو شخص ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسول کے خلاف چلے اور مومنین کے راستے سے علیحدہ کوئی راستہ اختیار کرے تو ہم اس کو اُدھر ہی جانے دیں گے اور دوزخ میں داخل کر دیں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ (النساء)

یعنی رسول کے خلاف چلنا مسلمانوں کا راستہ نہیں، بلکہ کافروں کا راستہ ہے، دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ رسول سے اختلاف کرنے کے اختیار کو سلب کر لیا گیا ہے، ارشاد ہے :۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا

کسی مومن مرد یا عورت کیلئے حلال نہیں کہ جب اللہ اور

قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ	اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اس
لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ	معاملہ میں اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس
يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ	کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں مبتلا
ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب)	ہو گیا۔

قول و فعل میں رسول سے اختلاف رکھنا، تو بہت بڑی بات ہے اللہ تعالیٰ تو یہ بھی برداشت نہیں کرتا، کہ کوئی شخص دل میں بھی کسی قسم کا اختلاف رکھے ارشاد باری ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ	آپ کے رب کی قسم لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے
فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا	جب تک وہ اپنے تمام اختلافات میں آپ کو حکم و مان لیں
فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ	پھر جو فیصلہ آپ نے کیا ہو اس سے اپنے دل میں تنگی
يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء)	محسوس نہ کریں بلکہ بسر و چشم اسے قبول کریں۔

کیونکہ ایمان کا اصلی تعلق دل سے ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول سے دل میں اختلاف رکھنے کو بھی کفر بتایا، اور قسم کھا کر فرمایا، کہ ایسا شخص مومن نہیں ہو سکتا، اسی بنا پر یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ قول رسول پر ایمان لانا فرض ہے، اگر قول رسول پر ایمان لانا فرض نہ ہوتا، تو اختلاف کی گنجائش نکل سکتی تھی، اور کم از کم پوشیدہ طور پر تو اختلاف رکھا جا سکتا تھا، لیکن یہاں ان باتوں کی قطعاً گنجائش نہیں، بلکہ غیر مشروط طور پر سر جھکا دینا لازم ہے، قرآن میں متعدد مقامات پر رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے کہیں اللہ اور رسول کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں، اور کہیں صرف رسول کی اطاعت کا ذکر ہے۔ مثلاً:۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ	اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اور رسول کی اطاعت
اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ	کرو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے

(النور)

لیکن امیر کی اطاعت کا حکم صرف ایک آیت میں ہے، پھر اس آیت میں بھی حکم امیر کو آخری سند کا درجہ نہیں دیا گیا، بلکہ اس سے اختلاف کی اجازت دی گئی، اور آخری سند اللہ اور رسول کو بتایا گیا، اس وضاحت کے بعد یہ کیسے کہا جا سکتا ہے، کہ رسول اور حاکم وقت کی اطاعت کی نوعیت ایک ہی ہے، دونوں اطاعتوں میں بڑا فرق ہے، لہٰذا ان دونوں اطاعتوں کا مقابلہ قطعاً غیر صحیح ہے حاکم کی اطاعت کو کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت نہیں فرمایا، مگر رسول کی اطاعت کو عین اپنی

اطاعت فرمایا، ارشاد باری ہے۔

وَمَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ — جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی

پس ثابت ہوا، کہ کجا اطاعت رسول، اور کجا اطاعت حاکم۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

صحیح فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"س۔ تو کیا اقوال رسول قابل ایمان نہیں؟

ج۔ کیوں نہیں! بشرطیکہ ہمیں کہیں سے کوئی قول رسول مل جائے" (دو اسلام صـ۱۱۱)

مؤدبانہ گذارش برق صاحب کی مندرجہ بالا عبارت غلط فہمی کے عنوان سے نہیں لکھ سکتا تھا اس لئے کہ اس عبارت میں برق صاحب نے اقوال رسول کو قابل ایمان تسلیم کیا ہے، یہ حقیقۃً صحیح فہمی اور حق کا اعتراف ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں، کہ ہمارا اور آپ کا اختلاف ہی ختم ہوگیا، جو آپ کا عقیدہ وہی ہمارا۔ لہٰذا اب آپ سے ایک مؤدبانہ گذارش ہے، وہ یہ کہ براہ کرم اپنے موجودہ رویہ میں کچھ اصلاح کیجیے۔ اس لئے کہ جس چیز پر ایمان لانا ضروری ہو، اس کو ماخذ قانون اور حجت شرعیہ تسلیم نہ کرنا شان ایمان نہیں، پھر بقول آپ کے اقوال رسول قرآن حکیم کی تشریح ہیں، اور دائرہ ایمان میں شامل ہیں، تو پھر ان کا من جانب اللہ تسلیم نہ کرنا کسی مومن کو تو زیب نہیں دیتا پھر یہ کہنا بھی کسی طرح صحیح نہیں، کہ جو تشریح من جانب اللہ ہو جس پر ایمان لانا لازمی ہو، وہ غیر محفوظ ہو، گویا ایمان کے لوازمات ضائع ہوگئے، قرآن کے الفاظ تو موجود ہوں لیکن یہ نہ معلوم ہو، کہ قرآن کے بھیجنے والے کا منشا ان الفاظ سے کیا تھا، اور جو چیز منشاء الٰہی کو بتلانے والی تھی، وہ موجود نہیں۔ بتلائیے کیا کوئی کہہ سکتا ہے، کہ یہ دین کی حفاظت ہے، کیا یہ اہانت اسلام نہیں، قرآن بھی محفوظ ہے، اور اس کی تشریح بھی موجود ہے، اور یہ تشریح کہاں محفوظ ہے۔ اس کے لئے بھی زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں آپ اپنی کتاب کا بیسواں باب (صـ۳۴۱ وصـ۳۴۳) ملاحظہ فرمائیں، آپ کی عبارتوں کے اقتباسات میں اسی باب میں گذشتہ صفحات میں نقل کر چکا ہوں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ نے ہمیں قوانین کی ایک کتاب یعنی قرآن دے کر اپنے رسول کو ہمارا امیر اور اولی الامر بنادیا، تاکہ وہ ان قوانین کو نافذ کر سکے، اور ہمیں حکم دے دیا، کہ رسول کی اطاعت کرو، رسول خدا جب تک بقید حیات رہے، صرف انہیں قوانین کی تعمیل کراتے رہے، جن کی تفصیل قرآن میں دی ہوئی تھی اور آج بھی ہم پر رسول خدا کی اطاعت قرآنی احکام کی حد تک فرض ہے" (دو اسلام صـ۱۱۲)

ازالہ جب رسول ایسا حاکم نہیں، جو خود حاکم بن بیٹھا ہو، یا لوگوں نے اس کو اپنا حاکم بنا لیا ہو، بلکہ وہ اللہ کا مقرر کیا ہوا حاکم ہے، تو پھر اس کی فرمانروائی منصب رسالت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مقام پر رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے حالانکہ ہر مقام پر امیر کی اطاعت کا حکم ہونا چاہیے تھا۔ اس لئے کہ جب رسول صرف تلاوت قرآن کی حد تک رسول ہے، اور اس کے بعد وہ ایک عام حاکم کی طرح ہے، تو پھر بار بار بلکہ ہر بار یہ کہنا کہ رسول کی اطاعت کرو، نعوذ باللہ دھوکا دینے کے مترادف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہر کلام میں وضاحت ہوتی ہے، اور کوئی کلام مبہم اور گمراہ کن نہیں ہوتا۔ اس لئے یہی تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ رسول کی اطاعت بہ حیثیت منصب رسالت ہے، نہ کہ بہ حیثیت حاکم، لہٰذا ایسا حاکم جس کو اللہ نے مقرر کیا ہو، جس کی حکمرانی منصب رسالت کے ساتھ وابستہ ہو، جب کوئی حکم نافذ کرے گا، یا کسی قانون کی تشریح کرے گا، تو اس کا وہ طریقہ نفاذ اور اس کی تشریح قانون من جانب اللہ ہی ہوگی، اور ہر لحاظ سے بالکل منشار الٰہی کے موافق ہوگی، اور اگر ایسا نہ ہو، تو کہا جائے گا، کہ قانون الٰہی کے نفاذ اور اس کی تشریح میں روز اول ہی سے غلطی نے راہ پالی، اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، کہ فلاں قانون کی تشریح کیا ہے، اور اس کو کس طریقے سے نافذ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (نجم) یعنی رسول نہ کبھی گمراہ ہوا نہ کبھی بہکا۔

بلکہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى (نجم) اس کی زبان وحی الٰہی کی ترجمانی کرتی ہے۔

بھلا ایسے حاکم کی فرمانروائی کو دوسرے حاکموں کی فرمانروائی سے کیا نسبت؟ اگر رسول کی اطاعت قرآن کی حد تک فرض ہے، اور اس کے علاوہ نہیں، تو پھر بلا وجہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ قرآن کے بجائے رسول کا لفظ استعمال کر کے دنیا کو غلط فہمی میں مبتلا کیا، کیوں نہ ہر جگہ قرآن کی اطاعت کا حکم دیا، کیا اللہ تعالیٰ بھی بھول جایا کرتا ہے، یا قصداً ایسا کرتا ہے، کہ کہنا کچھ چاہتا ہے، اور کہتا کچھ ہے، نعوذ باللہ من ذٰلک۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

م۔ آپ کا مطلب غالباً یہ ہے، کہ اگر رسول قرآنی احکام کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دے تو آپ اس کی تعمیل نہیں کریں گے۔

ب۔ یہ آپ نے فرض ہی کیوں کیا، کہ رسول صلعم قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دینے کی بھی جرأت کر سکتے تھے، انہیں بار بار کہا جا رہا تھا، بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ " اے رسول تم وہ احکام امت تک پہنچاؤ جو ہم تمہیں دے رہے ہیں، کیا رسول اکرم صلعم اس صریح حکم سے سرتابی کی جرأت کر سکتے تھے؟

لفظ رسول کے معنی ہی قاصد ایلچی اور چٹھی رساں ہیں تو لکیف نا صد خود کیسے آقا بن سکتا ہے؟ (دو اسلام ص۱۱۲)

جی ہاں وہ خود آقا نہیں بن سکتا، بلکہ بنایا جاتا ہے، جس چٹھی کو وہ لے کر آتا ہے، اسی چٹھی میں یہ لکھا ہوتا ہے، کہ چٹھی رساں کی اطاعت کرنا، یہ ہمارا چٹھی رساں ہے لیکن تمہارا حاکم ہے، اس کی اطاعت کرو، بس یہی میری اطاعت ہے، اس سلسلہ میں متعدد آیات اس چٹھی میں موجود ہیں، جن کو اوپر نقل کیا جا چکا ہے، کیا اس کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ خود حاکم بن بیٹھا؟ ہرگز نہیں اگر رسول کی حیثیت اتنی ہی ہے، کہ وہ چٹھی پہنچا دے، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں، تو پھر اس کا درجہ ہر انسان سے کم ہوا، اس لئے کہ چٹھی بھیجنے والے، اور چٹھی وصول کرنے والے کے درمیان چٹھی رساں محض ایک ذریعہ ہوتا ہے، اہم شخصیتیں تو وہ ہیں، جو چٹھی کو بھیجنے والی اور چٹھی کو وصول کرنے والی ہیں، چٹھی رساں کی حیثیت دونوں کے درمیان محض ایک ملازم کی سی ہوتی ہے اور بس، اگر یہی درجہ آپ رسول کو دینا چاہتے ہیں، تو بس پھر ایمان کا اللہ ہی حافظ ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

ازالہ

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ	تحقیق اللہ نے مومنین پر بڑا احسان کیا جب
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ	کہ ان میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ	جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کے قلوب کا
وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ	تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران)	ورنہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

برق صاحب کیا چٹھی رساں کے یہی فرائض ہیں، خدارا غور کیجیے مزکی و معلم انسانیت کو آپ چٹھی رساں بنا رہے ہیں، العیاذ باللہ، حقیقت تو یہ ہے کہ رسول کی حیثیت اس شخص کی سی ہے، جو کہ بادشاہ کی طرف سے کسی صوبہ کا گورنر مقرر کیا جاتا ہے، بادشاہ کی طرف سے چند ہدایات اس کو دی جاتی ہیں، اور وہ ان کی روشنی میں اس صوبہ پر حکومت کرتا ہے، وہ چٹھی رساں نہیں ہوتا، کہ چٹھی حوالہ کی اور چل دیا، بلکہ رسول اللہ کی طرف سے منتخب ہوتا ہے، اور مطاع عالم بنا کر بھیجا جاتا ہے، وہ ہدایت کا نسخہ دے کر رخصت نہیں ہو جاتا، بلکہ اپنی اطاعت اور فرمانروائی کا ڈنکہ بجاتا ہے، وہ آتا ہے، اور علی الاعلان کہتا ہے

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (نوح)	اللہ سے ڈرو اور صرف میری اطاعت کرو۔

اور اطاعت اور فرمانروائی کا یہ منصب وہ اپنے لئے خود اختیار نہیں کرتا، بلکہ اس منصب پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فائز ہوتا ہے، ارشاد باری ہے:۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء) ہر رسول کی اطاعت اللہ کے حکم سے کی جاتی ہے

تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں، تمہید میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ سنت بھی وحی کے ذریعہ نازل ہوئی ہے، لہٰذا "بلغ ما انزل" میں وہ بھی شامل ہے۔

غلط فہمی

برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ ایک چھوٹا سا نکتہ پیش نظر رکھیں، کہ رسول اکرم صلعم کی دو حیثیتیں تھیں، وہ پیغمبر بھی تھے اور بشر بھی، بہ حیثیت پیغمبر ہم ان کی اطاعت پر مامور ہیں، اور بہ حیثیت بشر، اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں مکمل آزادی دے رکھی ہے، کہ ہم چاہیں، تو کھانے، پینے، چلنے، بولنے لیٹنے اور سونے میں حضور کی روش اختیار کریں، یا حدود شریعت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی پسند، اپنے مذاق، اپنے ملک دیا حول اور اپنے رجحان سے کام لیں" (دو اسلام ص ۱۱۲-۱۱۳)

ازالہ

اگر کھانے پینے سے یہ مراد ہے، کہ ہم اپنی پسند کی چیزیں کھائیں اور پئیں، اور ہم پر یہ لازمی نہیں کہ جو کی روٹی اور کھجور ہی کھائیں تو بے شک آپ نے ٹھیک فرمایا ان چیزوں کے سنت دینی ہونے کا کوئی قائل نہیں۔ لیکن کھانے پینے کے جو اصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقرر فرمائے ہیں ان سے ہم تجاوز نہیں کر سکتے اور نہ اس معاملہ میں ہمیں اختیار دیا گیا ہے۔ کہ خواہ ان اصولوں کے مطابق عمل کریں خواہ ان کو ترک کر کے دوسرے اصول اختیار کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی اور اصول وضوابط مقرر فرمائے، ان اصول وضوابط کی خلاف ورزی کرنا بے شک جرم ہے مثلاً آپ نے ہم کو الٹے ہاتھ سے کھانے پینے سے منع فرمایا۔ اب ہم اپنے ماحول یعنی مغربی تہذیب کے غلبہ سے متاثر ہو کر الٹے ہاتھ سے کھانا پینا شروع کر دیں۔ تو یہ کسی طرح جائز نہیں۔ بلکہ اس سے مسلم معاشرہ کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اسی طرح اندھا دھند تقلید، نقالی، اور احساس کمتری کے جراثیم اسلامی تہذیب کو فنا کر دیں گے۔ پس ایک تو ہوئی رسول کی طبعی پسند اور ایک ہوئی اصولی و تشریعی پسند طبعی پسند کی مثال لوکی کھانا ہے ضروری نہیں کہ آپ لوکی کھائیں۔ لیکن لوکی ہو یا کوئی دوسری چیز اس کے کھانے کے جو آداب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم دیئے ہیں وہ ہمارے اسلامی تہذیب و شریعت کا جزو لاینفک ہیں ان میں ہمیں اختیار نہیں کہ خواہ ان پر عمل کریں خواہ اپنے ماحول یا اپنی پسند کے مطابق دوسری قوم کی نقالی کرتے پھریں۔ اسی طرح زراعت و تجارت، جہاد و سفر، لین دین کے وہ تمام ذرائع جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں رائج تھے یا جن کو خود آپ نے استعمال فرمایا سنت نہیں کہے جا سکتے مثلاً جہاد میں تیر و کمان کا استعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا لیکن دور حاضرہ میں اس کے استعمال کو سنت کوئی نہیں کہتا نہ اس ایٹمی دور میں، تیر و کمان کے استعمال کے کار ثواب ہونے

کا کوئی قائل ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جہاد اور اسی طرح کے دوسرے معاملات کے متعلق جو اصول آپ نے مقرر فرمائے وہ چاہے ہم قبول کریں چاہے ان کی جگہ دوسرے اصول اپنی پسند و ماحول کے مطابق وضع کر لیں۔ یہ ہرگز جائز نہیں۔ یہ حدود شریعت ہیں اور غالباً اسی وجہ سے برق صاحب نے بھی "حدود شریعت" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اگر ان کا یہی منشا ہے تو ہمیں ان سے اتفاق ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں، کہ بعض اوقات صحابہ نے آپ کے بشری ہدایات یا مشورہ پر عمل نہیں کیا تھا مثلاً جب آپ کے غلام زید نے اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہی، تو آپ نے فرمایا "امسك عليك زوجك" (طلاق مت دو) لیکن زید نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا، اسی طرح جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضرت عمرؓ کا اصرار تھا، کہ انہیں قتل کر دیا جائے لیکن حضور نہ مانے اور وحی نے عمرؓ کی تائید کر دی (ص ۱۱۳)

ازالہ

برق صاحب نے جو مثالیں ذکر کی ہیں، یہ احکام، اصول اور ضوابط کی مثالیں نہیں ہیں، بلکہ بقول برق صاحب یہ مشورے ہیں، اور مشورہ ہوتا ہی اس لئے ہے، کہ جس کو مشورہ دیا جا رہا ہے، وہ مانے یا نہ مانے، لہذا مشورہ کو حکم وہدایت کے ذیل میں لانا بہت بڑی غلط فہمی ہے، مزید براں جنگ بدر کے قیدیوں کا معاملہ تو اس جگہ قطعاً بے محل ہے، اس لئے کہ فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کر دینا یہ اکثریت کی رائے تھی، اسی وجہ سے اس پر عمل کیا گیا، مشورہ سے جو معاملات طے ہوتے ہیں، وہ قانون اور ضوابط نہیں بنتے، قانون اور ضوابط تو صرف احکام الٰہی ہوتے ہیں، جو بذریعہ وحی نازل ہوتے ہیں، اور کسی قانون وضابطہ کے بنانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مشورہ نہیں لیا، مثلاً جب آپ نے الٹے ہاتھ سے کھانا پینا منع فرمایا، تو اس سے پہلے کوئی مجلس مشاورت قائم نہیں کی، بلکہ بغیر مشورہ کے اس ضابطہ کا اعلان فرمایا، لہذا اس ضابطہ کو ماننا ہم پر فرض ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضور نے گیارہ نکاح کئے تھے، لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں" (دو اسلام ص ۱۱۳)

ازالہ

یہ اختیار کی مثال نہ ہوئی، بلکہ جبر کی مثال ہوئی یعنی ہم مختار نہیں، بلکہ مجبور ہیں، کہ چار سے زیادہ نکاح نہ کریں، حالانکہ قرآن سے اس کی صریح ممانعت ثابت نہیں ہوتی، پھر فعلی سنت بھی اس کی تائید کرتی ہے، کہ چار سے زیادہ نکاح کئے جا سکتے ہیں، لیکن قولی حدیث کے ذریعہ اللہ کے رسول نے اس آزادی کو ہم سے سلب کر لیا، اور ہم کو چار سے زیادہ نکاح کرنے کی ممانعت کر دی، الغرض ایک فعلی سنت سے روکنے والی دوسری قولی سنت ہے، ہمارے اختیار کو اس میں کہاں دخل ہے؟

برق صاحب آپ سے ایک سوال ہے، وہ یہ کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی ممانعت قرآن میں

ہے یا نہیں؟ (۱) اگر ہے، تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گیارہ نکاح کرنے کی اجازت قرآن کی کس آیت میں ہے؟ اگر قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں تو پھر یا تو یہ اجازت کسی دوسری وحی میں آئی ہوگی، یا یہ کہنا پڑے گا کہ نعوذ باللہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے؟ چونکہ قرآنی احکام کی خلاف ورزی آپ سے قطعاً ناممکن ہے، لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، کہ ہم قرآن کے علاوہ بھی وحی کا آنا تسلیم کریں، اور اسی وحی کو حدیث کہتے ہیں۔

(۲) اگر قرآن میں چار سے زیادہ نکاح کی ممانعت نہیں، تو پھر وہ ممانعت کس جگہ ہے؟ ظاہر ہے کہ اس ممانعت کا مقام حدیث میں ہوگا پس ثابت ہوا کہ حدیث بھی ماخذ قانون اور حجت شرعیہ ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضور نے ایک اندھے سے بے التفاتی فرمائی تھی، جس پر سورہ عبس نازل ہوئی، اور ملک العرش نے اپنے محبوب کو ایک ہلکی سی ڈانٹ پلا دی" (دو اسلام ص ۱۱۳)

ازالہ

برق صاحب کا منشا یہ ہے، کہ اندھے سے بے التفاتی سنت ہے، لیکن اس سنت پر عمل کرنا منع ہے یا یہ کہ اس سنت پر عمل کرنا اللہ کو ناپسند ہے، گویا سنت کوئی واجب الاتباع چیز نہیں، بلکہ سنت کو کوئی دینی اہمیت حاصل نہیں، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لغزشیں ہوتی تھیں اور اللہ تنبیہ نازل فرماتا تھا، برق صاحب نے درحقیقت سنت کا مطلب سمجھا ہی نہیں، سنت دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فعل یا قول ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا بھی صاد ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ اور حیات طیبہ میں جو اقوال و افعال آپ سے صادر ہوئے سب پر اللہ کا صاد ہے، پوری زندگی میں یہ دو تین مثالیں ہی ایسی ملتی ہیں جن سے معمولی سی لغزش کا ثبوت ملتا ہے، اور یہی وہ مثالیں ہیں، جو ہمارے لئے موجب اطمینان ہیں، انہی مثالوں سے ثابت ہوتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال پر کس طرح اللہ تعالیٰ کی تنقیدی نظر پڑ رہی ہے، اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے "اِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا" آپ ہماری نظروں کے سامنے ہیں" رسول سے اول تو غلطی ہوتی نہیں، اور اگر کبھی ذرا سی بھی غلطی ہوتی ہے، تو فوراً وحی الٰہی جنبش میں آجاتی ہے، اور اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے، اگر رسول کے افعال پر اللہ خاموش رہتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ ان افعال سے راضی ہے، اگر ناراض ہوتا، تو ضرور تنبیہ کرتا جس طرح ان دو تین واقعات کے سلسلہ میں تنبیہ کا نزول ہوا، گویا اس اصلاح کے بعد اب پوری زندگی اللہ کی منظور و مقبول ہوئی، لہٰذا ثابت ہوا کہ جن اعمال سے اللہ راضی ہے، وہ رسول کے اعمال ہیں، اگر ان کی پیروی کر لی، تو اللہ راضی ہو جائے گا، اور یہی مومن کا مقصد حیات ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی اس آیت میں رسول کی حیات طیبہ کی پیروی کو اسوہ حسنہ فرمایا ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" اللہ تعالیٰ کی تنقید پھر اصلاح، پھر منظوری پھر یہ آیت، کیا اس بات کا قطعی ثبوت نہیں، کہ رسول کی زندگی کی پیروی میں ہی نجات ہے

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے، کہ آخر اللہ تعالیٰ کیوں ذرا ذرا سی بات پر تنبیہ کرتا ہے، کبھی اندھے سے بے التفاتی پر تنبیہ کرتا ہے، باوجود اس کے اصل غلطی بظاہر اس اندھے ہی کی تھی، کہ عین دوران تقریر ٹوک دیا، اور آپ کے فارغ ہونے تک صبر نہیں کیا، پھر اس بے التفاتی سے جو آپ کی نیت تھی وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، بیویاں مال و دولت کی خواہش کرتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ مداخلت کرتا ہے، آپ شہد کو نہ کھانے کا عہد کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ خفگی کا اظہار فرماتا ہے، آخر اس کی کوئی وجہ ہے، یا یہ سب کچھ یوں ہی ہو رہا ہے بات در حقیقت یہ ہے، کہ رسول کا ہر قول و فعل قانون کا درجہ رکھتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ اصلاح فرما دیتا ہے تاکہ کوئی ایسا قانون نہ بن جائے، جو اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دو تین قانونی لغزشیں ہوئیں، ان کی اصلاح ہو گئی، لہٰذا اب ہم بے کھٹکے رسول کی پوری زندگی کو اپنے لئے ضابطہ حیات اور ماخذ شریعت تسلیم کرتے ہوئے اس کا اتباع کر سکتے ہیں، کیونکہ آپ کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے تنقیدی معیار پر پوری اتری، لہٰذا اس نے حکم دے دیا، کہ اب اس زندگی کی پیروی کرو گے، تو ہدایت ملے گی ورنہ نہیں، ارشاد باری ہے:۔

وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (اعراف) رسول کی پیروی کرو تاکہ تمہیں ہدایت نصیب ہو۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"قرآن کے گنے ہوئے چند سادہ سے ابدی احکام کے سوا ہم کسی اور ہنگامی حکم یا وقتی ہدایت کے لئے قطعاً مامور نہیں" (دو اسلام ص۱۱۳-۱۱۴)

ازالہ ایک طرف تو آپ یہ تحریر فرماتے ہیں، کہ اقوال رسول گویا وقتی ہدایت ہیں، اور ص۱۱۱ پر آپ تحریر فرما چکے ہیں، کہ "اگر اقوال رسول مل جاتے، تو مجھے یقین ہے کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا، اور قرآن پر ایمان لاتے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جاتے" معلوم نہیں، ان میں سے کون سی تحریر صحیح ہے وقتی ہدایت کس طرح دائرہ ایمان میں داخل ہو سکتی ہے، بات دراصل یہ ہے، کہ سچی بات آپ کے قلم سے نکل گئی ہے، اور وہ یہ کہ اقوال رسول دائرہ ایمان میں شامل ہیں۔

اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے، کہ قرآن کے علاوہ جتنے احکام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے، وہ سب ہنگامی تھے، تو ان کے معنی یہ ہوں گے، کہ پانچ وقت کی نماز بھی ہنگامی حکم تھا، اور اس میں تخفیف یا اضافہ کیا جا سکتا ہے، الٹے ہاتھ سے کھانے، پینے کی ممانعت، سیدھے ہاتھ سے استنجا کرنے کی ممانعت وقتی ہدایات

تھیں، اور اب اگر ان پر عمل نہ کیا جائے، تو کوئی گناہ نہیں، گویا یہ تمام ہدایات ابدی حیثیت کی حامل نہیں، کیا کوئی عقلمند انسان ایسی بات تسلیم کر سکتا ہے ؟

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"اگر ہم ملا کا مذہب قبول کر لیں، تو پھر استنجا بھی اصول دین، منڈا ہوا سر بھی رکن اسلام، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار بھی مذہبی فرض، منڈی ہوئی مونچھیں، لمبی داڑھی، مسلمان کیا ہوا، ایک اچھا خاصا جوکر بن کر رہ گیا" (دو اسلام ص۱۱۱)

ازالہ منڈے ہوئے سر کو تو رکن اسلام کسی نے نہیں کہا، بلکہ سر منڈانا مندرجہ ذیل دو وجوہ کی بنا پر کچھ ناپسندیدہ نظر آتا ہے۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سر پر بال رکھا کرتے تھے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سر منڈانا خارجیوں کی نشانی فرمائی تھی۔

استنجا بے شک اصول دین ہے، اس لئے کہ طہارت و نظافت کا ذریعہ استنجا ہی تو ہے، اگر یہ نہ ہو، تو "وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ" پر کیسے عمل ہو سکتا ہے، نہ معلوم برق صاحب کو کیا سوجھی، کہ استنجا کو قابل ملامت سمجھا، اگر ان کا مطلب اس استنجا سے ہے، جو جاہل لوگ چلتے پھرتے کرتے ہیں، تو ہمیں بھی ان سے اتفاق ہے، یہ طریقہ بے شک حیا سوز اور خلاف سنت ہے، بلکہ بدعت ہے،

ٹخنوں سے اونچی شلوار یا پائجامہ، پست مونچھیں، اور لمبی داڑھی اسلامی شعار ہے، یہ سب چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، صحابہ کرام ان پر عمل کرتے تھے، کیا آپ ان کو بھی اسی لفظ سے یاد کریں گے جس لفظ سے ملا کو یاد کیا ہے ؟

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"اگر آپ کسی نو مسلم انگریز کا سر مونڈ کر اوپر ایک موٹا سا گڑ باندھ دیں، مونچھیں مونڈ ڈالیں، داڑھی ناف تک بڑھا دیں، نیچے ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار پہنا دیں، پگڑی میں مسواک، ٹانگ کے ساتھ تسبیح باندھ دیں، اور آنکھوں میں سرمہ ڈال کر اسے انگلستان بھیج دیں، تو وہی نتیجے ہوں گے، یا تو انگریز اسے جن سمجھ کر مار ڈالیں گے، اور یا پھر چڑیا گھر میں بند کر دیں گے" (دو اسلام ص۱۱۴)

ازالہ سر مونڈنے کو سنت کس نے کہا ؟ بلکہ سر پر بال رکھنا سنت ہے، پھر بالوں کی تحسین و تزئین اور تکریم کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص ہدایات دی ہیں، لہٰذا سر مونڈنے کو رکن اسلام سمجھنا برق صاحب کی بڑی زبردست غلط فہمی ہے۔

"موٹا سا بگڑ، بگڑ میں مسواک، ٹانگ میں تسبیح" یہ تو آج تک کسی ملا میں نہیں دیکھیں معلوم نہیں برق صاحب کو ایسے ملا کہاں دستیاب ہوتے تھے۔

مونچھیں مونڈنا کوئی انوکھی چیز نہیں، اس کا تو رواج عام ہے، پھر یورپ میں اس پر تعجب کیوں ہوگا رہا ناف تک واڑھی بڑھانا، تو یہ بھی کوئی انوکھی چیز نہیں، اکثر پادری لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے ہیں، البتہ مسلمانوں میں یہ چیز شاذ ہے۔

ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار بھی تعجب کی چیز نہیں، بھلا جن لوگوں کے ہاں گھٹنوں سے اوپر نیکر بلکہ نصف سالوں تک کی شورٹس (shorts پہننے کا رواج ہو وہ کیسے ٹخنوں سے اونچی شلوار پر متعجب ہونگے متعجب تو وہ لوگ ہوتے ہیں، جو احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں، امریکی لباس کو ملاحظہ فرمایئے، ٹخنوں سے اونچی پتلون، کمر تک بلکہ کمر سے بھی اونچی بش شرٹ یا کوئی اور چیز اور پھر اس پر طُرّہ ڈھیلی اتنی کہ معلوم ہوتا ہے، کہ گاما پہلوان کی اترن ہے، لیکن بایں ہیئت کذائی انہیں اپنے لباس پر ناز ہے، اور مسلمانوں کو ان کی نقالی پر فخر، اگر ایسی بش شرٹ پہنے ہوئے ہمارا کوئی بزرگ انہیں دیکھتا، تو یہ کہنے پر مجبور ہوتا، کہ اپنے چھوٹے لیکن بے حد موٹے بھائی کی بش شرٹ پہنے ہوئے ہیں، اسی وجہ سے چھوٹی بھی ہے اور ڈھیلی بھی ہے آنکھوں میں سرمہ لگانا بھی کوئی تعجب کی چیز نہیں، یہ تو خوبصورتی کے لئے لگایا جاتا ہے، برق صاحب سرمگین آنکھوں کو بھی بد تہذیبی شمار کرتے ہیں، اور بد تہذیبی شمار کرنے کو انگریزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، بھلا جن کے ہاں ہونٹوں پر سرخی لگانا زینت ہو، وہ سرمے کو عجوبہ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

برق صاحب اگر آپ اپنی عبارت کو اس طرح کر لیں تو مناسب ہے" اگر ہم کسی نومسلم انگریز کے سر پر بال رکھ کر، ان میں تیل ڈال دیں، اور مانگ نکال دیں، پھر خوبصورت سا عمامہ باندھ دیں، مونچھیں پست کر دیں، اور داڑھی چھوڑ دیں، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنا دیں، یا تہبند باندھ دیں، عمامہ میں اوپر طرہ ہو اور پیچھے شملہ، آنکھیں سرمگیں کر دیں، سفید جھک لمبا کرتہ پہنا دیں، اور پھر اسے انگلستان بھیج دیں، تو لوگ اس کو فرشتہ سمجھیں گے، اور ہر جگہ اس کا اکرام اور احترام کریں گے"

برق صاحب اصول دین تو یہ ہے" ان اللہ جمیل یحب الجمال" اللہ خوبصورت ہے، اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے (الحدیث رواہ مسلم) لہذا بات اصول دین کی کیجیئے، نہ فرضی ملا کی۔

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

غلط فہمی "اسلام میں یہی تو خوبی ہے، کہ وہ صرف حقائق پر نظر رکھتا ہے، اور ان ظواہر و مناسک کو قابل التفات نہیں سمجھتا" (دو اسلام صفحہ ۱۱۳)

ازالہ اسلام میں تو یہ خوبی ہے، کہ وہ ظاہر و باطن کو یکساں دیکھنا چاہتا ہے، ظاہر باطن کی نمائندگی کرتا ہے، شریعت ظاہری باتوں پر نافذ ہوتی ہے، باطن کا حال سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اگر ظاہر بے کار چیز ہے، تو پھر بتایا جائے، کہ ہر ملک کی فوج کی وردی الگ الگ کیوں ہے، جھنڈا الگ الگ کیوں ہے؟ بیجیز (Badges) علیحدہ علیحدہ کیوں ہیں، اگر ہم دشمن فوج کی وردی پہن کر لڑیں تو کیا حرج ہے، حقائق پر اس کا اثر کیا ہوگا۔

جماعت مومنین اللہ کا لشکر ہے، اور اس کا بھی ایک طرز ہے، جو اس کو غیروں سے ممتاز کرتا ہے، یہ شان امتیاز ہی تو ہے، جس پر ہر قوم کو ناز ہوتا ہے، برق صاحب نہ معلوم کیوں اس امتیازی شان کے خلاف ہیں، کیوں ان ظواہر و مناسک کو قابل التفات نہیں سمجھتے، حالانکہ ان ظاہری مناسک کے ملنے کی دو عظیم الشان پیغمبر اس طرح دعا کرتے ہیں:۔

(۱) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (البقرۃ)	حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل دعا کرتے تھے کہ اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت ایسی بنا جو تیری مطیع ہو۔ اور اے اللہ ہم کو ہمارے مناسک بتادے

اور ہم پر رحمت کے ساتھ متوجہ ہو۔ بے شک تو تواب اور رحیم ہے۔

قبلہ کی طرف منہ کرنا بھی ظاہری مناسک میں سے ہے، اللہ تعالٰے فرماتا ہے:۔

(۲) لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (البقرۃ)	یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرو۔ یا مغرب کی طرف بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا جا وغیرہ وغیرہ۔

آیت مذکورہ سے ثابت ہوا، کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا، کوئی خاص نیکی کی چیز نہیں، محض ایک ظاہری چیز ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی اہمیت ملاحظہ ہو، ارشاد باری ہے۔

(۳) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (البقرۃ)	اور جس قبلہ کی طرف آپ منہ کرتے ہیں اس کو ہم نے اس لئے قبلہ مقرر کیا ہے کہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون کفر کی طرف واپس لوٹ جاتا ہے۔

گویا ان ظاہری چیزوں سے اتباع رسول کے جذبہ کی جانچ ہوتی ہے، جو ان ظاہری چیزوں کو بے حقیقت سمجھتا ہے، وہ گویا جذبہ اتباع رسول سے عاری ہے، حالانکہ اللہ ہم سے اسی کا مطالبہ کرتا ہے، اور ان ظاہری چیزوں کو مسلمانوں کے لئے طرۂ امتیاز قرار دیتا ہے، بظاہر عرفات سے طواف کے لئے جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

(۴) ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (البقرۃ) — پھر تم طواف کے لئے اسی جگہ سے چلو جہاں سے عام لوگ چلتے ہیں۔ (یعنی قریش جس مقام سے چلتے ہیں)

ایک اور ارشادِ گرامی سنیئے:۔

(۵) وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ (البقرۃ) — اور تم لوگ اپنے سر نہ منڈانا جب تک قربانی کا جانور اپنی جائے مقررہ پر نہ پہنچ جائے۔

سر کا منڈانا یا نہ منڈانا کتنی بے حقیقت چیز ہے، نہ یہ کوئی اسلامی حقائق میں سے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس ظاہری اور غیر اہم چیز کا حکم دے رہا ہے، اور حکم ہی نہیں دے رہا، بلکہ اگر شرعی عذر کی وجہ سے سر منڈانا پڑ جائے، تو اس کا جرمانہ بھی مقرر فرما رہا ہے۔ ارشاد ہے۔

(۶) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (البقرۃ) — پس جو شخص تم میں سے مریض ہو۔ یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ (سر منڈا دے لیکن بطور فدیہ کچھ روزہ رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

ایک اور جگہ ارشادِ باری ہے:۔

(۷) وَلَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (المائدۃ) — حالت احرام میں شکار مت مارو۔

بتایئے اس حکم میں کون سے حقائق مضمر ہیں محض ظواہر میں سے ہے لیکن حکم اس شدومد کے ساتھ ہے آخر کیا بات ہے، اللہ تعالیٰ کیوں ظواہر کو اتنی اہمیت دے رہا ہے، ایک اور مقام پر ارشادِ گرامی ہے:۔

(۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرۃ) — اے ایمان والو۔ تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں۔

روزہ بالکل ایک ظاہری چیز ہے، جس سے انسان فاقہ مستی اور نفس کشی سیکھتا ہے، اور بقول آپ کے اللہ تعالےٰ کبھی ایسے لغو کاموں کو پسند نہیں کرتا، وہ تو حقائق کو پسند کرتا ہے، اسی سے راضی ہوتا ہے دنیا کی تمام فوجیں تو اپنی افواج کے لئے عمدہ سے عمدہ راشن مہیا کرتی ہیں، ان کی ہر قسم کی آسائش کا لحاظ رکھتی ہیں، تاکہ ان میں کسی قسم کی جسمانی کمزوری پیدا نہ ہو جائے، اور اللہ ہے، کہ اپنی فوج کو بھوکا رکھ کر اسے

دشمن کے مقابلہ میں کمزور دکھنا چاہتا ہے، معلوم نہیں، اس ظاہری فاقہ مستی سے اللہ تعالیٰ کیوں خوش ہے اس کی کیا مصلحت ہے؟ بہرحال ہم تعمیل کرتے ہیں، اگر ہم ہر چیز کو ظاہری ظاہری کہہ کر چھوڑتے چلے جائیں تو بس پھر اسلام ختم ہو جائے گا، جادو کے متعلق ارشاد باری ہے:۔

(۹) لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (البقرۃ) — جس نے جادو کو حاصل کیا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں

جادو ایک فن و ہنر (آرٹ) ہے لیکن کیا کیا جائے، کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا محض ظاہری چیز پر اتنا زور دیا، اللہ تعالیٰ کو تو حقائق سے بحث کرنی چاہیئے تھی، اور وہ یہ کہ ایسی چیزوں کے متعلق بس یہ حکم نافذ ہوتا، کہ اگر نیک مقاصد کے لئے استعمال کی جائیں تو جائز ہیں، ورنہ ناجائز لیکن ایسا نہیں ہے، تو پھر یہی کہا جائے گا کہ ظواہر اور مناسک پر قرآن بھی زور دیتا ہے اعتکاف کے متعلق حکم صادر ہوتا ہے:۔

(۱۰) وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ (البقرۃ) — جب تم مساجد میں اعتکاف کے لئے بیٹھ جاؤ۔ تو عورتوں سے میل جول مت رکھو۔

یہ کیا راہبانہ زندگی کا سبق ہے؟ نفس کشی کی تعلیم ہے؟ کہا جا سکتا ہے، کہ اصل حقیقت تو دل کا پاک و صاف ہونا ہے، محض ان ظاہری ترک لذات سے کیا ہوتا ہے، اب اگر ایسا کہا جائے، تو پھر یہ قرآن پر اعتراض ہوتا ہے، نعوذ باللہ پس ثابت ہوا، کہ ظاہری مناسک بھی کوئی حقیقت رکھتے ہیں، ان کی بھی کوئی اہمیت ہے، خرید و فروخت کے متعلق ارشاد ہے:۔

(۱۱) وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (البقرۃ) — خرید و فروخت کے لئے گواہ کر لیا کرو۔

بھلا دو پیسے کا نمک خریدیں، تو بھی گواہ کر لیا کریں، یہ کتنی بے حقیقت بات ہے لیکن حکم بظاہر یہی ہے۔ ہاں حدیث سے کچھ تخصیص ہوتی ہے، اور معاملات سہل ہو جاتے ہیں۔ عورتوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

(۱۲) وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ (النور) — عورتیں غیر محرم کے سامنے اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں

یہ حکم بھی بظاہر بے حقیقت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اصل مقصد تو عفت و پاکدامنی ہے، اور وہ تزکیہ نفس سے حاصل کی جا سکتی ہے، تاہم اللہ تعالیٰ ظواہر پر زور دیتا چلا جاتا ہے، بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے:۔

(۱۳) وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ (البقرۃ) — شہر کے دروازہ میں جھک کر داخل ہو، اور "حطۃ" کہو ہم تمہارے سارے گناہ معاف کر دیں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے، کہ جب قرآن حقائق سے بحث کرتا ہے، ظاہر پرستی کو لغو سمجھتا ہے، تو پھر یہ کیوں نہیں کہتا، کہ خالص دل سے توبہ کرو، تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے، اس ظاہری ہیئت پر کہ داخلہ کے

وقت تم جھکے ہوئے ہو، کیوں زور دیا جا رہا ہے

الغرض اس قسم کے بیسیوں قرآنی احکام ہیں جن میں ظاہر پرستی کی اچھی خاصی جھلک اور اہمیت پائی جاتی ہے، اب اگر اس قسم کی ظاہر پرستی احادیث میں ہو، تو یہ کہنا کہ یہ ملاّ کی ایجاد ہے کس حد تک مبنی بر انصاف ہے، اگر قرآن قبلہ کی طرف منہ کرنے، طواف کو آنے کے لئے جگہ مقرر کرنے، قربانی سے پہلے سر نہ منڈانے، رمضان کے مہینے میں نفس کشی، حالت احرام میں شکار نہ کرنے، نامحرم کے سامنے زینت چھپانے شہر میں داخلہ کے وقت سجدہ کرنے کے ظاہری حکم دے سکتا ہے، اور ان کو دینی حقائق میں شمار کرتا ہے، تو پھر احادیث کے احکام مثلاً داڑھی چھوڑنا، سیدھے ہاتھ سے کھانا پینا، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہننا وغیرہ حقائق میں کیوں شمار نہیں ہو سکتے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"ملاّ سے میرا نزاع اس بات پر ہے، کہ وہ حدیث کو آگے لا کر بے شمار ظواہر کو جزو اسلام بنانا چاہتا ہے، اور میں قرآن کو پیش کر کے ملت کو ان ملائی قیود سے آزاد کرانا چاہتا ہوں (دو اسلام ص ۱۱۱)

ازالہ برق صاحب! حقیقت میں یہ نزاع آپ کا ملاّ سے نہیں ہے، بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس لئے کہ یہ سب باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نزاع گمراہی اور ضلالت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء)	اور جو شخص رسول کے خلاف چلے بعد اس کے کہ اس کے پاس واضح طور پر ہدایت پہنچ چکی ہو اور مسلمانوں کے علاوہ کوئی راستہ اختیار کرے تو ہم اس کو ادھر ہی جانے دیں گے جدھر وہ جا رہا ہے۔ اور اس کو دوزخ میں داخل کر دیں گے وہ بہت

برق صاحب! رسول کے مقرر کردہ قیود سے آزادی گویا اسلام سے آزادی ہے پھر نہ قرآن قرآن رہے گا نہ اسلام اسلام رہے گا، قرآن بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ اگر میں "اقیموا الصلوٰۃ" کے معنی یہ کروں، کہ رقص و سرود کی محفل قائم کرو۔ تو مجھے روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی روکے تو میں اسے ملا کہہ کر چپ کرا دوں گا اس لئے کہ وہ بلا وجہ حدیث کی رو سے پانچ وقت کی پابندی نماز کی لگا کر ہم کو قیود میں جکڑنا چاہتا ہے۔ حالانکہ قرآن ہمیں آزادی دیتا ہے۔ کہ جو مناسب معنی ہوں وہ کر لئے جائیں۔ اور اگر کہیں "مرکز ملت" بھی میرے معنوں کی تائید کر دے تو بس پھر وہ اللہ کا حکم ہوگا۔ اب تو کسی کو چون و چرا کی

گنجائش نہ ہوگی ایسے موقع پر سوائے اناللہ پڑھنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ حدیث کے قیود اگر آپ پر بار گذرتے ہیں تو آخر قرآنی قیود کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے قرآن بھی تو قیود وحدود سے بھرا پڑا ہے۔ طلاق کے معاملہ میں قیود۔ عدت کے قیود۔ نکاح کے قیود۔ نماز روزہ کے قیود حج میں طرح طرح کے قیود غرضکہ کن کن قیود کو بیان کیا جائے۔ آخر ان قیود سے بھی کوئی چھٹکارا ہے اللہ کے ایک آزاد بندے کو اتنی قیود میں جکڑ دینا ظلم ہے یا نہیں؟ خاوند مرجائے تو عورت چار ماہ دس دن عدت میں بیٹھے پھر نکاح کر سکتی ہے۔ آخر یہ قید کیوں لگائی گئی ہے۔ کیوں اسے مرد کی طرح آزادی نہیں دی گئی۔ کہ وہ جب چاہے نکاح کرے حکومت وقت کتنے قواعد وضوابط بناتی ہے جن کی خلاف ورزی جرم ہے آخر یہ قیود تسلیم کرنے پڑتے ہیں یا نہیں؟ طوعاً یا کرہاً۔ اور جب غیر نبی کے بنائے ہوئے قواعد وضوابط سے چھٹکارا نہیں تو نبی کے بنائے ہوئے قواعد وضوابط سے نجات کی کیوں کوشش کی جاتی ہے؟ قواعد کی پابندی تو بہر حال کرنی ہے رسول کے قواعد کی نہ سہی کسی اور کے سہی۔ اب یہ اپنی اپنی پسند ہے کہ کوئی کسی پابندی کو اچھا سمجھتا ہے اور کوئی کسی کو۔ مگر ایک مومن کے لئے رسول کے بنائے ہوئے ضابطے ہی عین ایمان ہیں انہی سے نور ہدایت مل سکتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا (الاحزاب)	ہم نے آپ کو شاہد۔ بشارت دینے والا ڈرانے والا اللہ کے حکم سے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا

برق صاحب کیا کسی چٹھی رساں پر بھی یہ خصوصیات ہوتی ہیں؟ دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (جمعۃ)	اللہ نے امیوں میں ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمایا جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ ورنہ پہلے تو وہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

برق صاحب کیا کسی چٹھی رساں میں یہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں، اچھا یہ بتلایئے کہ چٹھی رساں چٹھی یعنی قرآن لے کر آیا، کیا وہ دے کر چلا گیا؟ اگر نہیں تو پھر وہ کیا کرتا رہا؟ کیا وہ ان پر نگران بنا کر بھیجا گیا تھا کہ اس کی نگرانی میں قرآن پر عمل کیا جائے؟ کیا کسی چٹھی رساں کے یہ فرائض ہوتے ہیں، قرآن اس لئے بھیجا گیا تھا کہ کہ

کا اتباع کیا جائے، اور یہ چیزیں خود قرآن میں بھی موجود ہیں، جب اصل اتباع قرآن کا کرنا تھا، تو قرآن نے رسول کے اتباع اور اس کی اطاعت پر کیوں زور دیا، اگر رسول کا اتباع صرف قرآن کی حد تک کرنا تھا، تو پھر تو یہ اس حکم میں شامل تھا، کہ قرآن کا اتباع کرو، رسول کے اتباع کو علیحدہ ذکر کیا، اور بار بار ذکر کیا، حتیٰ کہ قرآن کے اتباع کا ذکر اگر دو تین جگہ ہے، تو رسول کے اتباع کا ذکر سو سے زائد مقامات پر ہے، کیا یہ سب فضول ہے رسول کے اتباع سے مراد قرآن کا اتباع تھا، تو آخر قرآن کے اتباع کا ذکر بار بار کرنے میں کون سا امر مانع تھا؟ آخر اس میں کیا راز ہے کہ چٹھی میں کل ہدایات موجود ہیں، اور کامل ہدایات موجود ہیں لیکن پھر بھی چٹھی میں یہ لکھا ہوا ہے، کہ چٹھی رساں کی اطاعت کرنا، اس کی نافرمانی مت کرنا، آخر یہ کیوں؟

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ب ۔ روایت بالمعنے کی تشریح کیجئے:۔

م ۔ بالکل سادہ سا لفظ ہے، کہ احادیث میں رسول صلعم کے الفاظ منقول نہیں بلکہ صرف مطالب منقول ہیں۔

ب ۔ آپ کا مطلب یہ ہے، کہ مضمون حضور علیہ السلام کا ہوتا ہے، اور الفاظ راوی کے

م ۔ جی ہاں!

ب ۔ تو آپ ہر حدیث میں یہ کیوں کہا کرتے ہیں قال رسول اللہ ..... اگر ہر حدیث راوی کا قول ہے تو پھر وہ قول رسول نہیں ہو سکتی، یہ تو ناممکن ہے، کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی قول راوی کا بھی ہو اور حضور کا بھی مزید براں اگر روایت بالمعنیٰ تسلیم کی جائے، تو اس صورت میں حدیث کبھی وحی خفی نہیں بن سکتی، اس لئے کہ تمام احادیث راویوں کے اقوال ہیں، اور وحی حضور پر آیا کرتی تھی نہ کہ راویوں پر" (دو اسلام ص۱۱۵)

ازالہ برق صاحب کے مخاطب مولانا بالکل ہی جاہل تھے، ورنہ ایسے جاہلانہ جواب دے کر خاموش نہ ہوتے، برق صاحب آپ کے اس سوال کا جواب خود آپ کی عبارت میں ملاحظہ ہو:۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں، صحیح حدیث کے دو مفہوم ہیں، اول یہ کہ کسی حدیث کی نسبت آنحضرت صلعم کی طرف صحیح ہو، یعنی ہم بہ دلائل ثابت کر سکیں، کہ یہ قول حضور کی زبان مبارک سے واقعی نکلا، ان معنوں میں کوئی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں، البتہ ظن غالب یہ ہے، کہ بعض اقوال صحیح ہوں گے، دوم یہ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں" (دو اسلام ص۳۴۱)

لیجئے، آپ نے خود تسلیم کر لیا، کہ بعض احادیث ظن غالب ہے، کہ صحیح ہوں گی، اور یہ بھی آپ نے تسلیم کر لیا، کہ معنے تو ہزاروں صحیح ہیں۔

اچھا برق صاحب یہ بتائیے، کہ اگر کوئی اردو دان جس کو عربی نہ آتی ہو، یہ کہے کہ اللہ فرماتا ہے

نماز قائم کرو، کعبہ کی طرف منہ کرو" تو یہ صحیح ہوگا یا غلط؟ یقیناً صحیح ہوگا، وہ اللہ کے الفاظ ادا نہیں کر رہا، بلکہ اس کا مفہوم ادا کر رہا ہے، اس کے باوجود اگر وہ یہ کہے، کہ "اللہ فرماتا ہے" اور یہ طریقہ صحیح ہو، تو پھر حدیث کی ادائیگی کے لئے یہ طریقہ صحیح کیوں نہیں۔

روایت بالمعنی اگر کسی قرآنی حکم کو عمل کرنے کا طریقہ مختلف الفاظ میں بتایا جائے، اور معنی ان تمام الفاظ کے ایک ہی ہوں، تو بتایئے قرآن پر عمل کرنے کا طریقہ متعین ہو گیا، یا نہیں، اب یہی وہ طریقہ ہے جس کے متعلق ہم کہیں گے کہ وحی خفی نے اس کو متعین کیا تھا یعنی یہی وہ طریقہ ہے، جو من جانب اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کیا گیا تھا، اگر کسی کام کا طریقہ متعین ہو جائے، تو اس سلسلہ میں الفاظ کے تعین کا اصرار خود آپ یعنی برقی صاحب کے نزدیک بھی لغو ہوگا، ذرا علم کیمیا کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے، کہ ایک ہی گیس کی تیاری کے لئے ہر کتاب والا ایک ہی طریقہ بیان کرتا ہے، لیکن ہر ایک اپنے الفاظ میں، تو کیا اس صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ چونکہ ہر کتاب والے کے الفاظ علیحدہ علیحدہ ہیں، لہٰذا یہ طریقہ قابل اعتماد نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ وہ طریقہ قابل عمل اور قابل اعتماد ہوگا، اور اس کو کسی بھی کتاب سے اخذ کیا جا سکے گا اور اس کے متعلق یقین سے کہا جا سکے گا، کہ یہی وہ طریقہ ہے، جو اس سلسلہ میں بانی اول سے تواتر منقول ہے اور یہاں یہی مطلوب ہے، نہ کہ الفاظ اور طرز بیان۔

روایت باللفظ اب رہی یہ بات کہ کیا کوئی قولی حدیث من وعن محفوظ ہے یا نہیں، تو برق صاحب صرف اتنا تسلیم کرتے ہیں، کہ بعض احادیث ایسی بھی ہیں لیکن یقینی طور پر نہیں بلکہ ظن غالب ہے، کہ صحیح ہوں گی، اس سلسلہ میں ہمارا کہنا یہ ہے، کہ ظن غالب کا استعمال وہاں تو ممکن ہے جہاں کسی متن حدیث کی صرف ایک ہی سند ہو، لیکن جہاں دو دو، چار چار، دس دس اور بیس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ سندیں ہوں، اور الفاظ مشترک ہوں، تو پھر ظن غالب نہ ہوگا، بلکہ یقین ہوگا، کہ واقعی یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اور اس قسم کی بہت سی احادیث موجود ہیں۔

غلط فہمی "بہت خوب پہلے تو رسول اللہ سے روایت بالمعنی کرتے ہیں، پھر راوی رسول سے روایت بالمعنی کی تکرار کرتا ہے، اگر اسی طرح ہر راوی "بالمعنی" کے مصرع کا تکرار کرتا ہے، تو آخری راوی تک پہنچ کر غریب معنی کا کچومر نکل جائے گا؟" ناظر ثانی (حاشیہ دو اسلام ص۱۱۵)

ازالہ معلوم نہیں کہ یہ ناظر ثانی کون صاحب ہیں، بہرحال اب ہمیں غلط فہمی ان کی دور کرنی ہے، ناظر صاحب سمجھے نہیں، روایت بالمعنی سے "معنی" کا کچومر نہیں نکلے گا، اس لئے کہ معنی کی حفاظت تو ہر راوی کا مطمح نظر رہے گا، ہاں آپ یہ کہہ سکتے تھے، کہ الفاظ کا کچومر نکل جائے گا، معلوم ہوتا ہے کہ ناظر صاحب

کہنا ہی چاہتے تھے غلطی سے بجائے "الفاظ" کے "معنی" لکھ گیا۔

اس سلسلہ میں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے، کہ کسی راوی کا یہ منشا نہیں ہوتا، کہ بس مفہوم ادا کر دو، حدیث کا حق ادا ہو گیا، نہیں بلکہ سو فیصدی ہر راوی اس بات کی کوشش کرتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل الفاظ ہی روایت کئے جائیں، حتیٰ کہ اگر کسی کو دو ہم معنی الفاظ میں شک ہوتا ہے، کہ ان میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سا لفظ فرمایا تھا، تو وہ دونوں الفاظ کا ذکر کر دیتا ہے، اور یہ صاف بتا دیتا ہے کہ مجھے ان دونوں لفظوں کے معاملہ میں شک ہو گیا ہے، کتب حدیث پڑھنے والے اس سے بخوبی واقف ہیں، بتایئے، جہاں ہم معنی لفظوں کے سلسلہ میں اتنی سختی اور تشدد ہو، وہاں دوسرے الفاظ کے لئے نرمی، تساہل، مداہنت کا پایا جانا محال ہے، روایت بالمعنی، راوی کبھی اضطراری طور پر تو کر دیتا ہے لیکن اپنے اختیار اور امکان کی صورت میں روایت بالمعنی سے احتراز ہی نہیں، بلکہ کراہت کرتا ہے، پھر اگر کسی راوی میں روایت بالمعنی کی ذرا سی بھی عادت پائی جاتی ہے، تو محدثین اس کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور متن حدیث کی چھان بین میں لگ جاتے ہیں، اور اس طرح تحقیق و تفتیش کے بعد حدیث کے اصلی متن کو صحیح حدیث کی شکل میں امت کے سامنے پیش کرتے ہیں، الغرض قولی احادیث میں الفاظ ہی کی حفاظت کی گئی ہے، اور اس کی حفاظت کے لئے پورا فن حدیث معیاری طور پر مرتب و مدون ہے، خلاصہ یہ ہوا، کہ فن حدیث کا پورا زور حفاظت الفاظ پر ہے، نہ کہ مفہوم الفاظ پر جیسا کہ برق صاحب کے مولانا نے فرمایا ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ وحی بلا الفاظ میری سمجھ سے بالاتر ہے، وحی کے معنی ہیں پیغام، اگر اللہ کوئی پیغام بھیجے، اور الفاظ ساتھ نہ ہوں، تو وہ سمجھ میں کیسے آئے گا؟" (دو اسلام صفحہ ۱۱۶)

ازالہ یہ ضروری نہیں، کہ وحی خفی ہمیشہ بلا الفاظ ہی آتی ہو، اور اگر ہر وحی خفی کو ہم بلا الفاظ ہی سمجھ لیں، تو بھی یہ سمجھ سے کوئی بالاتر چیز نہیں، اس لئے کہ خیال پہلے پیدا ہوتا ہے، بعد میں الفاظ کی شکل اختیار کرتا ہے، خیال اور الفاظ کا ساتھ ساتھ پیدا ہونا لازمی نہیں، ایک ہی خیال اگر مختلف لوگوں کو پیدا ہو، تو الفاظ ہر شخص کے علیحدہ ہوں گے، صرف خیال میں وہ لوگ متحد ہو سکتے ہیں، لیکن جب وہ اس کو ادا کریں گے، تو الفاظ علیحدہ ہوں گے، بلکہ اکثر کی زبان بھی علیحدہ ہو گی، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے، کہ خیال دماغ میں گھومتا رہتا ہے، لیکن اس کی ادائیگی کے لئے موزوں الفاظ دیر میں یاد آتے ہیں، وہ مفہوم جو ذہن میں ہو، لیکن ابھی الفاظ ذہن میں نہ آئے ہوں، تو وہ خیال و تصور بلا الفاظ ہوا یا نہیں، بس اسی پر وحی خفی کو سمجھ لیجئے بلکہ

اصل بات تو یہ ہے، وحی خفی ہو یا جلی ہمارے سمجھنے کی چیز ہی نہیں، اور واقعی یہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے تو پھر وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء) کی تعمیل میں ہمیں اس کی تاویل و تشریح سے باز ہی رہنا چاہیے

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"م۔ آپ وحی خفی کا مطلب "سوجھنا" سمجھ لیں، کہ حضور کو جب کوئی بات سوجھ جاتی تھی، تو وہ اسے اپنے الفاظ میں ادا کرتے تھے، سوجھتے ہمیشہ خیالات ہی ہیں، اور یہی وحی خفی ہے

ب۔ اجی حضرت! سوجھنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے، ایک فلسفی کسی نئی الجھن کو پہروں، ہفتوں بلکہ مہینوں سوچتا ہے، اور کسی نہ کسی دن اسے حل سوجھ ہی جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ حل اس فلسفی کے دماغ میں اللہ نے ڈالا ہے، لیکن اسے وحی یا الہام نہیں کہتے، بلکہ القا کہتے ہیں (دو اسلام ص ۱۱۶)

ازالہ ہمیں اس سے کلیۃً اتفاق نہیں، کہ جو حل فلسفی کو سوجھا ہے، وہ اللہ ہی نے اس کے دماغ میں ڈالا تھا، ہو سکتا ہے، کہ اللہ نے ڈالا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے نہ ڈالا ہو، دونوں ممکن ہیں، اگر اللہ ہی نے ڈالا ہو، تو اس کی بھی دو صورتیں ہوں گی، یا تو وہ ہدایت و حکمت پر مشتمل ہو گا، یا گمراہی اور ضلالت سے بھرپور، اگر ہدایت و حکمت پر مشتمل ہے، تو پھر اس پر اللہ کی رضا کی مہر بھی ثبت ہو گی، اور اگر گمراہی اور ضلالت پر مشتمل ہے، تو اگرچہ وہ اللہ کے قانون فطرت کے لحاظ سے اللہ ہی کی طرف منسوب ہو گا، لیکن اس پر اللہ کی رضا کی مہر ثبت نہ ہو گی، بلکہ اللہ اس سے ناراض ہو گا، مندرجہ ذیل آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے:۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ. كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ (الحجر)	اور البتہ تحقیق ہم نے آپ سے پہلے بھی گذشتہ اقوام میں نبی بھیجے تھے اور جب کبھی ان کے پاس ہمارا رسول آیا تو انہوں نے اس کا مذاق ہی اڑایا مجرمین کے دل میں یہ استہزا اور مخالفت ہم اسی طرح ڈال دیتے ہیں

برق صاحب یہ آیت آپ کے سامنے ہے کہ رسول کی مخالفت اللہ ہی مجرمین کے دلوں میں ڈالتا ہے، اب آپ بتلایئے کیا اس مضمون کی آیت قرآن میں ہو سکتی ہے؟ اگر یہی مضمون کسی حدیث میں ہو، تو آپ جلدی سے کہہ دیتے ہیں، کہ حدیث وضعی ہے، اب یہاں کیا کہیں گے؟ اگرچہ میں نے آیت کو نقل کرنے سے پہلے اس الجھن کو دور کر دیا ہے، لیکن الفاظ متن پر جو اعتراض ہو سکتا ہے، وہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اور آپ کے لئے داعی الی الانصاف ہے۔

اگر وہ حل اللہ نے نہ ڈالا ہو تو پھر شیطان نے ڈالا ہوگا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے ثابت ہے

اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِهِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّکُمْ لَمُشْرِکُوْنَ (الانعام)

بے شک شیاطین اپنے اولیاء کی طرف وحی بھیجتے ہیں کہ وہ تم سے مجادلہ کریں اور اگر تم ان کا کہنا مانو تو تم درحقیقت مشرک ہو جاؤ گے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ شیطان بھی دلوں میں بعض باتیں ڈالتا رہتا ہے۔ اور اللہ اس شیطانی وسوسہ کو بھی وحی کا نام دے رہا ہے پھر تعجب ہے کہ اللہ اگر اپنے نبی کے دل میں کوئی بات ڈالے تو اس کو وحی کہنا ناجائز ہے۔ لہٰذا فلسفی جو کچھ سوچتا ہے۔ ہو سکتا ہے صحیح ہو اور ہو سکتا ہے کہ غلط ہو بے شمار فلسفے ایسے ہیں جو پہلے قابل اعتماد تھے لیکن بعد میں آنے والوں نے اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ فلسفی یا غیر نبی حضرات اور نبی کے سوچنے میں زمین و آسماں کا فرق ہے نبی سوچتا ہے اور نور نبوت اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ اللہ کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ اللہ کی تنقیدی نگاہیں اس پر پڑتی رہتی ہیں اور جہاں اس سے اس سوچ و اجتہاد میں غلطی ہوئی فوراً وحی آتی ہے اور اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے جیسا کہ دو تین واقعات اس قسم کے قرآن مجید میں موجود ہیں۔ نبی کی ہر سوجھ پر اللہ کی رضا کی مہر ہوتی ہے۔ نبی غلطی نہیں کر سکتا اور اگر غلطی کرے تو اللہ اس پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ رسول اللہ کے احکام پر عمل کرتا ہے اور اس عمل کا طریقہ (سنت) مقرر کرتا ہے۔ اگر اللہ یہ سمجھتا ہے کہ اس طریقہ سے یہ عمل غلط ہے۔ اور پھر بھی وہ خاموش رہتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اللہ نے ہمارے لئے ایسا معلم و مزکّی بھیجا جو خود کتاب اللہ کے سمجھنے و اس پر عمل کرنے میں غلطی کرتا ہے اس صورت میں اللہ اور اس کی رسالت سب محل اعتراض بن جائیں گے اور یہ آیت بے معنی ہو جائے گی۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام) یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کس کو دے۔

ورنہ اس طرح کہ جس رسول کو ہمارے لئے اسوہ حسنہ بنا کر بھیجا گیا اگر وہی غلطی پر ہے تو پھر وہ تمام لوگ جو اس کی اتباع کریں گے غلطی پر ہی رہیں گی اور اگر بالفرض وہ لوگ اپنے اجتہاد سے صحیح مطلب اخذ کر کے عمل کریں گے تو پھر یہ اعتراض لاحق ہوگا کہ عام لوگوں کی فہم و فراست رسول کی فہم و فراست سے بالاتر ہوئی اور یہ بھی ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معمولی سی سیاسی قسم کی غلطیوں پر بھی چشم پوشی نہیں فرمائی بلکہ وحی جلی سے ان کی اصلاح کر دی تو بھلا بڑی بڑی غلطیوں پر جو اصول دین پر اثر انداز ہیں کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ لہٰذا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ رسول کے اقوال و اعمال پر اللہ کی سند ہے۔ اور یہی وحی خفی کا اصلی مفہوم ہے ہاں یہ ضروری نہیں کہ تمام احادیث قولی و فعلی اسی وحی

خفی کے ضمن میں آتی ہوں، یہ تو محض ایک اصطلاح ہو گئی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے، کہ بہت سی احادیث وحی جلی کے ذریعہ نازل ہوئیں، بالکل اسی کیفیت سے نازل ہوئیں جس طرح قرآن نازل ہوتا تھا، احادیث میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، بشرطیکہ غلط فہمی سے ان کو ٹھکرایا نہ جائے

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"کیا لوگوں کو فکر و عقل کی دعوت دینے والا نبی۔۔ خود نہیں سوچا کرتا تھا اور اسے اپنے آپ پر اس قدر بے اعتمادی تھی کہ جب تک جبریل مشورہ نہ دیتا یا اللہ تعالےٰ رہنمائی نہ کرتا تو وہ دین و دنیا کے کسی معاملہ میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ یہ وحی خفی کا شوشہ تعظیم رسول کے لیے نہیں بلکہ تنقیص رسول کے لئے چھوڑا گیا ہے" (دو اسلام صفحہ ۱۱۶ و ۱۱۷)

ازالہ قرآن نے جہاں کہیں تدبر و تفکر کی دعوت دی ہے، وہ تدبر و تفکر کے ذریعہ توحید کی طرف دعوت دی ہے، اور اس بات پر زور دیا ہے، کہ یہ وحی، یہ مناظر قدرت، یہ کائنات کیا تم کو اس بات کا یقین نہیں دلاتے، کہ جو ان کا خالق ہے، وہی حقیقی الٰہ ہے، وہی عبادت اور فرمانروائی کے لائق ہے، اب رہا قرآنی احکام پر عمل کرنے کا طریقہ، تو یہ قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ تدبر و تفکر سے ان کا طریقہ تلاش کرو، مثلاً نماز پڑھنے کا طریقہ تدبر و تفکر سے خود متعین کرو، اگر کوئی ایسا کہتا ہے، تو اس کا یہ قول ایک عجوبہ روزگار ہے، وحی خفی کا شوشہ تنقیص رسول کے لئے نہیں، بلکہ تعظیم رسول کے لئے ہے، اس لئے کہ رسول نے جو کچھ کیا، اللہ اس سے راضی تھا اس لئے اللہ نے قرآن میں اس پر تنبیہ نہیں کی پس معلوم ہوا کہ رسول کا تفکر و تدبر یا تا صحیح ہوتا تھا، کہ اللہ تعالیٰ بھی اس پر گرفت نہیں کرتا تھا، اور پوری زندگی میں صرف دو تین موقعوں پر ہی اللہ کی طرف سے گرفت ہوئی، ورنہ ساری زندگی کے اجتہادات اللہ کے معیار تنقید پر پورے اترے، یہ وحی خفی کا سلسلہ صرف ایک حد تک احادیث پر حاوی ہے ورنہ احادیث کا معتدبہ حصہ وحی جلی کے ذریعہ یعنی وحی مثل قرآن کے ذریعہ نازل ہوتا تھا علم حدیث کے طالب علم اس سے بخوبی واقف ہیں، اور قرآن میں بصیرت رکھنے والے قرآنی آیات سے اس پر استدلال کر سکتے ہیں اور کر چکے ہیں، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"ہمارے بعض علماء تو عشق حدیث میں یہاں تک عقل و خرد گم کر چکے ہیں کہ اللہ کے کلام کو نہ صرف احادیث کا محتاج ٹھہراتے ہیں، بلکہ یہ کہتے ہوئے بھی سنے جاتے ہیں، کہ اگر اللہ کا کوئی قول رسول کے قول سے متصادم ہو جائے، تو قول خدا کو منسوخ سمجھو" (دو اسلام صفحہ ۱۱۷) اوزاعی مکحول کے اس قول کے راوی ہیں

کہ حدیث قرآن کی اتنی محتاج نہیں، جتنا قرآن حدیث کا محتاج ہے" (دو اسلام ص۱۱۸-۱۱۹)

ازالہ برق صاحب ایسا ہوا تو نہیں ہے، کہ حدیث سے قرآن منسوخ ہوا ہو، لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے، تو بعید از عقل بھی نہیں ہے، غلط فہمی آپ کو صرف اس وجہ سے ہوئی ہے، کہ قرآن کو تو آپ اللہ کا حکم سمجھتے ہیں، اور حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا، حالانکہ یہ نظریہ ہی غلط ہے، قرآن بھی اللہ کا حکم اور حدیث بھی اللہ کا حکم ہے، بمصداق آیہ کریمہ "وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ" لہٰذا منسوخ حکم بھی اللہ کا ہے، اور منسوخ کرنے والا حکم بھی اللہ ہی کا ہے، لہٰذا اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں حدیث میں ہر چیز کی تفصیل ہے، اور تفصیل کے لئے اجمال کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، ہاں اجمال کے لئے تفصیل و تشریح کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً حدیث میں ہے، کہ نماز قائم کرو، اور اس اس طریقے سے اس اس وقت پڑھو، تو اب حدیث میں دو چیزیں آگئیں، اول قرآنی حکم کہ "نماز قائم کرو" اور پھر اس کی تشریح کہ اس طرح اور اس وقت پڑھو، تو آپ بتائیے، حدیث میں قرآن کو سمو دیا گیا، یا نہیں، حدیث کی تشریح کے لئے قرآن کی کیا ضرورت ہے، لیکن برخلاف اس کے اگر قرآن کا حکم سنایا جائے "نماز قائم کرو" تو پھر یہ سوال ہوگا، کہ کب اور کیسے؟ اور اب حدیث کی ضرورت ہوگی یعنی قرآن کی تشریح کے لئے حدیث کی ضرورت پیش آئے گی مطلب یہ کہ قرآن کی تشریح کے لئے حدیث کی احتیاج و حاجت ہے، اور یہی مطلب ہے، امام مکحول کے قول کا، کہ قرآن حدیث کا محتاج ہے، لفظ "محتاج" کا استعمال اردو میں کراہت پیدا کرتا ہے، لیکن عربی میں نہیں اور یہی وجہ ہے، کہ برق صاحب کو غلط فہمی ہو گئی، اور اس لفظ کو قرآن مجید کے شایان شان نہیں سمجھا۔

غلط فہمی "یہ طریقت، رہبانیت اور جہاد اکبر کے راستے نکال کر خدائی پیغام کو کس نے مسخ کیا تھا...."

(دو اسلام ص۱۱۸)

ازالہ برق صاحب آپ نے سچ فرمایا، یہ کام بے شک ملانے کیا تھا یا کسی صوفی نے کیا تھا، لیکن کسی عالم دین نے کبھی اس پر مہر تصدیق ثبت نہیں فرمائی، ہم بھی آپ کی ہاں میں ہاں ملا کر یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

ز من بر صوفی و ملا سلامے	کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت	خدا و جبریل و مصطفےٰ را

——————— (اقبال)

باب ۔ ۶

تحریف احادیث کے اسباب

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"تحریف احادیث کے کئی اسباب تھے۔ اول حضور علیہ السلام نے حدیث لکھنے سے منع فرمادیا تھا اور جو چیز لکھی نہ جائے اسے تحریف سے بچانا ناممکن ہوجاتا ہے" (دو اسلام صفحہ ۱۳۱)

ازالہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے سے منع نہیں فرمایا تھا بلکہ قرآن کے ساتھ ملا کر لکھنے سے منع فرمایا تھا متواتر احادیث سے کتابت کی اجازت وحکم ثابت ہے تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو۔ حدیث لکھی گئی مسلسل لکھی گئی لہٰذا بقول برق صاحب تحریف سے بچ گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کی تحریر کردہ کتب احادیث کا بیان باب اول میں گذر چکا ہے۔ ان کے بعد تابعین وتبع تابعین کے دور میں تو کتب احادیث اتنی لکھی گئی کہ ان کا شمار ناممکن ہے۔ تفصیل کے لئے مولانا عبد الرؤف جھنڈا نگری کی کتاب "صیانۃ الحدیث" ملاحظہ فرمائیں۔

غلط فہمی "چند روز کا ذکر ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم لاہور تشریف لائے یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک جلسہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر میاں عبد الباری کی صدارت میں منعقد ہوا جب میاں صاحب تقریر کے لئے اٹھے تو مجمع سے یہ آوازیں بلند ہوئے "ہم غائنوں کے سردار کی تقریر نہیں سننا چاہتے۔ بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ چنانچہ وہ بیٹھ گئے" نوائے وقت اور اس کے ہمنواؤں نے لکھا کہ شور مچانے والوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہیں تھی لیکن "زمیندار" اور چند دیگر اخبارات کہہ رہے تھے، کہ یہ جلسہ میں شریک ہونے والے دو لاکھ انسانوں کی متفقہ آواز تھی، واقعہ دو دن کا ہے، دو لاکھ انسانوں نے اسے دیکھا، ہر اخبار کے نمائندے بھی وہاں موجود تھے، اور پھر اصل حقیقت تبیر کھلتی (صفحہ ۱۳۲)

ازالہ برق صاحب! یہاں دو سیاسی جماعتوں کے سیاسی فریب ہیں، جو اس خبر کی اشاعت میں کام کر رہے ہیں، برخلاف اس کے احادیث کی روایت میں صحابہ کرام میں دو جماعتیں نہیں تھیں، کہ ایک جماعت دوسری جماعت کو گرانے کے خیال سے فریب دیتی، اور احادیث میں تحریف کرتی، یہ تو صحابہ کرام کے متعلق بڑی زبردست غلط فہمی ہے اور اس کا جواب باب چہارم میں دیا جاچکا ہے، پھر یہ تو بتایئے، اس اختلاف تعداد سے اصل واقعہ پر کیا اثر پڑتا ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ میاں صاحب

لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے تقریر نہ کر سکے تھے، یہ تو صحیح ہے یا نہیں، کیا آپ یہ سمجھتے ہیں، کہ چونکہ تعداد میں اختلاف ہے، لہٰذا یہ واقعہ ہوا ہی نہیں، یہ سارا واقعہ من گھڑت ہے! کیا کوئی فہیم انسان اسے تسلیم کرے گا؟ خود آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعہ ہوا، اور اختلاف تعداد کے باعث اس واقعہ کو نہیں جھٹلاتے، تو پھر یہی حال حدیث کا بھی ہے، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بھول گئے، آپ کو یاد دلایا گیا، آپ نے کمی کو پورا کیا، اور بعد میں دو سہو کے سجدے کئے۔

اب اگر اس حدیث میں فرض کیجیے، یہ اختلاف پیدا ہو جائے، کہ کوئی کہے، کہ آپ عصر کی نماز میں بھولے تھے، کوئی کہے کہ ظہر کی نماز میں بھولے تھے، تو بتایئے اس سے اصل واقعہ پر کیا اثر پڑے گا ظہر یا عصر کی تصریح ہونا تو کوئی اہمیت کی چیز نہیں، اہمیت کی چیز یہ ہے، کہ جب کبھی نماز میں بھول ہو جائے، تو بعد میں دو سجدے سہو کے کر لئے جائیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا، سہو کے مسئلہ پر ظہر یا عصر کا اختلاف بالکل اثر انداز نہیں ہوگا، بلکہ مسئلہ پوری طرح ثابت ہوگا، اور محفوظ ہوگا، اور چونکہ سجدہ سہو کا مسئلہ ہی دینی مسئلہ ہے، لہٰذا اس کے محفوظ ہونے سے دین محفوظ ہو گیا اور ظہر یا عصر کی صراحت محفوظ نہ ہونے سے دین کی حفاظت متاثر نہ ہوگی، تمام احادیث میں یہی بات آپ کو ملے گی، جزئی اختلاف کے باوجود جب مسئلہ کی بات آئے گی، تو پھر صحیح احادیث میں ایک ہی بات ہوگی، اس کو اللہ کی حفاظت کہتے ہیں، اور اسی طرح اللہ نے اپنا وعدہ حفاظت پورا کیا۔

غلط فہمی "احادیث کی تحریف میں انسان کے اس فطری خاصہ کا کافی دخل ہے، حضور علیہ السلام سے ایک بات نکلی، ہزاروں نے سنی، رفتہ رفتہ اس میں رد و بدل ہونے لگا، زمانہ گزرتا گیا، اور بات بگڑتی گئی، ہزاروں سے نکل کر لاکھوں، اور لاکھوں سے کروڑوں زبانوں تک پہنچی، جہاں کوئی حصہ بھول گیا، پاس سے بڑھا لیا، اصلی قول محفوظ نہیں تھا، کہ مقابلہ کر کے تصحیح کر لیتے، راویوں میں اچھے بھی تھے اور برے بھی مؤخر الذکر نے احادیث کو اپنے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا، اور بات کہاں سے کہاں نکل گئی (ص ۱۲۳)

ازالہ اس کے جواب میں برقی صاحب آپ اپنی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں، مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

"گذشتہ ۱۴ برس میں مجھے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا، جو رنگ آمیزی، مبالغہ اور دیگر سخن گسترانہ عیوب سے پاک ہو، میں خود ان عیوب سے مبرا نہیں، اور آج کہ میری عمر ۴۰ سال سے کچھ اوپر ہو چکی ہے، علم کے کئی منازل طے کر چکا ہوں، متانت، حقیقت، اور واقعیت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں، پھر بھی داستان سرائی، مبالغہ اور رنگ آمیزی کے سوا کچھ نہیں" (دو اسلام ص ۱۲۱)

مندرجہ بالا غلط فہمی ہیں مبالغہ اور رنگ آمیزی کے سوا کچھ نہیں۔

انتباہ برق صاحب! آپ نے غور فرمایا، آپ کی عمر ۷۰ سال سے کچھ اوپر ہے، اور گذشتہ ۷۰ برس میں آپ کو ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جو رنگ آمیزی سے پاک ہو، ریاضی کا معمولی سا طالب علم بھی کہہ سکتا ہے، کہ کم از کم پانچ سال تو ۷۱ سال کے عرصہ میں سے تفریق کر دینے چاہئے تھے، اس لئے کہ ایام رضاعت اور ایام طفولیت کے پانچ سال اس قسم کے تجربات و مشاہدات کے لئے بنیاد نہیں بن سکتے۔ بہرحال اس غلطی کے باوجود برق صاحب کے اس مفہوم میں کوئی غلطی نہیں، کہ ان کو ایسے لوگ نہیں مل سکے جو مبالغہ آمیزی سے مبرا ہوں؟ اگر ریاضی کی اس غلطی کے باوجود ان کا منشا صحیح ہے تو یہی بات تو حدیث میں بھی ہوتی ہے، کہ باوجود اس کے کہ بعض راوی بعض غلطیاں کر جاتے ہیں، لیکن منشا میں کوئی غلطی نہیں کرتے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل منشا کو کما حقہ اور بالکل صحیح ادا کر دیتے ہیں، آپ معمولی سے جزئی غیر اہم اختلاف کو مبالغہ سے اتنا عظیم بنا دیتے ہیں، کہ ناواقف یہ سمجھ بیٹھتا ہے، کہ جب اتنا اختلاف ہے، تو اس کا اعتبار ہی کیا۔

غلط فہمی "حضور کا زمانہ تھا خود سرور کائنات بقید حیات تھے، کہ حضرت زبیر رضی سے ان کے بیٹے عبد اللہ نے پوچھا کہ آپ روایت احادیث سے کیوں اجتناب کیا کرتے ہیں، فرمایا اللہ کی قسم!

احادیث میں اختلاف ہو گیا ہے میں نے حضور کی زبان مبارک سے یہ حدیث ان الفاظ میں سنی تھی

من کذب علی فلیتبوا مقعدہ من النار ــــ جو شخص کوئی غلط قول میری طرف منسوب کرے گا جہنم میں جائے گا

لیکن لوگوں نے اس میں "متعمدًا" کا لفظ (من کذب علی متعمدًا) بڑھا لیا ہے" (دو اسلام صفحہ ۱۲۳)

ازالہ برق صاحب آپ کی عقل میں یہ بات کیسے آ گئی، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور احادیث میں اختلاف ہو جائے، اختلاف دور کرنے والی ہستی موجود ہو، اور نہ وہ اختلاف کو دور کرے، نہ لوگ اس کی طرف رجوع کریں، اور اختلاف کو دفع کریں، آپ نے تو بڑی عجیب و غریب بات کہی ہے برق صاحب! آپ کی وارد کردہ روایت بالکل بے سند ہے ٹھہریے ذرا انگلی تھیکی سے خالص اسلام ۱۶۳ عبد اللہ بن زبیر نے یہ سوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد کیا تھا نہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں، روایت کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیے عبد اللہ بن زبیر کہتے ہیں :-

مالی لا سمعتک تحدث عن رسول	کیا بات ہے کہ میں آپ سے اس طرح حدیث نہیں
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما اسمع	سنتا جس طرح ابن مسعود اور فلاں فلاں شخص سے
ابن مسعود وفلانا وفلانا قال اما	سنتا ہوں یہ حضرت زبیر نے فرمایا کہ میں کبھی آپ

انی لم افارقہ منذ اسلمت ولکنی	سے الگ نہیں رہا جب سے میں نے اسلام قبول
سمعت کلمۃ یقول من کذب علی	کیا لیکن ایک کلمہ میں نے آپ سے سنا ہے کہ
متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار	جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے اس کو اپنا
(ابن ماجہ)	ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرنا چاہیے۔

یعنی حضرت زبیر اس خوف سے احادیث بیان نہیں کرتے تھے، کہ کوئی غلطی نہ ہو جائے، اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ "متعمدا" کا لفظ حضرت زبیر رضؓ کی حدیث میں موجود ہے، حضرت زبیر رضؓ کے علاوہ اس لفظ کو روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد دو سو تک بتائی گئی ہے، صرف کتب صحاح میں یہ لفظ چودہ صحابہ کی روایت میں موجود ہے (خالص اسلام ص۱۶۲) پس ثابت ہوا کہ برقی صاحب کی نقل کردہ روایت بالکل باطل ہے۔

غلط فہمی "اسی طرح جب حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کے سامنے حضرت ابوہریرہ کی کتے والی حدیث بیان کی گئی جس کا خلاصہ یہ تھا، کہ مویشیوں کی رکھوالی اور کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا پالنا جائز ہے، تو ابن عمر رضؓ نے فرمایا کیوں نہ ہو، ابوہریرہ کھیتوں کا مالک جو ٹھہرا، چونکہ حضرت ابوہریرہ رضؓ نے کھیت کے لئے کتا پال رکھا تھا اس لئے بقول ابن عمر رضؓ آپ نے ایک حدیث تراش کر کتا پالنے کا جواز نکال لیا تھا (ص۱۲۳-۱۲۴)

ازالہ بات صرف اتنی ہے، کہ عبداللہ بن عمر رضؓ کو کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا پالنے کی حدیث معلوم نہ تھی، حضرت ابوہریرہ کو معلوم تھی، اور انہوں نے بیان کی، تو ابن عمر رضؓ نے کہا یہ حدیث انہیں معلوم ہونی ہی چاہیے، کیونکہ وہ کھیتی کرتے ہیں، اور کتا پالتے ہیں، اگر انہیں معلوم نہ ہوتی، تو وہ ایسا کیوں کرتے نہ ابن عمر رضؓ کا اس میں کوئی طنز ہے، نہ ابوہریرہ کی تکذیب، بلکہ ظاہر یہ کرتا تھا، کہ کوئی تعجب نہیں، اگر انہیں یہ حدیث یاد ہے، اور مجھے یاد نہیں، اس لئے کہ وہ اس کے ضرورتمند ہیں، اور میں نہیں، برقی صاحب کا ابن عمر رضؓ پر یہ بہتان ہے، کہ انہوں نے یہ خیال کیا، کہ ابوہریرہ نے حدیث تراش لی، حاشا وکلا، بلکہ اس کلمہ کو انہوں نے بھی یاد کر لیا، اور اس کی روایت کی۔

عن ابی الحکم سمعت ابن عمر یحدث	ابوالحکم کہتے ہیں میں نے ابن عمرؓ سے سنا کہ انہوں
عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال	نے آپؐ سے یہ روایت کیا کہ آپؐ نے فرمایا جس
من اتخذ کلبا الا کلب زرع او غنم	نے کتا پالا سوائے کھیتی یا بکری یا شکار کے کتے
او صید ینقص من اجرہ کل یوم	کے تو اس کے اجر میں ہر روز ایک قیراط
قیراط (صحیح مسلم۔ کتاب البیوع)	کم ہو جاتا ہے۔

گویا ابن عمرؓ نے تو ابو ہریرہ کو سچا سمجھا، اور برقی صاحب غلط فہمی سے کچھ اور سمجھ رہے ہیں، پھر یہ روایت دیگر صحابہ سے بھی مروی ہے، اور اس میں ابو ہریرہ رضہ کا انفراد نہیں، الغرض دونوں صحابی اس بہتان عظیم سے بری ہیں، برقی صاحب! اگر صحابہ کرام احادیث گھڑتے تھے، بدترین قسم کے کذاب و وضاع تھے تو پھر کیوں نہ کہہ دیا جائے، کہ ان لوگوں نے قرآن میں بھی کوئی تحریف کی ہوگی، کیونکہ صحیفہ عثمانی و صدیقی کی ترتیب میں نعوذ باللہ ان کذابین کی جماعت شامل تھی، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا فرقہ موجودہ قرآن کو محرف مانتا ہے (تفصیل کے لئے باب پنجم ملاحظہ ہو)

غلط فہمی "زمانہ گذرتا گیا، اللہ سے ڈرنے والے اور ذات رسول سے عشق رکھنے والے ختم ہوتے گئے، اور بعد میں آ گئے ایسے مسلمان جو کعبہ کو گرانے آل رسول کو ذبح کرنے، اور حرم نبوی کے معصوم بچوں کو گرم ریگستان میں تڑپا تڑپا کر ہلاک کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے، کیا ان حضرات کے لئے احادیث میں رد و بدل کوئی بڑی بات تھی" (دو اسلام صفحہ ۱۲۴)

ازالہ برقی صاحب بقول آپ کے صحابہ کرام تک احادیث میں تحریف کیا کرتے تھے، تو پھر بعد والوں پر تحریف احادیث کے سلسلہ میں تعجب کی بات ہی کونسی ہے" ایں خانہ ہمہ آفتاب ست"

جب قرآن کے مخاطبین اولین ہی احادیث میں ردوبدل کر دیا کرتے ہوں، تو پھر بعد والے جتنا بھی کریں کم ہے، گویا جن صحابہ کرام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معتمد اور محبوب سمجھتے ہوں، قرآن جن کی تعریف کرتا ہو، وہ گویا سب کے سب الا ماشاء اللہ منافق تھے، اس سے تو اس فرقہ کی تائید ہوتی ہے، جو کہا کرتا ہے، کہ صرف تین صحابی رہا اس سے کچھ زاید) مسلمان تھے، باقی سب منافق، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

برقی صاحب جن واقعات کی طرف آپ نے اپنی مذکورہ بالا عبارت میں اشارہ فرمایا ہے، ان میں سے اکثر بناوٹی ہیں لیکن معلوم نہیں آپ نے بے تحقیق بے سند باتوں پر کیسے یقین کر لیا، محدثین کی معیاری اور باسند باتیں تو آپ کو تسلیم نہیں، اور مورخین کی بے سند اور جھوٹی باتوں پر آپ یقین کر لیتے ہیں، تعجب ہے، اگر ہم ان واقعات کو صحیح بھی مان لیں، تو ہم آپ سے پوچھتے ہیں، کہ کیا محدثین کی جماعت تھی، جو یہ کام کرتی تھی، کیا آل رسول کو محدثین نے ذبح کیا تھا؟ کیا قاتلان حسین رض راویان حدیث تھے، جو محدثین کو احادیث املا کراتے تھے؟ آخر کیا بات ہے، خدارا انصاف کیجئے، محدثین کی جماعت ہمیشہ ان فتنوں سے علیحدہ رہی، وہ یکسوئی کے ساتھ صرف احادیث کی خدمت کرتے رہے، ان کی زندگی بے داغ اور اسلامی زندگی کا شاندار نمونہ تھی، محدثین کرام تو ان لوگوں کا اعتبار ہی نہیں کرتے تھے، جو ان واقعات میں شریک ہوتے تھے۔

غلط فہمی

"ہمارے بعض بزرگ کہتے ہیں، کہ احادیث کو چھوڑ دو گے، تو نماز پڑھنے کا طریقہ کہاں سے سیکھو گے اور زکوٰۃ کی مقدار کہاں سے معین کرو گے؟

جواب:۔ اس سوال کے تین جواب ہیں، اول:۔ اگر ہم احادیث کے مطابق نماز پڑھنا شروع کر دیں تو ہر مسجد کی نماز دوسری سے مختلف ہو جائے گی" (دو اسلام ص۱۲۴)

ازالہ

برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ اب تمام مسجدوں میں نماز کی ایک ہی صورت ہے، اگر حدیث کے مطابق پڑھیں گے، تو مختلف ہو جائے گی، یہ تو بڑی عجیب و غریب بات ہے، کیونکہ معاملہ بالکل برعکس ہے، یعنی آج کل نماز کی ہیئت میں اختلاف ہے، اور اس کی وجہ تقلیدی فرقہ بندی اور احادیث کی طرف سے غفلت ہے، اگر سب مل کر صحیح احادیث کے مطابق نماز پڑھنے لگ جائیں، تو یہ اختلاف مٹ جائے گا، جو آج کل مسجدوں میں پایا جاتا ہے، کہ کوئی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتا ہے، اور کوئی ہاتھ باندھ کر، کوئی سینہ پر ہاتھ باندھتا ہے، اور کوئی ناف سے نیچے، کوئی بلند آواز سے آمین کہتا ہے، اور کوئی بلند آواز سے چڑتا ہے کوئی رفع یدین کو نماز کی زینت سمجھتا ہے، اور کوئی اس کو سرکش گھوڑوں کے دموں سے تشبیہ دیتا ہے، وغیرہ وغیرہ،

غلط فہمی

"دوم۔ رسول اکرم صلعم کو لاکھوں مسلمانوں نے نماز پڑھتے دیکھا، انہیں کروڑوں نے، اور یہ سلسلہ ہم تک پہنچ گیا، کیا ان ارب کھرب انسانوں کی شہادت کافی نہیں؟ کیا دیہاتی مسلمان صحیح بخاری سے نماز کا طریقہ سیکھا کرتے ہیں، جس طریقہ سے ہمارے آباء و اجداد نماز ادا کرتے رہے، ہم نے وہ سلسلہ جاری رکھا، اور اب ہماری نقل[ع] آ رہی ہے، یہاں صحیح بخاری کی ضرورت ہی کہاں پیش آتی ہے کشمیر کی ساری وادی میں غالباً صحیح بخاری کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہوگا، لیکن پھر بھی وہ نہایت صحت سے نماز پڑھتے ہیں" (دو اسلام ص۱۲۵)

ازالہ

یہ جواب خود برق صاحب کے خلاف ہے، یعنی حدیث کی کتابت، حدیث کی حفاظت کے لئے لازمی شے نہیں، بلکہ حدیث پر جو عمل تواتر سے ہر زمانہ میں ہوتا رہا، یہی اس کی اصل حفاظت ہے، اور یہ ایسی حفاظت ہے، کہ تقریباً پورا قرآن اس حفاظت میں احادیث کی برابری نہیں کرتا، برق صاحب کی اس عبارت سے یہ بھی ثابت ہوا، کہ صحیح بخاری ہو یا نہ ہو، احادیث عملاً محفوظ ہیں اور جس طرح آج تواتر کی وجہ سے محفوظ ہیں، صحیح بخاری کی تالیف سے پہلے بھی تواتر کی وجہ سے اسی طرح محفوظ تھیں، لہٰذا یہ اعتراض کہ صحیح بخاری کی تالیف سے پہلے ڈھائی سو سال گذر چکے تھے، اس طویل زمانہ میں حفاظت حدیث کا کوئی انتظام نہ تھا، اور یہ کہ تمام احادیث غیر محفوظ تھیں اس لئے ناقابل

[ع] اصل کتاب میں عبارت اسی طرح ہے۔ غالباً عبارت یہ ہے اور اب ہماری اولاد ہماری نقل

اعتماد ہیں، خود بخود کالعدم ہو جاتا ہے، اور یہ ماننا پڑتا ہے، کہ صحیح بخاری کی تالیف کے وقت بھی احادیث عملی تواتر کی وجہ سے محفوظ تھیں، امام بخاری نے ان ہی محفوظ احادیث کو روایتاً اور سنداً بھی محفوظ کر لیا، اور حقیقت تو یہ ہے، کہ امام بخاری پہلے آدمی نہیں ہیں جنہوں نے احادیث کو لکھ کر محفوظ کر لیا بلکہ ہر دور میں یہ کام تواتر سے ہوتا رہا، اور احادیث مدونہ بھی تواتر کے ساتھ نقل ہوتی رہیں الا ماشاء اللہ

سوال برق صاحب مالکی اور شیعہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں، اور باقی فرقے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں، مالکیوں اور شیعوں نے یہ طریقہ سلسلہ بہ سلسلہ اربوں، کھربوں انسانوں کے عملی تواتر سے اخذ کیا، اسی طرح باقی فرقوں نے بھی اپنا طریقہ عملی تواتر سے حاصل کیا، تو اب بتائیے، کونسا عملی تواتر صحیح ہے، اور اگر ان میں سے ایک صحیح ہے، دوسرا غلط، تو کیا پھر تواتر کی اہمیت کچھ باقی رہ جائے گی؟ حالانکہ آپ نے اپنے اعتماد کی ساری عمارت تواتر کی بنیاد پر ہی کھڑی کی ہے، اگر آپ فرمائیں، کہ دونوں تواتر صحیح ہیں، تو پھر کیا آپ بتا سکتے ہیں، کہ کبھی دوسرے تواتر پر بھی آپ نے عمل کیا، اگر نہیں کیا تو کیوں؟ کیا ایک طریقہ کو اختیار کرنا اور دوسرے کو مطلقاً چھوڑ دینا مناسب ہے؟

برق صاحب! پھر ان متواتر اعمال میں بعض ایسے بھی ہیں، جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، مثلاً ایک ہی چیز ایک فرقہ کے ہاں حرام ہے، دوسرے کے ہاں حلال، ایک ہی چیز ایک فرقہ کے ہاں پاک ہے دوسرے کے ہاں ناپاک، ایک فرقہ کے نزدیک زیور پر زکوٰۃ فرض ہے، دوسرے کے ہاں نہیں، تو اب بتائیے کیا دونوں تواتر صحیح ہیں، حلال بھی عملاً تواتر سے ثابت ہے، اور حرام بھی عملی تواتر سے ثابت ہے، اور یہ دونوں صحیح، یہ کس قدر مضحکہ خیز ہے، اس مضحکہ خیز اختلاف کو دور کرنے کا ایک طریقہ ہے، اور وہ یہ ہے، کہ ان احادیث کو دیکھا جائے، جو روایۃً محفوظ اور منضبط ہیں، آخر وہ کس کی تائید کرتی ہیں بس جس کی وہ تائید کریں، وہی صحیح ہے، اور دوسرا غلط ہے، یہ ہے وہ مقام جہاں کتب حدیث کی ضرورت ہے، اور ان کے بغیر چارہ نہیں، دوسری بات یہ بھی ثابت ہوئی، کہ عملی تواتر کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں، مثلاً تعزیہ پرست تعزیہ کو عملی تواتر کا درجہ دیتے ہیں، وہ جب جواب دیتے ہیں یہی جواب دیتے ہیں، کہ ہمارے آباء و اجداد سے ایسا ہوتا آیا ہے، لہٰذا ہم تو یہی کریں گے، خواہ آپ ان کے سامنے قرآن کی آیات تلاوت کریں یا احادیث سنائیں، ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا، اور اگر ہوگا، تو اس صورت میں ہوگا، کہ وہ اپنے عملی تواتر کو مسترد کر دیں۔

برق صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں، کہ وادی کشمیر میں صحیح بخاری کا کوئی نسخہ موجود نہیں، بریح صحیح بخاری کیا وہاں کے کتب خانوں میں صحاح ستہ تک محفوظ ہیں، اور نہ صرف کتب خانوں میں، بلکہ بہت سے

علماء کے پاس یہ کتابیں موجود ہیں۔

پھر یہ خیال بھی صحیح نہیں، کہ کشمیری نہایت صحت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، نہایت صحت تو کجا سو میں سے ایک بھی بمشکل صحیح نماز پڑھ سکتا ہے، جہالت، تقلیدی بندشوں اور تغافل کا دور دورہ ہے کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ کا نقشہ نظر آتا ہے

غلط فہمی "سوم۔ قرآن ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے، جس طرح ہم کسی تفسیر، تاریخ یا تصوف کی کتاب کو یہ منصب عطا نہیں کر سکتے، کہ وہ اسلام میں کسی نئے حکم یا اصول کا اضافہ کرے، اسی طرح ہم حدیث کو بھی یہ رتبہ نہیں دے سکتے، انسانی اقوال کی بے اندازہ آمیزش کی وجہ سے اس کی حیثیت انسانی تصنیف کی ہو چکی ہے جس طرح بعض باقی انسانی تصانیف کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآنی آیات و احکام کی تشریح بیان کریں، اسی طرح محدثین کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا" (دو اسلام ص۱۲۵)

ازالہ برقی صاحب کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے، کہ انسانی اقوال کی آمیزش کی وجہ سے حدیث کی حیثیت ایک انسانی تصنیف کی سی ہو گئی ہے، لہٰذا ایسی حدیث اسلام میں کسی نئے اصول یا حکم کا اضافہ نہیں کر سکتی، برقی صاحب! ہمیں آپ سے سو فیصدی اتفاق ہے لیکن مطلب اس کا ظاہر ہے، کہ اگر انسانی اقوال کی آمیزش نہ ہو، تو پھر حدیث انسانی تصنیف نہ ہوگی، اور یہی ہماری مراد ہے، اور یہی برقی صاحب کا منشاء ہے، جب یہ بات تسلیم ہو چکی، کہ خالص حدیث انسانی تصنیف نہیں، تو پھر حدیث کا حجت شرعیہ ہونا بھی ظاہر ہے، کیونکہ اس سے اسلام میں کسی نئے حکم یا اصول کا اضافہ برقی صاحب کے نزدیک بھی جائز ہے۔

برقی صاحب محدثین کو قرآن کی شرح کا حق دے رہے ہیں، لیکن ہم یہ کہتے ہیں، کہ یہ بھی قطعاً غلط ہے، نہ محدثین خود کو شارح قرآن سمجھتے ہیں، نہ لوگوں ہی نے انہیں شارح قرآن سمجھا، محدثین تو صرف صحیح خالص حدیث کو قرآن کا شارح سمجھتے ہیں، اور اسی شرح کو ہم تک پہنچاتے ہیں لہٰذا اس شرح کو (عذر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) ہر حال میں قبول کرنا ہوگا، یا پھر یہ کہدیا جائے، کہ ہماری شرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح سے زیادہ صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہے نعوذ باللہ

یہ بات بھی صحیح نہیں، کہ احادیث میں انسانی اقوال کی بے اندازہ آمیزش ہے، محدثین نے تخلیصِ حدیث کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا، متعدد فنون اور اصولِ حدیث اس پر شاہد ہیں

برقی صاحب کا یہ فرمانا، کہ اگر محدثین کوئی ایسی شرح پیش کریں، جو قرآن سے متصادم نہیں ہوتی

اور تواتر عمل کے بھی خلاف نہیں ہے، تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے، ظاہر ہے کہ برق صاحب کی مراد اس سے محدثین کی اپنی شرح ہے، نہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح، کیونکہ اس کو تو ہر حال میں قبول کرنا ہوگا، ہاں محدثین کی اپنی شرح اس وقت قبول کی جائے گی، جب وہ قرآن کے یا تواتر عمل کے خلاف نہ ہو، اور یہ تواتر عمل حدیث ہی تو ہے، اس کو آپ حدیث کا نام کیوں نہیں دیتے، برق صاحب کی عبارت اس طرح ہونی چاہیئے تھی یعنی "اگر محدثین اپنی طرف سے قرآن کی شرح کریں، اور وہ شرح قرآن اور حدیث کے خلاف نہ ہو، تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں عذر ہی کیا ہو سکتا ہے" اور اس طرح ہمارا اور برق صاحب کا اتفاق ہو جائے گا،

برق صاحب تواتر عملی کو حجت تسلیم کر رہے ہیں یعنی دوسرے معنوں میں حدیث کو حجت مان رہے ہیں، بشرطیکہ اس کا صحیح ہونا یقینی ہو، نماز کا طریقہ تواتر عملی یعنی یقینی احادیث ہی سے معلوم ہوتا ہے، ورنہ قرآن اس معاملہ میں خاموش ہے، اور صرف نماز ہی کا کیا ذکر ہے، قرآن بہت سی باتوں کے متعلق خاموش ہے اور بعض آیتیں اگر ان کو حدیث کی روشنی میں نہ دیکھا جائے، تو بالکل مہمل نظر آتی ہیں، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں۔ "قرآن ہر لحاظ سے ایک مکمل کتاب ہے" یہ ایک خوشنما جملہ تو ضرور ہے، لیکن حقیقت کچھ بھی نہیں، نہ نماز کا طریقہ اس میں ہے، نہ کسی اور عمل کا، اور پھر بھی وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے! یہ عجیب بات ہے

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"باقی رہا زکوٰۃ کا مسئلہ، تو اسے خود قرآن نے بھی واضح کر دیا ہے، زکوٰۃ ہے کیا چیز؟ اللہ کے راستہ میں مالی قربانی" (دو اسلام ص ۱۲۶)

ازالہ قرآن میں کسی جگہ بھی زکوٰۃ کی تشریح نہیں دی گئی، برق صاحب کو اعتراف ہے، کہ زکوٰۃ کے معنی پاکیزگی کے ہیں (دو اسلام ص ۱۲۶) تو پھر اس کے معنی مالی قربانی کرنا نہ قرآن سے ثابت ہے نہ لغت سے، قرآن میں جہاں کہیں مالی قربانی کا ذکر ہے، یہ کہنا کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے، زبردستی ہے، کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی مالی قربانی کے ہیں، نہ کہ زکوٰۃ کے

غلط فہمی "ہمارے فقہاء کہتے ہیں، کہ ادائے زکوٰۃ کے لئے ایک وقت (ماہ رجب) ۔ ۔ ۔ ۔ معین ہے" (دو اسلام ص ۱۲۶)

ازالہ یہ قطعاً غلط ہے، ماہ رجب ادائے زکوٰۃ کے لئے مقرر نہیں، برق صاحب نے حوالہ نقل نہیں کیا،

غلط فہمی "مال سپاری کا بھی کوئی خاص وقت نہیں، جب بھی ملت پہ ابتلا کا وقت آیا، مسلمان نے سب کچھ خدا اور رسول کی خدمت میں پیش کر دیا" (دو اسلام ص ۱۲۶)

ازالہ برق صاحب! تاریخ سے تو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، کہ ہر مسلمان نے ہر ابتلاء کے وقت یا کسی خاص ابتلا کے وقت اپنا سارا مال اللہ اور اس کے رسول کی خدمت میں پیش کر دیا ہو، تاریخ میں تو یہ ملتا ہے، کہ جس شخص نے جتنا چاہا دیا، کسی پر زبردستی نہیں کی گئی، برخلاف اس کے جن لوگوں نے مقررہ شرح سے مقررہ میعاد میں زکوٰۃ دینے سے انکار کیا، ان سے زکوٰۃ جبراً وصول کی گئی، برق صاحب کا مقصد یہ ہے، کہ اسلامی حکمران ہر وقت ہر ضرورت کے وقت مسلمانوں سے چندہ کی درخواست کرتا رہے، بند باندھنا ہو، تو چندہ مانگے، پل بنانا ہو، تو چندہ مانگے، سرائے بنانی ہو، تو چندہ مانگے، کسی اندھے کا وظیفہ مقرر کرنا ہو، تو چندہ مانگے، اس کے پاس سالانہ مستقل آمدنی کی مد کوئی نہ ہو، کہ وہ ان کاموں کے لئے اس مد میں سے صرف کر سکے، گویا اسلامی حکومت کی سالانہ آمدنی کی کوئی مد نہ ہو، نہ سالانہ اخراجات کا کوئی بجٹ۔

غلط فہمی "اگر میری بات پر یقین نہ آئے، تو لیجئے اللہ کا فیصلہ: خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ[1] "مسلمانوں سے صدقے لے کر انہیں مطہر اور مزکی (پاک) بنا دو۔ تزکی کا ماخذ زکوٰۃ ہے، تو گویا اللہ کے ہاں ہر قسم کی مالی قربانی زکوٰۃ شمار ہوتی ہے" (دو اسلام ص ۱۲۶-۱۲۷)

ازالہ "تطہر" کا ماخذ طہارت ہے، تو کیا اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر قسم کی مالی قربانی "طہارت" شمار ہو گی اور جہاں کہیں بھی قرآن میں لفظ طہارت یا اس سے مشتق کوئی لفظ آئے گا، تو اس کے معنی مالی قربانی کے ہو گئے؟ ہرگز نہیں، لہٰذا زکوٰۃ کے معنی ہر مالی قربانی قرآن سے ثابت نہیں۔

برق صاحب آپ کا کہنا تو یہ ہے، کہ سب مال راہ خدا میں دے دو، لیکن آپ کی وارد کردہ آیت میں "من اموال" ہے، جس کے معنی یہ ہوئے، کہ اموال میں سے کچھ لو نہ کہ سب، گویا سارا مال دے دینا فرض نہیں ہے۔

غلط فہمی "کیا اہل سرمایہ کو ان تمام آرائش اور زائد از ضرورت املاک پر قابض ہونے کا حق حاصل ہے قرآن کہتا ہے، ہرگز نہیں سنو اللہ کا ازلی اور اٹل فیصلہ: يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ "اے رسول لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ مالی قربانی کی حد کیا ہے، انہیں کہہ دو کہ ہر فالتو اور زائد از ضرورت چیز خدا اور رسول کے سامنے پیش کر دو" (دو اسلام ص ۱۲۸)

ازالہ برق صاحب نے آیت مذکورہ کا ترجمہ صحیح نہیں کیا، صحیح ترجمہ یہ ہے:- اے رسول لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا صرف کیا کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ فاضل مال صرف کیا کرو"۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مسلمان اس مال کو جو ضروری اخراجات کے بعد بچ جائے اللہ کے راستہ میں

[1] برق صاحب نے اسی طرح نقل کیا ہے صحیح یہ ہے "تطہرھم وتزکیھم بہا"

بقدر ضرورت خرچ کرنا ہے۔ خواہ مقررہ وقت میں مقررہ شرح سے یا ہنگامی حالات میں غیر مقررہ شرح سے غرض یہ کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے وہ زائد از ضرورت مال میں سے دیا جائے۔ نہ یہ کہ بھوکا اور ننگا رہ کر سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا (بنی اسرائیل) — نہ ہاتھ کو بالکل روک ہی دو اور نہ بالکل کھول ہی دو۔ کہ بعد میں تم ملامت زدہ اور نادم ہو کر بیٹھ رہو۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ ضروریات زندگی کے لئے جس مال کی ضرورت ہے۔ وہ خرچ نہ کیا جائے اللہ تعالیٰ کا یہ منشا نہیں کہ انسان خود محتاج ہو کر بیٹھ جائے اور سب کچھ دیدے نہ اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہے کہ بس جو بچ گیا وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کر دو۔ کچھ بھی اپنے پاس مت رکھو۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر نہ ترکہ ہوتا نہ وارثوں میں تقسیم ہوتا۔ حالانکہ قرآن نے اس تقسیم کو فرض کیا۔ اسی طرح نہ دولت مند ہوتے نہ فقراء حالانکہ قرآن کہتا ہے۔ کہ فقراء کو صدقہ دیا کرو۔

برق صاحب نے آیت مذکورہ کو زکوٰۃ کی تشریح میں پیش فرمایا گویا ان کے نزدیک زکوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ ہر فاضل اور زائد از ضرورت چیز اللہ اور رسول کے سامنے پیش کر دینا لیکن برق صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ کب پیش کی جائے۔ اس سے پہلے وہ فرما چکے ہیں:۔

"کہ زکوٰۃ کا کوئی خاص وقت معین نہیں" (دو اسلام ص ۱۴۷)

دوسری جگہ برق صاحب فرماتے ہیں:۔

"جس طرح جان سپاری کا کوئی وقت معین نہیں جس وقت جنگ کا بگل بجا۔ مسلمان سر بکف حاضر۔ اسی طرح مال سپاری کا بھی کوئی خاص وقت معین نہیں جب بھی ملت پر ابتلاء کا وقت آیا مسلمان نے سب کچھ خدا اور رسول کی خدمت میں پیش کر دیا" (دو اسلام ص ۱۲۶)

برق صاحب کی ان عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ زائد از ضرورت مال صرف ہنگامی حالات میں پیش کر دینا "زکوٰۃ ہے" اس سلسلہ میں ہم عرض کرتے ہیں کہ ہنگامی حالات کا مقابلہ تو اس مالی امداد سے کر لیا جائے گا۔ لیکن روزمرہ کے سرکاری اخراجات کی کیا سبیل ہے۔ امن کی حالت میں فوج کے اخراجات اور اسلحہ کی فراہمی کا کیا ذریعہ ہے؟ دوسرے سرکاری اور رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا کیا حکومت کا نہ کوئی سالانہ میزانیہ ہوگا نہ سالانہ تخمینہ اخراجات؟ کیا کوئی حکومت اس طرح چل سکتی ہے جو سالانہ اخراجات کے لئے آمدنی کا ایک اچھا ذریعہ ہونا لازمی ہے۔ اور اس کا نام زکوٰۃ ہے جو سالانہ

وصول کی جاتی ہے، اور یہ چیز صرف حدیث سے ثابت ہے، قرآن اس سے یکسر خاموش ہے، ورنہ براہ کرم وہ آیت پیش کیجیے، جس میں یہ ہو، کہ "زکوٰۃ زائد از ضرورت مال کو خرچ کر دینے کا نام ہے" پھر یہ بھی ثابت کیجیے، کہ عام اور غیر ہنگامی حالات میں بھی سرمایہ دار طبقہ سے سرکاری اخراجات کے لئے کچھ لیا جائے، یا نہیں؟ برق صاحب زکوٰۃ اگر زائد از ضرورت مال کے صرف کر دینے کا نام ہے، تو پھر یہ بتلایئے کہ ضرورت کا معیار کیا ہوگا؟ ہر ایک کا انفرادی معیار ہوگا، یا حکومت ایک خاص معیار مقرر کرے گی؟ اگر انفرادی معیار ہوگا، تو اس میں بڑی دقتیں پیش آئیں گی، زکوٰۃ دینے والوں اور وصول کرنے والوں کے درمیان ایک مسلسل اختلاف رونما ہوگا، اگر حکومت نے اس کا کوئی خاص معیار مقرر کر دیا، تو یہ فطرت کے تقاضہ کے خلاف ہوگا، اور اسلام فطری قانون کے خلاف تعلیم نہیں دیتا، پھر فطرۃً زیادہ کمانے کی خواہش مفقود ہو جائے گی، اور کچھ عرصہ میں حکومت کا خزانہ بھی خالی ہو جائے گا، اگر آپ روس کے اشتراکی نظام کی مثال پیش کریں، تو وہ مثال یہاں صادق نہیں آئے گی، اس لئے کہ روس میں ہر چیز حکومت کی ہوتی ہے، اور حکومت کے قبضہ میں رہتی ہے، وہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کہ ضروریات زندگی کے لئے کچھ مال رکھ کر باقی سب حکومت کے حوالہ کر دو، نہ وہاں یہ ہوتا ہے، کہ صرف ہنگامی حالات میں رعایا سے مال طلب کیا جاتا ہے، وہاں رعایا کے پاس ہوتا ہی کچھ نہیں، کہ وہ اس میں سے چندہ دیں، ترکہ وارثوں میں تقسیم کریں، اقرباء اور فقراء کو دیتے رہیں، برخلاف اس کے قرآن انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، رعایا سے مانگتا ہے، ترکہ کو تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے، اقرباء اور مساکین کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے، لہٰذا روس کے اخراجات اس لئے چلتے رہتے ہیں، کہ حکومت نے ہر چیز پر قبضہ کر رکھا ہے، اور اسلامی حکومت کے اخراجات اس لئے نہیں چل سکیں گے، کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہوگا، جو کچھ ہوگا، وہ رعایا کی ملکیت ہوگی، اور رعایا سے حکومت صرف ہنگامی حالات کے لئے ہی مانگ سکتی ہے، نہ کہ غیر ہنگامی حالات میں، برق صاحب براہ کرم سوچیں کہ یہ گتھی کس طرح سلجھے گی۔

برق صاحب ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں، کہ ہنگامی حالات میں حکومت کے سامنے سب کچھ پیش کر دو، اور دوسری طرف یہ فرماتے ہیں، کہ غیر ہنگامی حالات میں بھی سرمایہ داروں کو اپنے پاس مال رکھنا زیادہ کمانا، عیش و راحت کی زندگی گذارنا قطعاً ناجائز ہے، ان کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:۔

"اس دنیا میں بعض صدی افراد کو عظیم الشان محلوں، موٹروں، باغوں اور پارکوں میں عیش اڑانے کا کیا حق حاصل ہے، انھوں نے سرمایہ کے بل بوتے پر غریبوں سے کیوں زمینیں چھینیں، ان کی کمائی پر کیوں ناجائز قبضہ کیا!۔۔۔ کیا اہل سرمایہ کو ان تمام آرائشی اور زائد از ضرورت املاک پر قابض رہنے

کا حق حاصل ہے؛ قرآن کہتا ہے، ہرگز نہیں سنو اللہ کا ازلی اور اٹل فیصلہ ..... (رد اسلام ص ۱۲۷-۱۲۸)

(اس کے بعد برق صاحب نے وہی آیت پیش کی ہے، جو غلط فہمی کے عنوان کے اوپر درج کی جاچکی ہے)

اب بتلایئے، بے چارہ سرمایہ دار، اہل ایمان جائز طریقہ سے مال کمانے والا طبقہ کس طرح اپنی جائز آمدنی سے فائدہ اٹھانے سے روکا جارہا ہے؟ آخر کیوں، کہیں تو برق صاحب فرماتے ہیں، کہ ہنگامی حالات میں سب کچھ دے دو، اور یہاں یہ فرمایا، کہ ہر حالت میں کچھ رکھو ہی نہیں، تو فقراء کو کیا دیا جائے، اقرباء کو کیا دیا جائے، وارثوں میں کیا تقسیم کیا جائے گا، جب کہ سب کچھ بچتے ہی حکومت کے حوالہ کیا جاچکا، اصل بات یہ ہے، کہ برق صاحب سے اللہ تعالیٰ کا منشا سمجھنے ہی میں غلطی ہوگئی، انہوں نے ایک آیت کو سامنے رکھا، اور پھر غلط فہمی سے کچھ کا کچھ نتیجہ نکال لیا، اللہ تعالیٰ کا ہرگز یہ منشا نہیں، کہ تمام دنیا کے انسان ایک حالت میں زندگی گذاریں، اور معیشت کے لحاظ سے فرق مراتب مفقود ہو جائے، کاش برق صاحب مندرجہ ذیل آیت کو بھی سامنے رکھ لیتے، تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ	کیا یہ لوگ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں
قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ	حالانکہ دنیاوی زندگی میں ان کی معیشت کو
الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ	ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیا ہے۔ اور بعض کو بعض
دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا	پر درجات کی بلندی عطا فرمائی ہے تاکہ ایک دوسرے
سُخْرِيًّا (الزخرف)	کو اپنا خادم و محکوم بنا سکے۔

اس آیت سے یہ بات ثابت ہوگئی، کہ سرمایہ دار طبقہ کو اپنی جائز آمدنی سے جائز عیش و راحت سے زندگی گذارنے کا حق حاصل ہے، اور اس آمدنی کے وسیلہ سے اپنے لئے خادم و ملازم رکھنے کا حق حاصل ہے، ان کی یہ سربلندی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اسی نے یہ فرق مراتب قائم کر رکھا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کا نظام نہیں چل سکتا، رہا غرباء، غلام اور ملازمین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی ضروریات کا لحاظ تو وہ علیحدہ مسئلہ ہے، دونوں کا علیحدہ علیحدہ محل ہے، بے شک غرباء کی حسب ضرورت امداد ان پر فرض ہے، لیکن سارا فاضل مال حکومت کے حوالہ کر دینا، ان پر فرض نہیں، برق صاحب نے دونوں کو گڈمڈ کر دیا، اور اس وجہ سے مغالطہ پیدا ہوگیا۔

غلط فہمی

"ہاں تو ہم عرض کر رہے تھے، کہ اقوال رسول اڑھائی سو برس تک کروڑوں زبانوں پر گھومتے رہے، کہیں مجبوراً اضافے ہوئے، اور کہیں عمداً، کہیں حافظہ سے اتر گئے، اور کہیں انسانی اقوال حضور کی طرف منسوب ہوگئے، بہ اصل اقوال رسول کی تعداد پانچ سات ہزار سے زیادہ"

نہیں ہوگی۔ لیکن جب امام بخاری کا زمانہ آیا، تو ان کی تعداد چودہ لاکھ سے متجاوز ہو چکی تھی (دو اسلام منا۱۳)

ازالہ اس کا جواب کئی مرتبہ گذر چکا ہے، لیکن کیونکہ برق صاحب اسے بار بار دہرا رہے ہیں، تو ہم بھی پھر عرض کرتے ہیں، کہ یہ بالکل غلط ہے، کہ اقوال رسول ڈھائی سو برس تک صرف کروڑوں زبانوں پر گھومتے رہے، نہیں بلکہ سینوں اور سفینوں میں محفوظ رہے، کیا امام مالک کی مؤطا، امام شافعی کی کتاب الام، امام عبدالرزاق کی مصنف، امام احمد کی مسند وغیرہ وغیرہ ڈھائی سو سال بعد کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، نہیں ہرگز نہیں، بلکہ عہد رسالت سے لے کر امام بخاری کے عہد تک تدوین حدیث کی ایک مسلسل تاریخ ہے، ہر زمانہ میں کتابیں لکھی جاتی رہیں، پہلی صدی کی تمام تصنیفات دوسری صدی کی تصنیفات میں سمو دی گئیں، اور ان دوسری صدی کی تصنیفات سے منتخب کردہ اسناد کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کر دیا، پھر امام بخاری کی یہ تصنیف بھی ڈھائی سو سال بعد کی تصنیف نہیں ہے امام بخاری کا انتقال ۲۵۶ھ میں ہوا، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ۲۴۶ سال بعد لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے، کہ صحیح بخاری دو سو پچاس سال بعد تصنیف ہوئی ہو، امام بخاری کی زندگی میں یہ کتاب ان سے لاکھوں طلبار نے نقل کی، اور اس کام کے لئے کم از کم مدت اگر ہم ۴۰ سال فرض کر لیں، تو صحیح بخاری کی تصنیف کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ۲۴۶ - ۴۰ = ۲۰۶ سال بعد قرار پاتا ہے۔ ۲۰۶ کو ۲۵۰ بنا دینا تحقیق کے یکسر منافی ہے۔

برق صاحب یہ بالکل صحیح ہے، کہ اقوال رسول کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے اور یہی حقیقت بھی ہے، صحیح احادیث کی تعداد ہزاروں ہی میں تھی، یہ چودہ لاکھ جو برق صاحب نے نقل کی ہیں، یہ احادیث کی تعداد نہیں ہے، بلکہ ان چند ہزار صحیح احادیث کی اسناد ہیں، اور ہر سند کو ایک حدیث کا نام دے دیا گیا ہے، یہ ہے غلط فہمی کی اصل وجہ۔

برق صاحب فرماتے ہیں، کہ ڈھائی سو سال تک اقوال رسول کروڑوں زبانوں پر گھومتے رہے اگر یہ صحیح ہے، تو پھر احادیث کے متواتر ہونے میں کیا شبہ رہا، اور متواتر کی صحت میں شبہ نہیں ہوتا لہٰذا امام بخاری نے اگر ان متواتر غیر مشتبہ صحیح احادیث کو جمع کر دیا، تو اعتراض کیا ہے، گویا برق صاحب کی اپنی عبارت سے احادیث متواتر ہونے کی وجہ سے محفوظ تھیں، اور انہیں محفوظ احادیث کو ضبط تحریر میں لا کر قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا، فللہ الحمد

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"قرآن کا اسلام بڑا مشکل اسلام ہے، یہاں جان و مال کی قربانی کرنا پڑتی ہے" (دو اسلام منا۱۳)

ازالہ میں کہتا ہوں، کہ قرآن کا اسلام تو "بڑا آسان اسلام" ہے مشکل تو اس کو ان "قیود" نے بنا دیا ہے جو احادیث میں مذکور ہیں، ورنہ

(۱) دعا مانگ لو، صلوٰۃ ادا ہو گئی (۲) پاکیزگی اختیار کرلو، زکوٰۃ ادا ہو گئی

(۳) صلوٰۃ میں ریاح خارج ہو جائے، وضو سلامت رہے (۴) ناچ ورنگ کی محفلیں قائم کرو، کوئی ممانعت نہیں

(۵) فنون لطیفہ سے دلچسپی لو، کوئی حرج نہیں (۶) تاش و شطرنج سے لطف اٹھاؤ کوئی مضائقہ نہیں

(۷) قحبہ خانہ کھولو کوئی ممانعت نہیں، ہاں کسی عورت کو زبردستی قحبہ خانہ میں مت بٹھاؤ، وغیرہ "آسان اسلام"!

رہا جان ومال کی قربانی کا مسئلہ تو یہ احادیث میں بھی موجود ہے "شمشیر کے سایہ میں جنت" کا جو محاورہ برق صاحب نے منہ ۱۳۰ پر استعمال کیا ہے، وہ حدیث ہی سے ماخوذ ہے۔

غلط فہمی برق صاحب نے صفحہ ۱۲۱ سے ۱۶۱ تک کچھ گھڑی ہوئی احادیث قلم بند فرمائی ہیں، اور ان احادیث کے گھڑنے کا الزام ملا پر لگایا ہے۔

ازالہ برق صاحب نے تمہید ہی میں "ملا" کی تعریف کر دی ہے، اور ہم نے بھی اس اصطلاحی تعریف کو تسلیم کر لیا ہے (ملاحظہ ہو تمہید کتاب ہذا) اس تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اتفاق کرتے ہیں، کہ بے شک یہ احادیث ملا نے گھڑی ہیں فلعنۃ اللہ علی الکاذبین لیکن یہ بتلایئے کس عالم نے انہیں تسلیم کیا، محدثین نے ہمیشہ ان کو جھوٹی سمجھا اور موضوعات کی کتابوں میں ان کو جمع کر کے ہمیشہ کے لئے امت مسلمہ کو خبردار کر دیا، برق صاحب نے انہیں کتب موضوعات سے ان موضوع احادیث کو نقل فرمایا، تو بتلایئے اس میں قصور کس کا ہے؟ ملا کا یا ائمہ حدیث کا؟ جس ملا کو آپ ملزم ٹھہرا رہے ہیں، صدیوں پہلے ائمہ حدیث نے اس کو ملزم ٹھہرایا تھا، آپ نے انہیں کے قول کو دہرا دیا ہے، ورنہ بس۔

انتباہ ائمہ حدیث کا عقیدہ ہے، کہ "قرآن غیر مخلوق ہے" اس سلسلہ میں انہیں بڑے بڑے مصائب میں مبتلا ہونا پڑا لیکن اس عقیدہ سے باز نہیں آئے، ان کی تائید میں کسی ملا نے حدیثیں بھی گھڑ دیں کہ "قرآن غیر مخلوق ہے"۔ (ان احادیث کو برق صاحب نے بھی منہ ۱۴۳ پر نقل فرمایا ہے) لیکن قربان جایئے محدثین کی دیانتداری کے کہ اپنی تائید میں احادیث انہیں ملتی ہیں، تو بجائے خوش ہونے کے ان کو آنکھوں سے لگانے کے، اس پر آشوب زمانے میں اعلان کرتے ہیں، کہ یہ احادیث گھڑی ہوئی ہیں حالانکہ اگر وہ چاہتے، تو بطور ہتھیار کے ان احادیث کو استعمال کر سکتے تھے، اور بادشاہ وقت کے سامنے پیش کر کے بحث و ابتلا کا خاتمہ کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، صحیح احادیث میں گھڑی ہوئی احادیث کی آمیزش اس نازک زمانے میں بھی نہیں ہونے دی، تو کیا یہ بات قرین قیاس ہے،

کہ حالات امن و امان میں انہوں نے اس آمیزش کو قبول کر لیا ہوگا، نہیں ہرگز نہیں، یہ صحیح احادیث کا دامن تحریف سے بالکل پاک ہے، یہی نہیں بلکہ محدثین نے ان تمام احادیث کو جن میں ان کی اپنی فضیلت تھی اور جن کو برق صاحب نے صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۰ پر نقل کیا ہے، جھوٹی قرار دیا

اشتباہ

"حلوا" کے عنوان کے ماتحت برق صاحب نے چند احادیث نقل فرمائی ہیں بے شک وہ سب احادیث جھوٹی ہیں، سوائے مندرجہ ذیل حدیث کے

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب الحلواء والعسل — حضرت محمد اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میٹھی چیز اور شہد پسند تھا۔

معلوم نہیں برق صاحب کو اس حدیث میں کیا قباحت نظر آئی کہ گھڑی ہوئی احادیث کے ساتھ اسے شامل کر دیا، اور پھر مزہ یہ کہ جہاں گھڑی ہوئی احادیث کے متعلق وہ ائمہ حدیث کی تصریح نقل کرتے ہیں کہ فلاں فلاں حدیث گھڑی ہوئی ہے اس حدیث کے متعلق ایسی کوئی تصریح بھی نقل نہیں فرمائی، اور نقل فرماتے بھی کیسے اس لئے کہ یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

غلط فہمی

"سوال:۔ بعض حضرت کہتے ہیں، کہ تم صحیح و غلط کی الجھن میں کیوں پڑتے ہو، جو حدیث قرآن کے مطابق ہو، وہ لے لو، اور باقی سب کو مسترد کر دو"

جواب اس سوال کے کئی جواب ہیں۔ اول، جو حدیث قرآن کے مخالف ہے، وہ ہر طبقہ کے ہاں مردود ہے، اور جو قرآن کے موافق ہے، اس کی ضرورت ہی نہیں، اس لئے کہ قرآن کافی ہے" (دو اسلام صفحہ ۱۵)

ازالہ

ایسی کوئی حدیث نہیں، جو صحیح ہو، اور قرآن کے خلاف ہو، لیکن یہ بات مسلمہ ہے، کہ جو شخص اپنی رائے سے قرآن کے ایسے معنی کرے، جو صحیح حدیث کے مخالف ہوں، تو ایسے معنی مردود ہوں گے نہ کہ حدیث، مثلاً ایک صاحب نے "صلوٰۃ" کے معنی پریڈ کئے ہیں، اور دوسرے نے "نظام ربوبیت" یہ دونوں معنی صحیح حدیث کے خلاف ہیں، لہٰذا مردود ہیں۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھئے، کہ قرآن کے مخالف ہونا، اور بات ہے، اور قرآن کی شارح ہونا اور بات ہے، یہ تو کسی حد تک صحیح ہے، کہ موافق کی ضرورت نہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں، کہ تشریح و توضیح کی بھی ضرورت نہیں، تشریح کی بے شک ضرورت ہے، اور بغیر تشریح کے قرآن پر عمل نہیں ہو سکتا، مثلاً قرآن میں ہے:۔

(۱) وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ — اور جہاں کہیں تو جا رہا ہو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیرے اور جہاں کہیں تم جا رہے ہو اپنا منہ

فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (البقرۃ) مسجد حرام کی طرف پھیرلو!

کیا قرآن میں کہیں تشریح ہے، کہ یہ مسجد حرام کی طرف منہ کس وقت کیا جائے، قرآن سے تو یہ ثابت ہوتا ہے، کہ چلتے پھرتے اور بحالت سکون و اقامت غرض کہ ہر حالت میں منہ قبلہ کی طرف رہنا چاہیئے کیا اس گتھی کو قرآن سے سلجھایا جاسکتا ہے؟ ایک حدیث میں ہے، کہ پیشاب پاخانہ کرنے وقت منہ قبلہ کی طرف مت کرو، تو کیا یہ حدیث قرآن کے مخالف ہے؟ کیونکہ قرآن سے تو ہر حالت میں قبلہ کی طرف منہ کرنا لازمی ثابت ہوتا ہے، لہٰذا اس حدیث کا مخالف قرآن ہونا ظاہر ہے، اگرچہ حقیقۃً ایسا نہیں، محض ظاہر بینی سے اس قسم کی غلط فہمیاں ہو جایا کرتی ہیں۔

(۲) فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (البقرۃ) تم جس طرف منہ کرو اس طرف ہی اللہ کا منہ ہے۔

پہلی آیت سے قبلہ کی طرف منہ کرنا لازمی ہوا، اور اس آیت نے اس فرضیت کو ساقط کر دیا، کیا قرآن سے آپ بتا سکتے ہیں، کہ ان دونوں پر عمل کرنے کی کیا صورت ہے؟ بلکہ قرآن تو اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتا ہے، کہ:۔

(۳) لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ .... (البقرۃ) مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنا یہ کوئی نیکی نہیں بلکہ نیکی تو یہ ہے خداوند تعالےٰ پر ایمان لائے ...... وغیرہ وغیرہ۔

اب ان تینوں آیات کا مطلب کوئی کیا سمجھے، جب تک معلم کتاب و حکمت نہ سمجھائے صلی اللہ علیہ وسلم،

(۴) وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا (البقرۃ) جو مرد تم میں سے مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو ان بیویوں کو عدت میں بیٹھنا چاہیئے چار مہینے اور دس

کیا آپ قرآن سے بتا سکتے ہیں، کہ یہ دس کیا ہیں؟ سال یا مہینے، ہفتے یا دن؟ گھڑیاں یا گھنٹے؟ بس یہی وہ چیزیں ہیں، جن کی وضاحت کے لئے حدیث کی ضرورت ہے، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ ہو۔

غلط فہمی:۔ دوم۔ آپ کی اس تجویز کی بنیاد ایک وضعی حدیث پر ہے" (دو اسلام ص۱۵۸)

ازالہ نہ ہماری یہ تجویز ہے، اور نہ ہم وضعی حدیث پر کسی تجویز کی بنیاد رکھ سکتے ہیں، ہمارے ہاں تو ایسی کسی صحیح حدیث کا وجود ہی نہیں، جو قرآن کے مخالف ہونے کی وجہ سے مسترد کر دی گئی ہو، جو حدیثیں قرآن کے مخالف ظاہر ہوئیں، وہ صحت کے درجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی رد ثابت ہوئیں ہماری تجویز تو یہ ہے، کہ قرآن کے معنی وہ کرو، جو صحیح حدیث میں ہوں، نہ کہ اپنی رائے سے ایسے معنی گھڑ لو جو

صحیح حدیث کے خلاف ہوں، صحیح حدیث تو قرآن کے معنی کو متعین کرتی ہے، اگر یہ نہ ہو تو قرآن مجید "ستد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا" کا مصداق بن جائے گا

غلط فہمی

مطلب یہ کہ اگر کوئی رتن سنگھ یہ کہہ دے کہ دو اور دو چار بنتے ہیں، اور اسے رسول کی طرف منسوب کر دے، تو قبول کر لو، اس لئے کہ یہ قول خلاف حقیقت نہیں، بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ یہ تجویز بری نہیں لیکن اس راہ میں بھی بڑی مشکلات ہیں، اس لئے کہ بعض ایسی احادیث بھی جو تعلیم قرآن کے عین مطابق اور حدیث کی اہم کتابوں میں شامل ہیں محققین کے ہاں جعلی ہیں (دو اسلام ۱۵۹)

ازالہ

برق صاحب محدثین یہ نہیں دیکھتے، کہ جو بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے وہ حقیقتہً صحیح ہے یا غلط، بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں، کہ وہ بات حقیقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح منسوب ہے یا نہیں، کیا وہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوئے ہیں یا نہیں یہاں سائنس یا ریاضی کے مسائل اصول کی تالیف مقصود نہیں ہوتی، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال، آپ کا طور و طریق، طرز گفتگو، طرز ادا، اسوہ حیات مقصود ہوتا ہے، اگر کوئی شخص یہ حدیث گھڑ دے، کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے" تو یہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا، کہ فی الواقع یہ بات صحیح ہے یا غلط، بلکہ یہ دیکھا جائے گا، کہ فی الواقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے یا نہیں؟ پانی کے آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہونے سے یہ بات لازم نہیں آئیگی کہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی فرمایا تھا، کیا آپ اس بات کو قبول کر لیں گے، کہ یہ جملہ "دو اور دو چار ہوتے ہیں" قرآن کے متن میں شامل کر دیا جائے، کیونکہ یہ خلاف حقیقت نہیں، لہذا اسے قرآن کی حیثیت سے قبول کرنے میں کیا امر مانع ہے؟ بقول آپ کے یہ تجویز بری نہیں، تو پھر قرآن کے لئے بھی اس کو گوارا ہونا چاہیئے، رہا یہ کہ بعض احادیث تعلیم قرآن کے عین مطابق ہیں، لیکن پھر بھی جعلی ہیں تو مکرر عرض ہے، کہ کسی حدیث کے مضمون کے صحیح ہونے سے یہ کب لازم آتا ہے، کہ فی الواقع وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی حدیث ہے، اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے، تو پھر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، ریاضی وغیرہ علوم و فنون کے تمام مسلمات و حقائق حدیث ہیں، اس لئے کہ وہ صحیح ہیں، برق صاحب جہاں حدیث کو تحریف سے بچانا مقصود تھا، یہ بھی مقصود رہا کہ صحیح اور ثابت مضمون کے لئے بھی وہی لفظ محفوظ کئے جائیں، جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے آپ نے جو احادیث صفحہ ۱۵۹-۱۶۰ پر نقل فرمائی ہیں، اگرچہ مضمون کے لحاظ سے صحیح سہی لیکن الفاظ کے لحاظ سے صحیح نہیں، اس لئے کہ یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا نہیں ہوئے، یہاں

ایک بات اور بھی ثابت ہوئی، کہ محدثین نے صرف مفہوم کی حفاظت نہیں کی بلکہ الفاظ حدیث کی بھی حفاظت کی، اور اسی وجہ سے ان الفاظ سے وارد شدہ احادیث کو گھڑی ہوئی قرار دیا، محدثین کا یہ کارنامہ ہمارے لئے باعث صد افتخار ہے، اور اس پر ہم نازاں ہیں فللہ الحمد، یہاں ایک بات اور واضح کر دوں کہ برق صاحب نے مذکورہ بالا صفحات پر جو جعلی حدیثیں نقل فرمائی ہیں، وہ ان الفاظ سے حدیث کی کسی اہم کتاب میں شامل نہیں ہیں۔

غلط فہمی برق صاحب لکھتے ہیں:-

"حدیث طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ..... کو ابن راہویہ، سخاوی، ابو علی نیشاپوری اور بیہقی نے موضوع قرار دیا ہے" (دو اسلام صفحہ ۱۶۰)

ازالہ برق صاحب نے تذکرۃ الموضوعات کا حوالہ دیا ہے، اور اس کتاب سے نقل کرنے میں ان سے غلطی ہوئی ہے، ان چاروں اماموں میں سے کسی نے بھی اسے موضوع نہیں کہا، امام سخاوی کے الفاظ یہ ہیں

روی عن انس بطرق کلھا معلولۃ واھیۃ — یعنی یہ روایت حضرت انس رضی اللہ تعالے عنہ سے بہت سی سندوں سے مروی ہے جن میں سے ہر ایک معلول اور کمزور ہے

مطلب یہ کہ کوئی سند درجہ صحت کو نہیں پہنچتی، امام احمد فرماتے ہیں:-

لا یثبت فی ھذا الباب شئی و کذا قال ابن راھویہ وابو علی النیسابوری — اس باب میں کوئی سند ثابت نہیں" اور یہی ابن راہویہ اور ابو علی نیشاپوری کا قول ہے۔

یعنی ان تینوں میں سے کسی نے اس کو موضوع قرار نہیں دیا، نہ اس کے واضع کا نام بتایا، صرف اتنا بتایا کہ ہر سند میں کوئی نہ کوئی ضعف ہے، کوئی سند بطریق محدثین ثابت نہیں ہوتی، اب رہ جاتی ہے محدثین کی ایک اصطلاح وہ ہے "حسن لغیرہ" یعنی جب سندیں زیادہ ہوں، راوی کذاب نہ ہوں، تو پھر محض حافظہ کی وجہ سے جو شبہ ہے، وہ زائل ہو جائے گا، اور سند کے لحاظ سے نہیں، بلکہ قرائن کے لحاظ سے وہ حدیث ثابت ہو جائے گی، یہی وجہ ہے کہ کسی محدث نے اسے موضوع نہیں کہا، برق صاحب نے امام بیہقی کی طرف جو اس کا موضوع قرار دینا منسوب کیا ہے، وہ بھی صحیح نہیں، امام بیہقی فرماتے ہیں:-

متن مشھور واسنادہ ضعیف و ابو عاتکۃ من رجال الترمذی لم یجرح بکذب ولا تھمۃ وقد وجدت لہ متابعا عن انس ونصفہ الثانی — یعنی یہ متن مشہور ہے اسناد اس کا ضعیف ہے ابو عاتکہ ترمذی کے رجال میں سے ہیں کسی نے اس پر اس قسم کی جرح نہیں کی کہ وہ جھوٹ بولتا ہے نہ کسی نے اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی پھر اس کے کئی متابع ہیں

لابن ماجه وله طرق كثيرة عن انس يصل مجموعها مرتبة الحسن (تذكرة الموضوعات ص ۱۷-۱۸)

جو اس کو حضرت انس سے روایت کرتے ہیں اور آخری حصہ (یعنی طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم) ابن ماجہ میں موجود ہے اور حضرت انس سے کثیر تعداد میں اس کے طرق ہیں جن کا مجموعہ حسن تک پہنچتا ہے

یہ ہے، امام بیہقی کا بیان: انہوں نے کہاں کہا، کہ یہ موضوع ہے؟

غلط فہمی "ائمہ فن کی تصانیف میں اس طرح کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ حدیث کا مضمون درست، تعلیم قرآن کے عین مطابق، اور پھر بھی غلط، اب فرمایئے احادیث کو جانچنے کے لئے پیمانہ کہاں سے لائیں" (ص ۱۶۱)

ازالہ اس کے متعلق اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ مضمون صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ فی الواقع وہ قول رسول ہے۔ اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے۔ کہ محدثین کرام نے معانی کے ساتھ الفاظ کی بھی حفاظت کی۔ لہٰذا اب یہ کہنا کہ پیمانہ کہاں سے لائیں کس قدر عجیب ہے۔ ہر وہ بات جو فی الحقیقت صحیح ہو قول رسول ہونی چاہیئے" کیا یہ بھی کوئی پیمانہ ہے؟ عمدہ عمدہ اقوال گھڑ دو اور کہہ دو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ آپ اس جھوٹ کو جائز سمجھتے ہیں لیکن محدثین نے اس کے بھی پرخچے اڑا کر رکھ دیئے ہیں اور کسی بات کو بھی خواہ وہ کتنی عمدہ کیوں نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی اجازت نہیں دی اور محض اجازت ہی نہیں دی بلکہ اس کو کذاب کہہ کر پھر اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں کیا۔ اس طرح متن حدیث کو بالکل خالص طریقہ سے محفوظ رکھا۔ اگر عمدہ عمدہ اقوال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی اجازت دے دی جاتی یا اس سلسلہ میں ذرا سی بھی مداہنت برتی جاتی تو پھر وہ کونسی بدعت حسنہ ہے جس کی پشت پر سنت کی سند نہ ہوتی کونسی عمدہ رسم ہے جو دین میں داخل کر کے جزو دین نہ بنا دی گئی ہوتی۔ ان بدعات کا وہ کوہ گراں ہمارے سر پر ہوتا کہ۔ الاماں والحفیظ! اس کے نیچے دبے ہوئے اصل دین کا معلوم کر لینا قطعاً ناممکن ہوتا۔ یہ محدثین ہی کا کارنامہ ہے۔ کہ اصلی دین محفوظ ہے اور بعد والوں کی آمیزش اور اضافہ سے اس کو پاک کر دیا گیا ہے۔

برق صاحب! پیمانہ کا سوال کرنا آپ جیسے آدمی کیطرف سے عجیب معلوم ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ سے کہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے۔ تو کیا آپ اس کو تسلیم کریں گے یا نہیں؟ اگر تسلیم نہیں کریں گے تو پھر تین صورتیں ہوں گی۔

اول آپ یہ کہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا فرمایا تو ہے لیکن ہم نہیں مانتے اس لئے کہ قرآن میں پانچ وقت کی تصریح نہیں اور ہم کو صرف قرآن پر ایمان لانے کا حکم ملا ہے نہ کہ حدیث پر

اب بتائیے کہ ایسا کہنے کے بعد ایمان بالرسول باقی رہے گا اور اگر باقی رہے گا تو سوال پیدا ہوگا کیا وہ شخص جو اللہ تعالیٰ پر افترا کرتا ہے رسول بھی ہو سکتا ہے۔ اور کیا اس کی لائی ہوئی کتاب صحیح ہو سکتی ہے اگر وہ ایک جھوٹ بات کو اللہ کی طرف منسوب کر سکتا ہے تو کیا یہ شبہ نہیں کہ اس نے یہ بھی جھوٹ بولا ہو کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اور اگر باوجود جھوٹ بولنے کے اللہ پر افترا کرتے کے قرآن اللہ ہی کی کتاب ہے تو پھر یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پہنچانے کے لئے آدمی بھی وہ منتخب کیا جو جھوٹ بولتا ہے اللہ پر افترا کرتا ہے۔ کیا حدیث کا انکار تکذیب رسول اور تکذیب قرآن نہیں ہے؟

دوم آپ یہ کہیں" اے ابوبکر! آپ جھوٹ بولتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہرگز نہیں فرمایا اور آپ قرآن سے زائد کچھ فرما ہی نہیں سکتے" کیا اس صورت میں یہ لازم نہیں آئے گا۔ کہ آپ ایک صادق کو کاذب سمجھ رہے ہیں اور محض اپنے مفروضہ عقیدہ کی خاطر ایک صادق القول کی بات کو تسلیم نہیں کرتے، اگر یہ بات ہٹ دھرمی نہیں تو ہٹ دھرمی پھر کس کا نام ہے؟

سوم میں سمجھتا ہوں مذکورہ بالا دونوں باتیں آپ نہیں کہیں گے اب رہ جاتی ہے تیسری صورت اور وہ یہ کہ آپ کہیں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا ہوگا بلکہ آپ کا مطلب کچھ اور تھا اے ابوبکر آپ کو غلط فہمی ہو گئی۔ ویسے ہم آپ کو جھوٹا تو نہیں کہتے لیکن بہر حال آپ انسان ہیں اور انسان سے غلطی غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے لہذا ہم اس شبہ کی بنا پر آپ کی بیان کردہ بات کو حدیث رسول تسلیم نہیں کرتے" اس صورت میں نہیں آپ کے متعلق یہ گمان ہوگا کہ یا تو آپ ضرورت سے زیادہ وہمی ہیں یا علم و فن میں "ہم چنیں دیگرے نیست" کا مصداق ہیں۔ کہ کسی کی بات مانتے ہی نہیں خواہ وہ غلط سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن آپ اسے اس لئے تسلیم نہیں کریں گے کہ آپ کی سمجھ و عقل کے خلاف ہے۔ اور کیونکہ وہ آپ کی عقل و فہم کے خلاف ہے لہذا بیان کرنے والا ضرور غلط سمجھا ہے میں سمجھتا ہوں یہ تیسری بات بھی آپ علم و فہم، حفظ و اتقان۔ صدق و دیانت والے لوگوں کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ صادق حافظ۔ ضابط۔ علیم فہیم شخص کی بات کو تسلیم کرنے میں آپ کو کوئی عذر نہیں ہوگا خصوصاً ایسی صورت میں کہ ایسے بیان کرنے والوں کی تعداد ہر طبقہ میں دو دو، تین تین، چار چار بلکہ دس دس، بیس بیس اور اس سے بھی زیادہ ہو۔

خلاصہ لہذا اب حدیث کو پرکھنے کا معیار خود بخود نکل آیا کہ جو حدیث بھی صادق۔ حافظ۔ ضابط، علیم و فہیم شخص یا اشخاص کے ذریعہ ہم تک پہنچے وہ صحیح ہوگی خواہ ہماری نگاہ میں وہ قرآن سے ٹکرائے یا ہماری عقل سے ٹکرائے۔ ہم اپنی عقل اور فہم قرآن کو قصور وار ٹھہر سکتے ہیں نہ کہ صادق القول۔ حافظ ضابط اشخاص کو۔

باب ـ ۷

"موطا پر ایک نظر"

غلط فہمی اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ امام مالک کا کردار تقدس اور خلوص تمام شبہات سے والا تر تھا۔ اور کہ انہوں نے صحیح کو غلط سے جدا کرنے کے لئے تمام انسانی ذرائع استعمال کئے ہوں گے۔ لیکن پونے دو سو برس کا عرصہ گذر چکا تھا۔ احادیث بڑھتے بڑھتے اور بگڑتے بگڑتے کیا سے کیا بن چکی تھی اس ذخیرے میں سے قول رسول تلاش کرنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا" (دو اسلام صد ۱۶۲)

ازالہ امام مالکؒ کی ولادت ۹۳ھ میں ہوئی اور یہی سنہ پیدائش برق صاحب نے بھی ۱۶۲ پر نقل فرمایا ہے گویا امام مالکؒ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے صرف ۸۳ سال بعد پیدا ہوئے تقریباً سترہ سال کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ گویا موطا کی تصنیف کے وقت صرف سو سال گذرے تھے۔ نہ کہ پونے دو سو برس۔

برق صاحب کا فرمانا کہ "احادیث بڑھتے بڑھتے اور بگڑتے بگڑتے کیا سے کیا بن چکی تھیں" کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ امام مالکؒ اور صحابی کے درمیان انکی اکثر روایتوں میں صرف ایک ہی راوی ہوتا ہے مثلاً عبداللہ بن عمر کی روایتوں میں صرف امام نافعؒ ہوتے ہیں حضرت نافعؒ کے متعلق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب مولوی فاضل۔ ایم اے۔ ایل ایل۔ بی۔ پی ایچ۔ ڈی (جرمنی) ڈی لٹ (فرانس) پروفیسر اسلامک اسٹڈیز پیرس یونیورسٹی لکھتے ہیں "طبقات ابن سعد میں سلیمان بن موسیٰ کی روایت ہے کہ ابن عمر کے مولیٰ یعنی نافع کو دیکھا کہ ابن عمرؓ اسے املاء کرا رہے تھے اور نافع لکھتے جا رہے تھے"۔ نافع ایک بہت بڑے عالم اور حضرت ابن عمرؓ کے سب سے قابل شاگرد تھے۔ اور اپنے آقا ابن عمرؓ کی صحبت میں پورے تیس سال گذار چکے تھے۔ ناگزیر انہوں نے اپنے استاد کے سارے معلومات حاصل کر لئے ہوں گے حضرت ابن عمرؓ فخر سے فرمایا کرتے تھے کہ نافع کا وجود ہم پر اللہ کا ایک بڑا احسان ہے" (پیش لفظ صحیفہ ہمام صد ۴۰) حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنی تمام مرویات امام نافع کو لکھوا دیں اور ان سے امام مالک نے نقل کر لیں لہٰذا ان روایات کو بگڑنے کا کونسا موقع ملا۔ یہی حال دوسری مرویات کا بھی ہے مثلاً امام مالک کے دوسرے بہت بڑے استاد امام محمد بن مسلم زہری ہیں ان کی پیدائش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے انتقال کے ۵۰ سال بعد ہوئی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں "خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے فرمان کی تعمیل

میں حضرت ابوبکر بن حزم کے شاگرد ابن شہاب زہری نے حدیثوں کے جمع کرنے کا کام شروع کیا ....
عمر بن عبدالعزیز کا یہ حکم صرف مدینہ اور مدینہ کے گورنر کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا، بلکہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تمام صوبوں کے گورنروں کے نام اسی قسم کا فرمان بھیجا تھا ..... احادیث اور سنن کے دفاتر مرتب ہو کر دارالخلافہ دمشق آئے۔ اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ان کی نقلیں ممالک اسلامیہ کے گوشہ گوشہ میں بھیجیں؛ دیکھیں لفظ صحیفہ ہمام صـ ۳۲)

الغرض امام زہری اور دیگر تابعین ائمہ حدیث نے حدیث کو صحابہ کرام سے براہ راست حاصل کیا، اور یہی وہ محفوظ و مکتوب سرمایہ حدیث تھا، جو امام مالک کو ملا، اور اس سرمایہ کو امام مالک کے شاگردان عظام سے امام بخاری نے نقل فرمایا، لہٰذا بڑھنے اور گھٹنے کا سوال صرف وہم ہی وہم ہے، اور بس۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہم موطا کی تعظیم ضرور کرتے ہیں، لیکن وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے، کہ اس کے مندرجات واقعی اقوال رسول ہیں، اور خصوصاً ان حالات میں اس کی بعض روایات محل نظر ہیں، مثلاً موطا میں درج ہے کہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے وضو ضروری ہے، اور اذا قمتم الی الصلوٰۃ کی تفسیر ای من المضاجع یعنی المنوم دی ہوئی ہے، لیکن صحیح بخاری (کتاب الوضوء) میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے یہ حدیث دی ہوئی ہے، کہ رسول اللہ رات کو جاگے صلوٰۃ تہجد ادا کی .... پھر بستر پر دراز ہو گئے، پھر سو گئے، یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی، اس کے بعد نماز کے لئے بلانے والا آیا، آپ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیئے، اور وضو کئے بغیر نماز پڑھ لی" (دو اسلام صـ ۱۶۲ و صـ ۱۶۳)

ازالہ موطا کی جو روایت برق صاحب نے نقل کی ہے، وہ حدیث نہیں ہے، بلکہ حضرت زید بن اسلم تابعی کا قول ہے، لہٰذا قول تابعی اور حدیث رسول کو تعارض کی مثال میں پیش کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ اس سے موطا پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے، کسی شخص کا قول خواہ وہ صحیح ہو یا غلط نقل کر دینا کتاب کے لئے موجب نقص نہیں ہوتا، ہاں یہ واضح رہے، کہ زید بن اسلم کا قول غلط نہیں ہے، اور نہ وہ صحیح بخاری کی حدیث کے متعارض ہے، محض سونا ناقض وضو نہیں، ہاں ریاح کے خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور چونکہ بستر پر لیٹ کر سونے سے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں، اور ریاح خارج ہونے کا قوی احتمال ہوتا ہے لہٰذا جب سو کر اٹھے، تو وضو کرنا چاہیئے، یہ ہے زید بن اسلم کے قول کا مطلب، اور یہ مندرجہ ذیل حدیث

کے بالکل مطابق ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

(۱) العین وکاء السہ فمن نام فلیتوضا (ابوداؤد)
آنکھ دبر کا بندھن ہے، پس جو سو جائے، وہ وضو کرے۔

(۲) لیس علی من نام ساجداً وضوء حتی یضطجع فانہ اذا اضطجع استرخت مفاصلہ (احمد)
جو سجدہ میں سو جائے۔ اس پر وضو لازم نہیں جب تک لیٹ کر نہ سوئے، کیونکہ جب لیٹ کر سوئیگا تو جوڑ ڈھیلے ہو جائیں گے

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ مخصوص تھا، آپ کی آنکھیں سوتی تھیں دل نہیں سوتا تھا، فرشتوں کا یہ منقولہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے

ان العین نائمۃ والقلب یقظان (صحیح بخاری)
یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ سوتی ہے دل جاگتا رہتا ہے۔

مطلب یہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیند میں اتنے غافل نہیں ہوتے تھے، کہ آپ کو خبر ہی نہ ہو، کہ ریاح خارج ہوا ہے یا نہیں، پس اس یقین کی بنا پر آپ سو کر اٹھنے تو بغیر تازہ وضو کئے نماز پڑھ لیتے تھے، لہٰذا زید بن اسلم کے قول میں اور صحیح بخاری کی حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، اگر برق صاحب تحقیق کر لیتے، تو یہ الجھن پیدا نہ ہوتی، خود امام مالک نے اپنی موطا میں مندرجہ ذیل حدیث نقل کر کے اس الجھن کو دور کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

قالت عائشۃ فقلت یارسول اللہ أتنام قبل ان توتر فقال یاعائشۃ ان عینیّ تنامان ولاینام قلبی (موطا ص ۴۲)
حضرت عائشہ کہتی ہیں میں نے کہا، اے اللہ کے رسول آپ وتر پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں آپ نے فرمایا اے عائشہ بیشک میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں، لیکن میرا دل نہیں سوتا۔

غلط فہمی "چند اور احادیث ملاحظہ ہوں:۔

من قبل امرأتہ اوجسہا بیدہ فعلیہ الوضوء (موطا ص ۳۲)
جو شخص اپنی بیوی کو چوم لے، یا صرف چھولے، تو اس پر وضو لازم ہو جاتا ہے۔

لیکن اسی صفحہ پر یہ حدیث بھی موجود ہے:۔

عن عائشۃ رضہ ان النبی قبل بعض نسائہ ثم خرج الی الصلوۃ ولم
حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے اپنی ازواج میں سے کسی کے بوسے لئے، اور پھر

بتوضا   وضو کئے بغیر نماز ادا فرمالی۔

حضور کا حکم وہ، اور عمل یہ۔ کس کی اقتدا کریں" (دو اسلام ص ۔)

ازالہ مؤطا کی جس روایت کو برق صاحب حدیث سمجھ رہے ہیں، وہ حدیث نہیں ہے، بلکہ ایک صحابی کا قول ہے، برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی کہ اسے حدیث سمجھ لیا، لہٰذا برق صاحب کا یہ سوال صحیح نہیں، کہ "حضور کا حکم وہ، عمل یہ، کس کی اقتدا کریں" حدیث صرف دوسری ہے، اور اسی پر عمل کرنا چاہیئے۔

غلط فہمی "صحیح مسلم (جلد اول مع فتح الملہم طبع مجتبائی ص۴۸۵) میں درج ہے۔ . . . . ابی بن کعب رض کہتے ہیں ہیں نے رسول اللہ صلعم سے ایک ایسے شخص کے متعلق فتویٰ پوچھا کہ جو اپنی بیوی کے پاس بغرض مجامعت گیا، کام شروع کیا لیکن انزال سے پہلے ہی اس کی شہوت ختم ہوگئی، فرمایا، وہ تمام نجاستوں کو دھولے، اور پھر وضو کر کے نماز پڑھ لے . . . . . . اسی مسئلہ پر اب مؤطا کا فیصلہ سنیئے . . . . .

عبد الرحمٰن بن عوف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ کس صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے کہا جب آلہ تناسل کا سر عورت کی شرمگاہ کے ابتدائی حصہ میں داخل ہو جائے، تو غسل واجب ہو جاتا ہے" (دو اسلام ص۱۴۴)

ازالہ جن احادیث کا ترجمہ برق صاحب نے نقل کیا ہے ان احادیث کا متن بہت ہی مخفی، اور حیادار الفاظ کا مجموعہ ہے، معلوم نہیں برق صاحب نے اتنا عریاں ترجمہ کیوں کیا؟ خیر۔ برق صاحب نے صحیح مسلم اور مؤطا میں تضاد سمجھا، ان کے خیال میں صحیح مسلم سے ثابت ہوتا ہے، کہ ایسی حالت میں غسل واجب نہیں، اور مؤطا سے ثابت ہوتا ہے، کہ غسل فرض ہے، چونکہ برق صاحب نے اس باب میں مؤطا پر اعتراض کئے ہیں، اور اس کی بعض احادیث کو محل نظر سمجھا ہے، لہٰذا ہمارا گمان ہے کہ برق صاحب کے خیال میں ایسی حالت میں غسل واجب نہیں، بلکہ ان کی بیان کردہ صحیح مسلم کی حدیث پر عمل ہونا چاہیئے، حقیقت یہ ہے، کہ برق صاحب کو یہاں بھی غلط فہمی ہوگئی، حالانکہ جو کچھ مؤطا میں ہے وہی صحیح مسلم میں بھی موجود ہے، امام مسلم کی اپنی صحیح میں پہلے یہ باب . . . ہے :-

باب انما الماء من الماء   یعنی غسل انزال کی صورت میں فرض ہے

اور اسی عنوان کے ماتحت وہ حدیث . . . . ہے، جو برق صاحب نے نقل کی ہے، پھر اس باب کے بعد دوسرا باب . . . . ہے:-

باب نسخ الماء من الماء ووجوب   یعنی یہ حکم کہ غسل انزال کی صورت میں فرض تھا منسوخ

الغسل بالتقاء الختانين — ہوا، اور بعد میں محض ختنہ کے مقامات ملنے سے غسل فرض کیا گیا

برق صاحب نے شاید اگلا باب نہیں دیکھا، اس باب میں امام مسلم نے کئی حدیثیں روایت کی ہیں، ان میں سے ایک حضرت عائشہ کی حدیث بھی ہے، غرض کہ حضرت عائشہ کی یہ حدیث مؤطا میں بھی ہے اور صحیح مسلم میں بھی، لہٰذا دونوں کتابوں میں کوئی تعارض نہیں ورنہ مؤطا کی حدیث محل نظر ہے، برق صاحب نے ایک کتاب سے ناسخ اور دوسری سے منسوخ حدیث دیکھی، اور اس طرح انہیں غلط فہمی ہو گئی۔

غلط فہمی سب سے پہلے تو یہ دیکھئے، کہ اس زمانہ میں سینکڑوں صحابہ مدینہ میں موجود تھے، اور عبد الرحمٰن بن عوف خود بھی فقیہ صحابہ میں شمار ہوتے تھے، اس مضمون پر احادیث بھی لوگوں کو یاد ہوں گی، بایں ہمہ انہوں نے یہ کمال کیا، کہ ایک نہایت نازک مسئلہ حضور علیہ السلام کی سب سے کم عمر زوجہ مطہرہ سے جا پوچھا کیا مدینہ بھر میں اس چھوٹی سی بات کو جاننے والا کوئی مرد موجود نہیں تھا، کیا کوئی غیر مرد کسی معزز خاتون سے اس قسم کی بات دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے، اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے، کہ ابن عوف یہ غلطی کر بیٹھے تھے تو حضرت عائشہ کو چاہیئے تھا کہ ابن عوف کو اس جسارت پر ڈانٹتیں، کہ تم کو حرم نبوی سے ایسا عریاں سوال پوچھنے کی جرأت کیسے ہوئی (دو اسلام صفحہ ۱۶۵)

ازالہ صحیح ہے، کہ سینکڑوں صحابہ مدینہ میں موجود تھے، اور اس مضمون پر احادیث بھی لوگوں کو یاد تھیں، مثلاً حضرت ابی بن کعب جن سے صحیح مسلم کی روایت برق صاحب نے اوپر نقل کی ہے فرماتے ہیں

انما الماء من الماء رخصة فی اول الاسلام ثم نهی عنها وفی روایة ثم امرنا بالاغتسال بعدها (ابو داؤد)	یعنی صرف انزال کے بعد نہانا یہ رخصت شروع اسلام میں تھی، پھر اس سے روک دیا گیا، اور ہمیں حکم دیا گیا، کہ انزال نہ ہو تب بھی غسل کریں۔

لیکن سوال یہ ہے، کہ پھر حضرت عائشہ صدیقہ سے ہی یہ مسئلہ کیوں پوچھا گیا؟ اس کا جواب بھی صحیح مسلم ہی میں موجود ہے، حضرت ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں:۔

اختلف فی ذلك رهط من المهاجرین والانصار فقال الانصاریون لا یجب الغسل الا من الدفق او من الماء وقال المهاجرون بل اذا خالط فقد وجب الغسل قال قال فانا اشفیکم من ذلك فقمت فاستاذنت	وجوب غسل کے سلسلہ میں مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت میں اختلاف ہوا، انصار نے کہا، کہ بغیر انزال کے غسل فرض نہیں ہوتا مہاجرین نے کہا غسل فرض ہو جاتا ہے، میں نے کہا میں اس کا تصفیہ کرتا ہوں، میں اٹھا، اور حضرت عائشہ کے پاس گیا اور ان سے اجازت چاہی، انہوں نے مجھے اجازت

علیٰ عائشۃ فاذنت لی فقلت لہا یا اماہ او یا ام المؤمنین اسالک عن شیء وانی استحییک فقالت لا تستحی ان تسالنی عما کنت سائلا عنہ امک التی ولدتک فانما انا امک قلت فما یوجب الغسل قالت علی الخبیر سقطت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جلس بین شعبہا الاربع ومس الختان الختان فقد وجب الغسل (صحیح مسلم)	دی، میں نے کہا، اے اماں جان میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں لیکن آپ سے پوچھتے ہوئے شرم آتی ہے، حضرت عائشہ نے فرمایا شرماؤ مت، جو چیز تم اپنی ماں سے، جس نے تم کو جنا تھا پوچھ سکتے ہو، وہی مجھ سے بھی پوچھ سکتے ہو۔ کیونکہ میں بھی تمہاری ماں ہوں، میں نے کہا غسل کب فرض ہوتا ہے، حضرت عائشہ نے فرمایا، تم باخبر کے پاس آئے ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب مرد اس کی چاروں شاخوں کے درمیان بیٹھ جائے، اور ختنہ ختنہ سے مل جائے، تو غسل فرض ہو گیا،

اس حدیث سے ثابت ہوا، کہ اس مسئلہ میں صحابہ کے درمیان اختلاف ہو گیا، اور اس اختلاف کی زد میں عبدالرحمن بن عوف رضؓ بھی آ گئے، اور بعض صحابیوں کے غلط فتووں سے ان کو بھی شبہ ہو گیا، لہذا وہ بھی اپنی تسلی کے لئے حضرت عائشہ رضؓ کے پاس تحقیق کرنے چلے گئے، اور اپنی ام محترم ام المومنین سے مسئلہ پوچھ کر چلے آئے، حضرت عائشہ نے ان کے سوال پر تعجب کا اظہار بھی کیا، کہ اتنے بڑے صحابی ہو کر بعض نوجوان لوگوں کے فتووں سے مرعوب ہو گئے، اور شبہ میں پڑ گئے، موطا کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں۔

قالت ہل تدری ما مثلک یا ابا سلمۃ مثل الفروج یسمع الدیکۃ تصرخ فیصرخ معہا اذا جاوز الختان الختان فقد وجب الغسل	حضرت عائشہ نے فرمایا، تمہاری مثال مرغی کے بچے کی سی ہے، جب وہ چلاتی ہے، تو وہ بھی اس کے ساتھ چلانے لگتا ہے، جب ختنہ ختنہ سے مل جائے، تو غسل فرض ہو گیا۔

الغرض اس اختلاف کے دوران میں ہی ان دونوں صحابیوں کو اس سوال کے پوچھنے کی جرأت ہوئی عبدالرحمن بن عوف نے انفرادی طور پر پوچھا، اور حضرت ابوموسیٰ نے صحابہ کرام کے نمائندہ کی حیثیت سے پوچھا، اور ان سب کو مطلع کر دیا، حضرت عمر رضؓ نے اس کے بعد حکم دیا، کہ خبردار اب کوئی اس کے خلاف فتویٰ نہ دے (تسہیل القاری شرح صحیح بخاری)

غلط فہمی کیا کوئی غیر مرد کسی معزز خاتون سے اس قسم کی بات دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے، اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے، کہ ابن عوف یہ غلطی کر بیٹھے تھے، تو حضرت عائشہ رضؓ کو چاہئے تھا، کہ ابن عوف

کی اس جسارت پر ڈانٹتیں، کہ تم کو حرم نبوی سے ایسا عریاں سوال پوچھنے کی جرأت کیسے ہوئی، یا خاموشی اختیار فرمالیتیں، اور اگر خواہ مخواہ کوئی جواب دینا ہی تھا، تو کنایہ و استعارے سے کام لیتیں، یہ آلہ تناسل کا سر شرمگاہ میں داخل ہونا، ایسے الفاظ ہیں جو ایک حیادار اور شریف خاتون اپنے شوہر کے سامنے بھی منہ سے نہیں نکال سکتی، چہ جائیکہ غیر مردوں کے سامنے" (دو اسلام ص ۱۶۵)

ازالہ یہ تو اوپر بتایا جا چکا ہے، کہ کن حالات میں یہ مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی بات تو ضرور شرم کی تھی لیکن مسئلہ کی تحقیق اس سے زیادہ اہم تھی، سوال جس سے پوچھا گیا، وہ بے شک معزز خاتون ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ ماں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (احزاب) نبی کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔

برق صاحب قرآن میں تو اس سے بھی زیادہ شرم کی آیتیں ہیں، چند آیات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ (واقعہ) کیا تم نے دیکھا، کہ جب تم . . . . ٹپکاتے ہو تو کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو، یا ہم

(۲) فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۔ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ (طارق) انسان کو چاہیئے، کہ دیکھے وہ کس چیز سے بنایا گیا ہے وہ کود کر آنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے

(۳) وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (تحریم) اور مریم بنت عمران، جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی، پس ہم نے اس کی شرم گاہ میں اپنی روح پھونک دی۔

(۴) فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا (اعراف) جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو وہ حاملہ ہوگئی

(۵) اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰى (القیامۃ) کیا انسان ایک قطرہ نہیں تھا . . . . . کا جو ٹپکائی گئی تھی۔

برق صاحب کیا ان آیات کا عریاں ترجمہ نہیں ہو سکتا، بیشک ہو سکتا ہے، اور یہ وہ آیتیں ہیں، جو مردوں، عورتوں اور کنواری لڑکیوں کے سامنے تلاوت کی جاتی رہیں، اور تلاوت کی جاتی ہیں، لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھائی جاتی ہیں، اور سمجھائی جاتی ہیں، فرمائیے۔ ان کو پڑھاتے وقت شرم آئے گی یا نہیں

برق صاحب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (البقرۃ) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، پس اپنی کھیتوں میں آؤ جس طرح تم چاہو۔

کہ کنواری لڑکی اپنے باپ یا استاد سے یا لڑکا اپنی ماں یا استانی سے ان تمام آیات کی تشریح پوچھ سکتا ہے، اگر لڑکا اپنی ماں سے ان آیات کی تشریح کرا سکتا ہے، تو اگر کسی شخص نے اپنی محترم ماں سے غسل کے وجوب کا سوال کر لیا، اور ایسے وقت کر لیا جس وقت اور کوئی اس مسئلہ کو حل کرنے والا نہ رہا تھا، تو کیا غضب ہو گیا، برق صاحب اگر آپ علم الحیوانات کے درس میں شریک ہوئے ہیں تو آپ کو معلوم ہو گا، کہ وہاں کیا کیا ہوتا ہے، وہ کون سی چیز ہے، جو پڑھائی نہیں جاتی، اور جس کی تشریح نہیں کی جاتی، اور وہ بھی ایسی جماعت میں جس میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بیٹھی ہوتی ہیں، اور اکثر پڑھانے والے بھی جوان ہی ہوتے ہیں، بورڈ پر شرمگاہوں کی شکلیں تک کھینچی جاتی ہیں، ان پر نام تک لکھا جاتا ہے، اور پھر وہ شکلیں کئی کئی دن تک بورڈ پر باقی رہتی ہیں، کیا یہ سب کچھ عریانیت ہے؟ نہیں تعلیم و تعلم کے لحاظ سے ایسی چیز عریانیت میں شمار نہیں ہوتی، نہ کبھی کسی کو اس کا خیال بھی آتا ہے، عریانیت جب ہوتی ہے کہ مزہ لینے کے لئے یا چھیڑ چھاڑ کے لئے ایسی باتیں صادر ہوتی ہوں، برق صاحب یہ حدیث تعلیم و تعلم کے ذیل میں آتی ہے، پھر الفاظ کتنے پوشیدہ ہیں، کہ عریانیت کا شائبہ بھی اس میں نہیں پایا جاتا، ترجمہ صرف اتنا ہے، کہ "جب ختنہ، ختنہ سے مل جائے، تو غسل فرض ہو جاتا ہے" بتائیے کتنا حیادار جملہ ہے، اور پھر مطلب بھی پورا ہو گیا، ختنہ کا لفظ کتنا مشہور اور زبان زد خاص و عام ہے، حجام کی دکانوں کے بورڈ پر بھی لکھا ہوتا ہے، نہ اس میں کوئی عریانیت ہے نہ بے شرمی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تو در حقیقت استعارہ اور کنایہ ہی سے مطلب ادا کیا تھا، اور یہ استعارہ بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیم کردہ تھا، اور اسی کو انہوں نے دہرا دیا، نہ معلوم کس رنگیلے سے آپ نے ترجمہ کرا کر اپنی کتاب میں درج کر دیا۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"چونکہ یہ حدیث ہمارے مشاہدہ، عام تجربہ، عورت کے مسلمہ کیفیات نفسی، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بلند مقام سے متصادم ہو رہی ہے، نیز صحیح مسلم کی دو احادیث اس کی تردید کر رہی ہیں، اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں، کہ اس قول کو حضرت عائشہ کی طرف منسوب کرنا درست نہیں (دو اسلام صفحہ ۱۶۵)

ازالہ

مذکورہ بالا بحث اور قرآنی آیات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کہ اس حدیث میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں، نیز صحیح مسلم کی احادیث اس کی تردید کر رہی ہیں، بلکہ صحیح مسلم کی ناسخ حدیثیں اس کی تائید کر رہی ہیں جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔

غلط فہمی

"ملا کہتا ہے، کہ میری حدیث کا ہر لفظ محفوظ ہے، اسلام رہے یا نہ رہے، حضور کی منزلت زیادہ ہو یا کم، لوگ اسلام پر ہنسیں یا رو دیں، میری بلا سے" (دو اسلام صفحہ ۱۶۶)

ازالہ اس عبارت میں رنگ آمیزی کے سوا اور کچھ نہیں، اگر کسی ملا نے ایسا کیا ہو، تو ہم بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں، لیکن کسی عالم دین محدث نے تو ایسا کبھی نہیں کیا، بر خلاف اسلام موضوع حدیث کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے۔ بلکہ ملاؤں نے تو اسلام کی تائید میں بھی جو خوش آیند حدیثیں گھڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردی گئی تھیں، ان کی غلط نسبت کو واشگاف کر دیا، اور اپنی کامل دیانتداری کا ثبوت دیا، لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں، کہ وہ ان صحیح واقعات کو بھی جھٹلا دیتے، جن سے بظاہر اسلام پر اعتراض وارد ہو سکتا تھا، اگر وہ ایسا کرتے، تو پھر یہی رویہ ان کا قرآن کے ساتھ بھی ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ قرآن میں بھی ایسی آیات پائی جاتی ہیں، جن سے بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منزلت کو بہت بڑا دھکا پہنچتا ہے مثلاً

(۱) اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا۔ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (فتح) — بیشک ہم نے آپ کو فتح مبین عطا فرمائی، تاکہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دے۔

اس آیت اور اس قسم کی دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ گناہ گار تھے؟

(۲) يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبۡتَغِىۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِكَ (التحریم) — اے نبی آپ ان چیزوں کو کیسے حرام کرتے ہیں جن کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کر دیا، آپ تو اپنی بیویوں کی رضا کے جویا ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ شریعت الٰہیہ میں تبدیلی کر دیا کرتے تھے، اور وہ بھی محض اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لئے

(۳) مَا كَانَ لِنَبِىٍّ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗۤ اَسۡرٰى حَتّٰى يُثۡخِنَ فِى الۡاَرۡضِ (انفال) — نبی کے لئے یہ جائز نہیں، کہ اس کے پاس قیدی ہوں جبتک کہ وہ زمین میں خوب خونریزی نہ کرے۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ اسلام خونریزی کو بہت پسند کرتا ہے

کیا ان آیات سے دشمنان اسلام کو اسلام پر ہنسنے کا موقع نہیں ملتا؟ برق صاحب کیا آپ کی مذکورہ بالا عبارت میں "حدیث" کی جگہ "آیت" کا لفظ چسپاں نہیں ہو سکتا؟ اگر احادیث کو اس معیار پر رکھ کر رد کر دینا جائز ہے، تو آیات کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہیئے یا نہیں، اگر نہیں تو آخر اس فرق کی کیا وجہ ہے تفصیل کے لئے بیسواں باب ملاحظہ ہو۔

غلط فہمی لیلۃ القدر کی تردید کرتے ہوئے برق صاحب لکھتے ہیں:۔
"اس میں کلام نہیں، کہ قرآن حکیم میں لیلۃ القدر کا ذکر آیا ہے اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۚ ہم نے

یہ قرآن لیلۃ القدر یعنی فیصلہ کن رات میں اتارنا شروع کیا۔ (دو اسلام ص۱۶۷)

ازالہ برق صاحب لیلۃ القدر کے معنی آپ نے "فیصلہ کن رات" کے کس طرح کر دیئے، اس کے لئے آپ نے کوئی دلیل نہیں دی، پھر انزلنا "کے معنی" اتارنا شروع کیا" کیسے ہو گئے؟ حالانکہ اس کے صرف یہ معنی ہیں، کہ ہم نے اتارا" کیونکہ آپ ایک اعتراض سے بچنا چاہتے تھے، جو بغیر حدیث کے حل نہیں ہو سکتا اس لئے آپ نے معنوں میں تھوڑا سا تصرف کر دیا، برق صاحب آخر اس تصرف سے کیا فائدہ! کیوں نہ حدیث کی روشنی میں ترجمہ کر دیا جائے، نہ اعتراض رہے نہ تصرف کی ضرورت، بہر حال اتنا ضرور ثابت ہوا کہ قرآن پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آپ مفہوم قرآن میں تصرف کر لیتے ہیں، لیکن حدیث کے لئے آپ اس کو بھی گوارا نہیں فرماتے، کاش آپ غور فرمائیں۔

مزید براں آپ کی تحریر سے روز روشن کی طرح یہ بات ظاہر ہے، کہ لیلۃ القدر وہ رات ہے، جس رات کو قرآن اترنا شروع ہوا تھا، وہ رات گذر گئی، اور اب کبھی نہیں آتی، حالانکہ اس نظریہ کی تردید خود قرآن میں موجود ہے، ارشاد باری ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ (قدر) — اس رات کو فرشتے اور روح الامین اپنے رب کے حکم سے تمام احکام لے کر اترتے ہیں۔

کیونکہ اب اگر یہ رات گذر گئی، تو الفاظ اس طرح ہونے چاہیئے تھے" اس رات کو فرشتے اترے تھے" تنزل مضارع کا صیغہ ہے، لہٰذا اس کے صحیح معنی" اترتے ہیں" ہوئے، لہٰذا یہ رات بار بار آتی ہے، اور یہی حدیث کا مقصود ہے، قرآن و حدیث میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

غلط فہمی " اگر واقعی لیلۃ القدر ہر رمضان میں آتی ہے، تو وہ گذشتہ تین سو برس میں شب بھر جاگنے والے چوکیداروں، ریلوے ملازموں، ملاحوں، ہوابازوں، اور مورچے میں ڈٹے ہوئے فوجیوں کو کیوں نظر نہ آئی" (دو اسلام ص۱۶۸)

ازالہ مذکورہ بالا قرآنی تشریح کے بعد ان الفاظ میں کوئی جان نہیں ہے، مادی باتوں سے روحانیات کا مذاق نہیں اڑایا جا سکتا، جب قرآن سے یہ ثابت ہے، کہ یہ رات بار بار آتی ہے، تو اب اس اعتراض کا رخ قرآن کی طرف مڑ جاتا ہے، معاذ اللہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم) — انسان کو وہی ملتا ہے جو اس نے کوشش کی،

ملاحوں نے اور چوکیداروں نے اس رات کے لئے محض اللہ کی رضا جوئی کی خاطر کوئی کوشش نہیں کی، لہٰذا ان کو وہ رات کیسے مل سکتی تھی محض اس رات کو جاگنا اس رات کو پانا نہیں، بلکہ اس رات کو جاگ کر اللہ تعالیٰ کو

راضی کرلینا درحقیقت اس رات کو پانا ہے یعنی اس رات کی فضیلت سے فیضیاب ہونا ہی حقیقت میں رات کو پانا ہے، لیکن اس کے لئے بھی محض اس رات کی عبادت، رکوع وسجود کوئی وقعت نہیں رکھتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

کم من قائم لیس لہ من قیامہ	بہت سے نماز پڑھنے والے ایسے ہیں کہ ان کو
الا السھر (دارمی)	سوائے جاگنے کے اور کچھ نہیں ملتا۔

برق صاحب! چوکیدار اور ملاح تو کجا نماز میں شب گذارنے والوں کو بھی اس رات کا فیض حاصل نہیں ہوتا اس کے لئے توحید خالص، انابت الی اللہ، تقویٰ اور خشیت الٰہی کی ضرورت ہے

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (مائدہ) اللہ تو صرف اہل تقویٰ کے اعمال قبول کرتا ہے

حدیث کا جواب اوپر نقل کیا گیا، باقی رہا مسلمانوں کے من گھڑت افسانے واحوال ومشاہدات، توان کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے، کہ چند آیات پہلے قرآن میں موجود تھیں لیکن بعد میں نکالدی گئیں مثلاً:۔

لولا ان یقول الناس زاد عمر فی	اگر لوگ مجھے یہ نہ کہتے کہ عمر بن خطاب نے قرآن میں
کتاب اللہ لکتبتھا الشیخ والشیخۃ	اضافہ کر دیا تو میں یہ آیت اس میں شامل کر دیتا الشیخ
اذا زنیا فارجموھما فانا قد	والشیخۃ ..... "کہ جب کوئی بوڑھا اور بڑھیا زنا کے
قرأناھا (موطا ص۳۴۸)	مرتکب ہوں، توانہیں سنگسار کردو، ہم یہ آیت قرآن میں پڑھتے

اگر پڑھتے رہے تو نکالی کس نے؟ اور اگر نکالدی گئی تھی، تو اللہ کا وعدہ حفاظت قرآن کیا ہوا (دو اسلام ص۱۶۸)

ازالہ اس حدیث کو حضرت عمرؓ سے روایت کرنے والے سعید بن مسیب ہیں، اور انہوں نے حضرت عمرؓ سے اس حدیث کو نہیں سنا، علامہ ابن القطان لکھتے ہیں:۔

ان سعیدا لم یسمع من عمر الا نعیہ	یعنی سعید نے حضرت عمرؓ سے کچھ نہیں سنا سوائے
النعمان بن مقرن قال ومنھم من نکرہ	نعمان بن مقرن کی نعی کے، بلکہ بعض تو مطلق سننے
مطلقا (نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ کتاب الجنایہ ۳۲۹)	کا انکار کرتے ہیں۔

لہٰذا سند حدیث منقطع ہے، اور یہ حدیث ضعیف ہے، اور ضعیف حدیث کے ہم جواب دہ نہیں، اس کا ضعف ہی اس کے لئے کافی ہے، اور ضعیف حدیث پر اعتراض کرنا بھی فضول ہے، پھر اس حدیث کا متن صحیح بخاری کی اس حدیث کے بھی خلاف ہے، جو اگلی غلط فہمی کے ازالہ کے تحت درج کی جا رہی ہے

لہٰذا یہ حدیث خود ہمارے نزدیک بھی ثابت نہیں، جواب دینے کی ضرورت ہی کیا ہے

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس موضوع پر ایک حدیث بخاری میں بھی موجود ہے

عن عمر بن الخطاب قال ان اللہ بعث	عمر بن خطاب فرماتے ہیں، کہ اللہ نے محمد صلی اللہ
محمدا صلی اللہ علیہ وسلم وانزل	علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا، اور اس پر ایک
علیہ الکتاب فکان فیما انزل اٰیۃ	کتاب نازل فرمائی، جس میں آیت رجم بھی
الرجم	موجود تھی۔

یعنی امام بخاری نے بھی تسلیم کر لیا، کہ قرآن میں آیت رجم موجود تھی، لیکن یہ نہیں بتایا وہ گئی کہاں؟ (دو اسلام ص ۱۶۹)

ازالہ اس سے پہلے کہ ہم صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث کا جواب دیں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ زنا کی سزا کا پس منظر اور اس کی تاریخ پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالی جائے، اس سلسلہ کی سب سے پہلی سزا قرآن کی اس آیت میں ہے:۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ	جو عورتیں زنا کریں، تو ان پر چار گواہ پیش کرو، پس
فَاسْتَشْہِدُوْا عَلَیْہِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ	اگر وہ شہادت دیں، تو ان کو گھروں میں قید
فَاِنْ شَہِدُوْا فَاَمْسِکُوْھُنَّ فِی الْبُیُوْتِ	رکھو، یہاں تک کہ موت ان کا کام تمام
حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ	کر دے، یا اللہ ان کے لئے کوئی اور سبیل یعنی
لَھُنَّ سَبِیْلًا (النساء)	سزا مقرر فرما دے۔

کیونکہ زنا عموماً عورت کے حق میں زیادہ معیوب سمجھا جاتا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ جب تک عورت کی طرف سے رضامندی نہ ہو، مرد کی تمام کوششیں بے کار ہو جاتی ہیں، سب سے پہلے عورت پر سزا نافذ کی گئی، تاکہ عصمت کے قلعہ کو زیادہ محفوظ و مضبوط بنا دیا جائے، اس کے بعد سزا کی حدود کو اور زیادہ بڑھا دیا گیا، اور یہ آیت نازل کی گئی جو مندرجہ ذیل ہے، اور جس کا ذکر مؤطا کی روایت میں موجود ہے، اور جو بعد میں منسوخ کر دی گئی۔

الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما الخ	بوڑھا اور بوڑھی جب زنا کریں، تو انہیں سنگسار کر دو

کیونکہ بوڑھے اور بوڑھی کا زنا کرنا بہت زیادہ قبیح تھا لہٰذا پہلے ان پر سزا کو نافذ کیا گیا، جوان اور کنواری عورتوں کے متعلق ابھی تک کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، اور وہ بدستور محبوس رہا کریں، اسی طرح جوان مردوں کے متعلق بھی کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں آخری حکم نازل فرمایا جس کا ذکر مندرجہ

ذیل حدیث میں ہے:۔

عن عبادة بن الصامت قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا نزل علیہ کرب لذلک وتربد لہ وجہہ قال فانزل علیہ ذات یوم فلقی کذلک فلما سری عنہ قال خذوا عنی فقد جعل اللہ لهن سبیلا الثیب جلد مائۃ ثم رجم بالحجارۃ والبکر جلد مائۃ ثم نفی سنۃ (صحیح مسلم)	عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی، تو آپ مشقت محسوس کرنے لگتے، چہرہ متغیر ہو جاتا تھا، ایک دن آپ پر وحی نازل ہوئی، اور یہی کیفیت ہوگئی، پھر جب وہ کیفیت زائل ہوگئی، تو آپ نے فرمایا، مجھ سے یہ احکام سیکھ لو بے شک اللہ نے ان کے لئے سبیل (سزا) مقرر کردی، شادی شدہ کو سو کوڑے مار کر رجم کر دیا جائے، اور کنوارے کنواری کو سو کوڑے مار کر ایک سال کے لئے جلاوطن کر دیا جائے۔

(اس حدیث اور اس قسم کی بے شمار احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آیا کرتی تھی) اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں سو کوڑے کی سزا شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کے لئے مشترک تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سزا کو قرآن کی آیت کی صورت میں نازل فرما کر مصحف میں شامل کر دیا، اور غیر مشترک سزا کو احادیث کی صورت میں رہنے دیا گیا۔

اب رہ گیا برق صاحب کا یہ اعتراض کہ وہ آیت کہاں گئی جس کا ذکر حضرت عمرؓ کی مذکورہ بالا روایت میں ہے، تو اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا پورا بیان درج ذیل کیا جاتا ہے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں

ان اللہ قد بعث محمدا صلی اللہ علیہ وسلم بالحق وانزل علیہ الکتاب فکان مما انزل علیہ آیۃ الرجم قرأناها ووعیناها وعقلناها فرجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل ما نجد الرجم فی کتاب اللہ فیضلوا بترک فریضۃ انزلها اللہ وان الرجم	بے شک اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، اور آپ پر شریعت نازل کی، اس نازل کردہ شریعت میں رجم کا حکم بھی ہے، ہم نے اسے پڑھا ہے، محفوظ کر لیا ہے، اور سمجھ لیا ہے پھر عملاً بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا ہے، اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا ہے، میں ڈرتا ہوں کہ ایک مدت گذرنے کے بعد کہنے والا یہ نہ کہے، کہ شریعت میں رجم کا کوئی حکم نہیں ہے پس لوگ اللہ کے ایک فرض کو جس کو اللہ نے

فی کتاب اللہ حق علی من زنی اذا احصن (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

نازل فرمایا ہے ترک کر کے گمراہ نہ ہو جائیں، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ رجم کا حکم شریعت الٰہیہ میں اب بھی حق و ثابت ہے۔ اس پر جو شادی شدہ ہو کر زنا کرے

برق صاحب اب بتایئے، حدیث پر کیا اعتراض ہے، اعتراض اس لئے پیدا ہوا کہ آپ نے کتاب اللہ کے معنی قرآن کر دیئے، اور پھر ہم سے سوال کرنے لگے کہ قرآن میں تھی، تو کہاں گئی؟ یہ آیت قرآن میں تھی ہی نہیں، حدیث میں تھی، اور بقول حضرت عمرؓ حدیث میں اب بھی موجود ہے، اور جو آیت قرآن میں تھی یعنی "بوڑھے اور بوڑھی کو سنگسار کرنے کی آیت" وہ منسوخ ہو گئی، اور اب قرآن میں نہیں ہے، اس کا حکم بھی منسوخ اور تلاوت بھی منسوخ۔ ہاں اگر یہ تعجب ہو، کہ قرآن میں نسخ کیسا، تو یہ بھی کوئی عجیب بات نہیں، یہ بات تو خود قرآن سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۱) مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِہَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْہَآ اَوْ مِثْلِہَا (البقرۃ)

جب ہم کوئی آیت منسوخ کر دیتے ہیں یا اس کو بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت نازل کر دیتے ہیں

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ قرآن کی آیات میں نسخ ہوا ہے۔

(۲) وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ وَّ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ اَکْثَرُہُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (النحل)

اور جب کبھی ہم نے ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دی، اور اللہ خوب جانتا ہے، جو نازل کرتا ہے، تو ان لوگوں نے کہا، کہ آپ خود گھڑنے والے ہیں، بات یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے ہی نہیں

(۳) اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَہَا (البقرۃ)

بے شک اللہ نہیں شرماتا، کہ مچھر کی مثال بیان فرمائے یا اس سے بھی ادنیٰ تر مخلوق کی۔

کفار نے اعتراض کیا ہوگا، کہ وہ بھی کوئی اللہ ہے، جو مچھر کی مثال بیان فرماتا ہے، اللہ نے اس کے جواب میں یہ آیت اتاری، لیکن وہ آیت جس میں اللہ نے مچھر کی مثال بیان فرمائی تھی، اور جس پر کفار نے اعتراض کیا تھا، کہاں گئی، قرآن میں تو نہیں ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ بعض آیتیں ضرور منسوخ ہوئی ہیں۔

(۴) سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰٓی اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ (الاعلیٰ)

ہم آپ کو پڑھائیں گے پس آپ نہیں بھولیں گے سوائے اس کے جو اللہ ہی بھلانا چاہے۔

اس آیت سے ظاہر ہے، کہ ضرور کچھ نہ کچھ بھلانا اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادے میں تھا، ورنہ استثناء کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

ان آیات کی روشنی میں اگر کسی حدیث میں یہ ملتا ہے، کہ فلاں آیت منسوخ ہو گئی، تو آخر اعتراض کی کون سی بات ہے، جو اعتراض حدیث پر ہو گا، وہی پھر قرآن پر بھی ہو گا (معاذ اللہ)

غلط فہمی "آج اعدائے اسلام یہی احادیث پیش کر کے ہمیں کہتے ہیں، کہ تمہارے قرآن میں رد و بدل ہوتا رہا اور اس کی آیات انسانی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں، کوئی بتاؤ کہ ہم اس الزام کا کیا جواب دیں (ص ۶۹)

ازالہ برق صاحب یہ کس حدیث میں ہے، کہ قرآنی آیات انسانی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں، یہ کس حدیث میں ہے، کہ انسان آیات میں رد و بدل کرتے رہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا رد و بدل کرنا بھی انسانی رد و بدل کہلا سکتا ہے؟ آخر کچھ تو انصاف کیجیے، قرآنی آیات انسانی دست برد سے بے شک محفوظ رہیں، دستبرد کرنے والی وہی ہستی ہے، جس نے اس کو اتارا تھا، اس کو بے شک اختیار ہے، کہ جس حکم کو چاہے بدل دے، اور جس حکم کو چاہے باقی رہنے دے، دین کی تکمیل سے پہلے رد و بدل ہوا لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا) تو پھر اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوا، جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تھا، آج تک ویسا ہی ہے، اعدائے اسلام یہ بتائیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کون سی تبدیلی ہوئی، اور پھر اعتراض کریں، برق صاحب اعدائے اسلام کے ایک اعتراض سے اتنے مرعوب ہیں، کہ حدیث کا انکار کرنے پر تل گئے، کیا انہیں خبر نہیں کہ اعدائے اسلام نے قرآن کے متن پر سینکڑوں اعتراض کئے، تو کیا متن قرآن کا بھی انکار کر دیں گے کیا ان آیات کا بھی انکار کر دیں گے، جن سے نسخ آیات ثابت ہوتا ہے، اور جو اوپر نقل کی جا چکی ہیں، ہاں یہ دوسری بات ہے، کہ آپ آیات کا مفہوم بدلتے چلے جائیں، اس طرح سے بظاہر آپ مطمئن ہو جائیں گے لیکن ضمیر کی آواز اس سے کچھ مختلف ہی ہوگی، مثال کے طور پر ایک اعتراض نقل کرتا ہوں، حروف مقطعات مثلاً الٓمٓ - کٓهٰیٰعٓصٓ - قٓ وغیرہ کے کیا معنی ہیں؟ اگر کچھ معنی ہیں، تو لغت عرب، محاورات عرب سے ان معانی کو ثابت کیجیے، تاکہ ہر عربی دان مسلم ہو یا غیر مسلم ان کو تسلیم کرے، اگر کچھ معنی نہیں ہیں، تو پھر یہ حروف مہمل ہیں، اور لغو ہیں، اور اللہ کا کلام مہمل اور لغو نہیں ہوتا، لہٰذا قرآن کلام الٰہی نہیں، یا کم از کم حروف مقطعات انسانی دست برد کا نتیجہ ہیں، کہیے اس اعتراض کا کیا جواب دیں۔

غلط فہمی تحریف کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔ حضرت علقمہ فرماتے ہیں، کہ میں شام میں حضرت ابو درداءؓ سے ملا، تو آپ نے پوچھا، کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود واللیل کی تلاوت کیسے کرتے ہیں، تو میں نے کہا اس طرح وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى آپ نے فرمایا خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلعم سے یہ آیات بالکل اسی طرح سنی ہیں، اور میں اسی طرح پڑھوں گا (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۶۲)

توگویا تین جلیل القدر صحابہ نے شہادت دی، کہ یہ آیات مذکورہ بالا صورت میں نازل ہوئی تھیں، لیکن آج قرآن شریف میں یوں درج ہیں وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ، اب کس کو صحیح تسلیم کریں! ان صحابہ کو؛ صحیح مسلم کو؟ یا قرآن شریف؟ لازماً یہی کہنا پڑے گا، کہ ہمارا قرآن صحیح ہے، اور یہ حدیث غلط۔ (دو اسلام صفحہ ۱۷۱)

ازالہ برق صاحب انفرادی غلطی اور لاعلمی سے مسلمات کو جواب نہیں دیا جا سکتا، اگر تین صحابہ سے غلطی ہو گئی تو ہو جائے، ہزار ہا صحابہ جس طرح تلاوت کرتے رہے، قرآن تو درحقیقت وہی ہے، ان تین صحابہ کی لاعلمی یا بھول کی وجہ سے قرآن کے متن پر کوئی اعتراض نہیں آتا، لہذا حدیث قابل اعتراض ہی نہیں، اگر یہ اعتراض ہو، کہ یہ تین صحابہ کیسے بھول گئے، تو اول تو یہ تین نہیں دو ہیں، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود، اور حضرت ابو درداء رضی، آپ نے علقمہ تابعی کو بھی غلطی سے صحابی سمجھ لیا، وہ تو ان دونوں صحابہ کی غلطی کے راوی ہیں، اب رہا بھول کا اعتراض، تو کیا بھول بھی کوئی قابل اعتراض چیز ہے، انسان سے بھول ہو ہی جایا کرتی ہے، وہ بھول جاتا ہے، اور سمجھتا یہ ہے، کہ جو کچھ مجھے یاد ہے، وہ صحیح ہے، یہ واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں، اور روزمرہ کے تجربات میں سے ہیں، کیا محض ان دو صحابہ کو بھول کے نقص سے بچانے کے لئے ایک مسلمہ حقیقت کا انکار کر دیا جائے، وجہ یہ کہ علقمہ نے ان دونوں صحابہ سے ایک آیت غلط طریقہ سے سنی تھی اور اس کو انہوں نے بیان کر دیا، لہذا قرآن بھی صحیح، حدیث بھی صحیح، اور ان دو صحابہ کی بھول۔

اس کا ایک اور جواب بھی ہے، ممکن ہے، کہ یہ آیت پہلے اسی طریقہ سے نازل ہوئی ہو جس طریقے سے ان دونوں صحابہ کو یاد تھی، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں "وَمَا خَلَقَ" کا اضافہ کر دیا، اور ان دونوں صحابہ کو اس کا علم نہ ہو سکا، اور یہ اسی طریقہ سے پڑھتے رہے، قرآن بہرحال جمہور صحابہ کی قرأت کے مطابق شائع ہوا، لہذا اس میں ان صحابہ کی لاعلمی کی وجہ سے کوئی نقص نہیں آتا۔

(برق صاحب یہ باب تو "موطا پر ایک نظر" کے لئے مخصوص تھا، پھر دوسری کتابوں کی حدیثیں اس میں قابل اعتراض سمجھ کر کیوں داخل کر دی گئیں)

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضور نے اصحاب صفہ میں سے چند حضرات کو اہل نجد کے پاس تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا، جب وہ بئیر معونہ (مکہ اور عسفان کے درمیان ایک مقام) میں پہنچے تو عامر بن طفیل، رعل، ذکوان وغیرہ نے انہیں قتل کر ڈالا، حضرت انس رضی سے روایت ہے، کہ ان لوگوں کے متعلق مندرجہ ذیل آیت اتری تھی، جو بعد میں منسوخ ہو گئی۔ بلغوا قومنا انا قد لقينا ربنا فرضي عنا ورضينا عنه "ہماری قوم کو کہہ دو، کہ ہم

اللہ سے اس حال میں ملے، کہ وہ ہم سے خوش تھا، اور ہم اس سے (بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۳ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۳) اگر یہ آیت واقعی نازل ہوئی تھی، تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اس کا باقی رہنا ضروری تھا" (دو اسلام صفحہ ۱۷۱)

ازالہ آیت کے منسوخ ہونے کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے، منسوخ کرنے میں کیا مصلحت تھی، اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے، ہاں ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے، جو آپ کے مندرجہ ذیل الفاظ میں پائی جاتی ہے:۔

"قرآن شریف میں غزوات اور اس قسم کے دیگر واقعات کے متعلق بیسیوں آیات نازل ہوئیں، جو بعینہ محفوظ ہیں" (دو اسلام صفحہ ۱۷۱)

گویا ان آیات کی موجودگی میں اس آیت کی ضرورت نہ سمجھی گئی پیغام پہنچا دینے کے بعد اس کو منسوخ التلاوت کر دیا گیا، اور حوصلہ افزائی کے لئے باقی آیات کو کافی سمجھا گیا۔

غلط فہمی "چونکہ اس قسم کی احادیث سے قرآن کی قطعیت پر چوٹ پڑتی ہے، اس لئے ہمارے لئے محفوظ ترین راستہ یہی ہے، کہ ہم اس قسم کی تمام احادیث کو ناقابل اعتماد قرار دیں" (دو اسلام صفحہ ۱۷۱-۱۷۲)

ازالہ نسخ کا جواب تو اوپر دیا جا چکا ہے، نسخ سے قطعیت قرآن مجروح نہیں ہوتی پھر قرآن کی قطعیت پر تو قرآن کی آیات سے چوٹ پڑتی ہے، لہٰذا حدیث کا فکر چھوڑ دیجئے، پہلے ان کا جواب سوچئے، ستیارتھ پرکاش وغیرہ کتابیں ملاحظہ فرمائیں، وہ ایک اعتراض اوپر نقل کئے جا چکے ہیں، مثلاً "مچھر کی مثال والی آیت کہاں گئی؟ مہمل حروف قرآن میں کہاں سے آ گئے۔

غلط فہمی "میری ذاتی رائے یہ ہے، کہ دشمنان اسلام ایک خاص سازش کے ماتحت اس قسم کی احادیث معتبر راویوں کے نام سے وضع کرتے رہے، تاکہ مسلمان کا ایمان قرآن کے متعلق متزلزل ہو جائے، اور چونکہ ائمہ حدیث صرف اسناد کو دیکھتے تھے، اس لئے مسلم جیسے محقق بھی اس چال کے شکار ہو گئے، اور انہوں نے اس روایت کو اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا" (دو اسلام صفحہ ۱۷۲-۱۷۳)

ازالہ یہ تو تسلیم کیا جا سکتا ہے، کہ دشمنان اسلام اس قسم کی احادیث وضع کرتے تھے، یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے، کہ معتبر راویوں کے نام ان کی اسنادیں لگا دیا کرتے تھے، لیکن براہ کرم یہ تو سوچئے کہ محققین کے پاس وہ احادیث کس سند سے پہنچتی تھیں، کیا ان اسنادیں ان دشمنان اسلام کے نام نہیں ہوتے تھے، ضرور ہوتے تھے، تو پھر جو حدیث دشمنان اسلام کا نام آتے ہی موضوع ہو جاتی تھی محققین کے نزدیک صحیح کیسے ہو گئی، معتبر راویوں کے نام تو ان دشمنان اسلام کے اوپر ہوں گے، لہٰذا اوپر کے راویوں کے معتبر ہونے سے حدیث مستند کیسے ہو جائے گی، جب کہ نیچے کے راوی کذاب ہوں، برق صاحب یہ بات آپ نے سوچ سمجھ کر نہیں لکھی، ہاں یہ آپ کہہ سکتے ہیں، کہ محققین یہ دھوکا کھا گئے، کہ ان کذابین اور

دشمنان اسلام کو ائمہ اسلام سمجھتے رہے، لیکن یہ قول محض تعسف ہوگا، جس کے لئے نہ کوئی دلیل پیش کی جاسکتی ہے، نہ کوئی شہادت۔ وَاللیل کی قرأت کے متعلق جو حدیث برق صاحب نے نقل فرمائی ہے، صحیح مسلم میں اس کی یہ اسناد ہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ و ابو درداءؓ
|
علقمہ
شعبی	ابراہیم
داؤد بن ابی ہند	اعمش — مغیرہ

- شعبی ← داؤد بن ابی ہند ← اسمٰعیل بن ابراہیم ← علی بن حجر ← امام مسلم
- شعبی ← داؤد بن ابی ہند ← عبدالاعلیٰ ← محمد بن مثنیٰ ← امام مسلم
- ابراہیم ← اعمش ← ابو معاویہ ← ابوبکر ← امام مسلم
- ابراہیم ← اعمش ← ابو معاویہ ← ابو کریب ← امام مسلم
- ابراہیم ← مغیرہ ← جریر ← قتیبہ ← امام مسلم
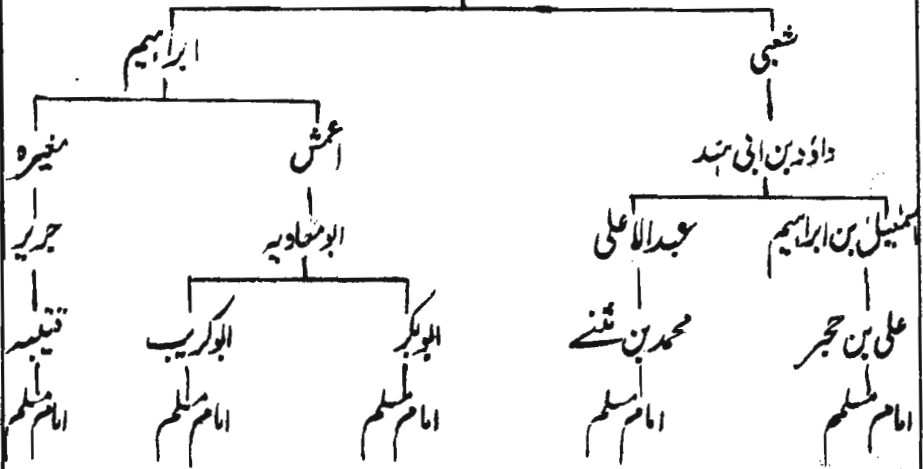
اس اسناد میں ہر ایک مسلّمہ امام ہے، بتایئے کس کو دشمن اسلام سمجھیں؟ سب سے آسان طریقہ یہ ہے، کہ امام علقمہ تابعی کو دشمن اسلام قرار دے دیا جائے، جو کہ عبداللہ بن مسعود کے اصحاب کبار میں شمار ہوتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں صرف ان کو دشمن اسلام قرار دے کر باقی کو اس الزام سے بچایا جاسکتا ہے، اگر ان کو صادق سمجھا جائے، تو پھر دو اماموں کو یعنی امام شعبی اور امام ابراہیم نخعی کو دشمنان اسلام ماننا پڑے گا، اور اگر یہ بھی صادق سمجھے جائیں، تو پھر متعدد ائمہ دین کو دشمنان اسلام کی فہرست میں شامل کرنا ہوگا، اور یہ کبھی بھی قرین قیاس نہیں ہوسکتا، کہ اتنے زیادہ آدمی اس حدیث کے بنانے میں شریک ہوں اور کسی کے متعلق ادنیٰ سا بھی وہم نہ امام مسلم کو ہوا، نہ کسی اور محدث کو، حالانکہ صحیح مسلم کی احادیث کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے، امام مسلم خود لکھتے ہیں:۔

لیس کل شیٔ عندی صحیح وضعتہ ھٰھنا انما وضعت ھٰھنا ما اجمعوا علیہ (مسلم باب التشہد فی الصلوٰۃ)	یں صحیح مسلم میں ہر وہ حدیث نہیں لکھتا، جو میرے نزدیک صحیح ہے، صحیح مسلم میں تو صرف وہ حدیث لکھتا ہوں، جس کی صحت پر اجماع ہے۔

اب بتائیے یہ کیسے ممکن ہے، کہ تمام محدثین ان تمام دشمنان اسلام سے بے خبر رہے، بلکہ ان کو ائمہ دین شمار کرتے رہے، ظاہر ہے، کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے، برق صاحب صحیح مسلم کی یہ اسناد آپ کے سامنے ہے، آپ اس شخص یا ان اشخاص پر انگلی رکھیئے، جو اس حدیث کے گھڑنے والے تھے، لیکن مشکل یہ ہے، کہ کس کس کو کذاب کہا جائے، صرف صحیح مسلم کی سند کا یہ حال ہے، تمام کتب حدیث میں اس کی سند کا ایک جال بچھا ہوا ہے، ناممکن ہے، کہ ان تمام کے تمام ائمہ حدیث و فن کو دشمن اسلام قرار دیا جائے، پھر یہی کیوں نہ کہہ دیا جائے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے، اور صرف گنتی کے چند افراد کو مسلم چھوڑ گئے، باقی سب کے سب منافق تھے، ان کی نسل سے بھی منافق پیدا ہوتے رہے، ان کے شاگردان خاص بھی منافق تھے، غرض یہ کہ امت مسلمہ سب کی سب ان منافقوں پر مشتمل تھی، نہ کوئی مسلم تھا، نہ کوئی حق گو، اور اگر کوئی تھا بھی تو وہ کہیں گوشہ عافیت میں زندگی گذار رہا تھا، نہ اس سے کوئی واقف تھا، نہ وہ کسی سے واقف، دور دورہ انہیں منافقوں کا تھا، جو علم و فن کے آفتاب و ماہتاب تھے، عمل صالح، اور تقوی و طہارت کے پیکر تھے، ائمہ دین کہلاتے تھے، لیکن تھے منافق، دشمن اسلام، نعوذ باللہ، قطعاً ناممکن ہے، کہ یہ لاتعداد ائمہ دین سب کے سب منافق ہوں، پھر مکرر عرض کرتا ہوں، کہ ہمارے لئے سب سے آسان بات یہ ہے، کہ ہم ان تمام ائمہ کو دشمنان دین کہنے کے بجائے امام علقمہ کو دشمن دین کہہ دیں، لیکن یہاں بھی ایک بڑی مشکل ہے، وہ یہ کہ علقمہ معمولی آدمی نہیں بلکہ صحابہ کرام کے شاگرد خاص، اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ کے مشہور اصحاب کبار میں سے ہیں، اور ائمہ دین، محدثین کے مسلمہ استاذ ہیں، اس مشکل کا حل سوائے اس کے کچھ نہیں، کہ ہم صحت حدیث کے معترف ہوں، اور عبداللہ بن مسعود رضہ اور ابو درداء کی اس قرأت کو قرأت شاذہ میں شمار کریں، اور یہ کہیں، کہ غالباً یہ قرأت اوائل اسلام میں کبھی جائز تھی، اب منسوخ ہے۔

غلط فہمی سرور عالم صلعم اور ان کے صحابہ گوشت کو ایک نعمت سمجھ کر کھایا کرتے تھے، لیکن موطا کی ایک حدیث ہمیں گوشت جیسی نعمت سے اجتناب کا حکم دیتی ہے

عن عمر بن الخطاب قال ایاکم واللحم	عمر فاروق فرماتے ہیں، کہ گوشت خوری سے بچو
فان لہ ضراوۃ کضراوۃ الخمر	اس لئے کہ شراب کی طرح اس کی عادت پڑ جاتی ہے

اگر ایک اچھی چیز کی عادت بھی پڑ جائے، تو حرج کیا ہے" (دو اسلام ص ۱۷۳ س ۱۷)

ازالہ امام مالک نے اس قول کو متصل سند سے بیان نہیں کیا، لہذا یہ قول ضعیف ہے اور اس پر اعتراض اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے، اعتراض جب ہوتا، کہ امام مالک اس کو متصل سند

سے بیان کرکے اس پر اعتماد کرتے، پھر رقی صاحب کا خیال بھی صحیح نہیں، کہ ہر اچھی چیز کی عادت اچھی ہوتی ہے، کھانے، پینے کی چیزوں میں سے کسی چیز کی عادت پڑ جانا یقیناً تکلیف کا باعث ہوتا ہے اگر کبھی وہ چیز میسر نہیں ہوتی، تو طبیعت مکدر رہتی ہے آدمی اس کا غلام بن جاتا ہے، اور اس کو بغیر اس چیز کے چین نہیں آتا، اور ہو سکتا ہے، کہ جب بے صبری زیادہ بڑھ جائے، تو وہ اس کے حصول کے لئے کوئی ذلیل قسم کی حرکت کر بیٹھے، ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اگر یہ قول حضرت عمر کی طرف صحیح منسوب ہے تو یہی وہ حرج ہے جس کی طرف ان کے اس قول میں اشارہ ہے، کثرت کسی چیز کی بھی اچھی نہیں ہوتی، حتی کہ عبادت کی کثرت بھی نامحمود ہے، تو پھر گوشت خوری کی کثرت کیوں نہ نامحمود ہو، یہی وہ رمز ہے، جو اس قول میں پوشیدہ ہے، فللہ الحمد

باب ۔ ۸

"صحیح بخاری پر ایک نظر"

غلط فہمی "اس میں کلام نہیں، کہ امام بخاری (وفات ۲۵۶ھ) نے صحیح احادیث کی تلاش میں لمبے لمبے سفر کئے، اور سالہا سال کی مسلسل جستجو و تگاپو کے بعد اپنا مجموعہ تیار کیا" (دو اسلام ص۱۷۵)

ازالہ اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ امام بخاری سے پہلے کوئی مجموعہ احادیث نہیں تھا، بہت سے تھے لیکن ان مجموعوں میں بعض ضعیف احادیث شامل تھیں، بعض میں کسی قسم کا شبہ تھا، بعض کے متعلق اختلاف رائے تھا، امام بخاری نے ان کتب احادیث کو پڑھا، اور ان میں سے ان احادیث کا انتخاب کیا، جو ہر قسم کے شبہ سے بالاتر تھیں، اور جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق تھا، ان منتخب کردہ احادیث کو اپنی جامع میں جمع کر دیا، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:۔

وجاء محمد بن اسماعیل البخاری	محمد بن اسماعیل بخاری جو اپنے زمانہ میں محدثین
امام المحدثین فی عصرہ فخرج	کے امام تھے آئے، اور انہوں نے ابواب
احادیث السنۃ علی ابوابھا فی مسندہ	کے ماتحت اپنی صحیح کو مرتب کیا، اور صرف انہی
الصحیح اعتمد منھا ما اجمعوا علیہ	حدیثوں پر اعتماد کیا، جن کی صحت پر اجماع تھا، ان
دون ما اختلفوا فیہ ثم جاء	کو چھوڑ دیا، جن میں اختلاف تھا پھر امام مسلم
المسلم بن حجاج القشیری فالف	آئے، اور انہوں نے بھی امام بخاری کی طرح
مسندہ حذا فیہ حذو البخاری فی	ان ہی احادیث کو اپنی صحیح میں نقل کیا، جن کی
نقل المجمع علیہ (مقدمہ ابن خلدون ص۳۸۶	صحت پر اجماع تھا۔
نصرۃ الباری ص۹۳)	

برق صاحب کے ممدوح امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

وما صححاہ کان قبلھما عند ائمۃ	صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث ان دونوں
الحدیث صحیحا متلقی بالقبول وکذلک	اماموں سے پہلے بھی ائمہ حدیث کے نزدیک صحیح
فی عصرھما وکذلک بعدھما قلم	تھیں، اور ان دونوں کے زمانہ میں بھی صحیح مانی گئیں

ینفرد الا بروایتہ ولا بتصحیحہ
(منہاج السنۃ جلد ۴ صفحہ ۵۹
نصرۃ الباری صفحہ ۹۳)

اور ان کے بعد کے زمانہ میں بھی صحیح تسلیم کی گئیں، پس نہ روایت میں یہ منفرد ہیں، نہ تصحیح میں ان دو کا انفراد ہے۔

غلط فہمی "لیکن اس قدر محنت اور احتیاط کے باوجود اس مجموعہ میں چند ایسی احادیث موجود ہیں، جو یا تو تعلیم قرآن سے متصادم ہوتی ہیں، یا آپس میں ٹکراتی ہیں، یا مسلمانوں کو بے کار، اپاہج اور بے عمل بناتی ہیں اور یا ان سے حضور علیہ السلام اور ان کی ازواج مطہرات کی توہین کا پہلو نکلتا ہے (دو اسلام صفحہ ۱۷۵)

ازالہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، صحیح بخاری میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے، جس میں مذکورہ بالا باتیں پائی جاتی ہوں، اگر بظاہر کوئی بات پائی بھی جائے، تو وہ حقیقۃً ایسی نہیں ہوتی، اگر حدیث کا گہرا مطالعہ کیا جائے، تو وہ غلط فہمی خود بخود دور ہو سکتی ہے، اور اگر محض ظاہری معنوں سے اس قسم کے اعتراضات کئے جا سکتے ہیں، تو پھر ان اعتراضات سے قرآن بھی نہیں بچ سکتا، جہاں برق صاحب احادیث سے اس قسم کی مثالیں پیش کریں گے، وہیں ان کے مماثل ہم قرآنی آیات پیش کریں گے صحیح بخاری کی احادیث کی صحت پر جیسا کہ اوپر بیان ہوا علمائے سلف و خلف کا اجماع ہے، تو کیا یہ سب دشمن دین و پیغمبر تھے، یا اسلام کے نادان دوست تھے، کوئی ان میں محب رسول اور اسلام کا دانا و سمجھدار دوست تھا ہی نہیں! برق صاحب آخر کچھ تو انصاف چاہیے، اگر ان سب نے مل کر کسی حدیث کو قرآن کے خلاف نہیں سمجھا، اور ہم اس کو قرآن کے خلاف سمجھیں، تو کیا یہ ہماری سمجھ کا قصور ہے، یا ان سب متقدمین و متاخرین محدثین کے فہم کا قصور ہے؟

غلط فہمی "امام بخاری کی نظر زیادہ تر اسناد پر رہی، انہیں جس حدیث کے وضعی ہونے پر کوئی تاریخی شہادت نہ مل سکی، اسے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا" (دو اسلام صفحہ ۱۷۶)

ازالہ یہ قطعاً صحیح نہیں، اسناد کے علاوہ تمام فنون حدیث پر امام بخاری کی نظر تھی، موضوع حدیث تو کجا انہوں نے تو ضعیف و مشکوک و مختلف فیہ احادیث بھی نقل نہیں کیں، بلکہ صحیح احادیث میں سے بھی ان بہت سی احادیث کو اس لئے چھوڑ دیا، کہ وہ احادیث ان کی سخت شرائط کے معیار کے مطابق نہیں تھیں، بھلا جو شخص صحیح احادیث اپنے سخت شرائط کی بنا پر چھوڑ دیتا ہو، وہ ضعیف بھی نہیں موضوع حدیثیں نقل کرے گا، حاشا وکلا۔

برق صاحب کا یہ جملہ "جس حدیث کے وضعی ہونے پر کوئی تاریخی شہادت نہ مل سکی اسے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا" درحقیقت منکوس جملہ ہے، اس جملہ کو اس طرح ہونا چاہیے تھا، جس حدیث کے

صحیح ہونے پر تمام ضروری تاریخی شہادتیں میسر تھیں، ان احادیث کو امام بخاری نے اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا محدث تو صحت احادیث کے لئے تاریخی شہادت مہیا کرتے تھے، اور جہاں یہ تاریخی شہادت نہ ہوتی تھی، اس کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، پھر یہ کیسے ممکن ہے، کہ کسی حدیث کی صحت کے لئے تاریخی شہادت نہ مل سکے، اور پھر بھی وہ حدیث صحیح بخاری میں شامل ہو جائے۔

غلط فہمی "گذشتہ صفحات میں آپ دیکھ چکے، کہ احادیث کا کیا حال ہو چکا تھا، راویوں کے حالات کس بے احتیاطی سے قلمبند ہوئے تھے، اور وہ ایک دوسرے کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے" (دو اسلام ص۱۷۶)

ازالہ ان غلطیوں کے ازالہ کے لئے گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں متعلقہ ابواب ملاحظہ فرمائیں۔

غلط فہمی "احادیث کی حیثیت محض تاریخ کی ہے، تاریخ میں غلط باتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور صحیح بھی، فرق صرف اتنا ہے، کہ ایک مورخ تدوین تاریخ میں اس قدر خلوص اور محنت سے کام نہیں لے سکتا، جتنا کہ امام بخاری نے لیا" (دو اسلام ص۱۷۶-۱۷۷)

ازالہ جب مورخ تدوین تاریخ میں اس قدر خلوص سے کام نہیں لے سکتا، جتنا امام بخاری نے لیا پھر بھی حدیث کو تاریخ کی حیثیت دینا عجیب ہے، بے شک تاریخ میں غلط باتیں ہوتی ہیں جیسا کہ برق صاحب کو اعتراف ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے، کہ وہاں واقعہ کی تنقید کے لئے نہ کوئی ٹھوس معیار ہوتا ہے، نہ مورخین اس کی کوئی خاص ضرورت ہی سمجھتے ہیں، جو سنا لکھ لیا، خواہ وہ واقعہ فرضی ہی کیوں نہ ہو، لیکن احادیث کا معاملہ بالکل الگ ہے، یہاں ہر واقعہ، ہر قول و فعل کی سند ہوتی ہے، پھر ایک سند نہیں ہوتی، بلکہ متعدد سندیں ہوتی ہیں، پھر ہر زمانہ میں سند پر بھی بحث ہوتی ہے، اور متن پر بھی، تمام فنون حدیث سے اسے پرکھا جاتا ہے، جب وہ تمام مراحل تنقید کو طے کر لیتی ہے، تو قابل اعتماد کہلاتی ہے، اس کو صحیح کہا جاتا ہے، یہاں نہ جانبداری ہوتی ہے، نہ بغض و تعصب، نہ مداہنت نہ تعسف، بلکہ پوری ہوشیاری، تندہی، ایمان و دیانتداری سے ہر حدیث کو پرکھا جاتا ہے، اس تنقید کے بعد جو حدیث صحیح کہلائے، اور تمام ناقدین کے نزدیک صحیح کہلائے اس کو تاریخ کا درجہ دینا بڑی زبردست غلط فہمی ہے

غلط فہمی "رسول اللہ صلعم نے خسرو پرویز شاہ ایران ..... اور ہرقل قیصر روم ..... کی طرف خطوط بھیجے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی، ہرقل نے قاصد رسول کی بڑی تعظیم کی، لیکن کسریٰ (شاہ ایران) نے خط پھاڑ ڈالا، اور قاصد کو ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیا، جب حضور کو اس سلوک کی اطلاع ملی، تو آپ

نے ایک پیشین گوئی کی قیصر کے حسن سلوک، اور کسریٰ کی بدتمیزی کا تقاضا تو یہ تھا، کہ حضور صرف نسل کسریٰ کے خاتمہ کی پیشگوئی فرماتے اور ہرقل کے لئے اسی طرح محبت کا اظہار کرتے جس طرح وہ نجاشی سے کیا کرتے تھے لیکن جو پیش گوئی بخاری میں موجود ہے، وہ ہماری اس تمنا کو پورا نہیں کرتی۔

عن ابی هریرۃ ان رسول اللہ صلعم	ابو ہریرہ نبی کریم صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ
قال اذا ھلك كسرى فلا كسرى بعده	آپ نے فرمایا، کسریٰ کے تباہ ہونے کے بعد
واذا ھلك قیصر فلا قیصر بعده	کوئی اور کسریٰ نہیں ہوگا، اور نہ قیصر کے بعد کوئی اور قیصر"

(دو اسلام ص۱۶۷-۱۶۸)

الازالہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر دی گئی، کہ کسریٰ نے آپ کا نامہ مبارک چاک کر ڈالا تو آپ نے یہ پیشین گوئی نہیں فرمائی، جو برق صاحب نے نقل کی ہے، بلکہ آپ نے اس وقت صرف یہ فرمایا تھا، کہ:۔

ان یمزقوا کل ممزق (صحیح بخاری) یعنی وہ پارہ پارہ ہو جائیں گے

اور فرمایا، مزق کسری ملکہ" کسریٰ نے اپنی سلطنت کو چاک کر ڈالا (رحمۃ للعالمین جلد ۳ ص۲۰۵ بحوالہ بیہقی) کیونکہ خسرو نے انتہائی ذلیل و گستاخانہ حرکت کی تھی، لہٰذا اس کے حق میں یہ بددعا اور پیشین گوئی فرمائی، اور فعل نازیبا کی سزا میں وہ اور اس کی سلطنت دونوں کے پرخچے بہت جلد اڑ گئے، اس واقعہ کو اس پیشین گوئی سے جس کو برق صاحب نے نقل فرمایا ہے، کوئی تعلق نہیں، برق صاحب نے غلط فہمی سے اس پیشین گوئی کے پس منظر میں اس واقعہ کو پیش کر دیا۔

برق صاحب کا یہ فرمانا، کہ ہرقل کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح محبت کا اظہار کرتے جس طرح نجاشی کے لئے کیا کرتے تھے، کسی طرح بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ نجاشی مسلمان ہو گئے تھے، اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کیا کرتے تھے، برخلاف اس کے ہرقل مسلمان نہیں ہوا، بلکہ اسلامی فوجوں کے مقابلہ میں جنگ کرتا رہا، بھلا دونوں بادشاہوں کو ایک پلڑے میں کیسے رکھا جا سکتا ہے اس کے معنی یہ ہیں، کہ دوست، دشمن، وفادار و باغی، کفر و ایمان برابر ہیں، اور ان میں کوئی فرق نہیں ایک بادشاہ وفادار، اطاعت گذار، دوسرا نافرمان، باغی، اور دونوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کا مطالبہ کیا یہ تعجب خیز نہیں؟ قابل اعتراض بات تو برق صاحب خود کر بیٹھے، اور غلط فہمی سے صحیح بخاری پر اعتراض کر دیا۔

ایک غلط فہمی برق صاحب کو یہ بھی ہوئی کہ وہ بددعا اور پیشنگوئی کو ایک سمجھ بیٹھے، قیصر کے حق میں جب

الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے، وہ پیشین گوئی تو کہے جا سکتے ہیں، لیکن بددعا سے ان کا کوئی تعلق نہیں، لہٰذا برق صاحب کا یہ فرمانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے باادب شخص کے لئے بددعا کیوں کی، صحیح نہیں، آپ نے بددعا نہیں کی، بلکہ ایک پیشین گوئی فرمائی تھی، اور پیشین گوئی باادب کافر تو کجا مسلم، وفادار، اطاعت گذار کے لئے بھی کی جا سکتی ہے، جیسا کہ مسلمانوں کے زوال کے متعلق مختلف پیشین گوئیاں احادیث میں موجود ہیں۔

غلط فہمی "کسریٰ کے متعلق یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، آنحضرت کی رحلت سے صرف دس برس بعد ۲۲ھ میں جنگ نہاوند نے ساسانی خاندان کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا، کچھ عرصہ بعد آخری کسریٰ یزدگرد قتل ہو گیا، اور اس کے بعد آج تک پھر کوئی کسریٰ پیدا نہ ہوا، چاہیئے تو یہ تھا کہ قیصر کے متعلق بھی یہ پیش گوئی اسی طرح پوری ہوتی، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا" (دو اسلام ص۱۷۸)

ازالہ کسریٰ کے متعلق اگر یہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی، کہ خسرو مارا گیا، اور سلطنت ختم ہو گئی، تو یہ صحیح نہیں، خسرو کے بعد بھی کئی بادشاہ ہوئے، اسی طرح ہرقل سوم کے بعد بھی کئی بادشاہ ہوئے، اگرچہ زیادہ ہوئے، پیشین گوئی میں یہ نہیں ہے، کہ ایسا کب ہوگا، پیشین گوئی صرف اتنی ہے، کہ جب یہ دونوں سلطنتیں اپنے آخری حکمران کے ساتھ ختم ہو گئیں، تو پھر دوبارہ ان کی حکومتیں قائم نہیں ہوں گی"

برق صاحب آپ کو یہ تو اعتراف ہے، کہ کسریٰ کے متعلق یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اور حرف بحرف پوری ہوئی، لیکن کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ یہ پیشین گوئی بھی پوری نہیں ہوئی، اس لئے کہ آپ نے تو یہ فرمایا تھا، کہ کسریٰ (یعنی خسرو پرویز) ہلاک ہو گیا، تو پھر کوئی کسریٰ نہیں ہوگا، لیکن باوجود اس کے کہ خسرو ہلاک ہو گیا، کسریٰ پھر بھی ہوئے، آخر اس وقت آپ کیا جواب دیں گے، کسریٰ کی ہلاکت کے بعد اگر ایک کسریٰ کا بھی ہوا ہوتا تو بھی یہی اعتراض ہوتا، کہ پیشین گوئی صحیح نہیں نکلی، لیکن آپ فرماتے ہیں، کہ حرف بحرف پوری ہوئی، جو توجیہ اس کی آپ فرمائیں گے، وہی قیصر کے متعلق بھی سمجھ لیجیئے گا۔

کسریٰ خاندان اس لئے جلد ختم ہو گیا، کہ اس کے حق میں اس کی ذلیل حرکت کی وجہ سے بددعا کی گئی تھی، قیصر خاندان اس لئے دیر میں ختم ہوا، کہ اس نے کوئی ذلیل حرکت نہیں کی، بلکہ بقول آپ کے قاصد رسول کی بڑی تعظیم کی (دو اسلام ص۱۷۷) نامہ مبارک کی بہت تکریم کی اور حفاظت کے ساتھ خزانہ شاہی میں رکھ دیا (خالص اسلام ص۲۱۳) اسی شریفانہ حرکت کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے بددعا نہیں کی، بلکہ فرمایا "واما هو لاء فتكون لهم بقية" یعنی ہرقل

اور اس کی کل اولاد کے لئے فوری ہلاکت نہ ہوگی، بلکہ وہ ابھی کچھ عرصہ باقی رہیں گے (خالص اسلام مصنفہ علامہ محمد داؤد راز صفحہ ۲۱۴) یہ تشریح خود حدیث میں موجود ہے، لہٰذا اعتراض یا اشکال کا کوئی موقعہ ہی نہیں برق صاحب تھوڑی تکلیف گوارا کرتے، تو یہ غلط فہمی دور ہو سکتی تھی

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ (الانبیاء) لوگوں کے حساب کا وقت قریب آگیا اور وہ ابھی تک غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے، کہ حساب کا وقت قریب آگیا لیکن زمانہ شاہد ہے، کہ تقریباً ایک ہزار چار سو سال گذر چکے، وقت حساب ابھی تک نہیں آیا، یہ کیسا قرب ہے، بات یہ ہے کہ ہم جس کو بعید سمجھ رہے ہیں، اللہ کے نزدیک وہ قریب ہے، اسی طرح ہو سکتا ہے، کہ ہم جس مدت کو دراز سمجھ رہے ہوں، اللہ کے نزدیک وہ قصیر ہو، اگر ہم لفظوں پر اس طرح اڑ جائیں، تو پھر قرآن مجید کو بھی اعتراض سے بچانا مشکل ہو جائے گا مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

أَتُرِيدُونَ أَن تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ (سورہ نساء) کیا تم اس شخص کو راہ راست پر لانے کا ارادہ کر رہے ہو، جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا۔

لیجئے اللہ کا کام گمراہ کرنا بھی ہے، کیا بغیر تاویل کے آپ اس آیت کی صفائی کر سکتے ہیں، اس قسم کی ایک دو نہیں سینکڑوں آیات ہیں جن کی صفائی بغیر تاویل کے ناممکن ہے۔

غلط فہمی

"آٹھ سو برس قوموں کی قدرتی عمر ہے، اتنی لمبی زندگی کے بعد اگر کوئی سلسلہ منقطع بھی ہو جائے تو کوئی عقلمند یہ باور نہیں کرے گا، کہ اس کا خاتمہ کسی پیشین گوئی کی وجہ سے ہوا تھا" (صفحہ ۱۷۹)

ازالہ

برق صاحب کو یہاں پھر غلط فہمی ہوئی، وہ بد دعا اور پیشین گوئی کو ایک سمجھ رہے ہیں، کسی کے خاتمہ کا سبب بد دعا کو تو کہا جا سکتا ہے، لیکن پیشین گوئی کو اس خاتمہ کا سبب نہیں کہا جا سکتا پیشین گوئی تو صرف اس کا نام ہے، کہ واقعہ کے ظہور سے پہلے اس واقعہ کی خبر دے دی جائے، اگر کسی واقعہ کے متعلق کوئی پیشین گوئی نہ ہو، تب بھی وہ واقعہ تو ظاہر ہو کر رہتا ہے، اس کے وقوع میں پیش گوئی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

غلط فہمی

"اگر حضور نے واقعی یہی فرمایا تھا، کہ قیصر کے بعد کوئی اور قیصر نہیں ہوگا، تو آپ کا اشارہ اس قیصر کی طرف ہوگا، جو اس وقت تخت نشین تھا" (دو اسلام صفحہ ۱۷۹)

ازالہ:۔ اسی اصول پر اس پیشین گوئی کو بھی پرکھئے۔ "کہ کسریٰ کے بعد اور کوئی کسریٰ نہیں ہوگا" تو آپ کا

اشارہ اس کسریٰ کی طرف ہوگا، جو اس وقت تخت نشین تھا، تو پھر ظاہر ہے، کہ خسرو کی ہلاکت کے بعد کوئی اور بادشاہ نہیں ہونا چاہیے، لیکن ایک نہیں کئی ہوئے، تو پھر پیشین گوئی کا یہ حصہ بھی حرف بحرف پورا نہیں ہوا، لیکن برقی صاحب تسلیم کرتے ہیں، کہ کسریٰ والی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، تو پھر بتائیے کہ قیصر والی پیشین گوئی کو حرف بحرف پورا ہونے میں کیا امر مانع ہے؟ اگر برقی صاحب تھوڑی سی تاویل کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں، تو حدیث کے دوسرے معانی بھی ہو سکتے ہیں، اور ان معانی کی صورت میں نہ کسریٰ والی پیشین گوئی میں اشکال وارد ہوگا، نہ قیصر والی پیشین گوئی میں

کسریٰ اور قیصر دونوں نکرہ واقع ہوئے ہیں، لہٰذا نہ کسریٰ سے خسرو مراد ہے، نہ قیصر سے ہرقل سوم کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسریٰ اور قیصر نکرہ ہیں، لہٰذا ان دونوں سے مراد حکومت و سلطنت ہے اور اس لحاظ سے پیشین گوئی میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ ان سلطنتوں کی تباہی کے بعد آج تک کسریٰ اور قیصر کی حکومتیں پھر دوبارہ قائم نہیں ہوئیں۔

غلط فہمی اگر کوئی غیر مسلم ہم سے پوچھ بیٹھے، کہ کیا تمہارے نبی (علیہ السلام) کی تمام پیش گوئیاں ایسی ہی ہوا کرتی تھیں، تو ہم اس طنز کا کیا جواب دیں گے، بغیر اس کے کہ اس حدیث میں قیصر والا حصہ بعد کا اضافہ تسلیم کریں" (دو اسلام ص۱۸۱)

ازالہ برقی صاحب آپ خاطر جمع رکھیے، غیر مسلم احادیث کی طرف رخ نہیں کرے گا، الاماشاءاللہ، وہ تو قرآن پر اعتراض کرے گا، اس اعتراض کو دور کرنے کے لئے تیار رہیے، مثلاً قرآن میں پیشگوئی ہے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ	بے شک جو لوگ کافر ہیں، انہیں آپ ڈرائیں یا
أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (البقرۃ)	نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے

اس پیشین گوئی میں اس بات کی صراحت ہے، کہ کافر ایمان نہیں لائیں گے لیکن زمانہ اور تاریخ شاہد ہیں، کہ ایک دو نہیں لاکھوں کافروں نے اسلام قبول کیا، ایمان لائے، تو کیا اس شہادت کی موجودگی میں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اگر کوئی غیر مسلم ہم سے پوچھ بیٹھے، کہ کیا تمہارے قرآن میں ایسی پیشین گوئیاں مندرج ہیں، تو ہم اس کا سوائے تاویل کے اور کیا جواب دے سکتے ہیں رہی حدیث زیر بحث تو اس کا جواب اوپر دیا ہی جا چکا ہے

مذکورہ بالا آیت پر اعتراض کرتے ہوئے سوامی دیانند لکھتے ہیں:۔

"اور جو بھولے راستہ پر ہیں، ان کو یہ قرآن راستہ نہیں دکھلا سکتا، پھر کس کام کا رہا"

اور اس سے اگلی آیت کے متعلق لکھتے ہیں:۔

• اگر خدا ہی نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگائی ہے، اور اس لئے وہ گناہ کرتے ہیں، تو ان کا بھی قصور نہیں، یہ قصور بھی خدا ہی کا ہے" (تسمیہ رتقدیر کا کش باب ۴۴ امت ۶۹۶ و مثلث ۶۹۷)

اب بتائیے اس قسم کی طنزوں کا سوائے تاویل کے اور کیا جواب ہے، جس طرح یہاں تاویل کی ضرورت ہے، اسی طرح بعض احادیث کی بھی تاویل کرنی پڑتی ہے، سوائے تاویل کے نہ وہاں چارہ ہے نہ یہاں، اور اگر تاویل نہ کریں، تو کیا نعوذ باللہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ یہ آیت انسانی اضافہ ہے، انصاف کی ضرورت ہے۔

غلط فہمی • حضرت سلیمان نے ۱۰۰۱ ق م میں مسجد اقصیٰ کی بنیاد ڈالی تھی، اگر عام تاریخوں پر اعتبار کرتے ہوئے ہم حضرت ابراہیم کی تاریخ وفات اندازاً ۲۰۰۰ ق م قرار دیں، اور مکہ کی تعمیر ۲۰۷۰ کے قریب فرض کریں، تو تعمیر مکہ اور تعمیر بیت المقدس کے درمیان ۱۰۵۹ برس کا زمانہ بنتا ہے ... لیکن بخاری کی ایک حدیث کے مطابق یہ زمانہ صرف چالیس سال بنتا ہے .... ہے کوئی محدث جو اس صریح تاریخی غلط بیانی کی کوئی تاویل پیش کر سکے" (دو اسلام ص ۱۸۳ - ۱۸۴)

ازالہ برق صاحب صحیح بخاری کا تو اعتبار کیا جا سکتا ہے، یہاں ہر چیز باسند ہے، رہی تاریخ تو اس کا اعتبار کیسے ہو سکتا ہے، وہاں الا ماشاء اللہ ہر چیز بے سند، من گھڑت، لہٰذا ہم تو یہ کہتے ہیں کہ صحیح بخاری کی مدت صحیح ہونی چاہیئے، اور تاریخ کی غلط، لیکن بات درحقیقت یہ ہے کہ نہ صحیح بخاری کی مدت غلط ہے نہ تاریخ کی، برق صاحب کو غلط فہمی ہو گئی، تاریخ میں بنائے ابراہیم علیہ السلام اور بنائے سلیمان علیہ السلام کی درمیانی مدت کا ذکر ہے، اور صحیح بخاری میں ان دونوں کی بنائے اولین کی درمیانی مدت کا بیان ہے

غلط فہمی • اگر حقیقۃً مسجد اقصیٰ ایک مرتبہ پہلے بن چکی تھی، تو تاریخی ثبوت لائیے، کوئی کتاب سند یا روایت پیش کیجیئے" (دو اسلام ص ۱۸۴)

ازالہ تاریخی ثبوت کی ہمیں کیا ضرورت؟ تاریخ کا کیا اعتبار؟ کتاب جو پیش کی جا رہی ہے، وہ صحیح بخاری ہے، سند جو پیش کی جا رہی ہے، وہ ٹھوس و مستند ہے، کتاب بھی اصح الکتب بعد القرآن، مقبول انام، اور سند بھی ٹکسالی بھلا اس کو تقویت دینے کے لئے کسی تاریخ کے ضعیف، غیر مستند حوالہ کی ضرورت ہے؟ ہاں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ فلاں تاریخی واقعہ کے لئے صحیح بخاری سے تائیداً کوئی روایت پیش کیجیئے، لیکن اس کا عکس بالکل نامناسب اور لایعنی ہے

حدیث زیر بحث اور تاریخ: ہمیں ضرورت تو نہیں، کہ صحیح بخاری کی تائید میں کوئی کتاب یا

روایت پیش کریں، لیکن برق صاحب کی خاطر یہ مطالبہ بھی پورا کئے دیتے ہیں، امام قرطبی فرماتے ہیں:۔

قد روی ان اول من بنی البیت آدم (حاشیہ نسائی مرتبہ اشفاق الرحمن ص۲۴ مطبوعہ مکتبہ رحیمیہ دہلی)	بے شک روایت کیا گیا ہے، کہ سب سے پہلے کعبہ کو آدم علیہ السلام نے بنایا تھا،

مصنف عبد الرزاق میں ہے، کہ عطاء، سعید بن مسیب وغیرہما کہتے ہیں:۔

ان آدم بناہ (تفسیر ابن کثیر ج۱ ص۱۷۳)	اس کو آدم علیہ السلام نے بنایا ہے۔

اشفاق الرحمن صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

قال الحافظ ابن حجر فی کتاب التیجان لابن ھشام ان آدم لما بنی الکعبۃ امرہ اللہ تعالی بالسیر الی بیت المقدس وان یبنیہ فبناہ ونسک فیہ (حاشیہ نسائی ص۸)	حافظ ابن حجر کہتے ہیں، کہ ابن ہشام کی کتاب التیجان میں ہے، کہ جب آدم علیہ السلام کعبہ تعمیر کر چکے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بیت المقدس کی طرف جانے کا حکم دیا، اور اس کو بنانے کا حکم دیا پس آدم علیہ السلام نے اس کو بنایا، اور اس میں عبادت کی،

لہٰذا حدیث زیر بحث میں جن عمارتوں کا ذکر ہے، وہ آدم علیہ السلام کی تعمیر کردہ عمارتیں ہیں، نہ کہ ابراہیمی اور سلیمانی عمارتیں، لیجئے اب تو تاریخ سے بھی حدیث کی تائید ہوگئی، برق صاحب ذرا تحقیق سے کام لیتے تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی، اس کی مزید تائید کے لئے مندرجہ ذیل روایت ملاحظہ فرمائیں۔

عن ابن عباس قال لما مر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوادی عسفان حین حج قال یا ابا بکر ای واد ھذا قال وادی عسفان قال لقد مر بہ ھود وصالح علی بکرات حمر خطمھا اللیف ازرھم العباء واردیتھم النمار یلبون یحجون البیت العتیق (مسند امام احمد فتح ربانی جز ۲۰ ص۱۴۲)	یعنی حضرت ابن عباس فرماتے ہیں، کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کرتے وقت وادی عسفان سے گذرے، تو آپ نے دریافت فرمایا، اے ابوبکر یہ کون سی وادی ہے، انہوں نے عرض کیا یہ وادی عسفان ہے، آپ نے فرمایا، یہاں سے ہود اور صالح علیہ السلام بھی سرخ اونٹنیوں پر گذرے ہیں...... وہ حج کرتے تھے اس بیت عتیق (یعنی کعبہ) کا

کیونکہ ان دونوں پیغمبروں کا زمانہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہے، لہٰذا کعبہ حضرت ابراہیم سے پہلے بھی موجود تھا

حدیث زیر بحث اور صحیح بخاری

صحیح بخاری کی حدیث مذکورہ مع اپنے سیاق و سباق کے خود اس کی تشریح کے لئے کافی ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا

سوال ملاحظہ فرمایئے، وہ پوچھتے ہیں:۔

ای مسجد وضع فی الارض اول — روئے زمین پر سب سے پہلے کونسی مسجد بنائی گئی

اس سوال کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے، کہ اس سے مراد بنائے ابراہیمی ہے، کیا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے مساجد نہیں تھیں، ضرور تھیں، لہذا سوال اپنی جگہ پر واضح ہے، کہ انسانی آبادی کے بعد جو مسجد سب سے پہلے بنائی گئی وہ کونسی تھی، اور یہ وہی مسجد ہو سکتی ہے، جس کو آدم علیہ السلام نے بنایا ہو، لہذا حدیث مذکورہ اعتراض سے بالکل خالی ہے

حدیث زیر بحث اور قرآن مجید برق صاحب تو حدیث کی تائید میں تاریخی حوالہ کا مطالبہ کرتے تھے، ہم حدیث کی تائید میں قرآن مجید کی آیات پیش کرتے ہیں، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ (آل عمران)

سب سے پہلا گھر جو انسانوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہ، وہ ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور عالمین کے لئے ہدایت۔

اگر اس سے مراد بنائے ابراہیمی ہے، تو جو اعتراض حدیث پر تھا، وہی قرآن پر ہوگا، ابراہیم علیہ السلام سے پہلے سیکڑوں پیغمبر دنیا میں تشریف لائے، کیا کسی نے مسجد نہیں بنائی؟ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے مسجد بنائی، یہ بات بالکل قرین قیاس نہیں ہو سکتی، برق صاحب بات دراصل یہ ہے، کہ آپ تو خیر صحیح حدیث کو مانتے تو ہیں کہیں کہیں آپ کو غلط فہمی ہو جاتی ہے، بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو قطعاً حدیث کو نہیں مانتے، حدیث پر لغو قسم کے اعتراض کرتے رہتے ہیں، معلوم نہیں کس وجہ سے وہ اس قسم کا اعتراض قرآن پر نہیں کرتے، اور پھر اس کی صحت کا انکار نہیں کرتے، غالباً اس کی وجہ یہی ہوگی، کہ وہ اپنے گمان میں یہ سمجھتے ہیں، کہ پھر ہمیں مسلمان کون کہے گا، حدیث کی مخالفت اور قرآن کی موافقت سے بہرحال نادان لوگ ہمیں مسلمان تو سمجھ لیتے ہیں، اور ہماری بات سن لیتے ہیں، اور مان لیتے ہیں، اگر قرآن کا انکار کریں، یا اس پر اعتراض کریں، تو کوئی کچھ سنے گا ہی نہیں حالانکہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، وہ مسلمان رہ کر بھی قرآن کا انکار کر سکتے ہیں، وہ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ہم اللہ تعالےٰ کو ایک مانتے ہیں، قیامت پر فرشتوں پر، کتب سماوی پر اور رسولوں پر ہمارا ایمان ہے، لیکن یہ قرآن وہ قرآن نہیں ہے، جو اللہ تعالےٰ نے نازل فرمایا تھا، اس میں تحریف ہو چکی ہے، اور مسلمانوں کا ایک جم غفیر اس تحریف پر ایمان رکھتا ہے، اور خود قرآن کی عبارت بھی اس کی شاہد ہے، وہ یہ کہ ہم اس بات پر کبھی یقین نہیں کر سکتے، کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کوئی مسجد

تھی ہی نہیں، اور یہ کہ روئے زمین پر سب سے پہلی مسجد بنائے ابراہیمی ہے، یہ ایک تاریخی غلطی ہے، جو کسی دشمن اسلام نے پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لئے قرآن میں داخل کر دی ہے، وغیرہ وغیرہ، کاش یہ لوگ حدیث کا انکار کرنے سے پہلے قرآن پر بھی نظر ڈال لیتے

حدیث زیر بحث کی تائید میں ایک اور قرآنی شہادت

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (البقرة ۵)

اور وہ وقت یاد کرو جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کعبہ کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے، اور وہ دعا کر رہے تھے کہ ہمارے رب اس خدمت کو ہم سے قبول فرما، بیشک تو سمیع و علیم ہے

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، اول بنیادیں پہلے سے موجود تھیں، جن کو اٹھایا جا رہا تھا، یعنی کعبہ کبھی پہلے تعمیر ہو چکا تھا، جس کی بنیادیں باقی رہ گئی تھیں، حافظ عمادالدین ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

وفی ھذا السیاق ما یدل علی ان قواعد البیت کانت مبنیۃ قبل ابراھیم (تفسیر ابن کثیر ج اول ص ۱۷۹)

یعنی اس سیاق سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ کعبہ کی بنیادیں تعمیر ابراہیم علیہ السلام سے پہلے موجود تھیں۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے، کہ حضرت عبداللہ بن عباس رض فرماتے ہیں:۔

القواعد التی کانت قواعد البیت قبل ذلک

یعنی کعبہ کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں (تفسیر ابن کثیر جلد اول ص ۱۷۹)

دوم کعبہ کی تعمیر میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی شریک تھے، دوسری آیت میں ارشاد باری ہے:۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (ابراھیم)

(ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں) اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد کو اس بنجر وادی میں تیرے باحرمت گھر کے پاس آباد کر دیا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہے، کہ اسمٰعیل علیہ السلام کے آباد کرنے سے پہلے وہاں کوئی باحرمت مسجد موجود تھی، جس کے قرب کو حاصل کرنے کے لئے حضرت اسمٰعیل کو وہاں آباد کیا گیا، آباد کرنے کا واقعہ اسمٰعیل علیہ السلام کی شیرخوارگی کے زمانہ میں واقع ہوا تھا، ظاہر ہے، کہ اس وقت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کردہ کعبہ کی عمارت وہاں موجود نہ تھی، کیونکہ وہ تو بعد میں بنی، اور اسمٰعیل علیہ السلام کی جوانی کے زمانہ میں بنائی گئی

وہ بھی اس تعمیر میں شریک تھے، اگر آباد کرنے کا واقعہ بعد کا واقعہ ہے، تب تو یہ کہا جا سکتا ہے، کہ ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کرنے کے بعد اس باحرمت گھر کی قربت و برکت حاصل کرنے کے لئے حضرت اسمٰعیل کو وہاں آباد کیا، لیکن حقیقت یہ ہے، کہ آباد پہلے کیا گیا، اور کعبہ بعد میں بنایا گیا، آباد اس لئے کیا گیا کہ یہاں اللہ کا باحرمت گھر تھا، ورنہ اس بے آب و گیاہ ریگستان میں آباد کرنے کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا، کسی دوسری اچھی جگہ بھی آباد کیا جا سکتا تھا، اور وہاں مسجد تعمیر ہو سکتی تھی، لہٰذا ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے ہو چکی تھی، مرور ایام سے یا طوفان نوح میں اس کی عمارت منہدم ہو گئی تھی، صرف بنیاد باقی رہ گئی تھی، اور اسی بنیاد پر ابراہیم علیہ السلام نے از سر نو کعبہ کی تعمیر کی تھی، اس کی مزید تائید میں قرآن مجید کی یہ آیت ملاحظہ فرمایئے، اللہ تعالےٰ حضرت ابراہیم کو حکم دیتا ہے۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (حج) — اور حج کرنے کے لئے لوگوں میں اعلان کر دو

پھر فرمایا:۔

ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ (حج) — (اے ابراہیم) جب لوگ حج کرنے آئیں اور قربانی کر چکیں تو پھر وہ نہائیں دھوئیں، اپنی نذریں پوری کریں اور اس بیت قدیم کا طواف کریں

(بیت عتیق کے معنی پرانا گھر۔ مفتاح اللغات) اس آیت سے معلوم ہوا، کہ اللہ تعالےٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جو حج کا حکم دیا، تو اس کعبہ کو بیت قدیم کہا، اگر یہ ابراہیم علیہ السلام ہی نے بنایا ہوتا، تو بیت جدید کہنا چاہیئے تھا، بیت قدیم کہنے سے یہ ثابت ہو گیا، کہ یہ گھر بہت پرانا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے صدیوں پہلے بنایا گیا تھا۔

اب بیت المقدس کے متعلق قرآن کا فیصلہ سنیئے، جب آگ کی تلاش میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پہنچے، تو آواز آئی۔

اِنِّیْ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (طٰہٰ) — اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں تم اپنی جوتیاں اتار دو، تم مقدس میدان میں کھڑے ہو۔

اس آیت سے ظاہر ہے، کہ طور پہاڑ اور اس کا میدانی علاقہ پہلے سے مقدس تھا، اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے، کہ جب وہاں پہلے سے کوئی بیت مقدس چلا آ رہا ہو، جس کی وجہ سے آس پاس کا علاقہ بھی محترم قرار دے دیا گیا ہو، پس اس آیت سے ظاہر ہوا، کہ سلیمان علیہ السلام تو کجا موسیٰ علیہ السلام سے بھی بہت پہلے یہاں کوئی بیت مقدس موجود تھا، جس کی وجہ سے تمام قرب و جوار کا علاقہ بابرکت

وبا حرمت تھا۔ اسی برکت اور حرمت کا ذکر قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں بھی موجود ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا	پاک ہے وہ جو لے گیا راتوں رات اپنے بندے کو
مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ	کعبہ سے بیت المقدس، وہ بیت المقدس جس کے
الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ (بنی اسرائیل)	آس پاس علاقے کو ہم نے بابرکت بنایا ہے

غرض یہ کہ بیت المقدس اور اس کے آس پاس کا علاقہ مقدس وبابرکت تھا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، کہ جوتیاں اتار دو، دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْھُمْ فَاَغْرَقْنٰھُمْ فِی الْیَمِّ	ہم نے قوم فرعون سے انتقام لیا، اور ان کو دریا
بِاَنَّھُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا عَنْھَا	میں غرق کر دیا، اس وجہ سے کہ انہوں نے
غٰفِلِیْنَ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ	ہماری آیات کو جھٹلایا، اور اس سے غفلت برتی،
کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ	اور ہم نے کمزور قوم کو اس سرزمین کے مشرق
وَمَغَارِبَھَا الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا وَتَمَّتْ	ومغرب کا وارث بنا دیا، جہاں کہ ہم نے برکت
کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ	رکھی تھی، اور بنی اسرائیل پر تیرے رب
(الاعراف)	کی نعمت پوری ہو گئی۔

اس آیت میں بھی شام وفلسطین کی برکت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام ہجرت کر کے وہیں چلے گئے تھے، اور یہ برکت اس سرزمین میں موسیٰ علیہ السلام سے قبل ایک زمانہ سے چلی آ رہی تھی،

ایک اور آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَۃَ الَّتِیْ	(حضرت موسیٰ نے فرمایا) اے قوم ارض مقدس میں
کَتَبَ اللہُ لَکُمْ (المائدہ)	داخل ہو جاؤ، یہ اللہ نے تمہارے لئے لکھدی ہے

موسیٰ علیہ السلام کا اس سرزمین کو مقدس فرمانا، اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے، جب وہ زمین پہلے سے مقدس چلی آ رہی ہو، اور یہ بھی ظاہر ہے، کہ جب تک وہاں کوئی بیت مقدس نہ ہو، محض زمین مقدس نہیں ہو سکتی پس ثابت ہوا، کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے صدیوں پہلے اس سرزمین میں بیت المقدس تعمیر ہو چکا تھا، قرآن سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا، کہ بیت المقدس کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا، ہاں یہ ضرور ثابت ہوتا ہے، کہ موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے بیت المقدس کو تعمیر کیا گیا تھا، اور اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں، کہ سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کو بنایا تھا، تو یہ بنائے ثانیہ ہو گی، نہ کہ بنائے اولیں، اس لئے کہ بنائے اولیں تو موسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے بن چکی تھی۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہوا، کہ حدیث زیرِ بحث میں کعبہ اور بیت المقدس کی بنائے اولین کا ذکر ہے، جو ابراہیم علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام سے بہت پہلے بنائی گئی تھیں، اور ان دونوں بنائے اولین کی درمیانی مدت چالیس سال تھی، کاش برق صاحب قرآن مجید کا غور سے مطالعہ فرماتے تو ان دونوں عمارتوں کی بنائے اولین کا ثبوت انہیں قرآن ہی میں مل جاتا، اور یہ غلط فہمی نہ ہوتی حقیقت یہ ہے کہ حدیث فہمی میں غلطی ہوتی ہی اس وقت ہے، جب کہ اس ضمن میں قرآن مجید سے پوری طرح واقفیت نہیں ہوتی۔

غلط فہمی "اگر ہم یہ کہہ دیں، ممکن ہے، کہ امر کیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا، تو کیا آپ مان لیں گے" (دو اسلام ص ۱۵۴)

ازالہ یہ بات اگر آپ اپنی طرف سے کہیں گے، تو ہم نہیں مانیں گے، اگر آپ آیت یا حدیث پیش کریں گے تو ہم ضرور مان لیں گے، آیت اور حدیث کا تعلق ایمان سے ہے، ہمارا ایمان ہے، کہ آیت یا حدیث کی خبر غلط نہیں ہو سکتی، اس کا صحیح ہونا یقینی ہے، لہٰذا یقینی چیز کو تاریخی خرافات کے بل بوتے پر ہم ہرگز نہیں چھوڑ سکتے، مثلاً ہمارا ایمان ہے، کہ قرآن کے مطابق سب سے پہلی مسجد کعبہ ہے، لیکن کعبہ تاریخی روایات کی بنا پر اور خود قرآن کی تصریح کی بنا پر ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے، لہٰذا اس کے سب سے پہلی مسجد مان لینے سے یہ اشکال پیدا ہوگا، کہ گویا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کوئی مسجد بنی ہی نہیں، اور یہ ناممکن ہے، لہٰذا اس اشکال کو دور کرنے کے لئے ہم یہی کہیں گے، کہ ممکن ہے کہ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے اس کو بنایا ہو، اور ابراہیم علیہ السلام نے صرف تجدید کی ہو، لیکن اس اشکال کی وجہ سے ہم کبھی یہ نہ کہیں گے کہ یہ آیت ہی محل نظر ہے، ممکن ہے انسانی اضافہ ہو، برق صاحب کا یہ کہنا کہ "ممکن ہے ایسا ہوا ہو" یا "تاویل کرنا" اسی لئے ضروری ہوتا ہے، کہ یقینی چیز پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

غلط فہمی "سیرت کی تمام کتابیں اس حقیقت پر متفق ہیں، کہ حضور علیہ السلام کی عمر تریسٹھ برس تھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے

عن عائشۃ ان النبی صلعم توفی وھو ابن ثلاث وستین | کہ نبی کریم صلعم نے تریسٹھ سال کی عمر میں رحلت کی (بخاری جلد ۲ ص ۱۷۵)

لیکن حضور کے خادم خاص حضرت انس جو ۱۲۶۸ احادیث کے راوی بھی ہیں، کہتے ہیں، کہ رسول اللہ صلعم کی عمر ساٹھ برس تھی ...... (دو اسلام ص ۱۵۵)

"بے شمار کتب سیرت کی شہادت اور ابن عباس رضی اللہ عنہ و عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کی روشنی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ

کی روایت قطعاً غلط ہے حیرت ہے، کہ امام بخاری نے اس غلط روایت کو اپنی "صحیح" میں کیوں جگہ دی اور زیادہ حیرت اس امر پر کہ جب انس کو اپنے آقا، رہبر اور پیغمبر کی عمر تک معلوم نہیں تھی اس کی باقی ۸۴ روایات کو امام بخاری نے کیسے صحیح سمجھ لیا۔" (دو اسلام ص۱۸۶)

ازالہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، حضرت انس رضؓ نے دہائیوں کا ذکر کیا ہے، اور تین سال کی مدت کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، یہ نہیں کہ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر معلوم نہیں تھی معلوم تھی، اور ضرور معلوم تھی، انس رضؓ فرماتے ہیں:۔

قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو ابن ثلاث وستین (صحیح مسلم) — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ برس کی عمر میں ہوئی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ حضرت انس رضؓ کو اصلی عمر بھی معلوم تھی، اور کبھی اکائیوں کو حذف بھی کر دیا کرتے تھے، اور صرف دہائیوں کا ذکر کر دیتے تھے، لہٰذا صرف دہائیوں کی روایت بھی بالکل صحیح ہے، اور اسی وجہ سے امام بخاری نے اس کو اپنی صحیح میں شامل کر لیا، حضرت انس رضؓ سے شمائل نبوی کے ضمن میں بہت سی احادیث مروی ہیں، جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا حلیہ اور اخلاق ہمارے سامنے آجاتا ہے، برق صاحب کی وارد کردہ مذکورہ بالا روایت ہی میں حضرت انس کے یہ الفاظ بھی ہیں

ولیس فی رأسہ ولحیتہ عشرون شعرۃ بیضاء — وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی اور سر میں بال بھی سفید نہیں تھے

غرض حضرت انس رضؓ نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا، حتیٰ کہ سفید بالوں کی تعداد کے متعلق بھی معلومات فراہم کر دیں، بلکہ یہ بھی بتا دیا، کہ یہ بال کہاں کہاں تھے۔ (صحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (صافات) — اور ہم نے یونس کو رسول بنا کر بھیجا، ایک لاکھ آدمیوں کی طرف یا اس سے کچھ زیادہ کی طرف۔

کیا اس آیت سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کو صحیح تعداد معلوم نہ تھی، پہلے ایک لاکھ کہا پھر فرمایا "یا کچھ زیادہ ہوں گے" کیا یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ اللہ بھی خوب ہے، جس کو صحیح تعداد بھی معلوم نہ تھی، پھر کیا یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ اللہ کو تو ہر بات کا علم ہے، اس کو تعداد کے متعلق شک ہونا ناممکن ہے لہٰذا یہ آیت ہی محل نظر ہے؟ کسی دشمن اسلام یہودی کا کارنامہ ہے؟ نعوذ باللہ من ذلک، اللہ تعالیٰ کا یہ ایک طرز بیان ہے، اس میں شک کی گنجائش نہیں، اسی طرح حضرت انس رضؓ کا ایک طرز بیان ہے

(یعنی اکائیوں کا حذف) اور شک کی اس میں بھی گنجائش نہیں۔

غلط فہمی عطاء بن یسار کہتے ہیں، کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا، کہ کیا تورات میں حضور پرنور کے متعلق کوئی آیت موجود ہے، کہا کیوں نہیں، آپ کے متعلق یہ آیت تورات میں موجود ہے

یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھدا و	اے رسول ہم نے تمہیں شاہد، بشیر، نذیر، اور
مبشرا ونذیرا وحرزا للامیین انت	ان پڑھ عربوں کا محافظ بنا کر بھیجا ہے، تو میرا
عبدی ورسولی سمیتک المتوکل	بندہ اور رسول ہے ..... تو نہ ترش مزاج ہے
لیس بفظ ولا غلیظ الخ	اور نہ تند طبع الخ

تورات کو "الف شے" "یا" تک پڑھ جاؤ، یہ الفاظ کہیں نہیں ملیں گے" (دو اسلام ص ۱۸۶-۱۸۷)

ازالہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

واللہ انہ لموصوف فی التوراۃ	اللہ کی قسم آپ کی بعض صفتیں جو قرآن میں ہیں
ببعض صفتہ فی القرآن	تورات میں بھی ہیں۔

اس کے آگے وہ الفاظ ہیں، جو برق صاحب نے نقل کئے ہیں، یہ حدیث صرف عبداللہ بن عمرو رضی سے مروی نہیں ہے، بلکہ دارمی میں مشہور یہودی عالم حضرت عبداللہ بن سلام سے بھی مروی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلین) عطاء کہتے ہیں، کہ عبداللہ بن عمرو سے یہ حدیث سننے کے بعد مشہور یہودی عالم کعب احبار سے ملا، تو انہوں نے اس کی تصدیق کی، بلکہ کچھ اور زائد صفات بتائے جو تفسیر ابن جریر میں محفوظ ہیں (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۵۳)

حضرت انس رضی سے مروی ہے، کہ ایک یہودی لڑکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا جب وہ بیمار ہوا، تو حضور اس کی عیادت کو گئے، اس لڑکے کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا، اور تورات پڑھ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مرتے دم پوچھا، کہ کیا میری صفت تورات میں ہے، اس نے کہا نہیں، لڑکے نے بستر مرگ پر کہا، بے شک آپ کی صفت تورات میں ہے، اور میں گواہی دیتا ہوں، کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں (مشکوٰۃ باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اسی طرح کی ایک روایت حضرت علی رضی سے بھی مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی کے مقروض تھے، اس نے آپ کے ساتھ کچھ زیادتی بھی کی، اور بعد میں مسلمان ہو گیا، پھر کہا۔

واللہ مافعلت بك الذی فعلت بك الا لانظر الی نعتك فی التوراۃ — میں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا اس لئے کیا، کہ میں آپ کی صفات کو جو تورات میں ہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

پھر اس شخص نے بھی آپ کی صفات میں تورات کے وہی الفاظ نقل کئے، جو برق صاحب کی نقل کردہ حدیث میں ہیں (مشکوٰۃ، باب فی اخلاقہ)

الغرض تورات میں آپ کی توصیف ہونا یہ ایک مسلمہ امر ہے، جو تواتر ثابت ہے لیکن برق صاحب کو اس سے انکار ہے، برق صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو توصیف تورات میں ہے، اس کا ذکر تو قرآن میں بھی ہے تو کیا قرآن کا بھی انکار کیا جا سکتا ہے، قرآن میں ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ .... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ — جو لوگ رسول، نبی امی کی پیروی کرتے ہیں، جس کے اوصاف کا ذکر تورات اور انجیل میں ہے ...... وہی لوگ نجات پانے والے ہیں (سورہ اعراف)

دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:۔

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (بقرہ) — اہل کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پہچانتے ہیں، جیسے اپنے بیٹوں کو۔

تیسری جگہ ارشاد ہے:۔

مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ (الفتح) — رسول کے صحابہ کی صفات بھی تورات وانجیل میں موجود ہیں۔

لیجئے، اب تو قرآن سے ثابت ہو گیا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات تورات میں موجود ہیں اب کیا قرآن کی آیات بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ موجودہ تورات میں آپ کی کوئی صفت موجود نہیں۔

غلط فہمی "ممکن ہے کہ آپ یہ کہدیں، کہ اجی صاحب! تورات میں تو اس قدر تحریف ہو چکی ہے، کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی، یہ آیت ملے تو کہاں سے؟ اس کے دو جواب ہیں۔ اول۔ اگر تحریف ہو چکی تھی، تو ابن عمر نے دو آیتیں کہاں سے دیکھ لی تھی" (دو اسلام ص۱۸۱)

ازالہ بے شک ہم بھی کہتے ہیں، کہ تورات محرف ہو چکی ہے، لہٰذا یہ عبارت اس میں نہیں، اب سوال یہ ہے، کہ پھر عبداللہ بن عمرو کو کہاں سے معلوم ہوا، اس کے دو جواب ہیں:۔

اول یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے لیکن حکماً مرفوع ہے، اس لئے کہ عبداللہ بن عمرو اس قسم کی خبر خود نہیں

دے سکتے، بلکہ انہوں نے یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی، اور پھر اس کو بیان کیا ہوگا، یہ حدیث اخبار غیب میں سے ہے، اور اس کی تصدیق ایمان بالرسول کا نتیجہ ہے، اس کی تکذیب رسول کی تکذیب ہے، اور ایمان بالرسول کا تقاضا یہ ہے، کہ اس حدیث کی روشنی میں موجودہ تورات کو محرف سمجھا جائے، اور یہی ہمارا اصلی جواب ہے۔

دوم۔ اناجیل کے اس وقت چار متداول نسخے ہیں، جو عیسائی دنیا میں مستند ملتے جاتے ہیں حالانکہ حقیقۃً انجیل کے صرف یہی چار نسخے نہیں اور بھی ہیں، ان میں سے بعض نسخے اب بھی مل جاتے ہیں جو کہیں کہیں کسی کتب خانے میں دبے پڑے ہیں، ان میں سے ایک نسخہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فارقلیط والی پیشین گوئی موجود ہے، لیکن ان چار مشہور نسخوں میں سے یہ پیشین گوئی خارج کردی گئی ہے، ہوسکتا ہے، کہ تورات کے بھی ایک سے زیادہ نسخے عہد رسالت میں پائے جاتے ہوں، اور کسی غیر مشہور نایاب نسخہ میں عبداللہ بن عمرو رضہ نے یہ صفات دیکھ لئے ہوں۔

عجیب و غریب

برق صاحب نے تاریخی حوالے، اور مسیح مصنفین کی تصریحات کا تذکرہ کیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے، کہ تورات میں تحریف ہوئی، لیکن ان تمام تاریخی مندرجات اور محققین کے فیصلوں کو صحیح تسلیم نہیں کیا، بلکہ قرآن کی روشنی میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے، کہ تورات میں تحریف نہیں ہوئی، بلکہ وہ اب بھی ویسی ہی موجود ہے، جیسے نازل ہوئی تھی ہم بھی برق صاحب کی خاطر اسے تسلیم کئے لیتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے، کہ وہ اپنی ہی کتاب کے صفحہ ۳۴۷ پر لکھتے ہیں کہ "ہر وہ حدیث بلا دریغ ٹھکرا دی جائے، جو مسلمہ تاریخی واقعات کی تردید کرتی ہو" (دو اسلام) تو اب ہم ان سے سوال کرتے ہیں، کہ تحریف تو مسلمہ تاریخی واقعہ ہے، لہٰذا جس آیت سے تحریف کی تردید ہوتی ہو، وہ قابل رد ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اگر مسلمہ تاریخی واقعہ کے خلاف آیت صحیح ہوسکتی ہے، تو حدیث صحیح کیوں نہیں ہوسکتی؟ یا پھر یہ کہیئے، کہ یہ معیار ہی غلط ہے، اس لئے کہ اس معیار پر تو قرآن بھی پورا نہیں اترتا تفصیل کے لئے آخری باب ملاحظہ فرمائیں۔

غلط فہمی

"آخر یہودیوں میں بھی ایسے ہزارہا اشخاص موجود ہوں گے جنہیں اپنی کتاب سے اسی طرح محبت ہوگی، جس طرح ہمیں قرآن سے" (دو اسلام ص۱۸۸)

ازالہ

جی ہاں! انہیں ایسی ہی محبت ہوگی، جس طرح ایک عظیم نام نہاد مسلم فرقہ کو قرآن سے ہے، جو قرآن کو محرف خیال کرتا ہے، یا جس طرح ہمارے پیٹ پرست علماء کو معنوی تحریف کے باوجود قرآن سے محبت ہے۔

غلط فہمی "دوم۔ حضرت مسیح نے اعلان کیا تھا: جب تک زمین و آسمان نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا شوشہ تورات سے ہرگز نہیں ٹلے گا۔ اگر تورات محرف ہو چکی تھی، تو حضرت مسیح اتنے زور سے یہ اعلان کیوں کرتے" (دو اسلام ص۱۸۸)

ازالہ برق صاحب گویا آپ کے نزدیک موجودہ اناجیل میں جو کچھ ہے سب صحیح ہے، حالانکہ یہ اناجیل تحریف شدہ بلکہ وضع کردہ کتابیں ہیں، ان کے مضامین میں تناقض و تضاد ہے، قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصورپوری سابق جج ریاست پٹیالہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان میں اتنا تناقض موجود ہے، کہ تطبیق دینا سخت دشوار ہے، آدم کلارک، نورٹن اور ہارن صاحب انجیل کے مشہور شارح ہیں، تینوں کا متفقہ قول ہے، کہ تطبیق کی کوئی صورت موجود نہیں، پادری فرنچ کو اقرار ہے، کہ ان انجیلوں کی چار پانچ آیتوں میں تحریف بھی ہوئی ہے، نیز وہ یہ بھی اقرار کرتا ہے، کہ ان میں چھوٹی موٹی تیس ہزار غلطیاں موجود ہیں (رحمۃ للعالمین جلد۳ ص۱۶ تا ۳۱۷)

برق صاحب آپ نے انجیل کی اصل نازل شدہ عبارت نقل نہیں کی، بلکہ صرف ترجمہ کا ترجمہ نقل فرمایا ہے، لہٰذا ہم نہیں کہہ سکتے، کہ "نقطہ یا شوشہ" سے کیا مراد ہے، اگر اس سے رسم الخط مراد ہے تو برق صاحب: تو معدوم و ناپید ہے جس زبان میں تورات نازل ہوئی، اس زبان میں تورات کہیں نہیں، اور اگر اس سے احکام مراد ہیں، تو یہ بھی ٹل گئے، عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سے احکام کو بدل دیا، قرآن میں ہے:۔

وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (آل عمران)	عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں، اور میں اس لئے آیا ہوں کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام کی گئی تھیں، ان کو حلال کردوں

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سے احکام کو بدل دیا تھا، ورنہ توریت کی موجودگی میں انجیل کی ضرورت ہی نہ تھی، لہٰذا تورات کا شوشہ تک نہ بدلنا مہمل ہے، یا پھر نزول انجیل لغو و عبث فعل ہے، الغرض یہ قول جو برق صاحب نے نقل کیا ہے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف غلط منسوب ہے۔

غلط فہمی "حضرت مسیح کے عہد تک تورات اپنی اصلی حالت میں باقی تھی، اور بخت نصر وغیرہ کی حکایات فرضی ہیں" (دو اسلام ص۱۸۹)

ازالہ:۔ گویا موجودہ انجیل صحیح ہے، جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذکورہ بالا قول نقل کیا گیا ہے،

اور بخت نصر کا حملہ جو ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے غلط ہے۔ اگر یہ معیار صحیح ہے، تو ہمیں بھی کہنے دیجئیے، کہ جو حدیث صحیح ہے وہ صحیح ہے، اور جو تاریخی واقعات اس کے خلاف ہیں وہ فرضی ہیں، برقی صاحب آپ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ کی صرف اس لئے تکذیب کر رہے ہیں، کہ وہ آپ کے اس مفروضہ کے خلاف ہے کہ اناجیل اپنی اصلی حالت میں باقی ہیں۔ حالانکہ اناجیل اربعہ میں تناقض اور تضاد خود اس بات کی اندرونی شہادت ہے، کہ موجودہ اناجیل سب جعلی ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی جعلی ہے

غلط فہمی
"سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات میں ہمیں تمام سابقہ آسمانی صحائف پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، اگر وہ کتابیں محرف ہو چکی تھیں، اور غلط سلط تھیں، تو ان پر ایمان لانے کا مقصد؟ (ص ۱۸۹)

ازالہ
برقی صاحب کتب سابقہ پر ایمان لانے کا حکم اب بھی باقی ہے یا اب نہیں ہے، صرف عہد رسالت تک تھا، اگر اب ایمان لانے کا حکم نہیں ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا، کہ یہ آیتیں منسوخ ہیں اگر یہ حکم صرف عہد رسالت میں تھا، تو کیا اس زمانہ میں تمام کتب سماویہ غیر محرف طور پر موجود تھیں، اگر نہیں تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ان کو پڑھا کرتے تھے، اگر جواب اثبات میں ہے، تو براہ کرم اس کا ثبوت دیجئیے۔

اگر یہ کتب سماویہ عہد رسالت میں تھیں اور بعد میں ضائع ہو گئیں، تو کیا قرآن کی طرح ان کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہیں لیا تھا؟ ان کتب سماویہ سے تو احادیث ہی اچھی رہیں، کہ ان کی حفاظت بہ تمام و کمال ہوئی، اگر ان کتب سماویہ پر ایمان لانا اب بھی فرض ہے، تو یہ کتب سماویہ اب غیر محرف موجود ہیں کیا کتاب نوح ع، کتاب ہود ع، کتاب صالح ع کہیں موجود ہیں کیا صحف ابراہیم ع، صحف لوط ع، و صحف یوسف علیہم السلام کہیں سے دستیاب ہو سکتے ہیں، اگر ہو سکتے ہیں، تو براہ کرم ان کا پتہ بتا دیجئے، اور اگر کہیں نہیں، ضائع ہو گئیں، تو پھر ان پر ایمان لانے کا مقصد بتا دیجئے، جو مقصد آپ کے ذہن میں آجائیے، اسی کو اپنے سوال کا جواب سمجھ لیجئیے، وہی تورات و انجیل پر ایمان لانے کا مقصد ہوگا۔

غلط فہمی
"کیا خدا کو علم نہیں تھا، کہ تورات میں تصرف ہو چکا ہے، اگر علم تھا تو تصدیق کیوں کی، کیا کوئی مجسٹریٹ کسی جعلی دستاویز کی دیدہ دانستہ تصدیق کر سکتا ہے" (دو اسلام ص ۱۹۰)

ازالہ
خدا نے موجودہ تورات کی تصدیق کہیں نہیں کی، جو آیات آپ نے نقل کی ہیں، ان کا جواب آگے آرہا ہے۔

غلط فہمی
"آپ کہیں گے، کہ اللہ نے اصلی تورات کی تصدیق کی تھی، نہ کہ صحیفہ رائجہ کی، بہت اچھا، تو پھر قرآن نے یہ کیوں کہدیا:-

قُلْ يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ

اے رسول اہل کتاب سے کہو کہ جب تک تم تورات و انجیل پر عمل نہیں کریں گے انکی بگڑی کبھی نہ بن سکے گی

اگر یہ کتابیں انسانی دست برد سے ناپاک ہو گئی تھیں، تو اہل کتاب کو ان پر عمل کرنے کی دعوت کیوں دی؟؟؟" (دو اسلام ص۱۹۰)

ازالہ اصلی تورات اور اصلی انجیل پر عمل کرنے کی دعوت بے شک دی گئی ہے لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا، کہ موجودہ تورات و انجیل پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، پھر برق صاحب نے پوری آیت بھی نقل نہیں فرمائی جو اس تمہید کی غرض و غایت ہے، اور وہ یہ ہے:۔

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا (المائدۃ)

یعنی تمہاری بگڑی کبھی نہیں بن سکتی، جب تک کہ تم (تورات اور انجیل) اور اس چیز پر عمل نہ کرو، جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل ہوئی ہے، اور اے رسول جو چیز آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اس سے ان میں سے بہت سوں کا کفر اور طغیان اور زیادہ ہوگا۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ قرآن پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، اور بغیر اس کے فلاح نہیں، اور اگر اہل کتاب اس کے قائل نہیں تھے، بلکہ قرآنی آیات سے ان کی سرکشی اور کفر زیادہ ہوتا تھا، برق صاحب آپ تو اہل کتاب کو مسلم سمجھتے ہیں، خواہ وہ قرآن پر ایمان لائیں یا نہ لائیں، قرآن پر عمل کریں یا نہ کریں، لیکن اس آیت میں اس کی تردید ہے، قرآن پر ایمان لانا، اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے، تورات و انجیل کی طرف ضمناً دعوت ہے، اس لئے کہ ان کتابوں کی دعوت ہی یہ ہے، کہ آنے والے رسول پر ایمان لایا جائے، اور اس کی شریعت پر عمل کیا جائے، تو جو شخص رسول، اور اس کی کتاب کا انکار کرتا ہے، وہ گویا تورات و انجیل کو بھی نہیں مانتا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دعوت دی، کہ تورات و انجیل کو پوری طرح مانو یعنی ان کی ہدایت کے مطابق قرآن کو مانو، اور اس پر عمل کرو۔

غلط فہمی "وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ" اور ان کے پاس تورات موجود ہے، جس میں اللہ کا حکم درج ہے، یہ نہیں فرمایا کہ درج تھا، بلکہ درج ہے، نحو کا مشہور قاعدہ ہے، کہ جہاں جار مجرور کا تعلق مذکور نہ ہو، وہاں موجودٌ یا کائنٌ محذوف فرض کر لو، اس قاعدہ کی رو سے آیت کے معنی ہونگے "تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے" (دو اسلام ص۱۹۰-۱۹۱)

ازالہ یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا، کہ ساری تورات محرف ہے، بے شک موجودہ تورات میں بھی اللہ تعالیٰ

کے بعض احکام من وعن محفوظ ہیں، شانِ نزول کے لحاظ سے یہ ارشادِ باری ایک خاص حکم کے متعلق تھا جو تورات میں اس وقت بھی موجود تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے واحد کا صیغہ "حکم" استعمال فرمایا ہے پوری تورات کے محفوظ ہونے کی صراحت نہیں کی، پوری آیت درج ذیل ہے:۔

وکیف یحکمونك وعندھم التوراۃ فیھا حکم اللہ ثم یتولون من بعد ذلك (المائدہ)

یہ لوگ آپ کو کیسے حکم تسلیم کر سکتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس تورات ہے، جس میں اللہ کا حکم موجود ہے، پھر یہ لوگ اس سے بھی منہ موڑ لیتے ہیں۔

یعنی جس کتاب پر ایمان ہے، اس سے منہ موڑ لیتے ہیں، تو آپ پر تو ایمان بھی نہیں، آپ کو کیسے حکم مان سکتے ہیں، یہ چیز بعید از قیاس ہے، اگر آپ کو حکم مان لیں، تو پھر تورات کا حکم ماننے سے کیا امر مانع ہو سکتا ہے، حالانکہ دونوں جگہ حکم ایک ہی ہے، انہیں تو وہ حکم ماننا ہی نہیں لہٰذا وہ آپ کو بھی حکم نہیں بنا سکتے، آپ کا حکم ماننا، گویا پھر اسی حکم تورات کو مان لینا ہے، جس سے اعراض کر چکے ہیں (نحوی قاعدہ کا جواب آگے آ رہا ہے)

غلط فہمی

"اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ (قرآن)

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور موجود ہے" (دو اسلام صفحہ ۱۹۱)

ازالہ

نحو کے جس قاعدہ کی رو سے آپ نے مندرجہ بالا ترجمہ کیا ہے، اور جس قاعدہ کا ذکر آپ اوپر کر چکے ہیں، اس قاعدہ کے لحاظ سے صرف لفظ "موجود" آپ لگا سکتے ہیں، زمانہ کا تعین اس قاعدہ سے نہیں ہوگا، لہٰذا "موجود تھا" اور "موجود ہے" دونوں کا احتمال ہے، اور محض احتمال سے آپ اپنے مطلب کو ثابت نہیں کر سکتے۔

غلط فہمی

"ایک اور آیت ملاحظہ ہو:۔

ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما اُنزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ..... الخ

اگر یہود و نصاریٰ ان کتابوں پر ایمان لا کر نیک بن جاتے، جو ان پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں تو وہ ہمارے انعامات کے مستحق بن جاتے،

اس آیت میں اہلِ کتاب کو تورات و انجیل پر ایمان لا کر نیک بننے کی ترغیب دی گئی ہے اگر یہ کتابیں غلط تھیں، تو اللہ نے ان پر ایمان لانے کا حکم کیوں دیا" (دو اسلام صفحہ ۱۹۱)

ازالہ

برق صاحب نے نہ تو آیات کو پورا نقل کیا ہے، اور نہ ہی ترجمہ صحیح کیا ہے، پوری آیت اس طرح ہے:۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ۔ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم (المائدۃ)

اگر اہل کتاب ایمان لے آتے، اور پرہیزگاری اختیار کرتے، تو ہم ان کے گناہوں کو معاف کر دیتے، اور ان کو جنت النعیم میں داخل کر دیتے اور اگر اہل کتاب قائم کریں تورات کو، اور انجیل کو، اور اس چیز کو جو ان کے رب کی طرف سے ان پہ نازل کی گئی ہے، تو ان کو اوپر سے بھی رزق ملے اور نیچے سے بھی۔

پہلی آیت میں صاف طور سے اہل کتاب کو ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے، اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے، کہ پہلے وہ کافر تسلیم کر لئے جائیں، دوسری آیت میں تورات اور انجیل کی طرف توجہ مبذول کرا کے قرآن پر عمل کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے، برق صاحب آپ تو نیک اہل کتاب کو خواہ وہ قرآن پر ایمان لائیں یا نہ لائیں مومن سمجھتے ہیں، لیکن قرآن اہل کتاب کے متعلق کیا کہتا ہے سنیئے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (المائدۃ)

اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے، تو وہ انہیں میں سے ہے بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

تمام یہود و نصاریٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہی فیصلہ ہے، کہ وہ سب ظالم ہیں، ان کو دوست مت بناؤ۔

غلط فہمی "ممکن ہے آپ یہ کہیں، کہ جب توراۃ و انجیل اصلی حالت میں موجود تھیں، تو پھر قرآن آنے کی کیا ضرورت تھی، اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں، لیکن میں صرف قرآن کا جواب پیش کروں گا"

وَهَٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ أَن تَقُولُوا إِنَّمَا أُنزِلَ الْكِتَابُ عَلَىٰ طَائِفَتَيْنِ مِن قَبْلِنَا وَإِن كُنَّا عَن دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَ۔ (انعام)

ہم نے تمہیں یہ مبارک کتاب (قرآن) عطا کی ہے، اسے مانو اور گناہ سے بچو، تاکہ تم ہماری رحمت کے مستحق بن سکو اب تم یہ عذر نہیں پیش کر سکتے کہ ہم سے پہلے دو امتوں (یہود و نصاریٰ) پر کتابیں تو نازل ہوئی تھیں لیکن وہ اجنبی زبان میں تھیں، اور ہم انہیں سمجھ نہیں سکتے تھے۔

یعنی نزول قرآن کی وجہ یہ نہیں بتائی گئی، کہ پہلی کتابیں مسخ ہو چکی تھیں، بلکہ یہ کہ وہ ایسی زبان میں تھیں جس سے عرب ناآشنا تھے، کیا تورات کی صحت پر اس سے بڑی شہادت پیش کی جا سکتی ہے؟" (دو اسلام ص ۱۹۱ - ۱۹۲)

ازالہ برق صاحب آپ نے قرآن میں صرف ایک ہی وجہ کو ملاحظہ فرمایا، حالانکہ اس کی ایک اور بھی وجہ قرآن میں موجود ہے، سنئیے :۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا	اے اہل کتاب بے شک تمہارے پاس ہمارا
يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ	رسول آگیا، جو ایسے وقت میں تمہارے لئے
أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا	شریعت کے احکام بیان کرتا ہے، جب کہ
نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ	رسولوں کا آنا ایک عرصہ سے موقوف تھا، یہ
(المائدہ ۵)	رسول اس لئے آیا، کہ کہیں تم یہ نہ کہدو کہ ہمارے

پاس کوئی بشیر و نذیر نہیں آیا۔ پس تمہارے پاس بشیر و نذیر آگیا۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ قرآن صرف عرب کے لئے نازل نہیں ہوا، بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی نازل ہوا، جن کے پاس بقول آپ کے کتاب الٰہی موجود تھی، بات درحقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کے لئے بھی رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، اور یہ کہ قرآن اہل کتاب کی ہدایت کے لئے بھی نازل کیا گیا تھا۔

دوسرا اور تیسرا جواب (۲) برق صاحب اگر آپ کی بات تسلیم کر لی جائے، کہ قرآن صرف عرب کے لئے نازل ہوا تو پھر سوال یہ ہے، کہ انجیل کیوں نازل کی گئی کیا بنی اسرائیل کے پاس بھی انجیل سے پہلے کوئی کتاب نہیں آئی تھی، اور اگر آئی تھی، تو کیا وہ اجنبی زبان میں تھی۔

(۳) اور کیا اسی اصول پر ہمارے لئے ضروری نہیں، کہ ہماری زبان میں بھی کوئی کتاب نازل فرمائی جائے، بلکہ ہر ملک میں اس ملک کے باشندوں کی زبان میں کتاب کے نزول کی ضرورت ہے ہندوستان میں سینکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں، اور ایک خطہ کی زبان دوسرے خطہ کے لئے اجنبی ہے، تو کیا صرف ہندوستان کے لئے سینکڑوں کتابوں کا نزول لازمی ہے، قرآن کی زبان اکثر ممالک کے لئے اجنبی ہے، لہٰذا برق صاحب فرمائیے کیا ہونا چاہیئے۔

چوتھا جواب :۔ (۴) برق صاحب ایک بات اور حل طلب ہے، قرآن کی ابتدائی بلکہ متعدد آیات

کی رو سے تمام کتب سماویہ پر ایمان لانا لازمی ہے اور بقول آپ کے یہ جب ہی ہو سکتا ہے، کہ وہ تمام کتب محفوظ ہوں ورنہ ایمان لانے کا مقصد؟ (دو اسلام ص ۱۸۹ ملخصاً) اور قرآن ہی سے یہ ثابت ہے کہ:-

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر) یعنی ہر امت میں ڈرانے والا آیا ہے

اور جب ڈرانے والا آیا ہے، تو کتاب بھی ضرور آئی ہوگی، اور یہ بھی قرآن سے ثابت ہے، کہ ہر قوم پر کتاب الٰہی اس قوم کی زبان ہی میں نازل ہوتی رہی، لہٰذا ہمارے ملک میں ہماری زبان میں ضرور کوئی کتاب نازل ہوئی ہوگی، بتلایئے وہ کس خزانہ میں محفوظ ہے؟ براہ کرم اس کا سراغ لگایئے، کہ ہم اس پر عمل کریں، اور قرآن جو کہ اجنبی زبان میں ہے، اسے چھوڑ دیں، آخر غیر ملکی زبان کو اپنی زبان پر ترجیح کیوں دیں، یہ تو غلامانہ ذہنیت اور احساس کمتری ہے، پھر عربی کے مقابلہ میں ہم پاکستانی انگریزی زبان سے زیادہ قریب ہیں بلکہ انگریزی زبان سے کوئی اجنبیت ہی محسوس نہیں ہوتی، تو کیا ہمارے لئے یہ بہتر نہیں ہوگا، کہ قرآن کے بجائے انجیل پڑھنی شروع کر دیں۔ اور سب عیسائی ہو جائیں۔

غلط فہمی "اور سنیئے:-

لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ. يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي	سارے اہل کتاب برے نہیں، ان میں ایسے نیک اور پرہیزگار بھی موجود ہیں، جو رات کو اللہ کی آیات (تورات وانجیل) پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نیکی کی ترغیب دیتے ہیں، برائی سے روکتے اور نیک

الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ. (آل عمران) اعمال کی طرف بیتابانہ بڑھتے ہیں، یہ لوگ صالح ہیں۔

اس آیت میں تورات وانجیل کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، اگر تورات بگڑ چکی ہوتی، تو اللہ اس کے احکام کو آیات کیوں کہتا، اور اس پر عمل کرنے والوں کو صالحین میں کیوں شمار کرتا" (دو اسلام ص ۱۹۲-۱۹۳)

ازالہ آیت مذکورہ میں آیات سے مراد تورات اور انجیل کی آیات نہیں ہیں، بلکہ قرآن کی آیات مراد ہیں، دوسری جگہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:-

تَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ وَلَوْ كَانُوا	تم دیکھتے ہو، کہ ان میں سے بہت سے کافروں کو دوست بناتے ہیں، بیشک انہوں نے جو اعمال کئے وہ بہت برے ہیں، اللہ ان سے ناخوش ہے اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے اور اگر وہ اللہ

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (المائدہ ۵)

پر، نبی پر، اور جو اس پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لے آتے، تو کبھی کافروں کو دوست نہ بناتے مگر ان میں بہت سے فاسق ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی ایک خصوصیت بیان فرمائی ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے، کہ وہ اللہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان نہ لانے کے سبب اس مرض میں مبتلا ہیں، اگر ان پر ایمان لے آتے، تو کبھی کافروں کو دوست نہ بناتے، گویا کفر سے بیزاری کا ذریعہ یہ ہے، کہ اللہ رسول اور قرآن پر ایمان لایا جائے، یہاں نبی سے مراد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، ورنہ اپنے نبی پر تو ان کا ایمان پہلے سے موجود تھا، ایک اور جگہ ارشاد باری ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (بقرہ)

جو لوگ اس وحی پر ایمان لاتے ہیں، جو آپ پر اتری اور جو آپ سے پہلے اتری، اور قیامت پر بھی ایمان لاتے ہیں، یہی لوگ ہدایت پر ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں، جو فلاح پائیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ ہدایت و فلاح کے لئے قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

غلط فہمی "آپ کہہ سکتے ہیں، کہ جب یہ صورت حالات ہے تو پھر مسلمان بننے کی ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے، عیسائی رہ کر بھی نیک عمل کئے جاؤ، نہ قرآن پر ایمان لانے کی ضرورت اور نہ رسول پر، سارے اسلام سے چھٹی مل گئی، یہ سوال اسلام کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، اسلام کسی زبانی اقرار کا نام نہیں، بلکہ نیکی کا نام ہے، اگر ایک عیسائی نیکی کر رہا ہے، تو وہ قرآن کی رو سے مسلمان ہے، رسول و قرآن کا صحیح پیرو وہی ہے" (دو اسلام ص ۱۹۳)

ازالہ اس کے جواب میں کچھ آیات اوپر نقل ہوئیں، جن سے ثابت ہوتا ہے، کہ قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے، اگر ایک شخص نیکی تو کرتا ہے، لیکن قرآن کے متعلق کہتا ہے، کہ (نعوذ باللہ) ایک شخص نے اسے گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کر دیا، تو کیا وہ شخص مسلمان کہلا سکتا ہے، ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ

(اے مسلمانو اہل کتاب سے کہدو) کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو نازل ہوا ہم پر، اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب اور اسباط پر نازل ہوا، اور جو صحائف موسیٰ اور عیسیٰ اور

النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (البقرۃ)

جملہ انبیاء کو دیئے گئے، ان پر بھی ایمان لائے ہم ان میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اللہ کے مطیع ہیں، پس اگر وہ اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو وہ ہدایت یاب ہو گئے، اور اگر منہ موڑیں، تو وہ شقاق میں مبتلا ہیں، اللہ ان سب کے خلاف آپ کے لئے کافی ہے، اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ جب تک وہ مسلمانوں کی طرح قرآن پر ایمان نہ لائیں، ہدایت نہیں پا سکتے، دوسری آیت ملاحظہ فرمائیے:۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران)

اے رسول آپ کہہ دیجئے، کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اور جو ہم پر نازل ہوا، اس پر ایمان لائے اور اس پر بھی ایمان لائے، جو ابراہیم، اسمٰعیل اسحاق، یعقوب اور اسباط پر نازل ہوا، اور موسیٰ اور عیسیٰ اور جملہ انبیاء پر نازل ہوا، ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے، اور ہم اسی کے مسلم ہیں، اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے گا، وہ اس سے ہرگز قبول نہیں ہو گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہو گا

اس آیت میں پھر بڑے زور کے ساتھ اہل کتاب کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، قرآن اور جملہ کتب سماوی پر ایمان لانے کی دعوت دے کر فرمایا، یہ ہے اسلام، اب جو شخص اس کو اختیار نہیں کرے گا، وہ تباہ و برباد ہو گا، اور اس کا دین قبول نہیں ہو گا، اس آیت سے معلوم ہوا، کہ اسلام، قرآن پر ایمان لانے، اور قرآن پر عمل کرنے کا نام ہے، نہ یہ کہ قرآن کی تکذیب کرے، اس کا مذاق اڑائے، بس نیکی کرتا ہے، تو وہ مسلمان ہو گیا، ہرگز ایسا نہیں، ارشاد باری ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى

اے ایمان والو (اس خطاب میں اہل کتاب بھی آ گئے، کیونکہ برق صاحب کے نزدیک وہ بھی مومن ہیں)

وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (النساء)

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اس کتاب پر ایمان لاؤ، جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے، اور ان کتابوں پر بھی جو اس سے پہلے نازل کیں، اور جو انکار کرے اللہ کا، فرشتوں کا، اس کی کتابوں اور رسولوں کا، اور قیامت کے دن کا، وہ بہت ہی سخت گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

اس آیت میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں، کہ رسول سے مراد کوئی اور رسول ہو، رسول سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں، پس ثابت ہوا، کہ جو شخص آپ پر اور قرآن پر ایمان نہیں لاتا، وہ سخت گمراہ ہے، اللہ تعالےٰ ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا (النساء)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفرق کرنا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں، کہ ہم بعض پر تو ایمان لائے، اور بعض کا انکار کرتے ہیں، اور بیچ میں ایک راستہ نکالنا چاہتے ہیں، یہی لوگ حقیقی کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا، کہ تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اور جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ بالکل کافر ہے، لہٰذا جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے، خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو مطلقاً کافر ہے، برق صاحب سچے نبی کو نبی نہ ماننا، اور جھوٹے نبی کو نبی مان لینا یہ بڑا اہم معاملہ ہے، اگر عمومی طور پر ہر رسول پر ایمان لانے کا یہ منشا ہے، کہ جو شخص بھی رسول ہونے کا دعویٰ کرے، اس کو رسول مان لیا جائے، تو پھر تو ہر شخص کو قادیانی جھوٹے نبی پر ایمان لانا ہو گا، حالانکہ ہم قطعاً اس پر ایمان نہیں لاتے، بلکہ اسے کذاب و دجال سمجھتے ہیں، اسی طرح بعض وہ لوگ بھی ہیں، جو باوجود نیک ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں، تو کیا وہ مسلمان ہیں، اگر جھوٹے نبی کا اقرار کفر ہے، تو سچے نبی کا انکار بھی کفر ہے، اور سنیے اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (آل عمران)

کہہ دیجیے، کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام محبت کرنے والوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو فرض قرار دیا ہے، اب اگر نیک اہل کتاب جو اللہ سے محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہیں کرتے، بلکہ اس سے منہ موڑتے ہیں، تو کیا وہ فلاح پائیں گے، ہر محب اکرم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع فرض ہے، اور جو شخص اس کا انکار کرتا ہے، وہ کافر ہے، سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۚ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

(الاعراف)

(موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے ہیں، کہ اے ہمارے رب) ہمارے لئے دنیا اور آخرت میں بہتری لکھ دے، ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں اللہ نے فرمایا میں عذاب کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، وہ رحمت میں ان لوگوں کے لئے لکھوں گا، جو پرہیزگاری کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، جو لوگ رسول، نبی امی کی پیروی کرتے ہیں، جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے، برائی سے ان کو روکتا ہے ان کے لئے پاک چیزیں حلال کرتا ہے ناپاک چیزیں ان پر حرام کرتا ہے، ان کے بوجھ اور ان کے طوق جو ان پر تھے ان پر سے اتارتا ہے پس جو لوگ اس رسول پر ایمان لائے، اس کو قوت پہنچائی، اس کی مدد کی، اور اس نور کا اتباع کیا، جو اس پر نازل کیا گیا ہے، تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

ان آیات سے ثابت ہوا، کہ اہل کتاب کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر موجود تھا وہ ان اوصاف مذکورہ کے باعث آپ کو پہچانتے تھے لیکن ایمان نہیں لاتے تھے، اللہ نے فرمایا، کہ

(۱) رحمت ان ہی کے حصہ میں ہے، جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں۔

(۲) وہ رسول ان پر پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے، ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے، اور وہ طوق وسلاسل جو ان پر گذشتہ کتب الٰہیہ میں ان کی بد اعمالی کی سزا کی وجہ سے ڈال دیئے گئے تھے، ان پر سے الگ کرتا ہے۔

(۳) اس رسول پر ایمان لانے والے، اس کی امداد کرنے والے، اور اس کی لائی ہوئی شریعت کا اتباع کرنے والے ہی نجات کے مستحق ہیں۔

کیا ان آیات کی موجودگی میں بھی کہا جا سکتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا اتباع نہ کرنے والے بھی مومن ہیں، ان ہی آیات کے متصل اللہ تعالے فرماتا ہے:۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ	اے رسول کہہ دیجیئے اے لوگو میں تم سب کی
جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ	طرف رسول ہوں اس اللہ کا جس کی بادشاہت
وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ	زمین و آسمان میں ہے، اس کے سوا کوئی
فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ	اور نہیں، وہی مارتا ہے اور جلاتا ہے، پس ایمان
الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ	لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو خود بھی
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (الاعراف)	اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان لاتا ہے اور

اس کی اطاعت و پیروی کرو، تاکہ تمہیں ہدایت مل جائے۔

اس آیت میں دنیا کے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تم سب کے لئے رسول ہیں، ان کا اتباع کرو گے تو ہدایت مل سکتی ہے، اس خطاب عام میں اہل کتاب خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں، کیونکہ اوپر سے انہی کا ذکر چلا آرہا ہے، پس ثابت ہوا کہ اہل کتاب کے لئے لازمی ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، آپ کی پیروی کریں ورنہ وہ ہدایت نہیں پا سکتے اور نہ نجات، مزید سنیئے:۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا	اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے، اور اہل کتاب
اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن	نے علم آ جانے کے بعد محض آپس کی ضد کے
بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ	باعث اختلاف کیا، اور جو شخص بھی اللہ کی
وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ	آیات کا انکار کرے، تو اللہ بہت جلد حساب
سَرِيعُ الْحِسَابِ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ	لینے والا ہے، پس اگر یہ اہل کتاب آپ سے

اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ (آل عمران)

بحث کریں، تو آپ کہہ دیجئے، کہ میں تو اللہ کے لئے اسلام لے آیا، اور وہ لوگ بھی جو میری پیروی کرتے ہیں، اور آپ اہل کتاب اور امی لوگوں سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ کیا اسلام قبول کرتے ہو، پس اگر وہ اسلام قبول کرلیں، تو ہدایت پائیں گے، اور اگر منہ موڑیں گے، تو آپکے ذمہ صرف تبلیغ ہے، اور اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

اس آیت میں بھی اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دی جارہی ہے، ان کو ہدایت کی طرف بلایا جارہا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی پیروی والوں کو اہل اسلام بتایا جارہا ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ خٰشِعِیْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (آل عمران)

بے شک بعض اہل کتاب اللہ پر ایمان لاتے ہیں، اور اس پر ایمان لاتے ہیں، جو تم پر نازل ہوا اور جو ان پر نازل ہوا، اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں، اللہ کی آیات کے عوض متاع قلیل حاصل نہیں کرتے، یہی لوگ ہیں، جن کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ ان اہل کتاب کے لئے اجر ہے، کہ جو قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں، اور یہی وہ اہل کتاب ہیں جن کی تعریف میں قرآن کی بعض آیات نازل ہوئی ہیں، برقی صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ ہر نیک عمل اہل کتاب کی تعریف میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، کاش وہ ان آیات کو ان آیات کی روشنی میں مطالعہ فرماتے، اللہ تعالےٰ نے تو ایسے اہل کتاب کی مذمت فرمائی ہے، جو قرآن پر ایمان نہ لائیں، مثلاً۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ (البقرۃ)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے، کہ ایمان لاؤ اس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی ہے، تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوا، اور اس کے علاوہ جو نازل ہوا، اس کا انکار

کرتے ہیں، حالانکہ وہ حق ہے، اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:۔

اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ (البقرۃ)	اے بنی اسرائیل اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کی ہے، وہ تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، اور اس کے ساتھ اولیں انکار کرنے والے نہ بن جاؤ۔

ان دونوں آیات میں بھی اہل کتاب کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بعض اہل کتاب ایمان لے آئے، اگر قرآن پر ایمان لانا ضروری نہ ہوتا، تو انہیں مسلمان ہونے کی کیا ضرورت تھی، وہ نیک بن جاتے، بس ان کے لئے کافی تھا، بلکہ وہ لوگ جو ایمان لائے مثلاً عبداللہ بن سلام، سلمان فارسی وغیرہ پہلے ہی سے نیک تھے، لیکن یہ نیکی ان کے لئے کافی نہیں سمجھی گئی، اور انہیں اسلام قبول کرنا پڑا۔ اور سنیئے، ارشاد باری ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓي اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (النساء)	اے اہل کتاب اس چیز پر ایمان لاؤ، جو ہم نے نازل کی ہے، جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہے، قبل اس کے کہ چہرے مٹا دیئے جائیں اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیا جائے یا ہم لعنت کریں ان پر جیسا کہ ہم نے ہفتہ والوں پر لعنت کی تھی، اور اللہ کا کام تو ہو کر رہتا ہے۔

اس آیت میں بھی اہل کتاب کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، اور ایمان نہ لانے کی صورت میں عذاب الٰہی کی دھمکی دی گئی ہے۔

غلط فہمی

"اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى	یہ قرآن ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔

اس لئے کتاب موسیٰ کا سچا عامل خود بخود قرآن کا عامل بن جاتا ہے۔" (دو اسلام ص۱۹۳)

ازالہ

برق صاحب نے اوپر سے آیات نقل نہیں فرمائیں، اور "ھذا" کا مرجع قرآن کو سمجھ لیا ہے آیات محولہ اس طرح ہیں:۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ	بے شک اس شخص نے نجات پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کر لیا اللہ کا ذکر کیا، اور نماز

الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ۔ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۔ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی (الاعلیٰ)	پڑھی، مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے، اور باقی رہنے والی ہے یہ بات پہلے صحیفوں میں بھی موجود تھی، مثلاً صحف ابراہیم اور صحف موسیٰ میں۔

آیت بالا سے معلوم ہوا، کہ "ہذا" کا مرجع قرآن نہیں ہے، بلکہ نجات اخروی کے اصول ہیں، جو پہلی کتابوں میں بھی موجود تھے۔

اگر برق صاحب کے مطلب کو صحیح مان لیا جائے، تو اس کے یہ معنی ہوں گے، کہ "قرآن تورات میں موجود ہے" یعنی پورا قرآن تورات میں موجود ہے، اور بقول برق صاحب کے تورات اس وقت بھی غیر محرف موجود ہے، تو کیا قرآن کو تورات میں دکھایا جا سکتا ہے، ہرگز نہیں، پھر اسی اصول پر ذرا اور آگے چلیے، تو یہ کہنا صحیح ہوگا، کہ انجیل بھی تورات میں موجود ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَیُعَلِّمُهُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ (آل عمران)	اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو کتاب و حکمت تورات اور انجیل کی تعلیم دے گا

اب اگر انجیل تورات میں موجود تھی، تو انجیل کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیوں دونوں کی تعلیم عیسیٰ علیہ السلام کو دی گئی، پھر ایک سوال اور ہے، کہ اگر قرآن تورات میں موجود ہے تو تورات اصل چیز ہوئی اور قرآن تورات کا ایک حصہ ہوا، اور تورات میں کچھ زیادہ ہی ہوگا، لہذا تورات قرآن سے افضل اور زیادہ کامل ہوئی، اس کی موجودگی میں قرآن کا نزول لاحاصل ہے۔ تورات اور اس کے تراجم کی اشاعت کافی تھی۔

برق صاحب! آپ تحریر فرماتے ہیں، کہ "کتاب موسیٰ کا سچا عامل خود بخود قرآن کا عامل بن جاتا ہے" کیا یہ حقیقت ہے؟ کیا دونوں کتابوں میں تضاد نہیں ہے؟ قرآن میں زنا کی سزا سو کوڑے ہے، تورات میں رجم ہے، بتایئے کیا تورات پر عمل کر کے قرآن پر عمل ہو سکتا ہے؟ کیا ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ دو الٰہی قانون چل سکتے ہیں؟

انبیاء

پہلے نبی صرف اپنی اپنی قوم کی طرف ہادی بنا کر بھیجے جاتے تھے، اس نبی کی پیروی صرف اس قوم ہی پر فرض ہوتی تھی، نہ کہ دوسری قوموں پر مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (آل عمران)	وہ بنی اسرائیل کے لئے رسول تھے

لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین کے تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ارشاد باری ہے:۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا)

اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔

دوسری آیت میں ہے:۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف)

کہہ دیجئے، اے لوگوں میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں

لہٰذا ایسے رسول پر جس کا دائرہ قوم وملک کے ساتھ محدود نہ ہو، بلکہ "لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا" کے مصداق جس کی رسالت تمام اقوام عالم کی طرف ہو ایمان نہ لانا، اور اس کی پیروی نہ کرنا کسی طرح صحیح نہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمادیا:۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا (آل عمران)

آپ کہہ دیجئے، کہ اے اہل کتاب اور اے وہ لوگو جن کے پاس کوئی کتاب نہیں، کیا تم اسلام قبول کرتے ہو، پس اگر وہ اسلام قبول کریں تو ہدایت پر آجائیں گے۔

اس آیت میں تمام اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے، اور ان کے لئے بھی اس کے بغیر چارہ نہیں، یہی وجہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی اور ہرقل جیسے نیک عیسائی بادشاہوں کو دعوت اسلام دی، اور صاف کہدیا، کہ اسلام قبول کروگے، تو سلامتی کے حقدار ہوگے، ورنہ نہیں۔

غلط فہمی "اہل کتاب کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ (آل عمران)

ہم ان اہل کتاب کے کسی نیک عمل کو ضائع نہیں جانے دیتے (دو اسلام ص۱۹۳-۱۹۴)

ازالہ یہ ان اہل کتاب کے متعلق ہے، جو مسلمان ہوگئے تھے، ارشاد باری ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ (القصص)

جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی، وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں، اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے، تو کہتے ہیں، کہ ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، ہم اس سے پہلے مسلمان تھے

یہ اہل کتاب نزول قرآن سے پہلے مسلمان تھے، نیک تھے، اور نزول قرآن کے بعد فوراً قرآن پر بھی

ایمان لے آئے اور اس کا انکار نہیں کیا۔ دوسری آیت سنیئے:۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ	اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری
فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ	پس جو اہل کتاب ہیں وہ اس پر ایمان لے آتے
بِهٖ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ	ہیں، اور دوسرے لوگوں میں سے بھی بعض لوگ ایمان
وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ	لے آتے ہیں، اور ہماری آیتوں کا انکار کوئی نہیں
(عنکبوت)	کرتا، سوائے کافروں کے۔

یہ ہیں وہ اچھے اور نیک اہل کتاب جو قابل تعریف ہیں، صرف اس وجہ سے کہ وہ قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں، اور جو اس کا انکار کرتے ہیں، وہ کافر ہیں

اور سنیئے ان اچھے اہل کتاب کے متعلق ارشاد باری ہے:۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا	اور ہم کیوں نہ اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف
مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا	حق کے ساتھ نازل ہوئی ایمان نہ لائیں، اور ہماری
رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ	تو یہ آرزو ہے، کہ ہمارا رب ہم کو صالحین میں
(المائدہ ۵)	داخل کردے۔

یہ ہیں وہ اہل کتاب جن کی تعریف قرآن کرتا ہے، یہ ایمان لاتے ہیں، اور طمع کرتے ہیں، کہ انہیں صالحین میں جگہ مل جائے، یہ ہیں وہ اہل کتاب جو قرآن کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں، کہ یہ ہماری طرف بھی حق کے ساتھ نازل ہوا ہے، یعنی وہ قرآن سے بے پرواہ ہو کر اپنے کو اہل ایمان اور صالحین میں شمار نہیں کرتے، قرآن پر ایمان لانے کو وہ اللہ پر ایمان لانا سمجھتے ہیں

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ قرآن پر ایمان لا کر ہی صالح بن سکتا ہے، اور درحقیقت اب قرآن کی پیروی ہی عمل صالح ہے، اور اس سے انکار اور اس سے بے پرواہی فلاح کے منافی ہے۔

غلط فہمی ان تفاصیل کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں، کہ عہد رسول صلعم میں تورات اصلی حالت میں موجود تھی، اور وہی تورات ہم تک پہنچی ہے، اس تورات میں ابن عمرؓ کی ذکر کردہ آیت کہیں موجود نہیں، اس لئے یہ حدیث ایک تاریخی غلط بیانی ہے اور جعلی ہے (ص ۱۹۴)

ازالہ ان تفاصیل کا جواب تو اوپر دیا جا چکا ہے، برق صاحب آپ کو تورات دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا، ورنہ موجود تورات تو پکار پکار کر کہہ رہی ہے، کہ وہ تحریف شدہ ہے، اس اندرونی شہادت کے ہوتے ہوئے خارجی دلائل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، مثال کے طور پر یہ

موجودہ تورات کے چند اقتباسات آپ کے ملاحظہ کے لیے تحریر کرتا ہوں سنیئے :۔

(۱) خدا انسان نہیں جو جھوٹ بولے، نہ آدمی زاد ہے، کہ پشیمان ہو (گنتی ۲۳/۱۹) گویا ہر انسان جھوٹ بولتا ہے، خواہ نبی ہو یا صدیق! کیا یہ آیت صحیح ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

(۲) خدا پشیمان ہوا (خروج ۳۲/۱۴) یہ آیت پہلی آیت کے خلاف و متضاد ہے۔

(۳) خدا دلگیر ہوا (پیدائش ۶/۶)

(۴) تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا، اور نہایت دلگیر ہوا (پیدائش ۶/۶)

(۵) (خدا نے) ساتویں دن آرام کیا (خروج ۲۰/۱۱)

برق صاحب ان آیات سے ثابت ہوا، کہ موجودہ تورات میں تضاد بھی ہے، اور اللہ جل جلالہ کی توہین بھی، آپ حدیث کے لئے تو معیار مقرر کرتے ہیں، کہ ایسی نہ ہو، ویسی نہ ہو، کیا یہ شرائط تورات کے لئے ضروری نہیں؟ اگر تورات میں اس قسم کی باتیں پائی جائیں، تب بھی وہ من و عن محفوظ تسلیم کی جائے لیکن حدیث کو غیر محفوظ کہا جائے، کیا یہ انصاف ہے۔ اور سنیئے :۔

(۶) پھر جب اس (لوطؑ) نے ان سے بہت منت کی، تب وے (فرشتے) اس کی طرف پھرے اور اس کے گھر گئے، اور اس نے ان کی مہمانی کی، اور فطیری روٹی ان کے لئے پکائی، اور انہوں نے کھائی (پیدائش ۱۹/۳) فرشتے بقول آپ کے نورانی مخلوق ہیں، ان کو روٹی سے کیا غرض! لیکن بایں ہمہ یہ چیز تورات میں ہے، اور آپ تورات کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں

(۷) اور خداوند نے ان کے بچھڑے بنانے کے سبب جسے ہارون نے بنایا تھا، لوگوں پہ مری بھیجی (خروج ۳۲/۳۵) قرآن میں ہے کہ بچھڑے کو سامری نے بنایا تھا، اور تورات میں ہے، کہ ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا، کس کو صحیح سمجھیں، اور کس کو غلط! پھر ایسے شرکیہ کام کی نسبت اللہ کے مقدس پیغمبر کی طرف کس قدر شرمناک بہتان ہے، اور نبی معظم علیہ السلام کی صریح توہین ہے، انصاف سے بعید ہے، کہ حدیث کے لئے یہی معیار، معیار کذب ہو، اور تورات کے لئے معیار صحت!

(۸) نبوت ملنے کے بعد بھی ساؤل داؤد کا دشمن رہا، اور انہیں مارنے کی فکر میں رہا (۱ سموایل ۲۰-۲۴) کیا نبوت کی یہی شان ہے، کہ نبی، نبی کا دشمن ہو۔

(۹) داؤد علیہ السلام نے زنا کیا (۲ سموایل باب ۱۱-۱۲)

(۱۰) داؤد، جالوت کے بادشاہ اکیس سے ڈرے، اور اس کے سامنے اپنی وضع بدلی، اور ان کے بیچ اپنے کو دیوانہ بنایا، اور پھاٹک کے پلوں پر واہیات بات لکھنے لگا، اور اپنے تھوک کو اپنی داڑھی

پر بیٹھنے دیا، تب اکیس نے اپنے چاکروں سے کہا، یہ آدمی تو سڑی ہے (۱۔ سموائیل ۲۱/۱۴)

(۱۱) نوح مے پی کر نشہ میں آیا، اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو ننگا کیا (پیدائش ۹/۲۱)

(۱۲) اور لوط ضُغر سے اپنی دونوں بیٹیوں سمیت نکل کر پہاڑ پر جا رہا، کیونکہ ضُغر میں رہنے سے اسے دہشت ہوئی، اور وہ اور اس کی بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے، تب پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا، کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے، اور زمین پر کوئی مرد نہیں، جو تمام جہان کے دستور کے موافق ہمارے پاس اندر آئے آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں، اور اس سے ہمبستر ہوئیں، تاکہ اپنے باپ سے نسل برقرار رکھیں، سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی، اور پلوٹھی اندر گئی، اور اپنے باپ سے ہمبستر ہوئی، پر اس نے اس کے لیٹتے اور اٹھتے وقت اسے نہ پہچانا، اور دوسرے روز ایسا ہوا، کہ پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا، کہ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہمبستر ہوئی، آؤ آج رات بھی اس کو مے پلائیں، اور تو بھی جا کے اس سے ہم بستر ہو، کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں، سو اس رات کو بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی، اور چھوٹی اٹھ کے اس سے ہم بستر ہوئی، اور اس نے اس کے لیٹتے اور اٹھتے وقت اسے نہ پہچانا، سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں، اور بڑی ایک بیٹا جنی، اور اس کا نام موآب رکھا، وہ موآبیوں کا جو آج تک ہیں باپ ہوا، اور چھوٹی بھی ایک بیٹا جنی، اور اس کا نام بن عمی رکھا، وہ بنی عمون کا جو اب تک ہیں باپ ہوا (پیدائش باب ۱۹/۳۰-۳۸)

الغرض ان عبارات سے روز روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے، کہ تورات تحریف شدہ ہے لہٰذا حضرت ابن عمرو کی بیان کردہ حدیث بالکل صحیح ہے، اور ضرور اس حدیث میں بیان کردہ صفات نبوی اصلی تورات میں موجود تھے۔

غلط فہمی ”قرآن اور تاریخ ہر دو شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ لکھ سکتے تھے، اور نہ لکھی ہوئی چیز پڑھ سکتے تھے، لیکن بخاری میں ہے، وہ لکھ سکتے تھے، حدیث یوں چلتی ہے، کہ حضور ذی قعدہ میں عمرہ کے لئے تشریف لے گئے، تو اہل مکہ نے کچھ پابندیاں عاید کر دیں، اور اس سلسلہ میں ایک تحریری معاہدہ ہے جسے محمد رسول اللہ تسلیم کرتے ہیں، کفار مکہ نے رسول اللہ کے الفاظ پر اعتراض کیا.... آپ نے حضرت علی سے فرمایا، کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو..... علی نے جواب دیا خدا کی قسم میں آپ کے نام سے رسول کا لفظ کبھی جدا نہ کروں گا، اس پر رسول اللہ صلعم نے وہ کاغذ اٹھا لیا، اور اسے لکھ دیا، یہ وہ فیصلہ ہے (دو اسلام ص ۱۹۴-۱۹۵)

ازالہ:- صحیح بخاری کی ایک مختصر حدیث لے کر برقی صاحب نے اعتراض کر دیا، حالانکہ اس میں کچھ عبارت

محذوف ہے جو دوسری سند میں بالصراحت مذکور ہے، جس کا حوالہ برق صاحب نے خود دیا ہے، وہ لکھتے ہیں

"بخاری کی ایک اور روایت (ج ۲ ص۱۳۵) بتلاتی ہے کہ حضور نے رسول اللہ کا لفظ کھرچ ڈالا تھا، اور کاتب نے ابن عبداللہ کے الفاظ کا اضافہ کر دیا تھا اسی حدیث پر باقی محدثین اعتماد کرتے ہیں اور تاریخ بھی اسی کی تائید کرتی ہے" (دو اسلام ص ۱۹۵-۱۹۶)

لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ کھرچنے کے لئے اٹھایا، پھر اس نے (یعنی کاتب نے، دوسری حدیث کی صراحت کے مطابق) لکھا، نہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا، برق صاحب کو یہ غلط فہمی ہوئی، کہ "کتب" کا فاعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھ لیا، لہٰذا حدیث اعتراض سے پاک ہے، ایک حدیث کہیں مختصر ہوتی ہے، اور کہیں مفصل، صرف مختصر کو دیکھ کر اعتراض کر دینا مناسب نہیں، سنیے قرآن میں ہے:۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ (مریم)

اللہ فرماتا ہے یہ جنت ہم ان لوگوں کو دیتے ہیں، جو پرہیزگار ہوتے ہیں، اور ہم نازل نہیں ہوتے مگر تیرے رب کے حکم سے

مندرجہ بالا دونوں آیات مسلسل ہیں، پہلی آیت میں "نورث" جمع متکلم کا صیغہ ہے، اور اللہ تعالےٰ نے اپنے لئے استعمال کیا ہے، دوسری آیت میں بغیر کسی مرجع کے تبدیلی کے جمع متکلم کا صیغہ ہے، عبارت کے تسلسل کے لحاظ سے، اور قواعد کے لحاظ سے بھی "نتنزل" میں ضمیر کا مرجع اللہ ہی ہونا چاہیئے، تو دوسری آیت کے معنی یہ ہوئے، کہ "اللہ نہیں اترتا، مگر رسول کے رب کے حکم سے" برق صاحب دیکھا آپ نے کتنا شاندار ترجمہ ہے، اور یہ نتیجہ ہے آیت کے شان نزول کو ملحوظ نہ رکھنے کا، برق صاحب اگر کسی حدیث کو مختصر دیکھ کر ضمیر کی وجہ سے الجھن پیدا ہو گئی، تو یہ الجھن قرآن میں بھی متعدد مقامات پر ہوتی ہے، جیسا کہ ایک مثال آپ کے سامنے ہے، جیسے قرآن میں صحیح معنی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے احادیث میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے، یعنی اصلی مفہوم کو ملحوظ رکھ کر حدیث کا ترجمہ کرنا چاہیئے، تاکہ غلطی راہ نہ پا سکے۔

باب - ۹

"آنحضرتؐ کی تصویر حدیث میں"

غلط فہمی بخاری میں ہے:-

عن عائشۃ قالت کان النبی	حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں، کہ حضور علیہ السلام
صلعم یقبل ویباشر وھو صائم	روزہ رکھ کر اپنی ازواج کے بوسے لیتے اور
	ان سے مباشرت فرمایا کرتے تھے (دو اسلام ص ۲۰۱)

برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

ازالہ ان احادیث سے روزہ کا فلسفہ واضح ہوگیا، یعنی پورے تیس دن تک ہر قسم کی بدزبانی، بدکاری اور شہوت رانی سے دور رہ کر اپنے اخلاق اور روحانیت کو بلند کرنا، اور اپنے آپ کو حفاکش بنانا (ص ۲۰۱)

یہ ہے فلسفہ صوم، اب برقی صاحب بتائیں، کہ حدیث مذکور میں کون سی چیز ایسی ہے، جو اس فلسفہ کے منافی ہے، ہو سکتا ہے کہ لفظ مباشرت سے غلط فہمی ہوگئی ہو تو اس کے متعلق عرض ہے کہ مباشرت کے معنی عربی زبان میں وہ نہیں، جو عام اردو اصطلاح میں لئے جاتے ہیں، عون المعبود شرح ابوداؤد میں ہے

معنی المباشرۃ ھھنا اللمس بالید من	یعنی یہاں مباشرت سے صرف ہاتھ سے چھونا،
التقاء البشرتین (دو اسلام ص ۲۳۹)	اور دو جسموں کا ملنا مراد ہے

بلکہ عربی زبان میں اس کے اصلی معنی بدن سے بدن ملانے ہی کے ہیں، اور اس کے سوا کچھ نہیں ہے امام شوکانی فرماتے ہیں:-

ان المباشرۃ فی الاصل التقاء البشرتین	یعنے مباشرت اصل میں دو جسموں کے
دلیل الاوطار باب تقبیل الصائم	ملنے کو کہتے ہیں۔

مزید براں مباشرت کے معنے، بالمشافہہ، بلا واسطہ، رو برو کے بھی ہوتے ہیں، اور ان معنوں میں یہ بکثرت استعمال ہوتا ہے، مثلاً علامہ احمد محمد شاکر لکھتے ہیں:-

ویحتمل کما قال ابن الترکمانی ان	یعنی احتمال ہے جیسا کہ ابن ترکمانی نے کہا
یکون سمع ھذا الحدیث من عمر	ہے، کہ راوی نے اس حدیث کو حضرت عمرؓ

مباشرۃ دسمع عنہ بالواسطۃ — سے مباشرۃ' (بلا واسطہ بالمشافہہ بھی سنا ہو اور
(ترمذی جزء اول مع شرح محمد احمد شاکر مطبوعہ مصر ص۳۱۵) — بالواسطہ بھی سنا ہو۔

لہٰذا حدیث زیر بحث کا مطلب یہ ہوا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحالت روزہ اپنی بیوی کے پاس اٹھتے، بیٹھتے تھے، ہاتھ لگاتے تھے، اور پیار بھی کر لیا کرتے تھے، کہئے ان معنوں پر کیا اعتراض ہے۔

غلط فہمی ۰اس حدیث میں مباشرت سے کیا مراد ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی سنئیے، آپ صحیح مسلم کی اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فتح الملہم میں فرماتے ہیں:۔

المباشرۃ فوق السرۃ وتحت الرکبۃ بالذکر او القبلۃ او المعانقۃ او اللمس وغیر ذلک حلال باتفاق المسلمین — یعنی آپ روزہ رکھ کر عورت کے ساتھ ناف سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے مباشرت کر سکتے ہیں یعنی اسے چھو سکتے ہیں، چوم سکتے ہیں، گلے لگا سکتے ہیں، اور آلہ تناسل کا استعمال کر سکتے ہیں" (دو اسلام ص۲۰۱)

ازالہ "مباشرت کے معنی آلہ تناسل کا استعمال، اور روزہ میں اسے حلال سمجھنا" یہ واقعی غلطی ہے، اور یہ آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان معنوں کے ذمہ دار آپ ہیں نہ کہ یہ کتاب — اللہ تعالےٰ ایسے معنوں سے محفوظ رکھے۔ اس لئے ترجمہ سمجھنے میں آپ کو غلطی لگی ہے۔

غلط فہمی اس حدیث کے متعلق برق صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں:۔
"یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے۔ اول۔ روزہ کا مقصد شہوات کو ترک کرنا ہے، نہ کہ بوس وکنار اور گھٹنوں سے نیچے آلہ تناسل کا استعمال" (دو اسلام ص۲۰۱)

ازالہ حدیث مذکور میں شہوت کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ اس کی تردید ہے، آپ نے پوری حدیث نقل نہیں فرمائی، اس کے آگے حدیث میں یہ بھی ہے "کان املککم لاربہ" یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہشات پر تم سب سے زیادہ قابو رکھتے تھے، مطلب ظاہر ہے، کہ بغیر شہوت کے کبھی اپنی بیوی کو پیار کر لیا کرتے تھے، اور آپ میں اتنی قوت ضبط تھی، کہ شہوت غالب نہیں ہو سکتی تھی، اور شہوت رانی کا کوئی خطرہ نہیں تھا، حدیث کا مطلب صرف اتنا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس اٹھتے، بیٹھتے تھے، اور پیار بھی کر لیا کرتے تھے، اس سے شہوت رانی، بوس وکنار، اور گھٹنوں کے نیچے آلہ تناسل کا استعمال، سمجھنا بہت بڑی غلط فہمی ہے، برق صاحب اب ایک بات آپ بتایئے، اگر کوئی شخص بحالت روزہ اپنی بیوی کو پیار کر لے — تو کیا روزہ ٹوٹ جائے گا، یا نہیں؟

(۱) اگر ٹوٹ جائے گا، تو قرآن سے دلیل دیجئیے۔

(۲) اگر نہیں ٹوٹے گا، تو دلیل کیا ہے؟

اگر آپ یہ فرمائیں، کہ نہیں ٹوٹے گا، تو پھر ہم بھی تو یہی کہتے ہیں، اور دلیل میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں جس پر آپ نے اعتراض فرمائے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فعل سے ثابت کر دیا، کہ پیار کرنا مفسد صوم نہیں، اب کوئی تقویٰ و طہارت کا مدعی یہ کہے کہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے، تو وہ ایسا نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ یہ کام اس نے کیا ہے، جو سب سے زیادہ متقی اور مقدس تھا،

غلط فہمی برق صاحب کو اس حدیث پر دوسرا اعتراض یہ ہے، جو درج ذیل ہے:-

"دوم - یہ حدیث ادپر والی دو حدیثوں سے متصادم ہوتی ہے" (دو اسلام ص۲۰۱)

ازالہ ان دو حدیثوں میں شہوت رانی، جھوٹ اور غلط کاریوں سے بچنے کو روزہ کا مقصد بتایا گیا ہے اور اس حدیث میں ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں، لہٰذا تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

غلط فہمی تیسرا اعتراض برق صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:-

"سوم - یہ حدیث قرآن سے ٹکراتی ہے، قرآن کہتا ہے، کہ ماہ رمضان میں رات کے وقت ہم تمہیں بیویوں سے متمتع ہونے کی اجازت دیتے ہیں ۔۔۔۔ تم ان سے مباشرت کر سکتے ہو (البقرہ) یعنی رات کے وقت مباشرت کی اجازت ہے، لیکن یہ حدیث کھلی چھٹی دیتی ہے، کہ دن ہو یا رات کام چلائے چلو" (دو اسلام ص۲۰۲)

ازالہ آیت "أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ" میں لفظ "رفث" جماع کے لئے استعمال ہوا ہے، نہ کہ لفظ مباشرت، برق صاحب مباشرت کو جماع کے ہم معنی سمجھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اور "کام چلائے چلو" جیسا طنزیہ فقرہ استعمال کر رہے ہیں، آیت میں جہاں جماع کی طرف اشارہ فرمایا، وہاں رفث استعمال کیا، اور جہاں مباشرت کا لفظ استعمال فرمایا، وہاں اس کی خود ہی وضاحت کر دی، کہ مباشرت کے بعد پھر کیا کرنا ہے، برق صاحب نے پوری آیت نقل نہیں فرمائی، حالانکہ اس کے آگے یہ لفظ ہیں:-

فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ (بقرہ ۲۳)	یعنی رمضان کی راتوں میں عورتوں سے مباشرت کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے لکھ رہا ہے اس کے تلاش کرو

اگر محض مباشرت سے جماع مفہوم ہوتا تو اس کے آگے اولاد کے لئے کوشش کرنے کا کنایہ استعمال نہ ہوتا، پس ثابت ہوا، کہ آیت کی رو سے جس چیز کی ممانعت روزے میں ہے، وہ جماع ہے، نہ

کرمباشرت :-

"گناہ اور محرکات گناہ ہر دو سے بچنا ضروری ہے"

غلط فہمی برق صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا، لیکن اس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں :-

"کیا رمضان میں بوس وکنار جماع کا شدید محرک نہیں، اپنے آپ کو دیکھو کسی سے پوچھو، اور انصافاً کہو، کہ کیا آج تک کوئی شوہر بیوی کو چومنے چاٹنے اور گلے لگانے کے بعد جماع سے بچ سکا ہے؟ روزے میں بوس وکنار کی ترغیب دینا، اور پھر اس کے نتائج پر قابل عقوبت ٹھہرانا عجیب قسم کا مذاق ہے" (دو اسلام ص ۲۰۲)

ازالہ برق صاحب یہ "بوس وکنار" کے الفاظ کچھ اور مفہوم رکھتے ہیں، حدیث مذکور اس مفہوم سے پاک ہے، اچھا ایک بات انصافاً بتلایئے، کیا جوان بیوی کا اسی گھر میں رہنا، جہاں روزہ دار خاوند رہتا ہو، جماع کا محرک نہیں ہو سکتا، تو پھر اس یکجائی کو بھی محرک گناہ سمجھ کر کیوں نہ حرام قرار دے دیا جائے کیوں نہ بیوی سے کہا جائے، کہ وہ رمضان کے مہینہ میں کسی اور جگہ چلی جائے، ایک محرک سے بچانا اور دوسرے کی کھلی چھٹی دینا کون سا انصاف ہے، فرق تو صرف شدید اور غیر شدید کا ہے محرک بہرحال دونوں ہیں برق صاحب آپ نے جو سوال کیا ہے، کہ "کیا کوئی شوہر بیوی کو چومنے چاٹنے کے بعد جماع سے بچ سکا ہے" اس کا جواب اتنا ہی کافی ہے، کہ ہاں بچ سکا ہے، یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے روزہ تو بہت بڑی چیز ہے، صبح کی نماز سے پہلے محض صبح کی نماز کی خاطر بہت سے لوگ اس کام سے باز رہتے ہیں، کہ کہیں سخت سردی یا پانی کی قلت کے باعث تیمم سے نماز ادا نہ کرنی پڑے، اگر آپ کو علم نہ ہو، تو یہ دوسری بات ہے، ہر ایک کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے، پھر برق صاحب یہ اجازت ایسی ہے، کہ مسلمان ہمیشہ سے اس پر عمل پیرا ہیں، لیکن کسی کے لئے یہ بات محرک جماع ثابت نہیں ہوئی روزہ کا تقدس و احترام ہی اتنا قوی جذبہ ہے، کہ کسی مسلمان کو جماع کا خیال بھی نہیں آتا، اور اگر آ بھی جائے، تو وہ اس پر عمل کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا، یہ تو ہمارے جیسے مسلمانوں کا حال ہے، برخلاف اس کے صحابہ کرام کو دیکھئے، کہ روزہ کی حالت میں جماع کر بیٹھتے تھے، اور اتنی کثرت سے یہ عمل ظہور پذیر ہوا، کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پابندی ہٹانی پڑی، ارشاد باری ہے :-

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا	اللہ کو معلوم ہے، کہ تم لوگ روزے کی حالت میں خیانت کرتے تھے، پس اللہ نے تم پر توجہ کی، اور تم کو معاف کر دیا، اب تم مباشرت اور

كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا (البقرۃ) — اولاد کے لئے جد وجہد کر سکتے ہو، اور صبح صادق ہونے تک کھا، پی سکتے ہو۔

یہ ہے قرآن کی آیت اور صحابہ کرام کی حالت! برق صاحب نے خود بھی اعتراف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں، کہ "آغاز اسلام میں رات کے وقت بھی بیویوں سے اختلاط ممنوع تھا، بعض صحابہ رک نہ سکے تو یہ پابندی دور کر دی گئی" (دو اسلام ص۲۰۲) برق صاحب نے بعض صحابہ کو اس فعل کا مرتکب تسلیم کیا ہے، حالانکہ قرآن کی آیت میں تمام صحابہ کو اس فعل کا مرتکب بتایا ہے، برق صاحب براہ کرم بتائیے تو سہی، یہ لفظ "بعض" کس قرآنی لفظ کا ترجمہ ہے، اگر کسی قرآنی لفظ کا نہیں، اور ہرگز نہیں، تو پھر انصافاً بتائیے، کہ قرآنی آیت پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آپ کو لفظ "بعض" کا اضافہ کرنا پڑا، تو کیا کسی حدیث پر سے اعتراض دور کرنے کے لئے آپ ایسا اضافہ نہیں کر سکتے؟ براہ کرم حدیث کے سلسلہ میں بھی آپ کا یہی رویہ ہونا چاہیئے، تاکہ آپ غلط فہمی سے بچ سکیں،

برق صاحب ہمارا حال تو یہ ہے، کہ روزہ کی حالت میں جماع کے خیال سے لرزہ چڑھتا ہے، جسم خوف الٰہی سے کانپنے لگتا ہے، مگر تمام صحابہ مصداق آیت قرآنی یا بعض صحابہ بقول آپ کے اتنے خدا سے بے خوف اور شہوت پرست تھے کہ جماع سے نہ بچ سکے، اور اللہ میاں ان لوگوں پر اتنے مہربان تھے، کہ بجائے سختی کرنے کے رحمت کے ساتھ متوجہ ہوئے، گناہ کو معاف کر دیا، اور اپنے حکم کی سختی کو محسوس کر کے اس حکم میں تخفیف کر دی، گویا نعوذ باللہ اللہ تعالےٰ کو پہلے اس سختی اور تکلیف مالایطاق کا علم نہ تھا، بعد میں علم ہوا، تو ترمیم کر دی، برق صاحب اس آیت سے نہ صرف صحابہ یا بعض صحابہ کی توہین ہوتی ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی بھی توہین ہوتی ہے، لیکن آپ دیکھیں گے، کہ یہ منکرین حدیث قرآن کی اس عبارت پر تو خاموش ہو جاتے ہیں، اور حدیث میں جہاں کہیں ایسی بات آتی ہے، تو اسے لے اڑتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، ان لوگوں کا کہنا ہے، کہ اگر کسی حدیث سے اللہ تعالیٰ کی یا صحابہ کرام کی توہین ہوتی ہو، تو وہ حدیث جعلی ہے، لیکن اگر کسی آیت سے اللہ تعالیٰ یا صحابہ کرام کی توہین کا مفہوم پایا جاتا ہے، تو وہ قطعی الصحت ہے، برق صاحب آپ نے غور فرمایا، یہ کیا طرفہ ماجرا ہے، اور یہ کہاں کا انصاف ہے۔

غلط فہمی

برق صاحب کا پانچواں اعتراض یہ ہے:۔

"پنجم۔ حضور علیہ السلام کی توہین کا پہلو نکلتا ہے، اگر کوئی غیر مسلم یہ سن پائے، کہ حضور ۵۶ برس کی عمر میں روزہ رکھ کر مباشرت فرمایا کرتے تھے، تو وہ ہمارے نبی کے متعلق کیا رائے

قائم کرے گا" (دو اسلام ص ۲۰۳)

ازالہ توہین کے پہلو کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے، مزید سنیئے، اول تو اس میں توہین کا کوئی پہلو ہی نہیں اس لئے کہ مباشرت کے معنے جو آپ سمجھ رہے ہیں، وہ سرے سے غلط ہیں، پاس اٹھنے بیٹھنے سے توہین نہیں ہوتی، دوم، باب ہشتم میں ہم نے تورات کے متعدد واقعات سات نقل کئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی توہین کا پہلو نکلتا ہے، انبیاء علیہم السلام کے متعلق ہے، کہ وہ شراب پیتے تھے، لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں سے زنا کیا، داؤد علیہ السلام نے اوریا کی بیوی سے زنا کیا وغیرہ وغیرہ، کیا ان آیتوں سے اللہ وانبیاء کی توہین نہیں ہوتی، آپ فرمائیں گے نہیں ہوتی، تو پھر روزے میں پاس اٹھنا بیٹھنا جو اتنا قبیح بھی نہیں، اس سے توہین کیسے ہوتی ہے، اور اگر آپ فرمائیں کہ توہین ہوتی ہے، تو پھر فرمائیے کہ اس توہین شدید کے باوجود تورات محفوظ اور قطعی الصحت ہو تو حدیث کیوں نہ ہو؟ آخر شراب خوری، زنا کاری جیسے شدید گناہوں کے باوجود جو انبیاء علیہم السلام کی نسبت تورات میں بیان ہوئے ہیں، آپ تورات کے محرف ہونے کے قائل کیوں نہیں، بات در حقیقت یہ ہے، کہ آپ نے مقابلہ نہیں کیا، غور نہیں فرمایا، ورنہ یہ غلط فہمیاں پیدا نہ ہوتیں یہ تو تھی تورات کی بات، اب قرآن کی باتیں سنیئے، قرآن میں ہے:-

يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ (ھود) — لوط علیہ السلام نے فرمایا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لئے زیادہ پاک ہیں

پھر ارشاد فرمایا:-

هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (الحجر) — یہ میری بیٹیاں ہیں، اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو ان سے کرلو۔

کیا بوجہ غلط فہمی ان آیات سے نبی کی توہین نہیں ہوتی، کہ اپنی کافر، بدکار، خلاف وضع فطری عمل کرنے والی قوم کو اپنی بیٹیاں پیش کر رہے ہیں اور یہ بھی فرماتے جاتے ہیں، کہ یہ تمہارے لئے زیادہ پاک ہیں، یعنی پاک تو وہ نوجوان مرد بھی ہیں لیکن یہ زیادہ پاک ہیں، اگر اس آیت سے واقعی توہین رسول ہوتی ہے، تو پھر کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت بھی کسی تحریف کا نتیجہ ہے؟ (معاذ اللہ) آخر اس تفریق کی بھی کوئی وجہ ہے؟ کیا غیر مسلم ایسے قرآن اور تورات کو تسلیم کرلے گا، ہاں اگر کوئی تسلیم کرے گا بھی تو وہ پوران جیسی کتابوں کا تسلیم کرنے والا ہوگا، کیونکہ اس میں دیوی دیوتاؤں کے متعلق ایسے قصے بہت کثرت سے بیان ہوئے ہیں، اور اگر کوئی غیر مسلم ایسی آیتوں کو تسلیم کرلے گا، اور ان پر کسی قسم کا اعتراض

نہیں کرے گا، تو میں یقین دلاتا ہوں، کہ وہ حدیث زیر بحث کو بھی تسلیم کرلے گا، اور اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کرے گا، اگر زنا کاری، شراب خوری قابل عفو ہے، تو اپنی منکوحہ بیوی کے پاس اٹھنا بیٹھنا، اور اس کو پیار کرنا کون سا ناقابل معافی جرم ہے۔ اور سنیئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا (التحریم)

اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے نوح اور لوط کی بیویوں کی مثال بیان فرماتا ہے، وہ دونوں ہمارے صالح بندوں کی بیویاں تھیں، پھر ان دونوں نے اپنے شوہروں کی خیانت کی۔

شوہر کی خیانت سے زنا ہی مراد ہو سکتا ہے، اور اس پر ایک قرینہ بھی ہے، اس لئے کہ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (تحریم)

مسلمانوں کے لئے مریم بنت عمران کی مثال بیان فرماتا ہے جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی،

حضرت مریم کے سلسلہ میں شرمگاہ کی حفاظت کا ذکر کرنے، اور اوپر کی آیت میں شوہر کی خیانت کا ذکر کرنے سے کیا بات ظاہر نہیں ہوتی؟ کہ شوہر کی خیانت سے کنایۃً بدکاری مراد ہے، اب فرمائیے کیا ان نبیوں کی بیویاں زنا کار تھیں؟ کیا اس آیت سے ان نبیوں کی توہین نہیں ہوتی (اگرچہ حقیقتاً خیانت سے زنا مراد نہیں ہے لیکن غلط فہمی ہو سکتی ہے) ذرا اوپر چلئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ (الاحزاب)

جب نبی کے گھر میں تم لوگ کھانا کھا چکو، تو چلے جایا کرو، اور یہ مت کرو، کہ وہیں بیٹھ کر بات چیت میں مشغول ہو جاؤ، اس سے نبی کو تکلیف ہوتی ہے، اور وہ شرماتا ہے، اور اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا

بتلایئے یہ تکلیف کیا تھی، ۵۶ سال کی عمر میں تنہائی کی اتنی سخت ضرورت تھی، کہ اللہ تعالیٰ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہشات کا اظہار کرنا پڑا، اور جو بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم شرم کی وجہ سے کہہ نہ سکتے تھے، اللہ تعالیٰ نے کہدی، کہیئے اس بے قراری کے ثبوت سے کچھ توہین رسول ہوئی یا نہیں، اگر ہوئی اور یقیناً ہوئی، تو کیا یہ آیت آپ کسی غیر مسلم کو سنا سکتے ہیں؟ اگر آپ نے سنادی، تو پھر وہ ہمارے نبی کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا؟ کہ اس بڑھاپے میں اتنی بیویوں کی موجودگی میں یہ حال تھا، اور تولاکہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کی رضامندی اور خوشی کے اتنے متلاشی تھے، کہ اللہ کے حلال کو حرام کر لیتے تھے، سنیے قرآن کہتا ہے:۔

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ (التحریم)	اے نبی کیوں اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام کرتے ہو، تم تو اپنی بیویوں کی رضامندی کے جویا ہو۔

کہیے، اس آیت سے بھی کچھ توہین ہوئی، یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر اللہ ہی حافظ ہے، اور اگر ہوئی، تو پھر آیت کا کیا جواب ہے؟ کیا وہی جواب جو آپ نے حدیث کو دیا؟ اگر نہیں تو تفریق کی وجہ بتایئے اگر آپ تاویل کریں، تو آخر تاویل کے لئے آیت ہی کیوں ہے، حدیث کیوں نہیں، برقی صاحب قرآن سے تو بظاہر اتنی شدید توہین رسول ہوتی ہے، کہ الامان والحفیظ، یہ حدیث ہی ہے، جو ان آیات کو صحیح معنی پہنا کر توہین کو محو کر دیتی ہے، معاذ اللہ نہ قرآن میں توہین رسول کا پہلو ہے نہ حدیث میں، بس اللہ صحیح فہم عطا کرے، تو غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں، ورنہ اعتراض تو کس چیز پر نہیں ہوا، اور کون سی چیز اس سے بچی۔

غلط فہمی "یہی وہ حدیث ہے، جس نے مجھے احادیث سے بدظن کیا، اور اس کتاب کی محرک بنی میں نے اس حدیث پر ہر قسم کے آدمیوں سے تبادلۂ خیالات کیا، مثلاً علماء، ملا، پروفیسر، معلم، انگریزی تعلیم یافتہ اور عوام، صحیح المذاق علماء نے کہا، ادب کا تقاضا یہی ہے کہ خاموش رہیے پروفیسر، معلم، اور انگریزی تعلیم یافتہ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے، اور عوام غضب سے کھولنے لگے، کہ سرور کائنات کی ذات پر یہ حملہ! لیکن ملا ہر مقام پر یہی کہتا نظر آیا، کہ حدیث درست ہے اور حضور یہ کام کرتے تھے۔" (دو اسلام ص ۲۴۳)

ازالہ معلوم نہیں کس قسم کے علماء سے آپ کو سابقہ پڑا، غالباً وہ بھی آپ کی اصطلاح میں ملا ہی ہوں گے کہ اتنی معمولی بات بھی آپ کو نہ سمجھا سکے، یہ بھی معلوم نہیں، کہ آپ نے پروفیسر، معلم، انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے مباشرت کے کیا معنی بتائے، وہ بے چارے مباشرت کو اپنی اصطلاح میں جماع سمجھ بیٹھے ہوں گے، اور اس وجہ سے تعجب کا اظہار کیا، ورنہ روزے کی حالت میں پاس اٹھنے، بیٹھنے، اور چھونے سے تعجب ہونا خود تعجب انگیز ہے، اب ذرا ان لوگوں کے سامنے تورات و قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات تلاوت کر کے ان سے پوچھیے، کہ وہ کیا کہتے ہیں، اگر وہ کانوں پر ہاتھ رکھیں، تو پھر تورات کو اصلی غیر محرف اور قرآن کو محفوظ سمجھنے کا جو عقیدہ آپ رکھتے ہیں، اس پر نظر ثانی

فرما لیجیے گا، اور اگر یہ نہیں کر سکتے (حالانکہ تورات کے متعلق ایسا کرنا لازمی ہے) تو پھر یہ کیجیے، کہ احادیث صحیحہ سے جو بدظنی پیدا ہوگئی ہے، اس پر نظر ثانی فرما لیجیے گا، اگر اللہ تعالیٰ، رسول صحابہ کی توہین کے تورات و قرآن دونوں مرتکب ہیں، پھر حدیث کے مرتکب ہونے سے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر وہ صحیح تو یہ بھی صحیح ہے۔

صحیح فہمی: "رسول اللہ صلعم کا ہر عمل امت کے لئے واجب التقلید ہے" (دو اسلام ص۲۰۳)

تائید: برق صاحب! آپ کا یہ جملہ کتنا مؤمنانہ جملہ ہے، اسی مؤمنانہ جذبہ سے آپ نے اپنی کتاب تصنیف کی، ہمارے حسن ظن اور آپ کی اپنی تحریر کے مطابق معاذ اللہ آپ کی تحریر معاندانہ نہیں، اس کی بنا صرف غلط فہمی ہی ہے، اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

غلط فہمی: "مانا کہ رسول اللہ ضبط نفس کی نعمت سے بہرہ ور تھے لیکن امت میں کتنے ایسے لوگ موجود ہیں جو معانقہ وغیرہ کے بعد جماع سے رک سکیں گے" (دو اسلام ص۲۰۳)

ازالہ: برق صاحب آپ کی اس عبارت سے ظاہر ہے، کہ آپ خود بھی اس بات کے قائل ہیں کہ مباشرت سے مراد جماع نہیں ہے، معلوم نہیں پھر اعتراض کی وجہ کیا ہے، غالباً مباشرت کے جو معنے دوسروں کے حوالہ سے آپ نے نقل کئے ہیں، وہ اس کے محرک ہیں، اگر یہ صحیح ہے، تو یہ سارا اعتراض دوسروں پر ہونا چاہیے، نہ کہ حدیث پر۔

اب رہی یہ بات کہ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت روزہ مباشرت کی ہے، لہٰذا ہر امتی پر واجب ہے، کہ وہ بھی ایسا ہی کرے، یہاں بھی آپ سے غلط فہمی ہوگئی، اگر روزہ میں مباشرت کرنا، روزہ کا کوئی رکن ہوتا، اور اس فعل کا تعلق براہ راست دین سے ہوتا، تو پھر بے شک ایسا کرنا ہر امتی پر واجب تھا، لیکن روزہ میں مباشرت کرنا نہ روزہ کا رکن ہے، نہ اس کا تعلق براہ راست دینی امور سے ہے، لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل امت کے لئے صورت جواز پیش کرے گا، نہ کہ وجوب پھر اس سلسلہ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرما دی ہے، کہ کون اس فعل میں میری تقلید کر سکتا ہے، اور کون نہیں، جو شخص خواہشات پر قابو رکھ سکتا ہے، وہ اس معاملہ میں آپ کی تقلید کر سکتا ہے، اور جو قابو نہیں رکھ سکتا، وہ تقلید بھی نہیں کر سکتا، یعنی اس اجازت و رخصت سے وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے، جو اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

فاذا الذی رخص لہ شیخ والذی | یعنی حضور نے بوڑھے کو مباشرت کی اجازت دی

نھاہ شاب (ابوداؤد کتاب الصوم) | اور جوان کو اس سے منع کر دیا۔

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوگئی، کہ اس فعل کی صرف رخصت ہے نہ کہ وجوب، پھر یہ رخصت بھی عام نہیں بلکہ مقید، غرض یہ کہ احادیث میں تو ہر چیز کی وضاحت ہے، اور اعتراض عدم تحقیق کا نتیجہ، پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ مباشرت مفسد صوم نہیں، اس نوعیت سے عقیدۃً حدیث کی تقلید سب کرتے ہیں اور اس عقیدہ کا ہونا فرض و واجب ہے، رہا اس کا محرک جماع ہونا، تو اس سبب سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے جوان کو اس سے روک دیا ہے، اور جس کی خواہشات کمزور ہوچکی ہوں، اور اس وجہ سے وہ اپنی خواہشات پر قابو رکھ سکتا ہو، اس کو رخصت دے دی ہے، اور کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی خواہشات پر ہر انسان سے زیادہ قابو تھا، لہٰذا آپ نے اس پر عمل کر لیا، اور قابو میں رکھنے والوں کے لئے فعلی اجازت بھی مہیا کر دی، اب جو لوگ اسے ناجائز کہتے ہیں، اور جن کے اقوال برق صاحب نے صفحہ ۲۰۴ پر نقل کئے ہیں، وہ ایسی ہی حالت کو ملحوظ رکھ کر کہتے ہیں جس میں اندیشہ تحریک جماع ہو، ورنہ نہیں، اور اس سلسلہ میں تمام بحثوں کا یہی خلاصہ ہے۔

غلط فہمی "امام بخاری اور مسلم نے تو صرف بوس وکنار اور گھٹنوں سے نیچے استعمال آلت کی اجازت دی تھی، ابوداؤد ایک قدم اور آگے نکل گئے، کہتے ہیں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ روزہ رکھ کر مجھے چومتے تھے، اور میری زبان چوستے تھے، ایں گل دیگر شگفت" (دو اسلام صفحہ ۲۰۵)

ازالہ برق صاحب انصاف سے بتایئے، بخاری و مسلم میں "گھٹنوں سے نیچے استعمال آلت کی اجازت" آپ نے کہاں دیکھی؟ براہ کرم اس کا جواب دیجئے گا، ورنہ اپنی غلط فہمی کو دور کر لیجئے گا، بخاری و مسلم میں یہ عبارت نہیں ہے، یہ ایک ملاجی کی تشریح ہے، جس کو آپ بخاری و مسلم کی طرف منسوب کر رہے ہیں، پھر "زبان چوسنے کا اضافہ" امام ابوداؤد کی طرف منسوب کرنا کتنی بڑی غلط فہمی ہے، حالانکہ امام ابوداؤد تو خود فرماتے ہیں:۔

ھذا الاسناد لیس بصحیح	یعنی یہ حدیث صحیح نہیں ہے

(ابوداؤد عربی مطبوعہ مجتبائی دہلی جلد اول حاشیہ صفحہ ۳۳۱)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "اس کی سند ضعیف ہے" (نیل الاوطار کتاب الصوم) زیلعی لکھتے ہیں:۔

رواہ احمد فی مسندہ وھو حدیث	یعنی اس کو احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا
ضعیف. قال ابن عدی ویمص	ہے، اور یہ ضعیف ہے ابن عدی فرماتے ہیں
لسانھا لا یقولہ الا محمد بن دینار و	"زبان چوسنے" کے الفاظ کوئی بیان نہیں کرتا سوائے
قد ضعفہ یحیی بن معین وسعد	محمد بن دینار کے، اور تحقیق اس کو امام یحییٰ بن معین

بن ادس، قال ابن معین فیہ ایضا	نے ضعیف کہا ہے، اور سعد بن ادس کو بھی امام
بصری ضعیف وقال عبد الحق فی	ابن معین فرماتے ہیں بصری بھی ضعیف ہے، اور
احکامہ ھذا حدیث لا یصح فان	عبد الحق نے احکام میں فرمایا ہے، کہ یہ حدیث صحیح
ابن دینار وابن ادس لا یحتج بھما	نہیں، کیونکہ ابن دینار، اور ابن ادس دونوں ہی
(نصب الرایہ ج ۲ ص ۲۵۳ فصل فی الاستبراء)	نا قابل حجت ہیں۔

برق صاحب محدثین تو اسے کھوٹا اور ناکارہ سکہ سمجھ کر مسترد کر رہے ہیں، اور آپ فرماتے ہیں کہ محدثین ایک سے ایک بڑھیا حدیث گھڑتے گئے (دو اسلام ص ۲۰۵) کہئے یہ محدثین کے ساتھ مذاق تو نہیں ہے؟ برق صاحب کسی پر الزام لگانے کے لئے وہ چیز پیش کی جاتی ہے جس کو وہ صحیح تسلیم کرتا ہو، اور جس کو وہ تسلیم ہی نہ کرتا ہو، اس کو بطور حجت پیش کرنا بعید از عقل ہے۔

غلط فہمی "(حذیفہ) فرماتے ہیں . . . روزہ رکھ کر جو شخص بیوی کا تصور باندھے اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے" (دو اسلام ص ۲۰۴-۲۰۵)

ازالہ برق صاحب یہ بھی کھوٹا سکہ ہے، یہ قول حضرت حذیفہ پر اتہام ہے، امام شوکانی لکھتے ہیں :-

قال فی الفتح واسنادہ ضعیف	یعنی حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے
(نیل الاوطار باب تقبیل الصائم)	کہ اس کی سند ضعیف ہے

غلط فہمی "سوال۔ حضرت عائشہ رض نے اسود کو تو مباشرت سے روکا، لیکن خود اس فعل کا ارتکاب کرتی رہیں، یہ کیا؟ . . . . کیا جواب دوں اس سوال کا، نہ صرف اس فعل کا ارتکاب کرتی رہیں، بلکہ دوسروں کو ترغیب دیتی ہیں . . . . محدثین کی ان نیرنگیوں کو کون سمجھے، ہر طرف اختلاف ہر جگہ تضاد" (دو اسلام ص ۲۰۵-۲۰۶)

ازالہ "حضرت عائشہ رض خود اس فعل کا ارتکاب کرتی رہیں" یہ کس حدیث میں ہے؟ براہ کرم اس کا حوالہ دیا جائے، مسئلہ زیر بحث کی اصلیت یہ ہے، کہ جو شخص اپنی خواہش قابو میں نہ رکھ سکتا ہو، اس کے لئے بحالت روزہ مباشرت منع ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوان کو اس سے منع فرما دیا، اور جو شخص اپنی خواہشات پر قابو رکھ سکتا ہے، اس کیلئے اجازت ہے، اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ایسا کر لیا کرتے تھے، اور اسی لئے آپ نے ایک بوڑھے کو اس کی اجازت دی، عبد اللہ چونکہ روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے بالکل علیحدہ رہا کرتے تھے پاس تک نہ آتے تھے، ان کی بیوی نے حضرت عائشہ سے شکایت کی، تو حضرت عائشہ نے مسئلہ سمجھانے کے لئے یہ بات کہی، کہ

تم اپنی بیوی کے پاس کیوں نہیں آتے، مطلب ان کا یہ تھا، کہ تم اپنی بیوی کے پاس آ سکتے ہو، پیار کر سکتے ہو کھیل سکتے ہو، یہ راہبانہ زندگی تم نے کس سے سیکھی، عبداللہ کو اس پر تعجب بھی ہوا، اور پوچھا، کہ کیا پیار بھی کر سکتا ہوں، حضرت عائشہ رض نے فرمایا ہاں (موطا امام مالک) گویا حضرت عائشہ کا مقصد مسئلہ سمجھانا، اور ان کی شدت کو ختم کرنا تھا، نہ اس میں کوئی ترغیب تھی، نہ کچھ اور، سیاق و سباق اور پس منظر کو سامنے نہ رکھنے سے ایسی غلط فہمیاں ہو جایا کرتی ہیں برقی صاحب غالباً یہ سمجھتے ہوں گے، کہ بیوی کے ساتھ ہنسنا، بولنا، پیار کرنا بغیر شہوت کے ہو ہی نہیں سکتا، اور غالباً غلط فہمی کی اصل وجہ یہی ہے۔

غلط فہمی حیا عورت کی فطرت ہے، کوئی عورت کسی صورت میں بھی شرمگاہوں (مردانہ ہوں یا زنانہ) کا ذکر نہیں کرتی، آج تک کسی بیوی نے اپنے شوہر سے مباشرت کی التجا نہیں کی، اور نہ مرد کے سامنے کبھی عریاں بات کی، تو پھر ہم یہ کیسے تسلیم کر لیں، کہ حضرت عائشہ غیر مردوں کو اپنے گھر میں اور وہ بھی روزہ کی حالت میں بوس و کنار کی ترغیب دیتی تھیں" (دو اسلام ص۲۰۶۔۲۰۷)

ازالہ بے شک حیا عورت کی فطرت ہے لیکن اظہار حق کے معاملہ میں حیا مذموم ہے، یہی وجہ ہے کہ مسائل کے بیان میں ازواج مطہرات نے اخفائے حق سے کام نہیں لیا، اور کتابوں میں مسائل کو مل کر دیا، یہ قطعاً صحیح نہیں، کہ کسی زوجہ مطہرہ نے شرمگاہوں کا ذکر کیا ہو، اگر ایسی کوئی حدیث ہو، تو بتایئے پھر یہ بھی بتایئے، کہ ڈاکٹری و طب یونانی کے کالجوں اور مدرسوں میں تناسل و توالد پر لیکچر دیئے جاتے ہیں یا نہیں، لیکچر دینے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں، اور سننے والوں میں لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط جماعتیں ہوتی ہیں، اور آج کل کا گندہ معاشرہ ہوتا ہے، لیکن کبھی کسی نے کہا ہے، کہ یہ کیا بے حیائی ہے، بلکہ اب تو عام اسکولوں میں اس قسم کی ابتدائی تعلیم لازمی ہو گئی ہے، ہر اسکول میں اعضائے تناسل کے متعلق پڑھایا جاتا ہے اس کی شکلیں تک کھینچی جاتی ہے، پڑھانے والی عورتیں ہوتی ہیں، پڑھنے والی بھی عورتیں ہوتی ہیں لیکن اس تعلیم سے ان دونوں کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی، یہاں عورت کی فطرت کہاں چلی جاتی ہے۔

برقی صاحب آپ بار بار لفظ مباشرت کو جماع کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں، اس سے قارئین کو بڑی غلط فہمی ہوتی ہے۔

پھر یہ بھی صحیح نہیں، کہ حضرت عائشہ نے غیر مردوں کو اپنے گھر میں بوس و کنار کی ترغیب دی تھی جس شخص سے حضرت عائشہ رض نے یہ بات کہی تھی آپ ہی کے بیان کے مطابق وہ حضرت ابوبکر کے پوتے عبداللہ تھے (دو اسلام ص۲۰۶) لہذا عبداللہ حضرت عائشہ کے حقیقی بھتیجے، اور محرم تھے، اور حضرت عائشہ رض ان کی حقیقی پھوپھی تھیں، اب بتایئے کہ وہ محرم تھے یا نامحرم معلوم نہیں آپ لکھتے وقت

کچھ غور بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ اچھا اب یہ بھی بتلایئے، کہ ماں یا پھوپھی اپنے بچے کو اس قسم کے مسائل سے آشنا کرتی ہے یا نہیں، خصوصاً اس وقت جب کہ بچہ مسئلہ کو غلط سمجھا ہو، حضرت عائشہ نے عبداللہ کی غلط فہمی دور کر کے مسئلہ سمجھا دیا، اور روزہ میں راہبانہ زندگی کو مہمل قرار دیا۔

غلط فہمی "ساری قوم میں حضرت عائشہ رضہ کو کیا پڑی تھی کہ مباشرت کی تلقین کرتی پھریں، آخر حضور علیہ السلام کے حرم میں دس ازواج اور بھی تھیں، ہر صحابی کے گھر میں ایک ایک بیوی تھی خود صحابہ کے منہ میں زبان تھی، پھر کیا وجہ ہے، کہ مباشرت کی اکثر احادیث حضرت عائشہ رضہ سے منقول ہیں" (دو اسلام ص۲۰۷)

ازالہ گویا برق صاحب کے خیال میں یہ حدیث صرف حضرت عائشہ رضہ سے مروی ہے، یہ عدم تحقیق کا نتیجہ ہے، یہ حدیث زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہ، حضرت عمر فاروق، حضرت ابوہریرہ رضہ اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضہ وغیرہ سے مروی ہے۔

غلط فہمی "مجھے یوں نظر آتا ہے، کہ دشمنان اسلام نے حضرت عائشہ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقار کو کم کرنے کے لئے یہ احادیث وضع کیں" (دو اسلام ص۔)

ازالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہ بیویوں کے تو آپ بھی قائل ہیں (دو اسلام ص۲۰۷) تو کیا یہ گیارہ بیویوں کا افسانہ بھی کسی دشمن اسلام کا ساختہ ہے، تاکہ اس سے کردار رسول پر بھرپور چوٹ پڑے، اور آپ کا وقار ختم ہو جائے، اور جب یہ نہیں، تو اظہار مسائل سے وقار ختم نہیں ہوتا، یہ بالکل مرعوب ذہنیت ہے۔

یہ حدیث جب دوسرے صحابیوں سے بھی مروی ہے، تو پھر صرف حضرت عائشہ کا نام لینا غلط فہمی ہے، لہٰذا وضع کا شاخسانہ لغو ہے، آخر دشمنان اسلام کے نام تو لیجئے، امام مالک نے مؤطا میں اس کو ہشام بن عروہ، اور عروہ بن زبیر رضہ سے روایت کیا ہے، عروہ حضرت زبیر رضہ کے صاحبزادے اور حضرت عائشہ کے حقیقی بھانجے اور تربیت یافتہ ہیں، ہشام انہی عروہ کے لڑکے، اور بہت بڑے امام ہیں، اب فرمایئے، اس حدیث کے گھڑنے والے حضرت عروہ ہیں، یا امام ہشام یا خود امام مالک، ان میں سے کس کو آپ دشمن اسلام سمجھتے ہیں؟ پھر ان کی یہی ایک سند نہیں، بلکہ متعدد اسناد ہیں کس کس امام کو آپ دشمن اسلام سمجھیں گے، کیا قرآن کی اس آیت "تبتغی مرضات ازواجك" (یعنی اے رسول تم اپنی بیویوں کی رضا کے جویا ہو) سے رسول اور ازواج کے وقار کو ٹھیس نہیں پہنچتی؟ پھر کس کس چیز کو آپ دشمنان اسلام کا کرشمہ قرار دیں گے۔

خلاصہ روزے کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس اٹھنا بیٹھنا اور خواہشات پر قابو رکھنے والے کے لئے پیار کرنا بالکل جائز ہے، اس سے نہ روزہ ٹوٹتا ہے، نہ روزہ میں کوئی خرابی آتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے منہ میں پانی لے کر کلی کرنا جس طرح منہ میں پانی لینے سے روزہ میں کوئی نقص نہیں آتا، اسی طرح بیوی کو پیار کرنے سے بھی کوئی نقص نہیں آتا، اور یہ مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، کہ میں نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کو پیار کیا، پھر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا:۔

ارأیت لو تمضمضت بماء وانت صائم قلت لا باس بذلک فقال ففیم (ابوداود کتاب الصیام)	یہ بتاؤ، اگر تم روزے میں پانی سے کلی کرتے تو کیا ہوتا، میں نے کہا اس میں تو کوئی حرج نہیں آپ نے فرمایا، پھر اس میں کیا حرج ہے۔

مطلب یہ کہ منہ میں پانی لینا اگرچہ پانی پینے کا پیش خیمہ ہے، لیکن چونکہ اس سے پانی پینے کی نیت نہیں ہوتی، لہذا روزہ میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح پیار کرنا جماع کا پیش خیمہ ہے، لیکن جب پیار کرنے سے جماع و شہوت کی نیت نہیں ہوتی، تو ایسا پیار بھی روزہ میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتا۔ آپ کہیں گے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت ہی کافی تھی، عمل کر کے دکھانے کی آخر کیا ضرورت تھی، میں کہتا ہوں، اس کی بھی وجہ ہے، لیکن اگر وجہ نہ بھی ہو، تو بھی جائز کام کرنے میں اعتراض ہی کیا ہے، آپ بلاوجہ ڈر رہے ہیں۔ وجہ یہ تھی، کہ مدعیان تقویٰ کے غلو کو توڑنا مقصود تھا ایسا نہ ہو، کہ کوئی مدعی تقویٰ یہ کہہ دے، کہ یہ کام تقویٰ کے منافی ہے، لہذا مناسب نہیں، عورت سے دور رہنا ہی مستحسن ہے اور اس طرح راہبانہ زندگی کی داغ بیل ڈالی جائے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص نے پیار کرنے کو مناسب نہیں سمجھا، بلکہ آپ کے فعل کو یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ آپ کی کیا بات ہے، آپ نبی ہیں، آپ کر سکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنکر فرمایا

واللہ انی لاتقاکم للہ واخشاکم (صحیح مسلم)	اللہ کی قسم مجھ میں تم سے زیادہ اللہ کا تقویٰ اور اس کی خشیت ہے

بلکہ یہاں تک فرمایا:۔

انا اعلمکم بحدود اللہ (نیل الاوطار باب تقبیل الصائم بحوالہ عبد الرزاق)	میں اللہ تعالےٰ کے حدود کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں

بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ متقی، اور سب سے زیادہ محرم رموز شریعت تھے

لہذا جو کچھ آپ نے کیا، وہ شریعت کے حدود کے اندر رہ کر کیا، اور جو کچھ کیا، وہ جائز تھا، نامناسب نہیں تھا، آپ اور ہم اس کو نامناسب کہنے والے کون؟

غلط فہمی "قرآن شریف میں مذکور ہے:۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ قُلْ هُوَ اَذًی فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِی الْمَحِیْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی یَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰهُ (البقرۃ)	لوگ آپ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ حیض ایک قسم کی غلاظت ہے، اس لئے دوران حیض میں بیویوں سے دور رہئے، اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان کے قریب مت جائیے اور پاک ہونے کے بعد ان سے مباشرت کیجئے

اس آیت میں دو حکم دیئے گئے ہیں، اول حیض کی حالت میں عورتوں سے دور رہئے، دوم ان کے قریب مت جائیے، ذرا دیکھیں کہ حدیث نے اس قریب و دور کی کیا تشریح پیش کی ہے۔

عن عائشۃ ... کان یامرنی فاتزر فیباشرنی وانا حائض	حضرت عائشہ فرماتی ہیں، کہ حیض کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تہ پوش پہننے کا حکم دیتے، اور اس کے بعد مجھ سے مباشرت کرتے تھے۔

...... یہ ہے قریب و دور کی تشریح حدیث میں" (دو اسلام ص۲۰۷-۲۰۸)

ازالہ آیت مذکور میں "اذی" وارد ہوا ہے، برق صاحب نے اس کا ترجمہ غلاظت کیا ہے، حالانکہ یہ لفظ اذیت سے بنا ہے یعنی حیض ایک قسم کی تکلیف ہے، اور اس تکلیف کی حالت میں قربت مناسب نہیں ہے، ہاں جب وہ اس تکلیف سے پاک ہو جائیں، تو پھر ان کے پاس آؤ، اس طریقہ سے جس طریقے سے آنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، یعنی قانون فطرت کے مطابق، نہ کہ خلاف وضع فطری کے طور پر، یہ ہے آیت کا منشا اور مفہوم، آیت میں قربت سے مراد جماع ہے، نہ کہ پاس اٹھنا، بیٹھنا، اور "فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰهُ" (اللہ کے حکم کے مطابق ان کے پاس آؤ) اس پر قرینہ ہے، برق صاحب نے قرب کے معنی پاس بیٹھنے کے سمجھ لئے اور اتنی لمبی چوڑی بحث کر ڈالی، آیت میں جماع کی ممانعت ہے، حدیث میں پاس اٹھنے، بیٹھنے کی اجازت، دونوں میں تعارض کہاں ہے، برق صاحب نے بار بار پاس اٹھنے بیٹھنے کے لئے لفظ مباشرت استعمال کیا ہے، حالانکہ وہ بھی جانتے ہیں، کہ یہ لفظ اردو میں کچھ دوسرے معنی رکھتا ہے، اور غلط فہمی کا موجب ہو سکتا ہے، برق صاحب کی تحریر جو کوئی پڑھے گا، وہ یہی سمجھے گا کہ جماع کرتے تھے حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔

غلط فہمی "احادیث میں بار بار آتا ہے:۔
وکان املککم لاربہ (بخاری ومسلم موطا وغیرہ) کہ حضور کو اپنی خواہشات پر کمال ضبط تھا
یہ عجیب قسم کا ضبط ہے، کہ بقول بخاری ومسلم آپ نہ روزے میں مباشرت سے رکتے تھے، نہ حیض
میں" (دو اسلام صفحہ ۲۱۰-۲۱۱)

ازالہ یہ جملہ دوسری احادیث میں نہیں آیا ہے، بلکہ مباشرت در حیض اور مباشرت در صیام کی احادیث ہی میں وارد ہوا ہے، معلوم نہیں برق صاحب نے کس وجہ سے اس کو علیحدہ ذکر کیا ہے، اس کلمہ ہی سے تو یہ ثابت ہوتا ہے، کہ مباشرت کے معنی وہ نہیں جو ہماری اصطلاح میں لئے جاتے ہیں، پوری حدیث اس طرح ہے، کہ آپ حالت حیض میں اور حالت صوم میں مباشرت فرمایا کرتے تھے، اور آپ کو اپنی خواہشات پر کمال ضبط حاصل تھا (بخاری ومسلم) حضرت عائشہ کے آخری الفاظ بتا رہے ہیں، کہ مباشرت سے مراد جماع نہیں، بلکہ پاس اٹھنا، بیٹھنا وغیرہ ہے، برق صاحب اس کے معنی جماع بتاتے ہیں، اور یہی غلط فہمی کا اصل سبب ہے، حدیث کا مطلب صاف ہے، کہ آپ مباشرت تو کرتے تھے لیکن کمال ضبط کی وجہ سے اور کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

غلط فہمی "امام مالک نے بھی یہ احادیث نقل کی ہیں، لیکن حضور کی طرف مباشرت منسوب نہیں کی، صرف بوسے کا ذکر کیا ہے، بہ دیگر الفاظ امام مالک بھی یہ سمجھتے تھے، کہ مباشرت کی نسبت حضور والا صفات کی طرف موجب تنقیص ہے" (دو اسلام صفحہ ۲۱۱)

ازالہ "مباشرت" کے معنی پاس اٹھنے بیٹھنے کے ہیں، اس لحاظ سے بوسہ کچھ مباشرت سے زیادہ ہی ہے لیکن برق صاحب مباشرت کے معنی جماع لے رہے ہیں، اور اسی وجہ سے اس کو بوسہ سے زیادہ سمجھ کر موجب تنقیص سمجھ رہے ہیں، امام مالک کی مؤطا میں مباشرت کا لفظ استعمال نہیں ہوا، یہ تو صحیح ہے لیکن جو اس کے معنی ہیں، وہ مؤطا میں موجود ہیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ کے پاس حیض کی حالت میں لیٹنا ـــــ پاس لیٹنا اور پاس اٹھنا بیٹھنا" اسی کو تو مباشرت کہتے ہیں، اور یہ چیز مؤطا میں موجود ہے، جماع کے معنوں میں یہ لفظ نہ مؤطا میں ہے نہ کسی دوسری کتاب میں۔

غلط فہمی "بخاری کی حدیث ہے:۔

عن عائشۃ قالت کنت اغتسل انا والنبی صلی اللہ علیہ وسلم من اناء واحد
حضرت عائشہ فرماتی ہیں، کہ میں اور رسول اللہ صلعم ایک ہی برتن سے نہاتے تھے

.... مطلب یہ کہ حضور ازواج کے ہمراہ برہنہ غسل فرمایا کرتے تھے" (دو اسلام صفحہ ۲۱۱)

برقی صاحب نے تمام حالات کا جائزہ نہیں لیا، ورنہ یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

ازالہ اول ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا تھا، حضرت عائشہ فرماتی ہیں:۔

كنت انام بين يدى رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجلاى فى قبلته فاذا سجد غمزنى فقبضت رجلى فاذا قام بسطتهما والبيوت يومئذ ليس فيها مصابيح (موطا مالک باب صلوٰة الليل)	میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لیٹی ہوتی تھی اور میرے پیر آپ کے قبلہ کی جانب ہوتے تھے، پس جب آپ سجدہ کرتے تو میرے پیر کو دبا دیتے، میں پیر سمیٹ لیتی، پھر جب آپ کھڑے ہو جاتے تو میں پیر پھیلا دیتی، اور ان ایام میں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔

یعنی تاریکی کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ آپ سجدہ کے لئے جھک رہے ہیں، لہٰذا آپ کو پیر دبانے کی ضرورت پیش آتی تھی، اگر اجالا ہوتا، تو وہ خود بخود آپ کو سجدہ کے لئے جھکتا دیکھ کر پیر سمیٹ لیتیں، دوسری حدیث سنیئے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

فقدت رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة من الفراش فالتمسته فوقعت يدى على بطن قدميه وهو فى المسجد وهما منصوبتان (صحیح مسلم باب ما يقال فى الركوع والسجود)	ایک رات کو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہیں پایا، تو میں نے ٹٹولا، تو میرے ہاتھ آپ کے تلوؤں پر لگے، آپ سجدہ کر رہے تھے، اور آپ کے پاؤں مبارک کھڑے تھے۔

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا، کہ آپ کے گھر میں اتنا اندھیرا گھپ ہوتا تھا، کہ ایک دوسرے کو دیکھنا محال تھا، لہٰذا حدیث پر جو اعتراض ہے، وہ کالعدم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھتے تھے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليصلى الصبح فينصرف النساء متلفعات بمروطهن ما يعرفن من الغلس (موطا امام مالک باب وقوت الصلوٰة - بخاری ومسلم)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے، کہ عورتیں جب نماز پڑھ کر اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی واپس ہوتی تھیں تو اندھیرے کے سبب سے پہچانی نہیں جاتی تھیں۔

اس حدیث سے ثابت ہوا، کہ نماز صبح سے فارغ ہونے کے بعد بھی اتنا اندھیرا ہوتا تھا، کہ کسی کو پہچاننا

نہیں جاسکتا تھا، یہ تو کھلی جگہ کا حال تھا، حجرہ کے اندھیرے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے، پھر یہ بھی غور فرمایئے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بڑی طویل قرأت کیا کرتے تھے، پھر اس سے پہلے کچھ دیر لیٹے رہتے، اس سے پہلے سنتیں پڑھتے تھے، نہانا ان تمام کاموں سے پہلے ہی ہوتا ہوگا، جب نماز کے بعد کھلی جگہ میں اچھی طرح دیکھا نہیں جاسکتا تھا، تو پھر بند حجرے میں شدید تر تاریکی میں کیا نظر آتا ہوگا، پس اس تشریح سے ثابت ہوا، کہ دونوں ایک دوسرے کو برہنہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے، لہذا اعتراض فضول ہے

رہا برق صاحب کا یہ کہنا، کہ یہ چیز جچتی نہیں، دشمن کیا کہیں گے، تو جناب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شایان شان تو متبنی کی بیوی سے نکاح کرنا بھی نہیں تھا، دشمن کہتے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں پھر کیا آپ اس واقعہ کو قرآن سے نکال دیں گے، برق صاحب یہاں دوسرے کی نگاہ میں جچنے نہ جچنے کا سوال نہیں ہے یہاں تو آپ کے افعال سے ضابطہ حیات تیار کروایا جارہا ہے، یہاں مسائل ڈھل رہے ہیں، جائز و ناجائز میں سنت کے ذریعہ امتیاز پیدا کروایا جارہا ہے، لہذا یہاں ہر وہ چیز ملے گی، جس سے ضابطہ حیات انسانی پر روشنی پڑتی ہو، یہی وجہ ہے، کہ دبیر عالم کے اندرونی حالات بھی منظر عام پر لائے گئے، اور یہی تو ضابطہ کا کمال ہے، اور ہم اس پر نازاں ہیں، اور آپ اس سے شرمارہے ہیں۔

دوم۔ حدیث میں ہے، کہ:۔

من اناء بینی و بینہ واحد   یعنی ہم ایک ہی لگن سے نہایا کرتے تھے، جو ہم دونوں کے درمیان رکھا ہوتا تھا

(صحیح مسلم عن عائشۃ)

لہذا یہ لگن دونوں کے درمیان پردہ کا کام بھی کرتا ہوگا۔

خلاصہ | انتہائی تاریکی میں دونوں نہاتے تھے، ایسا اندھیرا ہوتا تھا، کہ ایک، دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا تھا، پھر دونوں کے درمیان لگن رکھا ہوتا تھا، لہذا یہ سمجھنا کہ دونوں ایک دوسرے کو برہنہ دیکھتے تھے، بالکل غلط ہے۔

سوم۔ برق صاحب آپ نے یہ حدیث نقل کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ دونوں برہنہ نہایا کرتے تھے براہ کرم بتایئے، کہ اس میں "برہنہ" کس لفظ کا ترجمہ ہے، آخر اس اضافہ کی آپ کو کیا ضرورت پیش آئی اگر ہم یہ کہدیں، کہ دونوں تہبند باندھ کر نہایا کرتے تھے، دونوں کے درمیان پردہ پڑا ہوتا تھا، تو کیا یہ اضافہ ناجائز ہوگا، اگر وہ جائز ہے، تو یہ اس سے زیادہ جائز ہے، اور شایان شان بھی ہے، کاش آپ نے بجائے اس اضافہ کے یہ اضافہ کردیا ہوتا تو کتنا قرین انصاف تھا، حدیث میں برہنہ ہونے

کا کوئی ذکر نہیں ہے، لہذا اعتراض فضول ہے۔

چہارم :- حضرت عائشہ فرماتی ہیں :-

ما رأیت فرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قط (ابن ماجہ جلد اول) — میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرم گاہ کو کبھی نہیں دیکھا

اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ آپ اور ازواج مطہرات برہنہ نہیں نہاتے تھے، اور اگر بالفرض محال تاریکی میں برہنہ ہوکر نہاتے بھی تو ایک دوسرے کو ننگا نہیں دیکھتے تھے۔ یہ ننگا دیکھنے کا شاخسانہ بالکل فرضی ہے برق صاحب تمام احادیث پر نظر ڈال کر کسی حدیث کا مطلب نکالا کیجیے، تاکہ کبھی غلط فہمی نہ ہو۔

غلط فہمی "اور سنیے، ابو سلمہ کہتے ہیں کہ میں اور حضرت عائشہ کا بھائی، حضرت عائشہ رض کے پاس گئے، ان کے بھائی نے ان سے دریافت کیا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح غسل فرمایا کرتے تھے حضرت عائشہ نے پانی سے بھرا ہوا ایک برتن منگوایا، جس سے آپ نے غسل کیا، اور سر پر بھی پانی ڈالا، درمیان میں ایک پردہ لٹکایا ہوا تھا" (بخاری جلد ۱ ص ۳۹) سوال یہ ہے، کہ آیا یہ دونوں اس پردے میں سے حضرت عائشہ رض کو غسل کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے، اگر جواب نفی میں ہے، تو غسل رسول کی نمائش کرنے کا مقصد کیا تھا، اور اگر اثبات میں ہے تو پھر" (دو اسلام ص ۲۱۲-۲۱۳)

ازالہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوگئی غسل کے معنی صرف نہانے کے نہیں ہیں، بلکہ غسل کے معنی نہانے کے پانی کے بھی ہیں، اور ان معنوں میں یہ لفظ صحیح بخاری ہی میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے، مثلاً: حضرت میمونہ فرماتی ہیں :-

وضعت لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسلا (صحیح بخاری کتاب الغسل) — میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے "غسل" رکھا، یعنی نہانے کا پانی رکھا۔

امام بخاری اور امام مسلم کی تبویب اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے کافی ہے، امام بخاری نے اس حدیث پر باب باندھا ہے

الغسل بالصاع ونحوہ — یعنی غسل تقریباً ایک صاع پانی سے کرنا چاہیے

امام مسلم کی سرخی یہ ہے :-

قدر المستحب من الماء فی غسل الجنابۃ — یعنی غسل میں کتنا پانی لینا مستحب ہے

اس بنا پر فسالہا عن غسل النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہوا، کہ انہوں نے نہانے کے پانی کے متعلق سوال کیا، اس سوال کے جواب میں حضرت عائشہ نے کیا کیا، وہ ان ہی الفاظ کے آگے

مذکور ہے، کہ "فدعت باناء" انہوں نے ایک برتن منگوایا، اور اس برتن کے ذریعہ یہ بتا دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنے پانی سے نہایا کرتے تھے، لہٰذا حدیث مذکور میں غسل کی کیفیت کا بیان نہیں، بلکہ غسل کے پانی کا بیان ہے، نہ اس سے غسل رسول کی نمائش کرنا مقصود تھا، غسل کی کیفیت تو حضرت عائشہ نے زبانی بتائی تھی، ابو سلمہ کہتے ہیں:۔

قالت عائشة کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اغتسل بدأ بیمینه الخ (صحیح مسلم)	حضرت عائشہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل کرتے تو سیدھے ہاتھ سے شروع کرتے وغیرہ وغیرہ

نسائی میں اس طرح ہے، ابو سلمہ کہتے ہیں:۔

وصفت عائشة غسل النبی صلی اللہ علیه وسلم من الجنابة قالت کان یغسل یدیه ثلاثا	حضرت عائشہ رضہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی کیفیت بتائی تو کہا، کہ آپ پہلے دونوں ہاتھ دھوتے تھے، وغیرہ وغیرہ

غرض یہ کہ غسل کی کیفیت بتانے کے لئے حضرت عائشہ رضہ نے غسل نہیں کیا، بلکہ جب انہوں نے پانی کی مقدار کا ذکر کیا، تو ابو سلمہ وغیرہ نے تعجب کا اظہار کیا، کہ اتنے کم پانی سے کیسے نہایا جا سکتا ہے، تو حضرت عائشہ نے کہا یہ بالکل ممکن ہے، اور اب میں نہانے جا رہی ہوں، اور اتنے ہی پانی سے نہاؤں گی پس انہوں نے پردہ ڈالا، اور غسل فرمایا، اور یہ ثابت کر دیا، کہ اتنے پانی سے نہانا ناممکن نہیں، نہانے کا مقصد یہ تھا، نہ کہ وہ جو برق صاحب سمجھے۔

غلط فہمی "چار نامحرم آنکھیں حضرت عائشہ کو غسل کرتا دیکھیں، اور امام بخاری کو نہ غیرت آئے، نہ غصہ اور اس حدیث کو قول رسول سمجھ کر اپنی کتاب میں شامل کر لیں، کیا کوئی مسلمان یہ برداشت کر سکتا ہے، کہ اس کی بیوی ایک پتلا سا پردہ تان کر سارے محلہ کے سامنے نہائے، اور شرعی غسل کا طریقہ بتائے" (دو اسلام ص۲۱۳)

ازالہ برق صاحب یہ وہی مبالغہ اور رنگ آمیزی ہے، جس کا ذکر آپ پہلے کر چکے ہیں، ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں، دو آدمیوں کو چار آنکھ کہہ کر عجیب رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے آپ دو آدمی بھی کہہ سکتے تھے، پھر آپ نے ان دونوں کو نامحرم کیسے بنا دیا، آپ کی نقل کردہ عبارت میں موجود ہے کہ میں اور حضرت عائشہ رضہ کا بھائی حضرت عائشہ رضہ کے پاس گئے" (دو اسلام ص۲۱۲-۲۱۳) لہٰذا آپ ہی کی کتاب اور خود حدیث کے متن سے یہ بات واضح ہو گئی، کہ ایک تو یقیناً حضرت عائشہ کے

بھائی تھے اور محرم تھے، اب رہ گئے ابو سلمہ، تو ابو سلمہ بھی حضرت عائشہ رضہ کے رضاعی بھانجے تھے لہذا دونوں محرم تھے، برق صاحب یہ تو بتائیے، کہ "یہ پتلا سا پردہ تان کر سارے محلے کے سامنے نہائے" یہ کن الفاظ کا ترجمہ ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

عن ابی ھریرۃ ان النبی صلعم قال اذا جلس بین شعبھا الاربع ثم جھدھا وجب علیہ الغسل و ان لم ینزل (مسلم ج ۱ ص ۱۸۵)

ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا، جب مرد عورت کی ٹانگوں کے درمیان بیٹھ کر زور لگانا شروع کردے تو اس کے لئے نہانا ضروری ہو جاتا ہے خواہ انزال ہو یا نہ

اب اس بحث کو جانے دیجیئے کہ کئی احادیث کی رو سے غسل ضروری نہیں (تفصیل گذر چکی ہے) حدیث کی زبان دیکھئے ماشاء اللہ "کتنی پاکیزہ اور شستہ" ہے (دو اسلام ص ۲۱۴)

ازالہ برق صاحب عربی عبارت تو بے شک "پاکیزہ اور شستہ" ہے، ناشائستگی تو ترجمہ نے پیدا کر دی ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے "جب کوئی مرد عورت کے چاروں شعبوں کے درمیان بیٹھ جائے، پھر اس کے ساتھ کوشش کرے، تو غسل فرض ہو جائے گا، خواہ انزال نہ ہو" برق صاحب! آپ نے جو ترجمہ کیا ہے، اس سے بھی زیادہ ناشائستہ اور شرمناک ترجمہ ہو سکتا ہے، مترجم کی مرضی پر انحصار ہے، چاہے جیسا ترجمہ کردے، برق صاحب ذرا قرآن مجید کے مندرجہ ذیل کلمات پر غور فرمایئے۔

(۱) خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ (۲) اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ (۳) فَلَمَّا تَغَشّٰھَا (۴) اَلَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا (۵) نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ

کیا ان کلمات کے ناشائستہ اور حیا سوز ترجمے نہیں ہو سکتے؟ ہو سکتے ہیں لیکن یہ قصور ترجمہ کا ہوگا نہ کہ متن کا، میرا ایمان اجازت نہیں دیتا، ورنہ میں ان کے ایسے ترجمے پیش کر دیتا۔

غلط فہمی برق صاحب لکھتے ہیں:-

"جب اللہ کے فضل و کرم سے حضور نے قلعہ خیبر کو فتح کر لیا، تو کسی نے کہا صفیہ بنت حیی بڑی خوبصورت لڑکی ہے، اس کا خاوند جنگ میں مر چکا ہے، اور وہ ابھی دلہن ہے، یہ سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے لئے پسند کر لیا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور خیال سے نہیں، بلکہ صفیہ کی شہرت حسن سنکر اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا (دو اسلام ص ۲۱۵)

ازالہ:- برق صاحب حدیث کے مختلف اسناد سے بیان کردہ ٹکڑے آپ کی پریشانی کا سبب

ہیں، آپ نے ان عبارتوں کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ان عبارتوں کو متضاد سمجھ کر اعتراض کر دیا ہے

برق صاحب لکھتے ہیں:۔

"حضرت صفیہ جنگ خیبر کے اسیروں میں شامل تھیں، ایک صحابی نے رسول اللہ صلعم سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آپ نے فرمایا، خود چن لو، اس نے حضرت صفیہ کو منتخب کیا، بعد میں کسی نے کہا کہ یہ ایک رئیس کی بیٹی ہے، اسے لونڈی بنا کر اس سے خدمت لینا ظلم ہے، اس لئے حضور اسے حرم نبوی میں داخل کر لیں، حضور نے یہ تجویز مان لی، اور اسے آزاد کر کے نکاح کر لیا" (دو اسلام صفحہ ۲۱۴-۲۱۵)

یہ دونوں عبارتیں صحیح بخاری ہی سے ماخوذ ہیں، برق صاحب کو پہلی عبارت شایان شان نہیں معلوم ہوئی، وہ دوسری کو صحیح سمجھتے ہیں، اور پہلی کو غلط، حالانکہ دونوں صحیح ہیں، اور ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں:۔

"حضرت صفیہ اسیروں میں شامل تھیں، ان کے حسن کا ذکر آپ کے سامنے ہوا، یہ بھی کہا گیا، کہ وہ ابھی دلہن ہیں، یہ ذکر ہو ہی رہا تھا، کہ حضرت دحیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آپ نے فرمایا لے لو، انہوں نے حضرت صفیہ کو منتخب کیا (اس موقعہ پر قاضی سلیمان صاحب لکھتے ہیں کہ "اس میں اختلاف ہو گیا، لوگوں نے کہا، کہ یہ بنو قریظہ اور بنو نضیر کی سیدہ ہے، اور ایسی عورت دحیہ کو مل جانے کی کوئی وجہ نہیں" رحمۃ للعالمین جلد ۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اس بات کا ذکر آیا، آپ سے عرض کیا گیا، کہ یہ ایک رئیس کی بیٹی ہے، اور آپ کے سوا کسی کے شایان شان نہیں، اس لئے آپ اسے حرم نبوی میں داخل کر لیں، حضور نے یہ تجویز منظور کر لی، اور اسے آزاد کر کے نکاح کر لیا"

حدیث تو بالکل صحیح ہے، برق صاحب کو خواہ مخواہ الجھن پیدا ہو گئی، کاش وہ ان عبارتوں کو ترتیب دے کر سمجھنے کی کوشش فرماتے، قصص قرآن میں بھی یہی دقت پیش آتی ہے، کوئی بات کہیں ہے اور کوئی کہیں، بظاہر تضاد نظر آتا ہے، لیکن ترتیب عبارات سے یہ تضاد کالعدم ہو جاتا ہے (قرآن مجید کے اس ظاہری تضاد کو تفصیل سے دیکھنا ہو، تو اس کتاب کا بیسواں باب ملاحظہ فرمائیے) مجملاً بطور مثال کے ایک آیت درج ذیل ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّيْنَ (البقرہ)	سب لوگ ایک ہی جماعت تھے، پس اللہ نے نبی بھیجنے شروع کر دیئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے، کہ جب سب لوگ ایک ہی صراط مستقیم پر متحد و متفق تھے، تو پھر نبی بھیجنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی، جواب اس کا یہ ہے، کہ یہاں بعض عبارت محذوف ہے، جو دوسری جگہ مذکور ہے

یعنی "انہوں نے اختلاف کیا" لہذا آیت مذکور کا ترجمہ اس طرح ہوگا "سب لوگ ایک ہی جماعت تھے (پھر انہوں نے اختلاف شروع کر دیا) تو اللہ تعالیٰ نے (اس اختلاف کو رفع کرنے کی غرض سے) نبی بھیجنے شروع کر دیئے"

برق صاحب اس طرح منتشر عبارات کو ترتیب دے کر اعتراض دور کر لیا کیجیے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

عن قتادة عن انس بن مالك قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يدور على نسائه في الساعة الواحدة من الليل والنهار وهن احدى عشرة قال قلت لانس اوكان يطيقه قال كنا نتحدث انه اعطى قوة ثلاثين رجالا	قتادہ کہتے ہیں کہ مجھے انس بن مالک نے بتایا کہ رسول کریم صلعم دن یا رات ایک ہی وقت میں اپنی گیارہ بیویوں سے مجامعت فرمایا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ رسول اللہ صلعم میں اتنی طاقت تھی، کہا آپ میں تیس مردوں کی طاقت موجود تھی۔ (بخاری)

ملاحظہ کیا آپ نے حضور کی یہ دلچسپ تصویر! یہ حدیث صریحاً غلط ہے" (دو اسلام ص ۲۱۶، ۲۱۷)

ازالہ حدیث تو بالکل صحیح ہے آپ "کان یدور" کا ترجمہ غلط کر کے الجھن میں پڑ گئے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے "دورہ کرتے تھے" لہذا حدیث اعتراض سے بالکل پاک ہے، دوسری حدیث میں اس کی تشریح موجود ہے۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا انصرف من العصر دخل على نسائه (بخاری کتاب النکاح)	یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عصر سے فارغ ہوتے، تو اپنی بیویوں کے پاس تشریف لے جاتے۔

یعنی روزانہ تمام بیویوں کے پاس ملاقات کے لئے، اور ان کی خانگی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے، دن رات یعنی چوبیس گھنٹوں میں یہی وہ ساعت تھی، جو سب کے لئے مشترک تھی، اگر ایسا نہ ہوتا، تو ہر بیوی کے پاس نو دن بعد پہنچتے، اور اتنے طویل عرصہ تک اس کی خبر نہ لیتے، کہ کس حال میں ہے، اور اس پر کیا گذر رہی ہے، برق صاحب اس مشترک وقت میں کسی بیوی کے ہاں ٹھہر جانا کوئی ناانصافی نہیں، اس وقت میں تو سب شریک تھیں، اور یہ وقت باری میں شامل نہ ہوتا تھا۔

غلط فہمی :۔ "قرآن کہتا ہے انما انا بشر مثلکم، کہ رسول تم جیسے بشر ہیں، اور یہ بھی درست ہم جیسا

قد، ہماری طرح ایک دل، ایک جگر، دو پھیپھڑے، نظام جسم ہم جیسا، کھانا پینا ہم جیسا.....
ہو بہو ہم جیسے انسان...... لیکن حدیث کہتی ہے، کہ ان میں تیس مردوں کی طاقت تھی (دو اسلام ص۲۱۹)

ازالہ برق صاحب ظاہری اعضاء کے لحاظ سے تو بے شک سب انسان ایک جیسے ہیں، لیکن کیا آپ کا خیال ہے، کہ قوت جسمانی، قوت روحانی، بہادری، ہمت، عقل، حسن وغیرہ کے لحاظ سے بھی سب برابر ہیں، برق صاحب ایک پہلوان بھی آدمی ہے، اور ایک کمزور بھی آدمی ہے کیا دونوں برابر ہیں، کیا ایک پہلوان میں دس، پندرہ معمولی آدمیوں کے برابر طاقت نہیں ہوتی مگر ہوتی ہے، تو یہ کیسے جب کہ دونوں کے ایک دل ایک جگر ہے وغیرہ وغیرہ، موسیٰ علیہ السلام بھی ایک آدمی تھے، لیکن ایک تھپڑ سے ایک قبطی کو ہلاک کر دیا (قرآن) اور ہم بھی آدمی ہیں، لیکن کیا ایک تھپڑ سے کسی آدمی کو ہلاک کر سکتے ہیں، یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی آدمی تھے، لیکن زنان مصر نے ان کو دیکھ کر ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، اور یہ کہا تھا، کہ یہ انسان نہیں، کوئی مکرم فرشتہ ہے (قرآن) اور ہم بھی آدمی ہیں، کیا کسی عورت نے ہاتھ کاٹے، برق صاحب ایک نبی جس طرح روحانی قوت میں سب سے اعلیٰ ہوتا ہے اسی طرح جسمانی قوت میں بھی سب سے اعلیٰ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر رکانہ پہلوان مقابلہ پر آگیا، تو وہ بھی خاک میں غلطاں نظر آیا، اگر کوئی ناقابل تسخیر چٹان سامنے آگئی، تو ایک ہی وار میں پاش پاش ہو گئی حالانکہ اسی چٹان کو توڑنے سے صحابہ عاجز ہو گئے تھے، بہادری کا یہ عالم، کہ احد اور حنین کے میدانوں میں اکیلے ڈٹے رہے، برق صاحب آپ اللہ کے رسول کی قوت کو عام انسانوں کے برابر سمجھ رہے ہیں حیرت ہے، ایک انسان دوسرے انسان سے متعدد باتوں میں مختلف نظر آتا ہے، بعض آدمی ایسے بھی مل جاتے ہیں، جو اتنے حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے ہیں، جو دوسروں کے لئے ناممکن ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ انسان ہوتے ہیں، اور ایک ہی دل والے، برق صاحب آپ ہی کی تحریر کردہ عبارت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ نقل کر کے آپ سے انصاف کی درخواست کرتا ہوں۔

" ہمیں اس رسول پر ناز ہے، جو تیس آدمیوں کی قوت رکھتے ہوئے بھی ہر ترغیب، ہر کشش، اور ہر گناہ سے دامن بچا کر نکل گیا تھا " (دو اسلام ص۲۲۷)

غلط فہمی:۔ " حضور میں تیس مردوں کی طاقت اور کوئی اولاد نہ ہو، بات کیا تھی (دو اسلام ص۲۱۹)

ازالہ برق صاحب اولاد کا ہونا طاقت و صحت ہی پر منحصر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

یخلق ما یشاء لمن یشاء ویھب لمن یشاء اناثا   اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں

ویھب لمن یشاء الذکور (شوریٰ)   دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے۔

اور جس کو چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں دیتا ہے اور بے اولاد کر دیتا ہے۔ (شوریٰ)

خود ہمارے زمانہ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ باوجود قوت و صحت کے اولاد نہیں ہوتی تعجب تو یہ ہے، کہ آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولاد نہ ہونے پر تعجب ہے۔

غلط فہمی صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے، کہ خدا تعالیٰ تین آدمیوں کو دگنا معاوضہ دے گا، اول وہ یہودی یا عیسائی جو اپنے رسول پر ایمان لانے کے بعد حضور پر بھی ایمان لے آئے، دوم۔ وہ غلام جو خدا اور آقا دونوں کے حقوق ادا کرے، اور سوم وہ شخص جو لونڈی کو تعلیم و تربیت دے کر پہلے آزاد کرے اور پھر نکاح کر لے (صحیح مسلم جلد ۱ صـ ۹۹) یہ تھا رسول کا ارشاد، اب سوال یہ ہے، کہ کیا حضور نے ماریہ قبطیہ کو آزاد کر کے اس سے نکاح کیا تھا اگر ایسا کیا تھا، تو سیرت نگاروں نے آپ کا نام ازواج مطہرات میں کیوں درج نہ کیا اگر نہیں کیا تھا، تو دوسروں کو حکم کیوں دیا، اس لئے ماریہ قبطیہ کو گھر میں رکھنے اور اس سے ابراہیم کے پیدا ہونے کا افسانہ غلط ہے (دو اسلام حاشیہ صـ ۲۱۹-۲۲۰)

ازالہ برق صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کہاں دیا ہے؟ آپ نے تو اس کام کا ثواب بیان فرمایا ہے، آپ نے غلط فہمی سے ترغیب کو حکم سمجھ لیا، اب سوال یہ ہے، کہ آپ نے حضرت ماریہ قبطیہ کو آزاد کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب قرآن میں موجود ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ برق صاحب نے دونوں چیزیں (قرآن و حدیث) سرسری طور پر دیکھی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ (الاحزاب)	اے رسول تمہارے لئے ان بیویوں کے بعد اور بیوی حلال نہیں، نہ کسی اور کو تم ان میں کسی کے ساتھ بدل سکتے ہو خواہ وہ تمہیں کتنی ہی حسین کیوں نہ معلوم ہوں، مگر ہاں لونڈی رکھ سکتے ہو۔

اس آیت نے آپ کو روک دیا تھا، لہٰذا آپ حضرت ماریہ کو آزاد کر کے بیوی نہ بنا سکے، کہیے اب کیا اعتراض ہے

غلط فہمی "میرا خیال ہے، کہ حضور نے مدینہ میں اگر ازواج مطہرات کو بطور شوہر استعمال ہی نہیں فرمایا تھا" (دو اسلام صـ ۲۲۰)

ازالہ یہ خیال قطعاً صحیح نہیں، آپ کا یہ خیال تواتر کے خلاف ہے، اگر اس طرح محض ظن و تخمین سے تواتر کا انکار ہونے لگا، تو پھر قرآن کا بھی انکار ممکن نہیں رہے گا، برق صاحب اگر کوئی دشمن اسلام یہ کہہ دے، کہ آپ کے پیغمبر نے جوان جوان لڑکیاں اپنے گھر میں کیوں رکھ چھوڑی تھیں، جب کہ

وہ ان کی تسکین کے قابل نہ تھے؟ کیا یہ ان لڑکیوں پر ظلم نہیں تھا؟ کیا یہ انسانیت کا خون نہیں؟ کیا یہ عیسائی مذہب کی راہبہ عورتوں کی مماثلت نہیں؟ آخر ان لڑکیوں سے کیا کام لیا جاتا تھا؟ بتائیے ان سوالات کا آپ کیا جواب دیں گے، یہی کہ ہاں بھائی تھا تو ایسا ہی، اللہ کی مصلحت اللہ ہی جانے

غلط فہمی "بے اندازہ مصروفیات، لاتعداد تفکرات، اور بے شمار پریشانیوں میں انہیں مباشرت کی سوجھ ہی کیسے سکتی تھی" (دو اسلام ص ۲۲۲)

ازالہ بے شک ان بے اندازہ مصروفیتوں کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی راہبانہ نہیں تھی، آپ نے دین و دنیا کو اس طرح سمو دیا تھا، کہ ہمیں آپ کی اسی زندگی پر ناز ہے، کیا کوئی دوسرا انسان ایسا اسوہ پیش کر سکتا ہے، جو چیز قابل فخر ہے آپ اس سے شرما رہے ہیں، برق صاحب احساس کمتری کو دل سے نکال دیجیئے، انشاء اللہ سب کام ٹھیک ہو جائیں گے، دیکھئے ایک غیر مسلم پول برنٹن کیا لکھتا ہے، وہ تحریر کرتا ہے۔

I could not but respect the wisdom of prophet Mohammad for so deftly teaching his followers to mingle the life of religeous devotion with the life of the busy world. ("A search in the Secret Egypt" by Paul Brunton P.114)

"میں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی دانائی کی تکریم کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنہوں نے اپنے متبعین کو اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ دینی زندگی کو دنیاوی مصروف زندگی کے ساتھ سمونا سکھا دیا"

غلط فہمی "اس کا راوی انس ہے، اور یہ وہی بزرگ ہیں، جنہیں رسول صلعم کی عمر بھی معلوم نہیں تھی" (دو اسلام ص ۲۱۸)

ازالہ حضرت انس کو حضور کی عمر معلوم تھی ان کا بیان ہے، کہ حضور کی عمر ۶۳ سال کی تھی (صحیح مسلم) باقی رہا یہ امر کہ اس حدیث میں گیارہ بیویوں کا ذکر ہے، حالانکہ آپ کی صرف نو بیویاں زندہ تھیں دو کا انتقال ہو چکا تھا، یہ بے شک صحیح ہے، لیکن اس میں غلطی حضرت انس رضہ سے نہیں ہوئی، کسی اور راوی نے دو لونڈیوں کو ملا کر گیارہ کہہ دیا ہے۔ حضرت انس رضہ سے اسی حدیث میں نو کی تعداد مذکور ہے، معلوم نہیں صحیح بخاری سے اس حدیث کو نقل کرتے وقت آپ نے اس کا آخری حصہ کیوں چھوڑ دیا، حالانکہ امام بخاری نے اس کو نقل ہی اس لئے کیا تھا، کہ راوی کی غلطی ثابت کریں، کہ اس نے

اس روایت میں نو کے بجائے گیارہ غلطی سے کہا ہے، حضرت انس رضؓ نے نو ہی کہا تھا، غرض کہ ہر بات کا جواب حدیث میں موجود ہوتا ہے، مگر برق صاحب تحقیقی نظر نہیں ڈالتے۔

غلط فہمی حضرت عائشہ فرماتی ہیں، کہ میرا نکاح رسول اللہ صلعم سے چھ برس کی عمر میں ہوا تھا۔ دبنی بی وانا بنت تسع سنین" اور آپ نے مجھ سے نو برس کی عمر میں مجامعت کی . . . . .

اتنی نابالغ بچی ہو، جبینہ بھر تپ محرقہ میں مبتلا رہ کر کانٹا ہو چکی ہو، کیا ایسی بچی مجامعت کی تاب لا سکتی ہے" (دو اسلام ص ۲۲۳)

ازالہ برق صاحب یہ وہی مبالغہ آمیزی اور رنگین بیانی ہے، جس کا آپ کو خود اعتراف ہے، "مباشر" کے معنی آپ مجامعت کرتے ہیں، "یدور" کے معنی آپ مجامعت کرتے ہیں، "بنی" کے معنی آپ مجامعت کرتے ہیں آخر یہ مجامعت کا لفظ بار بار کیوں آجاتا ہے، ترجمہ کرتے وقت ذرا تحقیق کر لیا کیجیے ترجمہ مذکور میں مجامعت آپ کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے، "بنی" کے معنی ہیں "شادی کر کے بیوی کو گھر میں لانا" (منتخب اللغات) لہٰذا صحیح ترجمہ یہ ہوا، کہ نو سال کی عمر میں وداع ہوئی، اس کے بعد کیا ہوا حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں، مختلف ممالک میں بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے، بلکہ ایک ہی ملک میں بلوغ کی عمروں میں تفاوت پایا جاتا ہے، لہٰذا آپ کا یہ خیال کہ حضرت عائشہ رضؓ نابالغ تھیں غلط فہمی پر مبنی ہے ایک افریقی لڑکی کے ۹ سال کی عمر میں ۲۸ مارچ ۱۹۶۶ء کو بچہ ہوا (اخبار ڈان مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۶ء) گویا وہ آٹھ سال کی عمر میں بالغ ہو گئی تھی

غلط فہمی "سبرہ کہتے ہیں، کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے متعہ . . . . . کی اجازت طلب کی، آپ نے دے دی . . . . میں اس عورت کے پاس تین راتیں ٹھہرا (مسلم جلد ۳ ص ۲۲۳)

تو پھر کیا حکم ہے ان خواتین کے متعلق جو چادرے چل کر ٹپی بازار میں کچھ ایسے ہی مقاصد کے لئے جاتے ہیں، اور کئی کئی راتیں وہیں گذارتے ہیں" (دو اسلام ص ۲۲۴)

ازالہ کتنی زبردست غلط فہمی آپ کو ہوئی، یہ اس وقت کا ذکر ہے، جب متعہ کی ممانعت نہیں ہوئی تھی آپ نے خود لکھا ہے، کہ جنگ خیبر میں اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کر دیا تھا (دو اسلام ص ۲۲۴) لہٰذا پھر بھی اعتراض کئے جانا قرین انصاف نہیں، اسی طرح اوائل اسلام میں کافر عورتوں سے نکاح جائز تھا، شراب بھی عام طور پر پی جاتی تھی، بتدریج یہ چیزیں حرام ہوئیں، لہٰذا حدیث سے اس پر کیا اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔

غلط فہمی حضرت جابر کہتے ہیں، کہ ہم رسول کریم صلعم اور حضرت صدیق کے زمانہ میں مٹھی بھر آٹا دے کر عورتوں کو استعمال کیا کرتے تھے، اور اس حرکت سے ہمیں حضرت عمرؓ نے روکا تھا (ص ۲۲۴۔ ۲۲۵)

ازالہ حرمت کے بعد جن لوگوں نے ایسا کیا، یہ ان کی لاعلمی تھی، جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا، تو انہوں نے اس کی حرمت کا اعلان کروا دیا۔

غلط فہمی "حضرت جابرؓ کہتے ہیں، کہ ہم رسول اللہ صلعم کے ہمراہ حج کے لئے روانہ ہوئے، جن کے پاس قربانی کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، انہیں ذی الحجہ کی پانچویں تاریخ کو احرام توڑنے کی اجازت دی گئی، چنانچہ ہم نے خوب جماع کیا، اور پانچویں دن کے بعد جب ہم عرفہ کے لئے روانہ ہوئے تو فقطر من اکیرنا المنی" ہمارے اعضائے تناسل سے نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا . . . . عام حالات میں جماع کے بعد تسکین آجاتی ہے لیکن خدا جانے ان صحابہ نے کون سے کشتہ کھایا ہوا تھا، کہ حج کے مقدس موقع پر بھی ان کا نطفہ اچھل اچھل کر زمین پر گر رہا تھا" (دو اسلام ص۲۲۵)

ازالہ برق صاحب یہ رنگ آمیزی نہیں ہے، تو اور کیا ہے، عربی عبارت اس شرمناک ترجمہ کی متحمل نہیں، بہرحال قصور عبارت کے مقصد کو نہ سمجھنے کا ہے، سنئے عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو دو
یصلی من اللیل مثنی مثنی ویوتر	رکعت نماز پڑھتے تھے اور ایک رکعت
برکعۃ و یصلی رکعتین قبل الغداۃ	پڑھتے تھے اور صبح کی نماز سے پہلے دو رکعت
کان الاذان باذنیہ (صحیح مسلم	پڑھتے تھے گویا کہ اذان آپ کے کان میں
باب صلوۃ اللیل)	ہوتی تھی۔

یعنی صبح کی سنتیں ایسے وقت میں پڑھتے تھے، کہ اذان ختم ہوئی اور سنتیں شروع کر دیں، اس کا یہ مطلب نہیں، کہ آپ اذان سنتے تھے، اور سنتیں پڑھنی شروع کر دیتے تھے، اس کا مطلب صرف اتنا ہے، کہ اذان اور سنتوں کے آغاز کے درمیان میں بہت کم وقفہ ہوتا تھا، گویا وقت کی قلت کو عبداللہ بن عمرؓ اس طرح ظاہر کر رہے ہیں، یہی وقت کی قلت آپ کی نقل کردہ حدیث میں ہے یعنی ابھی کچھ دیر پہلے وہ صحبت کر چکے تھے، اور اب احرام میں تھے، اور صحبت کرنے اور احرام باندھنے کے درمیان بہت ہی قلیل وقفہ تھا، یہ الفاظ کہ ان کے مذاکیر پانی ٹپکا رہے تھے وقت کی قلت کا اظہار کرتے ہیں، اس کا مطلب صرف اتنا ہے، کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہم صحبت کر چکے تھے، اور اب حج کر رہے تھے، دوران حج میں پانی ٹپکانے کا ذکر نہیں ہے، بلکہ پانی ٹپکانا حج کے آغاز سے پہلے ہوا تھا، آپ نے جو ترجمہ کیا ہے، افسوس ہے کہ اس میں تحریف معنوی ہوئی ہے، گو نادانستہ ہوئی ہو، لفظ جماع سے پہلے "خوب" کا اضافہ بھی خوب ہے!! "نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا" یہ ترجمہ صحیح نہیں، پھر اس میں "بدستور" کا اضافہ محاورہ عرب کے خلاف ہے

صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ صحبت اور پھر احرام باندھ لینے میں اتنا کم وقفہ تھا، گویا ابھی پانی ٹپک رہا ہے۔

غلط فہمی

"نہ یہ احادیث صحابہ کی سیرت کے مطابق، اور نہ حضور کے عظیم الشان کردار کے موافق، صحابہ کے متعلق قرآن کہتا ہے

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔ تم ان صحابہ کو دیکھو کہ ہر وقت اللہ کے سامنے رکوع و سجود میں الطاف الٰہی کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ (دو اسلام ۲۲۵-۲۲۶)

ازالہ

ان ہی صحابہ کے متعلق آپ پہلے لکھ آئے ہیں :۔

"ان حالات میں ممکن ہے، کہ کسی صحابی نے مثلاً کسی حدیث کے الفاظ بدل دیئے ہوں" (ص۴۵)

اب بتایئے آپ کا کونسا بیان صحیح ہے، کیا یہ بیان کہ صحابہ کرام قصداً تحریف کرتے تھے، آپ کی وارد کردہ قرآنی آیت کے عین مطابق ہے۔ کچھ تو انصاف اور تحقیق سے لکھا کیجئے، اسلام کے مزاج کے مطابق ترجمہ کیا کیجئے، آزاد ترجمہ اگر جائز رکھا گیا، تو پھر کوئی من چلا قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے قحبہ خانہ کھولنے اور زنا بالرضا کی اجازت نکال لے گا، آیت یہ ہے :۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (النور ۴) دنیا کمانے کے لئے اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور مت کرو، اگر وہ پاک دامن رہنا چاہتی ہوں تو۔

باب ۱۰

"حدیث میں نماز کی صورت"

غلط فہمی معراج کی حدیث نقل کرنے کے بعد برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"اس داستان کا خلاصہ یہ ہوا، کہ امت رسول کی استعداد کا علم نہ خدا کو تھا، اور نہ حضور کو اگر موسیٰ علیہ السلام بیچ میں نہ پڑتے، تو امت پر پچاس نمازیں فرض ہو جاتیں، اور یہ امت صبح سے لے کر شام تک نمازیں ہی پڑھتی رہتی، نہ کما سکتی نہ کھا سکتی ..... یہ تو حضرت موسیٰ کی عقل کی داد دیجیے ..... ماشاء اللہ کیا داستان تراشی ہے، کہ حضرت موسیٰ کو خدا اور رسول کا معلم دانش بنا ڈالا ہے" (دو اسلام ص ۲۲۹)

ازالہ بات در حقیقت یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کو تو معلوم تھا، کہ پچاس وقت کی نمازیں ادا کرنا بہت مشکل ہے مگر احسان و کرم کرنا مقصود تھا، زیادہ بوجھ ڈال کر پھر اس کو کم کر دینے میں جو لطف و کرم ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اس کا تجربہ ہو، یا جو علم نفسیات میں ماہر ہوں قصور کو معاف کرنا، دل کو خوش کرتا ہے، اس میں معاف کرنے والے کا تحمل، اور اس کی شان عالیہ کا مظاہرہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی قصور معاف کر کے بہت خوش ہوتا ہے، اور بندوں کو ترغیب دیتا ہے، کہ وہ اپنے قصور معاف کرائیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا (زمر)

یعنی اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف کر دے گا۔

اور بار بار فرماتا ہے :۔

إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

بیشک اللہ بڑا معاف کرنے والا، اور رحم کرنے والا ہے

ایک اور جگہ فرماتا ہے :۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ)

اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کرنا چاہتا ہے، اور سختی کرنا نہیں چاہتا۔

اسی طرح بوجھ ہلکا کر دینا بھی اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ ہے، لیکن بندوں سے کہتا ہے کہ تم کہو، کہ اے اللہ

ہم پر زیادہ بوجھ نہ ڈال، مثلاً ارشاد ہے:۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (البقرۃ ۲۸۶)

یعنی اے ہمارے رب ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو ہماری طاقت سے باہر ہو۔

بات صاف ہے کہ اللہ تعالٰی خود ہی ایسا حکم نہیں دینا چاہتا جو دشوار ہو بلکہ وہ تو آسانی چاہتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ بندے التجا کریں، اور پھر میں تخفیف کردوں، اور اسی لئے اس نے ہمیں یہ دعا سکھائی، نمازوں میں تخفیف بھی اسی بنا پر بندے کی التجا پر واقع ہوئی

چلتے چلتے اس اعتراض کا جواب قرآن سے بھی سنتے جایئے، موسٰی علیہ السلام کو نبی بنایا جاتا ہے لیکن وہ درخواست کرتے ہیں:۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِيْ وَاَشْرِكْهُ فِيْۤ اَمْرِيْ (طٰہٰ)

اے اللہ میرے اہل میں سے میرا ایک وزیر بنادے یعنی میرے بھائی ہارون کے ذریعہ مجھے قوت عطا فرما، اور اسے میرے کام میں شریک کردے۔

بلکہ صاف صاف اس طرح دعا کرتے ہیں:۔

وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ (الشعراء)

میرا سینہ تنگ ہوتا ہے، اور میری زبان رکتی ہے، اس لئے اے اللہ ہارون کو بھی رسالت سے سرفراز فرما۔

کیا آپ کہہ سکتے ہیں، کہ موسٰی علیہ السلام اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے، اور یہ بات اللہ تعالٰی کو پہلے سے معلوم نہیں تھی، جب موسٰی علیہ السلام نے توجہ دلائی تو اللہ تعالٰی کو بھی نعوذ باللہ ہوش آیا کہ واقعی یہ کام اکیلے ان کے بس کی بات نہیں، لہٰذا ہارون علیہ السلام کو بھی رسول بنادیا، ارشاد باری ہے:۔

قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (طٰہٰ)

اے موسٰی ہم نے تمہارا مطالبہ منظور کر لیا ہے۔

قرآن مجید سے اس قسم کی متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں، اور جب اس قسم کی باتوں سے قرآن پر اعتراض نہیں، تو حدیث پر اعتراض کیوں، ایک مثال اور سنیئے، ہم نماز میں پڑھتے ہیں:۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

اے اللہ ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔

پھر ہم کہتے ہیں:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، ان لوگوں کا راستہ نہیں جو مغضوب یا گمراہ ہیں۔

تو کیا! اللہ تعالیٰ نہیں جانتا کہ سیدھا راستہ کونسا ہے، ہم اللہ کو بتاتے ہیں کہ سیدھا راستہ کونسا ہے، کہیں وہ غلطی نہ کر جائے، نعوذ باللہ۔ ایک اور مثال سنیئے:۔

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (المزمل) — اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے لہٰذا اس نے تم پر رحم کرنے کا ارادہ کیا۔ بس اب تم جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔

فرمایئے، کیا اللہ کو پہلے سے علم نہ تھا، جو بعد میں تخفیف کر دی، تجربہ سے معلوم ہوا، بات یہاں بھی وہی ہے یہاں بھی وہی اصول لطف و کرم جلوہ فرما ہے، یعنی زیادہ بوجھ ڈال کر ہلکا کر دینا یہ اللہ کو بہت پسند ہے اس طرح وہ اپنے بندوں پر ترحم خسروانہ کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ اور سنیئے ارشاد باری ہے:۔

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا (الانفال) — اب اللہ نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا اور اس کو معلوم ہو گیا (یا اس کو معلوم تھا) کہ تم میں کمزوری ہے۔

یعنی یہ حکم مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت تھا، بعد میں اس کو ہلکا کر دیا گیا، سوال یہ ہے کہ ایسا حکم پہلے دیا ہی کیوں گیا تھا؟ کیا ان آیات کی بناء پر قرآن پر اعتراض کیا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر حدیث نے کیا قصور کیا ہے؟

غلط فہمی اور یہ آخری فقرہ بھی خوب ہے کہ "ہم اپنا قول نہیں بدلا کرتے" اگر نہیں بدلا کرتے، تو پھر پچاس سے چالیس اور پچیس سے پانچ کیوں کیں" (دو اسلام ص ۲۲۹)

ازالہ یہاں بات سے مراد احکام شریعت نہیں ہیں، کیونکہ احکام شریعت تو بدلا ہی کرتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (البقرۃ) — جب ہم کسی حکم کو منسوخ کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مثل دوسرا حکم دے دیتے ہیں۔

برق صاحب اس آیت پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے، جو آپ نے حدیث پر کیا ہے، یعنی پہلے ایسا حکم دیا ہی کیوں جاتا ہے، جو چل نہیں سکتا یا جس سے بہتر دوسرا موجود ہوتا ہے، خیر یہ جملہ معترضہ تھا، اس آیت سے یہ ضرور ثابت ہوا کہ احکام شریعت منسوخ ہوا کرتے ہیں، اور حدیث زیر بحث میں "بات" سے مراد احکام شریعت نہیں، بلکہ حسنات کا وہ اٹل قانون مراد ہے، جو اس آیت میں بتایا گیا ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا — جو نیکی کرے گا اس کو اس نیکی کا دس گنا ثواب ملے گا۔

خلاصہ یہ ہوا، کہ ہم نے پچاس کی پانچ تو کر دیں، لیکن ثواب ہم پچاس ہی کا دیں گے، کیونکہ ہمارا قانون

یہی ہے، کہ ثواب دس گنا دیا کرتے ہیں، یہ قانون غیر متبدل ہے، بدلے گا نہیں یہی مطلب ہے حدیث کے اس ٹکڑے کا "ما یبدل القول لدی" کیونکہ اس فقرہ سے پہلے حدیث میں یہ الفاظ موجود ہیں "ھی خمس وھی خمسون" یعنی بظاہر یہ پانچ ہیں، لیکن حقیقت میں یہ پچاس ہی کے برابر شمار ہوں گی اور اس طرح پچاس جو ہم نے فرض کی تھیں، ان کی ادائگی ہو جائے گی۔ دوسری روایت میں حدیث کے الفاظ اس قانون کی طرف صراحت سے اشارہ کرتے ہیں، اور نہ بدلنے والی بات کی تفسیر کرتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:-

یا محمد انھن خمس صلوات	اے محمد دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں ہر نماز
کل یوم ولیلۃ لکل صلوۃ عشرا	کا ثواب دس کے برابر ہے اور یہ اس قانون کے
من ھم بحسنۃ فلم یعملھا کتبت	لحاظ سے ہے کہ جس نے ایک نیکی کا ارادہ کیا اور
لہ حسنۃ فان عملھا کتبت لہ عشرا	عمل نہ کر سکا، اس کے لئے ایک نیکی لکھی جائے گی
(صحیح مسلم جلد ۱ ص۹۲ مطبوعہ مصر)	اور جس نے عمل کر لیا اس کے لئے دس نیکیاں لکھوں گا

الغرض نہ بدلنے والی بات یہ قانون حسنات ہے، نہ کہ احکام شریعت۔

غلط فہمی "حضرت انس فرماتے ہیں، کہ حضور ہر نماز کے لئے نیا وضو کیا کرتے تھے (بخاری جلد ۱ ص۳۵)

تردید بالا ابن عباس کہتے ہیں، کہ ایک رات میں اپنی خالہ حضرت میمونہ کے گھر میں تھا، کہ رسول اللہ صلعم کچھ دیر سو چکنے کے بعد جاگے، وضو کیا، نماز پڑھی، پھر آپ لیٹ گئے، یہاں تک کہ خراٹوں کی آواز آنے لگی، اس کے بعد نماز کے لئے بلانے والا آیا، آپ اس کے ہمراہ مسجد کو چل دیئے، اور وہاں جا کر وضو کئے بغیر نماز ادا کی، بخاری" (دو اسلام ص۲۳۰)

ازالہ برق صاحب یہ تردید، یا تعارض نہیں ہے، ہر نماز کے لئے نیا وضو کرنا، یہ آپ کا معمول تھا، اور کبھی کبھی اسی وضو سے دوسری نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے لیکن یہ عمل شاذ تھا، اور وہ اکثر، لہذا بمصداق "للاکثر حکم الکل" حضرت انس رضی نے آپ کا معمول یہ بتایا، کہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کیا کرتے تھے، سنئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَن نَّفْسِهَا (النحل)	قیامت کے دن ہر شخص اپنے نفس کے معاملہ میں جھگڑتا آئے گا

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

هَٰذَا يَوْمُ لَا يَنطِقُونَ وَلَا يُؤْذَنُ	قیامت کے دن لوگ بات نہ کر سکیں گے، اور

لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ (مرسلات) نہ انہیں اجازت ملے گی کہ اپنے عذر پیش کر سکیں

پہلی آیت میں ہے، کہ انسان اپنے معاملہ میں خوب بحث کرے گا، اور دوسری میں ہے، کہ وہ بول بھی نہ سکے گا، کہ معذرت پیش کر سکے، کہیے کیا دوسری آیت پہلی کی تردید کرتی ہے؟ دوسری آیت عام حالت کا بیان ہے، اور پہلی آیت اس کو خاص کرتی ہے، اسی طرح پہلی حدیث عام حالت کو بیان کرتی ہے، اور دوسری اس کی تخصیص کرتی ہے، کہ اس خاص واقعہ میں محض اتفاقاً ایسا بھی ہوا تھا، اور یہ بھی جائز ہے، برق صاحب اگر آپ قرآن کو غور سے پڑھ لیتے، تو احادیث میں تطبیق دینے کا ملکہ پیدا ہو جاتا، اور یہ غلط فہمیاں نہ ہوتیں۔

دوسرے طریقہ سے برق صاحب پہلی حدیث کا مطلب یہ ہے، کہ ہر وقت کی نماز کے لئے آپ نیا وضو کرتے تھے، دوسری حدیث میں یہ ہے، کہ رات کی نماز کے لئے آپ نے وضو کیا، اور اسی وضو سے آپ نے صبح کی نماز پڑھی، اس میں یہ کہاں ہے، کہ عشاء کی نماز کے وضو سے آپ نے صبح کی نماز پڑھی، حدیث میں تو صاف ہے، کہ عشاء کی نماز کے بعد آپ سو گئے تھے، پھر اٹھے وضو کیا، اور نماز پڑھی، لہٰذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض ہی نہیں، تعارض اس وقت ہوتا جب آپ عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے۔

غلط فہمی "اس حدیث سے دو باتیں واضح ہو گئیں، اول، کہ حضور ہر نماز کے لئے نیا وضو نہیں کرتے تھے، دوم۔ کہ نیند کے بعد وضو ضروری نہیں، اگر آپ یہ کہیں، کہ رسول اکرم کی صرف آنکھیں سوتی تھیں، اور دل جاگتا رہتا تھا، اس لئے ان کے لئے وضو ضروری نہیں تھا، اور یہ ملازمت صرف امت کے لئے تھی، تو ملاحظہ کیجیے صحیح مسلم کا یہ قول

كان اصحاب رسول الله صلعم ينامون ثم يصلون ولا يتوضئون — کہ حضور کے صحابہ سو چکنے کے بعد وضو کئے بغیر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

کیا صحابہ کے دل بھی نبی علیہ السلام کی طرح جاگتے رہتے تھے" (دو اسلام ص۲۳۰-۲۳۱)

ازالہ پہلی بات کا جواب تو اوپر دیا جا چکا ہے، یعنی پانچوں نمازوں کے لئے آپ نیا وضو کرتے تھے اور ان میں سے کسی ایک نماز کے وضو سے دوسری نماز نہیں پڑھتے تھے یہی آپ کا معمول تھا سوائے جواز کے اظہار کے آپ نے اس کے خلاف کبھی نہیں کیا، اور جواز کے اظہار کے لئے بھی اس معمول میں صرف ایک مرتبہ فرق آیا تھا، لہٰذا برق صاحب کا یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں، کہ حضور ہر نماز کے لئے نیا وضو نہیں کرتے تھے۔

رہی دوسری بات کہ نیند کے بعد وضو ضروری نہیں، تو اس کے متعلق عرض ہے، کہ جو حدیث آپ نے نقل فرمائی ہے اس میں ہے:۔

"ثم اضطجع" یعنی آپ لیٹ جایا کرتے تھے۔

لیکن صحابہ کے متعلق یہ نہیں ہے، کہ وہ بھی لیٹ کر سویا کرتے، اور پھر وضو نہیں کرتے تھے، صحابہ کے متعلق جو الفاظ برق صاحب نے نقل فرمائے ہیں، وہ ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز میں دیر کی صحابہ مسجد میں انتظار کرتے رہے، حتیٰ کہ اس انتظار کے دوران میں بعض لوگ اونگھنے لگے، حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

حتی رقد ناس واستیقظوا ورقدوا یعنی بعض لوگ سو گئے تھے، پھر جاگے، پھر واستیقظوا (صحیح مسلم) جاگے، پھر سو گئے، پھر جاگے۔

الفاظ حدیث خود بتا رہے ہیں کہ بعض صحابہ اونگھ رہے تھے، سو جاتے تھے، پھر جاگ جاتے تھے، اس میں لیٹ کر سونے کا کوئی ذکر نہیں، اور یہی وجہ ہے جس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں، کہ اس حدیث میں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیٹ کر سو جانے اور پھر وضو نہ کرنے میں کوئی منافات ہی نہیں، صحابہ کیونکہ لیٹ کر نہ سوتے تھے، اس لئے نیند غفلت کی نہ ہوتی تھی، لہٰذا دوبارہ وضو کی ضرورت بھی نہ ہوتی تھی، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کی صراحت ہے:۔

حتی تخفق رؤسھم ثم یصلون ولا یتوضون (ابو داؤد) یعنی صحابہ کے سر اونگھ کی وجہ سے جھک جاتے تھے اور پھر وہ بغیر تازہ وضو کئے نماز پڑھ لیتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی غفلت کی نیند نہ سوتے تھے، لہٰذا آپ کا وضو نہ ٹوٹتا تھا، غفلت کی نیند بیٹھے بیٹھے سونے سے نہیں آتی، لہٰذا ایسی حالت میں صحابہ کا وضو بھی نہیں ٹوٹتا تھا، لیٹ کر سونے سے غفلت طاری ہو جاتی ہے، لہٰذا وضو ٹوٹ جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی صراحت فرما دی ہے ارشاد گرامی ہے۔

لیس علی من نام ساجدا وضوء حتی یضطجع فانہ اذا اضطجع استرخت مفاصلہ (مسند احمد) جو شخص سجدہ میں سو جائے، اس پر وضو نہیں، جب تک کہ لیٹ کر نہ سوئے، اس لئے کہ لیٹ کر سونے سے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔

دوسری روایت میں ہے:۔

العین وکاء السہ فمن نام فلیتوضا (ابو داؤد) آنکھ مقعد کا بندھن ہے پس جو سو جائے وہ وضو کرے

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا، کہ لیٹ کر سونے سے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں، بندھن ٹوٹ جاتا ہے اور ریاح خارج ہونے کا احتمال قوی ہوتا ہے، لہذا وضو لازمی ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیند میں غافل نہیں ہوتے تھے، کہ آپ کو وضو ٹوٹنے کا علم نہ ہو، اس لئے آپ کے لئے وضو ضروری نہیں تھا، معلوم نہیں برق صاحب کو اس تطبیق میں کیا دقت پیش آئی۔

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

• فقہ بتلاتی ہے۔ ... کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے" (دو اسلام ص ۲۲۹) پھر اس کے بعد تعارض میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں، کہ "غزوہ ذات الرقاع میں حضور ایک تیر سے زخمی ہو گئے، اور خون بہہ نکلا لیکن آپ اس حالت میں بھی نماز پڑھتے رہے" (دو اسلام ص ۲۳۱)

ازالہ

برق صاحب ابھی تک تو آپ حدیث کو حدیث سے ٹکرا رہے تھے، لیکن یہ آپ نے کیا کیا، کہ اب فقہ کو حدیث سے ٹکرانے لگے، فقہ میں اکثر مسائل بے بنیاد، و من گھڑت ہیں، اور یہ مسائل قرآن و حدیث سے ٹکراتے ہیں، لہذا وہ مسائل خود مردود ہیں، ان کو حدیث کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا پھر فقہ سے آپ کی مراد حنفی فقہ ہے، آپ نے دوسری فقہوں کا حوالہ کیوں نہ دیا، اگر آپ دوسری فقہوں کا حوالہ دیتے، تو پھر فقہ اور حدیث میں بھی مطابقت پائی جاتی، حنفی فقہ تو بیشتر مقامات پر حدیث سے ٹکراتی ہے اس لئے یہ سب سے بدتر ہے۔

انتباہ

برق صاحب نے لکھا ہے، کہ حضور کے تیر لگا، اور خون بہہ نکلا وغیرہ وغیرہ" یہ صحیح نہیں بلکہ ایک اور شخص کے تیر لگا تھا، اور اس کے خون نکلا، اور اس حالت میں بھی وہ نماز پڑھتا رہا (ملاحظہ ہو، صحیح بخاری جلد ۱ ص ۳۲)

غلط فہمی

برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

• ایک اہم سوال:۔ کیا مجامعت کے بعد غسل ضروری ہے؟

کتنی جواب:۔ زید بن خالد نے حضرت عثمان سے دریافت کیا، کہ اگر کوئی شخص مجامعت کرے، اور انزال سے پہلے علیحدہ ہو جائے، تو اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ فرمایا شرمگاہ کو دھو ڈالے، اور وضو کرلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سنا تھا .... (بخاری)

(۲) دخول کے بعد غسل واجب ہو جاتا ہے (موطا ص ۲۲)

(۳) ابو ہریرہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا ... غسل واجب ہو جاتا ہے، خواہ انزال ہو یا نہ ہو (صحیح مسلم)

(۴) ابی بن کعب کہتے ہیں، کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا، کہ اگر کوئی شخص مجامعت کرے، اور انزال سے پہلے علیحدہ ہو جائے، تو کیا وہ غسل کرے، فرمایا، وہ صرف وضو کرکے، نماز پڑھ لے (صحیح مسلم)

ازالہ حضرت عثمان کا جواب یہ ہے:۔

یتوضأ کما یتوضأ للصلوٰۃ (صحیح بخاری) یعنی ایسا وضو کرے، جیسا نماز کے لئے کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے، کہ سوال نماز پڑھنے کے لئے نہیں تھا، بلکہ دوسری ضروریات کے لئے تھا، مثلاً کھانا، پینا، چلنا پھرنا وغیرہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

توضأ واغسل ذکرک ثم نم" یعنی وضو کرو، اور ذکر کو دھو ڈالو، پھر سو جاؤ

بلکہ یہاں تک فرمایا" یغتسل اذا شاء" پھر جب چاہے غسل کرے، محض سونے کے لئے غسل کی ضرورت نہیں ہے، حدیث میں ہے:۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان جنبا فاراد ان یاکل او ینام توضا وضوء للصلوٰۃ (مسلم) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحالت جنب جب کھانے یا سونے کا ارادہ فرماتے، تو وضو کرتے جیسا کہ نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے

ان احادیث سے معلوم ہوا، کہ علاوہ نماز کے دوسری ضروریات کے لئے صرف وضو کافی ہے۔

نمبر (۲) اور نمبر (۳) کا مضمون واحد ہے، اور یہی حکم ہے، جو اب باقی ہے، اور قیامت تک رہے گا یعنی نماز کے لئے غسل ضروری ہے، خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔

حدیث نمبر (۴) ایک منسوخ حدیث ہے، جس کو حضرت ابی بن کعب نے بیان فرمایا تھا، ابی بن کعب خود ہی فرماتے ہیں:۔

انما کان الماء من الماء رخصۃ فی اول الاسلام ثم نھی عنھا (ترمذی) ثم امرنا بالاغتسال بعدھا (ابوداؤد) یعنی انزال سے غسل کرنا یہ رخصت شروع اسلام میں تھی، پھر ہم کو اس سے منع کر دیا گیا۔ پھر ہمیں اس کے بعد غسل کا حکم دیا گیا۔

لہٰذا چاروں احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

غلط فہمی "کیا سمجھے؟ ..... دخول کے بعد غسل ضروری ہے، یا غیر ضروری ہے، سمجھنا کیا ہے بھتیا! یہ ہے وحی خفی! ہم وحی جلی کو بھی نہیں سمجھ سکتے، ان مخفی اسرار کی تہ تک کیسے پہنچیں" (ص ۲۳۲)

ازالہ:۔ برق صاحب یہ طنز آپ کو زیب نہیں دیتا، یہ تو اپنے اصطلاحی ملا کے لئے رہنے دیجئیے،

اگر آپ وحی جلی کو نہیں سمجھ سکتے تو پھر وہ بھی قابلِ اعتراض ٹھہری، جس طرح کہ وحی خفی سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے قابلِ اعتراض ہے، آپ سمجھے؟ برق صاحب یہ حقیقت ہے کہ وحی جلی کا سمجھنا آسان کام نہیں، وحی جلی کے سمجھنے کا آسان طریقہ یہی ہے، کہ وحی خفی کی تشریح میں اسے دیکھا جائے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو نہ صلوٰۃ کے معنی معلوم ہوں گے نہ عمرہ کے

غلط فہمی کیا غسل سے بچے ہوئے پانی سے وضو جائز ہے؟ (۱) ناجائز ہے

(۱) ناجائز ہے "ان رسول اللہ نھی ان یتوضا الرجل بفضل الطھور ۃ" (ترمذی، ابن ماجہ)

عورت کے غسل سے بچے ہوئے پانی کو وضو کے لئے مت استعمال کرو۔

(۲) جائز ہے (الف)

عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یغتسل بفضل میمونۃ

(مسلم جلد اول صـ۱۷۳)

ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور حضرت میمونہ کے غسل سے بچے ہوئے پانی سے نہایا کرتے تھے"

(دو اسلام صـ۲۳۲-۲۳۳)

ازالہ برق صاحب! پہلی حدیث میں حکم عام ہے، دوسری حدیث میں اس کی تخصیص ہے، یعنی یہ حکم میاں بیوی کے درمیان نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک دوسرے کے محرم ہوتے ہیں، پھر دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، اس لئے اس قسم کی پابندی تکلیف مالا یطاق ہے، دونوں حدیثیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہیں، نامحرم کے بچے ہوئے پانی سے وضو نہیں کر سکتے، اور محرم کے بچے ہوئے پانی سے وضو کر سکتے ہیں، برق صاحب یہ ایک نفسیاتی اور جنسی مسئلہ ہے، وضو کرنے والے کو اس بچے ہوئے پانی سے ایک قسم کا تعلق ہو جاتا ہے اور ایک نامحرم اس تعلق کی وجہ سے اس پانی سے حظ اٹھا سکتا ہے، یہ محض ایک جذباتی چیز ہے، جو بغیر کافی تجربہ اور نفسیاتی و جنسیاتی علوم میں مہارت پیدا کئے سمجھ میں نہیں آسکتی، وضو ایک مقدس فریضہ ہے اور ایک مقدس فریضہ کا پیش خیمہ، لہٰذا اس میں کسی ایسے جذبہ کی آمیزش جس کا تعلق شہوات نفسانی سے ہو، مناسب نہیں تھا، اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا، اور چونکہ یہ چیز محرم کے بچے ہوئے پانی سے پیدا نہیں ہوتی، اس لئے آپ نے اپنے فعل سے اس پر مہر جواز لگا دی، کہیئے اب کیا اعتراض ہے؟

غلط فہمی کیا آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

(۱) ٹوٹ جاتا ہے..... زید بن ثابت کہتے ہیں، کہ میں نے حضور کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد نیا وضو ضروری ہے

(۲) نہیں ٹوٹتا . . . ایک مرتبہ حضور نے ایک بکری کا بھنا ہوا بازو تناول فرمایا، اور پھر وضو کئے بغیر نماز پڑھ لی۔ (دو اسلام ص ۲۴۳-۲۴۴)

ازالہ پہلی حدیث میں وضو سے مراد نماز کا وضو نہیں ہے، اور ایک حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے، افسوس ہے کہ آپ نے تحقیق نہیں کی وہ حدیث یہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھایا۔

فغسل یدیہ ومسح ببلل کفیہ وجھہ وذراعیہ ورأسہ وقال ھذا الوضوء مما غیرت النار (رواہ الترمذی)	پھر آپ نے دونوں ہاتھ دھوئے، اور دونوں ہتھیلیوں کی تری سے منہ پر کلائیوں پر اور سر پر مسح کر لیا، اور فرمایا، کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد کا وضو یہ ہے۔

یہ ہے وہ وضو جو کھانا کھانے کے بعد سنت ہے، یہ وضو صلوٰۃ نہیں، دوسری روایت میں وضو صلوٰۃ مراد ہے وہ نہیں ٹوٹتا، اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو صلوٰۃ نہیں کیا، اور پہلے وضو ہی سے نماز پڑھ لی، الغرض کھانا کھانے سے وضوء نماز نہیں ٹوٹتا، لیکن کھانا کھا کر دونوں ہاتھ دھو لینے چاہئیں، وغیرہ وغیرہ، ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، ایک حدیث میں اس کی صاف صراحت ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

قدم الیہ طعام فقالوا الا ناتیک بوضوء قال انما امرت بالوضوء اذا قمت الی الصلوٰۃ (ابوداؤد۔ ترمذی)	آپ کے سامنے کھانا لایا گیا، تو لوگوں نے کہا وضو کے لئے پانی لائیں، آپ نے فرمایا، وضو کا حکم تو صرف نماز کے لئے دیا گیا ہے۔

غلط فہمی سوال یہ ہے کہ آیا وضو میں ہاتھ، منہ اور پاؤں کو ایک ایک مرتبہ دھونا چاہیئے، یا زیادہ، حدیث کا فیصلہ ملاحظہ ہو:۔

(۱) حضور ایک مرتبہ دھوتے تھے۔

عن ابن عباس قال توضا النبی صلعم مرۃ مرۃ (بخاری۔ کتاب الوضوء)	ابن عباس کہتے ہیں، کہ حضور وضو میں اعضاء کو ایک ایک مرتبہ دھوتے تھے۔

(۲) دو، دو مرتبہ دھوتے تھے۔

عن عبداللہ بن زید ان النبی صلعم توضا مرتین مرتین (بخاری کتاب الوضوء)	عبداللہ بن زید کہتے ہیں، کہ حضور وضو میں اعضا کو دو، دو مرتبہ دھوتے تھے

(۳) تین تین مرتبہ دھوتے تھے۔

حضرت عثمان بن عفان فرماتے ہیں، کہ حضور تین مرتبہ اعضاء کو دھوتے تھے، اور جو شخص اس طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے، اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں بخاری کتاب الوضوء (دو اسلام ص۲۳)

ازالہ

پہلی دونوں حدیثوں کی عبارت بتا رہی ہے، کہ دونوں حدیثوں کا تعلق ایک خاص واقعہ سے ہے، برق صاحب سے ان دونوں کے ترجمہ میں غلطی ہوئی، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "ایک ایک مرتبہ دھویا" "دو، دو مرتبہ دھویا" نہ یہ کہ "دھوتے تھے" دونوں میں ماضی مطلق کا صیغہ ہے نہ کہ ماضی استمراری کا تیسری حدیث میں عادت مستمرہ کا بیان ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مستمرہ تو یہی تھی کہ آپ تین تین مرتبہ ہر عضو کو دھویا کرتے تھے، اور یہی اصلی وضو ہے، اسی پر وہ ثواب ہے جو حدیث نمبر (۳) میں مذکور ہے، ہاں کبھی ایسا بھی ہوا ہے، کہ آپ نے ایک یا دو مرتبہ بھی دھو لیا ہے اس کی صورت محض جواز کی ہے سنت کی نہیں، عرب کے بے آب و گیاہ ریگستانوں میں اکثر پانی کی قلت ہوتی ہے، لہٰذا جب کبھی پانی کی قلت ہوئی، آپ نے دو مرتبہ یا ایک مرتبہ دھو کر وضو کر لیا اس کا تجربہ ہم کو کراچی کی زندگی میں اکثر ہوا ہے، کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے، کہ نل سے پانی نہیں آتا، جو تھوڑا بہت پانی ہوتا ہے، اسی سے وضو کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات دو، دو مرتبہ اور بعض اوقات ایک ایک مرتبہ ہر عضو کو دھونا پڑتا ہے، اتنا پانی ہی نہیں ملتا، کہ تین تین مرتبہ دھویا جائے، غیر کامل وضو کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہوئی دوسری وجہ سنئے، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

دفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من عرفۃ حتی اذا کان بالشعب نزل فبال ثم توضأ ولم یسبغ الوضوء فقلت لہ الصلوٰۃ۔ قال الصلوٰۃ امامک، فرکب فلما جاء المزدلفۃ نزل فتوضأ فاسبغ الوضوء ثم اقیمت الصلوٰۃ فصلی المغرب (صحیح مسلم باب الافاضۃ من عرفات)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرفات سے چلے جب گھاٹی میں پہنچے تو اترے، پیشاب کیا، پھر وضو کیا لیکن پورا وضو نہیں کیا، میں نے کہا، نماز پڑھ لیجئے فرمایا نماز آگے چل کر پڑھیں گے، پس آپ سوار ہوئے، اور مزدلفہ پہنچ کر اترے، پھر آپ نے پورا وضو کیا، پھر اقامت ہوئی، اور آپ نے مغرب کی نماز پڑھی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ علاوہ نماز کے حضور مختصر وضو کر لیا کرتے تھے، لیکن نماز کے لئے پورا ہی وضو کرتے تھے، لہٰذا اگر کسی حدیث میں مختصر وضو مذکور ہے، تو ان دونوں وجہوں میں سے کسی ایک وجہ کی

بنا پر تھا۔

غلط فہمی ”ہم ظہر، عصر اور عشاء کی نماز میں چار چار رکعات پڑھتے ہیں لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ عمر بن خطاب فرمایا کرتے تھے، کہ رات اور دن کی نماز صرف دو، دو رکعت ہے“ (دو اسلام ص۲۳۵)

ازالہ حضرت عمر رضہ کے جس قول کو برقی صاحب نے نقل فرمایا ہے، اس سے نفل نماز مراد ہے، اس قول کو فرض نماز کی طرف گھسیٹ کر لے جانا زبردست غلط فہمی ہے، حضرت عمر رضہ سے متعدد احادیث میں ظہر، عصر اور عشاء میں چار رکعت ہی ثابت ہیں۔

دوسرے طریقہ سے حضرت عمر رضہ کا یہ قول سنداً بیان نہیں ہوا بلکہ مؤطا میں بلا سند ہے، لہٰذا بے سند چیز کو محل اعتراض میں لانا خود قابل اعتراض ہے، جو چیز ثابت ہی نہ ہو اس پر اعتراض فضول ہے۔

تیسرے طریقہ سے حضرت عمر رضہ کے اس قول کی تشریح ان کے اس قول سے ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

صلاۃ السفر رکعتان وصلوۃ الجمعۃ	سفر کی نماز دو دو رکعت ہے، جمعہ، عیدالفطر
رکعتان والفطر والاضحی رکعتان	اور عیدالاضحی کی نمازیں دو رکعت ہیں،
تمام غیر قصر علی لسان محمد	یہ پوری نمازیں ہیں، ان میں کوئی کمی نہیں ہے
صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد
(ابن ماجہ کتاب تقصیر الصلوۃ)	گرامی یہی ہے۔

الغرض حضرت عمر رضہ کا زیر بحث قول اول تو ثابت نہیں، اور اگر ثابت مان لیا جائے، تو اس سے مراد یا تو نفل نماز ہے، یا نماز سفر مراد ہے۔

غلط فہمی ”بخاری میں مذکور ہے، ابو جحیفہ کہتے ہیں، کہ ایک دن دوپہر کے وقت حضور باہر تشریف لائے پانی منگوایا، وضو کیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر صلوۃ ظہر و عصر کی دو، دو رکعتیں پڑھیں

اس حدیث میں قطعاً یہ مذکور نہیں ہے کہ آپ سفر پر تھے، اور اس لئے آپ نے نماز میں تخفیف کرلی تھی“ (دو اسلام ص۲۳۵-۲۳۶)

ازالہ اس ہی حدیث میں آگے یہ لفظ ہیں ”و بین یدیہ عنزۃ“ اور بطور سترہ کے آپ کے سامنے ایک برچھی کھڑی کردی تھی اس سے صاف ظاہر ہوا، کہ یہ مسجد نبوی کا واقعہ نہیں ہے، کیونکہ مسجد میں برچھی گاڑنا قرین قیاس نہیں ہے، پھر اس سے ذرا اوپر ابو جحیفہ کی دوسری روایت ہے، اس میں

صاف مذکور ہے کہ:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی بھم بالبطحاء وبین یدیہ عنزۃ الظہر رکعتین والعصر رکعتین یمر بین یدیہ المراۃ والحمار (بخاری، کتاب السترۃ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو مقام بطحاء میں ظہر و عصر کی دو دو رکعت نماز پڑھائی، اور آپ کے سامنے برچھی تھی اور آپ کے سامنے سے عورتیں اور گدھے گذر رہے تھے۔

بطحاء مکہ میں ہے، لہٰذا ثابت ہوا، کہ آپ نے دو، دو رکعت سفر میں پڑھائی تھیں، صحیح مسلم میں اور بھی زیادہ صراحت ہے، ابو جحیفہ فرماتے ہیں:۔

ثم لم یزل یصلی رکعتین حتی رجع الی المدینۃ (مسلم باب سترۃ المصلی)	حضور دو، دو رکعت ہی پڑھتے رہے یہاں تک کہ آپ واپس مدینہ منورہ پہنچے۔

دیکھا آپ نے احادیث تو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں، کہ یہ سفر کا واقعہ تھا لیکن کیا کیا جائے عدم تحقیق بہت بری چیز ہے، اگر آپ تحقیق کرتے تو یہ غلط فہمی کیوں ہوتی۔

"ہم نماز عصر کے بعد نفل وغیرہ مکروہ سمجھتے ہیں، اور یہی فیصلہ حضرت عمرؓ کا بھی تھا۔۔۔۔

غلط فہمی لیکن حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔۔۔۔

رکعتان لم یکن رسول اللہ یدعہما سرا وعلانیۃ رکعتان قبل الصبح ورکعتان بعد العصر	کہ حضور نماز صبح سے پہلے اور نماز عصر کے بعد ہمیشہ دو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ (دو اسلام ص۲۳۶)

برق صاحب سے ترجمہ کرنے میں غلطی ہوئی، پہلے حضرت عائشہ رضی کی یہ حدیث سنیے:۔

ازالہ

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلیہما ولا یصلیہما فی المسجد مخافۃ ان یثقل علی امتہ وکان یحب ما یخفف عنہم (بخاری جلد اول کتاب المواقیت)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے اور ان دونوں کو مسجد میں نہیں پڑھتے تھے یعنی خفیہ ادا کرتے تھے اس خوف سے کہ امت پہ بوجھ نہ ہو جائے اور آپ امت پر تخفیف پسند کرتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد ان دو رکعتوں کو آپ علانیہ ادا نہیں فرماتے تھے اب حدیث زیر بحث کا صحیح ترجمہ سنیے:۔

"دو رکعتیں ایسی ہیں، جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ علانیہ چھوڑتے تھے، اور نہ تنہائی میں چھوڑتے تھے، اور وہ دو رکعت فجر سے پہلے کی دو رکعت ہیں، اور عصر کے بعد کی بھی دو رکعت آپ پڑھتے تھے"

لفظ علانیہ بتا رہا ہے، کہ نہ چھوڑنا فجر کی سنتوں کے متعلق ہے، کیونکہ عصر کی سنتیں تو آپ علانیہ پڑھتے ہی نہ تھے۔

جو فیصلہ حضرت عمرؓ کا ہے، وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ہے، آپ نے بھی عصر کے بعد نوافل سے منع فرمایا ہے، مگر کب؟ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:-

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صلوۃ بعد العصر الا ان تکون الشمس بیضاء نقیۃ مرتفعۃ (نسائی)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد نفل نماز سے منع فرمایا ہے، مگر سوائے اس کے کہ سورج سفید چمکدار، اور بہت بلند ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی وقت میں یہ دو رکعت پڑھتے تھے، لہٰذا یہ پڑھنا ممانعت کے وقت میں نہیں تھا، لہٰذا تعارض بھی نہیں۔

غلط فہمی "ہم قیام صلوۃ کے وقت اقامت میں تکبیر دو مرتبہ کہیں، لیکن مسلم میں درج ہے ..... حضرت بلال کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان کی تکبیریں دو دو مرتبہ اور اقامت کی صرف ایک مرتبہ کہیں" ص۲۲۶)

ازالہ یہ بھی کوئی تعارض کی بات ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان و اقامت کے دو طریقے تعلیم دیئے ہیں، لہٰذا دونوں صحیح ہیں "ہم ایسا کرتے ہیں" اور "فقہ میں ایسا لکھا ہے" ان جملوں سے حدیث پر کیا اعتراض ہے، آپ حنفی المذہب معلوم ہوتے ہیں، اور حنفی مذہب سب کا سب صحیح بھی نہیں لہٰذا اگر اس میں کوئی بات غلط ہو، اور آپ غلط عمل کر رہے ہوں، تو اس غلط مذہب اور غلط عمل کو چھوڑا جائے گا، نہ کہ حدیث کو۔

غلط فہمی "ہم پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی سورت بھی پڑھتے ہیں لیکن مسلم میں درج ہے کہ ایک شخص نے ابو ہریرہؓ سے پوچھا کہ کیا فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت پڑھنا ضروری ہے کہا ..... اگر کوئی سورت پڑھ لے، تو اچھا ہے، ورنہ فاتحہ ہی کافی ہے، اور ہمارے ائمہ فقہ کہتے ہیں، کہ صرف فاتحہ سے نماز مکمل نہیں ہوتی" (دو اسلام ص۲۲۷)

ازالہ آپ حنفی مذہب کے مطابق نماز پڑھتے ہیں، حنفی مذہب میں تو یہاں تک ہے، کہ آخری دو رکعت میں کچھ بھی نہ پڑھے تو نماز ہو جائے گی، کہئے اب آپ کا کیا خیال ہے، آپ اپنے مروجہ مذہب کی غلطی کو صحیح مان کر حدیث کو قابل اعتراض ٹھہراتے ہیں، اور یہ اصول ہی غلط ہے، حدیث کے مقابلہ میں

فقہ کی بات مسترد کی جائے گی، حضرت ابوہریرہ کا یہ قول مقتدی کے لئے ہے، یا آخری یا دو رکعت کے متعلق، کیونکہ یہی دونوں باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

لا تقرءوا بشئ من القرآن اذا جهرت الا بام القرآن فانه لا صلوة لمن لم يقرأ بها (ابوداؤد)

جب میں بلند آواز سے قرأت کروں، تو قرآن میں سے کچھ بھی نہ پڑھو، مگر سورۃ فاتحہ، کیونکہ اس کے بغیر تو نماز ہی نہیں ہوتی۔

ابوقتادہ فرماتے ہیں:۔

كان النبي صلى الله عليه وسلم يقرأ في الظهر في الاوليين بام الكتاب وسورتين وفي الركعتين الاخريين بام الكتاب ... وهكذا في العصر (صحيح بخاری و صحيح مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور سورت پڑھتے تھے، اور آخری دو رکعت میں صرف سورہ فاتحہ۔

برق صاحب حنفی مذہب تو ان دونوں احادیث کے خلاف ہے، نہ ان کے ہاں مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ ضروری، اور نہ آخری دو رکعت میں سورت فاتحہ ضروری حتیٰ کہ ان کے ہاں تو سورہ فاتحہ پڑھنا نہ امام پر فرض نہ مقتدی پر نہ منفرد پر، اگر چھوٹی سی ایک آیت پڑھ لی جائے، فرض ادا ہو جائے گا

غلط فہمی "ہم دعائے قنوت عشاء میں پڑھتے ہیں، لیکن حضرت انس کہتے ہیں کہ دعائے قنوت نماز مغرب و فجر میں پڑھی جاتی تھی" (دو اسلام ص۲۳۷)

ازالہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں قنوت نازلہ کا بیان ہے، اور یہ اب بھی ضرورت کے وقت سنت ہے، وتر کا قنوت اس سے علیحدہ ہے، آپ دونوں کو ایک سمجھ رہے ہیں۔

غلط فہمی "ہمارا امام سبحانك اللهم وبحمدك ..... لا اله غيرك دل میں پڑھتا ہے لیکن مسلم میں عبدہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے پڑھتے تھے" (دو اسلام ص۲۳۷)

ازالہ برق صاحب تعلیم کی غرض سے ثناء کا بلند آواز سے پڑھنا جائز ہے، دار قطنی کی روایت میں صاف مذکور ہے:۔

يسمعنا ذلك ويعلمنا (دار قطنی ص۱۱۳)

یعنی ہمیں سناتے تھے، اور ہمیں سکھاتے تھے۔

غلط فہمی "بلکہ ایک روایت کے مطابق حضور اور ان کے صحابہ ..... سبحانك اللهم ..... کو چھوڑ جاتے تھے ..... انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول کریم صلعم، ابوبکر، عمر اور عثمان کے پیچھے نماز پڑھتا رہا یہ حضرات نماز کا آغاز ہی سورہ فاتحہ سے کیا کرتے تھے .... افتتاح کے معنی ہیں آغاز کرنا، شروع

کرنا۔ اور شروع کا مفہوم یہی ہے، کہ اس سے پہلے اور کوئی چیز نہ ہو (دو اسلام ص۲۳۷-۲۳۸)

ازالہ برق صاحب! حدیث میں تو یہ نہیں ہے، کہ سورہ فاتحہ سے نماز شروع کرتے تھے، لفظ "نماز" آپ کی طرف سے ہے، حدیث میں اس طرح ہے:۔

یستفتحون بالحمد للہ رب العالمین — یعنی الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے

اس کے آگے ہے:۔

لا یذکرون بسم اللہ الرحمن الرحیم فی اول قراۃ ولا فی اٰخرھا — یعنی نہ اس سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے نہ آخر میں

دوسری حدیث میں وہ خود اس کی وضاحت کرتے ہیں:۔

فلم اسمع احدا منھم یقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم (مسلم) — یعنی میں نے ان میں سے کسی سے بسم اللہ الخ کو پڑھتے نہیں سنا ہے

مطلب ظاہر ہے، کہ قرأت بالجہر کی ابتدا الحمد للہ رب العالمین سے کرتے تھے، حتیٰ کہ بسم اللہ بھی ایسی آواز سے نہیں پڑھتے تھے، کہ ہم سن سکیں، لہٰذا حدیث میں ثنا پڑھنے کی نفی نہیں ہے، بلکہ ذکر یہ ہے کہ بلند آواز سے کیا چیز شروع کرتے تھے، اور عدم ذکر سے عدم شے لازم نہیں آتا، برق صاحب کچھ تو اصول پر بھی غور فرما لیا کیجیئے، ان ہی حضرت انس رضہ سے دوسری حدیث میں مذکور ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افتتاح "سبحانک اللھم" سے کیا کرتے تھے (تعلیق المغنی شرح دارقطنی ص۱۱۳ بحوالہ طبرانی فی کتابہ المفرد فی الدعاء) غرض یہ کہ محض پڑھنے کی ابتدا ثنا سے ہوتی، اور بلند آواز سے قرأت کی ابتدا سورہ فاتحہ سے ہوتی۔

غلط فہمی • ہمیں نماز میں رکوع و سجود و قیام و قعود کے بغیر کسی اور عمل کی اجازت نہیں لیکن بخاری میں ہے • سہل بن سعد کہتے ہیں، کہ جب مسجد نبوی کے لئے منبر تیار ہوا، تو حضور اس پر چڑھ گئے منہ قبلہ کی طرف پھیر لیا، تکبیر کہی ..... پھر سجدے کے لئے زمین پر اتر آئے"

• ایک مرتبہ حضور نے اپنی دختر زینب رضہ کی بیٹی امامہ کو اٹھا کر نماز شروع کر دی"

• ابن عباس کہتے ہیں ..... حضور رات کی نماز پڑھ رہے تھے ..... میں بھی ان کے پیچھے بائیں طرف کھڑا ہو گیا، آپ نے مجھے پکڑ کر دائیں طرف کر دیا" (دو اسلام ص۲۳۹)

ازالہ برق صاحب یہ کس نے کہہ دیا، کہ کوئی عمل جائز ہی نہیں، کاش آپ حنفی فقہ ہی کو ملاحظہ فرما لیتے ہاں ایسا عمل جائز نہیں جو ضروریات نماز سے نہ ہو، منبر پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ضروریات

نمازنہ سے تھا، تاکہ لوگ نماز سیکھ لیں سہل بن سعد کی روایت میں خود فخر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمادی ہے، نماز کے بعد آپ نے فرمایا:۔

ایھا الناس انما صنعت ھذا لتاتموا بی ولتعلموا صلاتی (بخاری کتاب الجمعۃ) — اے لوگو میں نے اس لئے ایسا کیا تھا کہ تم میری اقتدا کرو، اور میری نماز سیکھ لو

(۲) جب بچہ کو سنبھالنے والا کوئی نہ ہو، اور نماز بھی پڑھنی ہو تو اس کی یہی صورت ہے، کہ بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھے، نماز کو محض اس عذر سے ترک نہ کیا جائے، امت کی عورتوں کے لئے یہ ایک آسانی بھی ہے، اور ان کے عذر لنگ کا رد بھی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نواسی کو اٹھا کر نماز پڑھی اور اپنے عمل سے اس حالت میں، نماز کی ادائیگی کا طریقہ سکھا دیا فللہ الحمد

(۳) بائیں سے دائیں طرف یا آگے سے پیچھے کر دینا یہ اب بھی جائز ہے، کیونکہ نماز کی ضروریات سے ہے، معلوم نہیں برق صاحب نے اسے ناجائز کیسے سمجھ لیا۔

غلط فہمی "فقہاء کے ہاں دوران نماز میں نمازی کے سامنے سے گذرنا ممنوع ہے، بخاری میں ابوسعید سے روایت ہے، کہ اگر کوئی شخص نمازی کے سامنے سے گذر رہا ہو تو اسے روکے، اگر نہ رکے "فلیقاتلہ فانما ھو شیطان" تو اس سے باقاعدہ تلوار سے جنگ کرو، اس لئے کہ وہ شیطان ہے"

لیکن ابن عباس کہتے ہیں، کہ میں گدھی پر سوار ہو کر منی میں پہنچا، رسول اللہ صلعم نماز پڑھا رہے تھے میں کچھ نمازیوں کے سامنے سے گذر کر گدھی سے اترا۔۔۔ نماز میں شامل ہو گیا اور کسی نے برا نہ مانا" (ص ۲۳۹)

ازالہ "فلیقاتلہ" کے معنی "باقاعدہ تلوار سے جنگ کرو" یہ کس حد تک صحیح ہیں؟ کیا یہ رنگینی اور مبالغہ آمیزی نہیں؟ سیدھے سادھے معنی یہ ہیں، کہ اس سے لڑے، یہ لڑنا کس طرح ہوگا، اس کی تشریح بھی حدیث میں موجود ہے" وادرؤا ما استطعتم" جہاں تک ہو سکے اسے دفع کرو (ابوداؤد)

امام کا سترہ تمام مقتدیوں کے لئے کافی ہے، لہذا اگر کوئی شخص سترہ کے پیچھے سے مقتدیوں کے سامنے سے گذرے، تو گذر سکتا ہے، دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے، کہ اگر کوئی شخص نمازی اور سترہ کے درمیان سے گذرے، اسے روکنا چاہیئے، اگر نہ رکے، تو طاقت کے ذریعہ سے واپس کر دے، لیکن اگر کوئی شخص کسی صف کے سامنے سے گذرے، ایسی حالت میں کہ امام کے سامنے سترہ ہو، تو گذر سکتا ہے لہذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

غلط فہمی "عبداللہ بن عمرؓ کا فیصلہ ہے۔۔۔۔ کہ کسی چیز کے سامنے گذر جانے سے نماز باطل نہیں

ہوتی۔۔۔ مسلم کی ایک حدیث ہے۔۔۔۔۔ ابوہریرہ رض حضور سے روایت کرتے ہیں، کہ عورت، گدھا اور کتا سامنے آجائیں، تو نماز ٹوٹ جاتی ہے" لیکن حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔۔۔ کہ میں نماز میں حضور کے سامنے پاؤں کی طرف پھیلا کر لیٹ جاتی تھی (دو اسلام ص۲۳۹-۲۴۰)

ازالہ عبداللہ بن عمر رض کا جو فیصلہ ہے، وہی حدیث میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اذا وضع احدکم بین یدیہ مثل مؤخرۃ الرحل فلیصل ولا یبال من مر وراء ذلک (صحیح مسلم)

جب میں تم سے کوئی شخص کجاوے کی پچھلی لکڑی کے مانند کوئی چیز اپنے سامنے رکھ لے، تو نماز پڑھے، اور جو کوئی سترے کے آگے سے گذرے تو اس کے گذرنے کی پرواہ نہ کرے۔

دوسری حدیث میں آپ فرماتے ہیں:۔

لا یضرہ ما مر بین یدیہ (مسلم) پھر کوئی چیز بھی جو سامنے سے گذرے نقصان نہ دیگی،

ہاں اگر کوئی چیز سترہ اور نمازی کے درمیان سے گذرے، یا سترہ نہ ہو، پھر نمازی کے سامنے سے گذرے تو نماز قطع ہو جائے گی، برق صاحب نے جو حدیث صحیح مسلم کے حوالے سے نقل کی ہے، اس کے آخری الفاظ نقل نہیں کئے، آخری الفاظ یہ ہیں:۔

ویقی ذلک مثل مؤخرۃ الرحل (صحیح مسلم)

(عورت، گدھا اور کتا نماز کو قطع کرتے ہیں) اور اس قطع کو بچاتی ہے، وہ چیز، جو بطور سترہ سامنے رکھی ہو، مؤخرۃ الرحل کے مثل۔

اب حدیث میں اور ابن عمر رض کے قول میں کوئی منافات و تعارض باقی نہیں رہا۔

اب رہ جاتی ہے، وہ حدیث جو حضرت عائشہ رض سے مروی ہے، یہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے، برق صاحب محرم عورت اور نا محرم عورت میں بھی آخر فرق ہے، پھر لیٹے رہنے، اور گذرنے میں بھی فرق ہے، گذرنے کی ممانعت ہے، لیٹے رہنے کی نہیں، آخر تعارض کی کون سی بات ہے پھر نبی اور غیر نبی کا فرق بھی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے، اندھیرے اور اجالے میں بھی فرق ہے، اختیار اور اضطرار میں بھی فرق ہے، آپ نے کسی فرق کو ملحوظ نہ رکھا، اگرچہ اصلی فرق محرم اور نا محرم ہی کا ہے، نا محرم کے گذرنے سے خیالات پریشان ہوتے ہیں، وسوسہ پیدا ہوتا ہے، حضور قلب جاتا رہتا ہے، اور یہی قطع صلوۃ ہے، برخلاف اس کے اگر محرم سامنے سے نکلے، تو خیالات میں پراگندگی پیدا نہیں ہوتی، نہ حضور قلب قطع ہوتا ہے، یہ نفسیاتی اور جنسیاتی مسئلہ ہے اس کے سمجھنے کے لئے ان علوم کی مہارت ضروری ہے، یا پھر تجربہ درکار ہے

غلط فہمی حضرت عائشہ فرماتی ہیں:۔

کنت انام بین یدی رسول	میں نماز میں حضور کے سامنے پاؤں ان کی طرف
اللہ صلعم ورجلای فی قبلتہ	پھیلا کر لیٹ جاتی، جب وہ سجدہ کرنے لگتے، تو مجھے
فاذا سجد غمزنی فقبضت رجلی	آنکھ سے اشارہ کر دیتے، چنانچہ میں پاؤں سمیٹ
فاذا قام بسطتھما والبیوت یومئذ لیس	لیتی، اور جب وہ اٹھتے، تو پھر پھیلا دیتی، اور گھر
فیھا مصابیح (بخاری ج ۱ ص ۵۵)	میں چراغ موجود نہیں تھا۔

یہ اندھیرے میں رسول اللہ صلعم کے اشارہ ابرو کو دیکھ لینا حضرت عائشہ ہی کا کمال ہو سکتا ہے (ص ۲۴)

ازالہ کمال تو آپ نے کیا، کہ غمزنی کا ترجمہ "آنکھ سے اشارہ کر دیتے" کر دیا، غلط فہمی کی حد ہو گئی غمز کے معنی کسی چیز کو ہاتھ سے دبانا بھی ہے، دیکھو منتہی الادب فی مجموعہ لغات العرب جلد ۳ ص ۹۷۹ و مفتاح اللغات ص ۵۹۷

برق صاحب قطع نظر اس لغوی معنی کے اگر آپ احادیث ہی کا گہرا مطالعہ فرما لیتے، تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی، دوسری حدیث میں حضرت عائشہ خود ہی فرماتی ہیں:۔

غمز رجلی فقبضتہا (بخاری ابواب السترۃ)	آپ میرے پیروں کو دبا دیتے، میں ان کو سمیٹ لیتی

غلط فہمی "جب حضرت عائشہ رض کے سامنے مسلم والی حدیث پیش کی گئی، تو آپ نے بگڑ کر فرمایا، تم لوگوں نے ہم عورتوں کو گدھوں اور کتوں جیسا سمجھ لیا، خدا کی قسم میں رسول اللہ صلعم کے سامنے چٹائی پر لیٹی ہوتی تھی، اور وہ نماز ادا کیا کرتے تھے" (مسلم)

بدیگر الفاظ حضرت عائشہ رض نے اس حدیث کی صحت سے انکار کر دیا ہے، اور پھر بھی یہ صحیح مسلم کا جزو بنی ہوئی ہے" (دو اسلام ص ۲۴۰ - ۲۴۱)

ازالہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، حضرت عائشہ کے سامنے حدیث بیان نہیں کی گئی، بلکہ بعض لوگوں کا قول پیش کیا گیا، مثلاً عروہ کہتے ہیں، حضرت عائشہ رض نے پوچھا:۔

ما یقطع الصلوۃ فقلنا المرأۃ والحمار	نماز کو کیا چیز قطع کرتی ہے، ہم نے کہا عورت اور گدھا

دوسری حدیث میں اس طرح ہے:۔

ذکر عندھا ما یقطع الصلوۃ	حضرت عائشہ کے پاس اس چیز کا ذکر آیا جو نماز کو توڑتی ہے

غرض یہ کہ حضرت عائشہ کے سامنے لوگوں کی رائے پیش کی گئی، اس لئے انہوں نے اس کی تردید میں حدیث

سنائی، اگر ان کے سامنے حدیث پیش کی جاتی، تو وہ مان جاتیں، اور دونوں میں تطبیق دیتیں یعنی لیٹنے اور گذرنے کا فرق، محرم اور نامحرم عورت کا فرق ملحوظ رکھ کر مطابقت پیدا کرتیں، انہوں نے صحیح مسلم کی حدیث کا انکار نہیں کیا، لہٰذا وہ صحیح ہے، یہ مسئلہ جب حدیث کی صورت میں ان کے پاس پہنچا، تو پھر وہ خود اس حدیث کو روایت کرنے لگیں، حضرت عائشہ فرماتی ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا یقطع صلوٰۃ المسلم شئی الا الحمار	مسلم کی نماز کوئی چیز قطع نہیں کرتی، سوا گدھے
والکافر والکلب والمراۃ لقد قرنا	کافر، کتے، اور عورت کے بیشک ہم عورتوں کو
بدواب السوء (مسند احمد)	برے جانوروں کے ساتھ کر دیا گیا۔

غرض یہ کہ حضرت عائشہ رض نے صحیح مسلم کی حدیث کی تائید کر دی، اور باوجود اظہار افسوس کے حدیث کو بعینہ روایت کر دیا، اور پھر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

غلط فہمی "عام مسلمان رکوع سے پہلے یا بعد ہاتھ نہیں اٹھاتے لیکن بخاری میں پوری چار احادیث اس مضمون پر ملتی ہیں، کہ حضور رکوع سے پہلے اور پیچھے، نیز درمیانی التحیات سے اٹھ کر ہاتھ اٹھایا کرتے تھے" (دو اسلام ص ۲۴۱)

الازالہ عام مسلمانوں سے مراد آپ کی احناف ہیں، جن کی ہندو پاکستان میں اکثریت ہے، اور حنفی مذہب ہی سے آپ کو بھی تعلق ہے لہٰذا ہر ایسی چیز آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہے، جو آپ کے مذہب میں نہیں ہے، برق صاحب مذہب اسلام تو وہی ہے، جو حدیث میں ہے، باقی رہا کسی فرقہ کا اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا یہ ان کا اپنا فعل ہے، ان کے کسی فعل سے اسلامی چیز پر کوئی اثر نہیں پڑتا، برق صاحب یہ گروہ بندیاں ہی ہیں، جنھوں نے اسلام کو تباہ کیا، یہ تقلید ہی کی بندشیں ہیں جنھوں نے فرقوں، بدعات و خرافات کو جنم دیا، آپ کو اسی تقلید کی وجہ سے رفع یدین نظر نہ آیا، ورنہ رفع یدین نقلاً و عملاً متواتر ہے سنت ثابتہ ہے، اور اسی پر جماعت حقہ کا عمل ہے، آپ کو تو صرف چار احادیث نظر آئیں، حالانکہ صحیح بخاری میں بھی چار نہیں پانچ احادیث ہیں، اور اگر آپ تحقیق کرتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ پوری چار سو احادیث و آثار اس باب میں صحیح و ثابت ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو سفر السعادت مصنفہ علامہ مجد الدین صاحب قاموس)

غلط فہمی "ہم بلاوجہ ظہر و عصر اور عشاء و مغرب کی نمازوں کو جمع نہیں کر سکتے، لیکن مؤطا میں ہے .... کہ حضور بغیر کسی خوف یا سفر کے بھی نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشا کو اکٹھا کر لیا کرتے تھے" (دو اسلام ص ۲۴۱)

ازالہ برق صاحب آپ نے "صلی" کا ترجمہ صحیح نہیں کیا، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ آپ نے ظہر و عصر کو جمع کیا، مغرب و عشاء کو جمع کیا، نہ یہ کہ جمع کر لیا کرتے تھے" آپ نے ماضی مطلق کو ماضی استمراری بنا دیا، یہ صرف ایک دفعہ کا واقعہ ہے، اور یہ بھی بلا وجہ نہیں تھا، عبدالرحمن بن علقمہ فرماتے ہیں۔

قدم وفد ثقیف علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ..... فقعد معھم لیسألھم ویسألونہ حتی صلی الظھر مع العصر (نسائی کتاب العمریٰ ج ۲ ص ۱۲۳)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں ثقیف کا وفد حاضر ہوا، آپ ان کے پاس بیٹھے رہے، آپ ان سے پوچھتے تھے، اور وہ آپ سے سوال کرتے تھے، حتی کہ عصر کے ساتھ ظہر کی نماز ادا فرمائی

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ تبلیغ احکام کی وجہ سے آپ نے نماز کو جمع فرمایا، پھر یہ بھی واضح رہے، کہ دونوں کو اپنے اصلی وقت ہی میں ادا کیا، وقت سے ہٹا کر کوئی نماز نہیں پڑھی گئی، عبداللہ بن عباس جن کی حدیث برق صاحب نے نقل فرمائی ہے، وہی اس کی تشریح کرتے ہیں،

صلیت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینۃ ثمانیا وسبعا جمیعا اخر الظھر وعجل العصر واخر المغرب وعجل العشاء (نسائی کتاب المواقیت)	میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ میں آٹھ اور سات رکعات اکٹھی پڑھیں، آپ نے ظہر کو آخر وقت پڑھا، اور عصر کو جلدی، مغرب کو آخر وقت میں ادا کیا، اور عشاء کو جلدی

غرض یہ کہ یہ جمع صوری تھی، نہ کہ حقیقی یعنی بظاہر دونوں ایک وقت میں پڑھی گئی تھیں لیکن حقیقۃً دونوں اپنے اپنے وقت میں پڑھی گئی تھیں، اور یہ جمع بھی ضرورۃً تھی نہ کہ بے ضرورت

غلط فہمی فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے، کہ حائضہ روزے رکھے، اور نماز نہ پڑھے۔

ان الحائض تقضی الصیام ولا تقضی الصلوٰۃ	حائضہ روزے رکھے لیکن نماز ادا نہ کرے (بخاری جلد ۲ ص ۲۳۹)

لیکن حضرت عائشہ سے روایت ہے، کہ

حضور کی ایک زوجہ حضور کے ہمراہ معتکف ہو گئیں، اس دوران میں انہیں حیض شروع ہو گیا، اور حالت یہ ہو گئی، کہ جب وہ نماز پڑھتی تھیں، تو ہم ان کے نیچے برتن رکھ دیتے تھے" (ص ۲۴۱-۲۴۲)

ازالہ برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ حائضہ روزے کی قضا کرے، اور نماز کی قضا نہ کرے، نہ یہ کہ بحالت حیض روزے رکھے، جیسا کہ برق صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔

دوسری حدیث میں "استحاضہ" کا ترجمہ "حیض" صحیح نہیں، حیض اور استحاضہ علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، برق صاحب دونوں کو ایک سمجھ بیٹھے، زوجہ مطہرہ استحاضہ کی حالت میں نماز ادا فرماتی تھیں نہ کہ بحالت حیض، حالت حیض میں نماز معاف ہے، لیکن حالت استحاضہ میں نماز معاف نہیں ہے استحاضہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

انما ذلك عرق وليس بحيض فاذا	استحاضہ حیض نہیں ہے، بلکہ ایک رگ کا خون
اقبلت حيضتك فدعی الصلوٰة	ہے، پس جب حیض شروع ہو، تو نماز چھوڑ دو
واذا ادبرت فاغسلي عنك الدم	اور جب حیض چلا جائے، تو خون دھو ڈالو، اور
ثم صلی (بخاری ومسلم)	نماز پڑھو۔

غلط فہمی "حضور فرماتے ہیں، کہ مجھے رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے سے روک دیا گیا ہے (مسلم جلد ۲ صہ ۹۱)
لیکن حضرت عائشہ رض سے روایت ہے، کہ
حضور رکوع اور سجدہ میں قرآن کی یہ آیت پڑھا کرتے تھے سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح" (مسلم)
مطلب یہ کہ حضور ایک حکم دے کر خود ہی اسے توڑ دیا کرتے تھے" (دو اسلام صہ ۲۴۲-۲۴۳)

ازالہ برق صاحب آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی، آپ اس تسبیح کو قرآن کی آیت سمجھ رہے ہیں حالانکہ یہ قرآن کی آیت نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ آپ نے قرآن کا بھی بہت ہی سرسری مطالعہ کیا ہے، اور حدیث کا بھی، اور اسی وجہ سے یہ غلط فہمیاں ہوتی ہیں، حدیث مذکور کے ترجمہ میں "قرآن کی آیت" آپ کا اضافہ ہے، عربی متن میں یہ الفاظ نہیں ہیں، نہ یہ قرآن کی آیت ہے، لہذا اعتراض بالکل لغو ہے

غلط فہمی "حضور نے فرمایا .... نماز میں انسانی کلام جائز نہیں (مسلم جلد ۲ صہ ۱۲۹)
لیکن ابو الدرداء روایت کرتے ہیں، کہ
ایک مرتبہ نماز کے دوران میں حضور کے سامنے شیطان آگیا، تو آپ نے تین مرتبہ کہا ...
تم پر اللہ کی لعنت (مسلم جلد ۲ صہ ۱۳۹)
یعنی حضور کے لئے نماز میں انسانی کلام جائز اور دوسروں کے لئے ناجائز (دو اسلام صہ ۲۴۳)

ازالہ بے شک نماز میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے کلام کرنا حرام ہے، لیکن نمازی کا اللہ سے کلام کرنا جائز ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابلیس کے سامنے آجانے پر کہا

اعوذ باللہ منک العنک بلعنۃ اللہ۔	میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، اللہ تجھے دور رکھے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسا کہ "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے دعا کی، کہ وہ شیطان کو دور رکھے، اور یہ شیطان سے پناہ مانگنا بھی اللہ کے حکم کی تعمیل میں تھا اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :۔

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ (حم سجدہ)	جب شیطان تمہیں ستائے، تو اللہ کی پناہ طلب کرو۔

پھر شیطان سے پناہ مانگنا صرف آپ کے لئے ہی جائز نہیں، بلکہ آپ کے اتباع میں ہر ایک کے لئے جائز ہے، اور اس کا آپ نے حکم بھی دیا ہے۔

غلط فہمی "ہم دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں، لیکن حضرت انس کہتے ہیں، کہ حضور بارش کی دعا کے بغیر کسی اور دعا میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے" (دو اسلام ۲۲۲)

ازالہ برق صاحب نے حدیث کا آخری جملہ چھوڑ دیا، اور وہ یہ ہے :۔

فانہ یرفع حتی یری بیاض ابطیہ (صحیح بخاری)	استسقاء میں ہاتھ اتنے بلند کرتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔

لہذا حضرت انس رضہ کا منشاء یہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی دعا میں ہاتھ اتنے اونچے نہیں کرتے تھے، جتنے دعاء استسقاء میں، کیونکہ اس میں اتنے بلند کر لیتے تھے، کہ بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی، حضرت انس رضہ نے دوسری دعاؤں میں رفع بلیغ کا انکار کیا ہے، نہ کہ مطلق رفع کا، برق صاحب کو بڑی زبردست غلط فہمی ہوتی۔

غلط فہمی "ہم جوتے اتار کر نماز ادا کرتے ہیں، لیکن سعید بن یزید الازدی کہتے ہیں، کہ میں نے حضرت انس سے پوچھا کہ ...... کیا حضور جوتوں سمیت نماز پڑھتے تھے، کہا ہاں" (دو اسلام ۲۲۲)

ازالہ دونوں طرح سنت ہے، اور دونوں طرح جائز ہے، اس میں کونسا تعارض ہے۔

غلط فہمی "ہمیں تاکید کی گئی ہے، کہ سجدے میں کتے کی طرح بازو مت کھولو، حضرت انس رضہ سے روایت ہے، کہ :۔

لا ینبسط ذراعیہ کالکلب	ایک نمازی سجدے میں کتے کی طرح بازو نہ کھولے

لیکن ایک اور حدیث میں ہے، کہ ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں بازوؤں کو اتنا

کھول لیتے تھے، کہ ان کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی (ردّ اسلام ص۲۴۴-۲۴۵)

ازالہ برق صاحب نے پہلی حدیث کا ترجمہ صحیح نہیں کیا، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ سجدے میں کتنے کی طرح بازو نہ بچھائے، اس میں کھولنے یا نہ کھولنے کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے، لہذا کوئی تعارض نہیں، حنفی مذہب میں بھی سجدے میں بازو کھولنا سنت ہے، اور عام لوگ بھی یہی کرتے ہیں، آپ کا عمل عام لوگوں کے بھی خلاف ہے۔ حنفی مذہب کے بھی خلاف ہے اور مذہب اسلام کے بھی خلاف ہے

غلط فہمی "ہم پہلی رکعت کے بعد سیدھے اٹھ جاتے ہیں، لیکن مالک بن الحویرث کہتے ہیں.... کہ حضور دوسرے سجدے سے سر اٹھانے کے بعد پہلے آرام سے زمین پر بیٹھ جاتے، اور پھر اٹھتے" (ردّ اسلام ص۲۴۵)

ازالہ پہلی رکعت کے بعد بیٹھنا سنت ہے، اور یہی جماعت حقہ کا معمول ہے حنفی تقلیداً اس کا انکار کرتے ہیں، اور بے دلیل کرتے ہیں۔

غلط فہمی "حضرت انس رض کہتے ہیں، کہ حضور.... سب سے زیادہ مختصر اور مکمل نماز پڑھاتے تھے" (ردّ اسلام ص۲۴۵)

وہی انس.... بیان کرتا ہے، کہ رسول اللہ صلعم کی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی، کہ جب وہ رکوع سے سر اٹھاتے تھے، تو اتنی دیر کھڑے رہتے تھے، کہ دیکھنے والا یہ سمجھتا، کہ آپ بھول گئے ہیں، اور سجدہ کے بعد بھی یہی حالت ہوتی تھی" (ردّ اسلام ص۲۴۶)

ازالہ پہلی حدیث میں ہے، کہ آپ مکمل نماز پڑھتے تھے، اور مکمل کی تشریح یہ ہے، کہ قومہ اور جلسہ میں کچھ دیر ٹھہر جایا کرتے تھے، یہ نہیں کہ تو چل میں آیا، اللہ اکبر، اللہ اکبر ہوتا رہتا ہے، کہیں سکون ہے نہ اطمینان، نہ قومہ میں دعا پڑھی جاتی ہے نہ جلسہ میں، ان دعاؤں میں مشکل سے ۳۰ سیکنڈ لگتے ہیں، اگر یہ ۳۰ سیکنڈ بھی بہت لمبا وقفہ ہے، تو پھر اللہ ہی حافظ ہے، ہاں جو لوگ جلدی جلدی اللہ اکبر اللہ اکبر کرتے ہیں، وہ یہی سمجھیں گے کہ شاید بھول ہو گئی ہو، اور ہمارا تجربہ ہے

برق صاحب نے لکھا ہے، کہ آپ کی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی" یہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں، برق صاحب نے غلط فہمی سے خود لکھ دیئے ہیں، قومہ اور جلسہ میں سکون سے بیٹھ جانے کو انہوں نے طول نماز سمجھ لیا۔

غلط فہمی "جو کسر باقی تھی، اسے ابو سعید الخدری پورا کرتا ہے، کسی نے ابو سعید سے رسول اللہ صلعم کی نماز کے متعلق سوال کیا تو آپ نے کہا...

كانت صلوة الظهر تقام فينطلق احدنا الى البقيع فيقضي حاجته ثم ياتي اهله فيتوضأ ثم يرجع الى المسجد ورسول الله صلى الله عليه وسلم في الركعة الاولى

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اتنی لمبی ہوتی تھی، کہ فرض کیجیے، نماز ظہر شروع ہو چکی ہے، ایک شخص پہلے بقیع میں جاتا ہے، وہاں سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا ہے، وضو کرتا ہے پھر مسجد میں جاتا ہے، اور حضور ابھی پہلی رکعت ہی پڑھ رہے ہوتے تھے۔

ازالہ اس حدیث میں بھی لمبی نماز کا کوئی ذکر نہیں، آپ نے "تقام" کا ترجمہ "شروع ہو چکی" کر کے، اور "فرض کیجیے" کے الفاظ کا اضافہ کر کے نماز کے لمبا ہونے کا مفہوم پیدا کر دیا، لیکن صحیح ترجمہ صرف اتنا ہے، کہ نماز کھڑی ہوتی، ظاہر ہے کہ اقامت بھی ہوتی ہوگی، صف بندی بھی ہوتی ہوگی، پھر صف بندی کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام مشہور ہے، آپ کسی کو آگے کرتے کسی کو پیچھے کرتے پھر نماز شروع ہوتی ہوگی، لہٰذا اتنے عرصہ میں اگر کوئی شخص پیشاب اور وضو سے فارغ ہو کر آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی رکعت میں پاتا۔ یہی حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں تقریباً تیس آیات تلاوت فرماتے تھے (صحیح مسلم) لہٰذا ثابت ہوا، کہ نماز طویل نہیں ہوتی تھی، اور نہ ایسی نامکمل ہوتی تھی، جیسی آج کل ہوتی ہے، برق صاحب نے حضرت انس رضہ اور حضرت ابو سعید رضہ کے متعلق جو خلاف ادب الفاظ استعمال کئے ہیں، اگر وہ اس سلسلہ میں اللہ سے معافی مانگیں تو مناسب ہے۔

غلط فہمی بخاری کی حدیث ہے، کہ "ابردوا بالصلوة" (نماز کو ذرا ٹھنڈے وقت میں پڑھو) لیکن بخاری ہی میں ایک اور حدیث ہے۔

"انس بن مالک کہتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر اتنی جلدی پڑھ لیتے تھے کہ اگر ہم نماز پڑھ کر عوالی (مدینہ سے چار میل) سے بھی پھر آتے، تو سورج کافی اونچا ہوتا تھا" (بخاری ج ۲ ص) انگریزی میل ۱۷۶۰ گز لمبا ہوتا ہے، اور عربوں کا پرانا میل ۵۵۰۲ گز۔ اس حساب سے عوالی اور مدینہ کا دو طرفہ سفر گیارہ میل اور ایک فرلانگ بنتا ہے، جس پر درمیانی رفتار سے کم از کم چار گھنٹے صرف ہوتے ہیں ..... بدیگر الفاظ حضور نماز عصر غروب آفتاب سے ساڑھے پانچ گھنٹے پہلے پڑھا کرتے تھے ..... قربان جائیے اس دروغ گوئی پر

(دو اسلام ص ۲۴۷ - ۲۴۸)

ازالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم، کہ نماز کو ٹھنڈے وقت پڑھا کرو" یہ ظہر کے متعلق ہے، اور یہ اس لئے کہ آنے والوں کو دیواروں کا سایہ مل جائے، اور وہ با آسانی آسکیں، یہ حکم اس زمانہ کے لئے مخصوص ہے، جب سخت گرمی کا موسم ہو، ورنہ ٹھنڈا کرنے کے کیا معنی ہوں گے، برق صاحب نے اس حکم کو عصر کے متعلق سمجھا، اور یہ ان کی پہلی غلط فہمی ہے، حالانکہ حدیث میں ظہر کی صراحت موجود ہے، معلوم نہیں لفظ "ظہر" برق صاحب کی نظر سے کیسے اوجھل ہو گیا۔

دوسری حدیث کا ترجمہ کرنے میں برق صاحب کو زبردست غلط فہمی ہوئی صحیح ترجمہ ملاحظہ ہو:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھتے
یصلی العصر والشمس مرتفعۃ	تھے جب کہ سورج بلند اور چمکدار ہوتا تھا پھر
حیۃ فیذھب الذاھب الی العوالی	ایک جانے والا عوالی جاتا تھا، اور ان کے
فیاتیھم والشمس مرتفعۃ	پاس پہنچ جاتا تھا، ایسی حالت میں کہ سورج
(صحیح بخاری وصحیح مسلم)	بلند ہوتا تھا۔

حدیث میں یک طرفہ فاصلہ کا ذکر ہے، برق صاحب نے دو طرفہ کر دیا، ایک طرفہ فاصلہ چار عربی میل ہوا، اور یہ فاصلہ باآسانی $1\frac{1}{2}$ گھنٹہ میں طے ہو سکتا ہے، اس حساب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غروب آفتاب سے تقریباً ڈھائی گھنٹے پہلے نماز پڑھ لیا کرتے تھے، کہئے کیا اعتراض ہے؟ بالکل اسی وقت ہم خود آج کل نماز عصر ادا کرتے ہیں۔

غلط فہمی "ابوامامہ کہتے ہیں، کہ میں اور عمر بن عبدالعزیز نماز ظہر پڑھ کر معاً حضرت انس بن مالک کے ہاں چلے گئے، کیا دیکھتے ہیں، کہ وہ نماز عصر پڑھ رہے ہیں، ہم نے پوچھا، یہ کیا ہم کہنے لگے، کہ حضور کا وقت عصر یہی تھا" (دو اسلام ص ۲۴۸)

ازالہ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے، ان لوگوں نے ظہر کی نماز دیر سے پڑھی ہوگی، یہ قصور ان کا ہے نہ کہ اصلی وقت تھا، عصر کا اصلی وقت مغرب سے تقریباً ۳ گھنٹہ پہلے شروع ہوتا ہے آج کل عوام الناس جس وقت نماز پڑھتے ہیں، وہ آخر وقت ہوتا ہے۔

غلط فہمی اس کے بعد برق صاحب نے چند اور اختلاف کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ دعائیں نقل فرمائی ہیں، اور ان کو اپنے عمل یا احسان کے عمل سے متعارض سمجھا ہے، برق صاحب بات یہ نہیں ہے، جو آپ سمجھے ہیں اگر رکوع میں ایک سے زاید دعائیں ماثور ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں، کہ وہ سب غلط ہیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے، کہ وہ بھی سنت ہیں، اور اگر کوئی شخص

چاہے، تو انہیں بھی پڑھ سکتا ہے، اور اگر صرف "سبحان ربی العظیم" پر اکتفا کرے، تو یہ بھی کافی ہے، آخر اس میں اشکال کی کونسی بات ہے، اشکال تو اس وجہ سے پیدا ہوا، کہ آپ کو بچپن سے ان دعاؤں سے ناواقف رکھا گیا، اگر شروع ہی سے ان کو بھی تعلیم دیا جاتا، تو پھر آپ کو یہ دعائیں عجیب و غریب معلوم نہ ہوتیں، بلکہ آپ خود کہتے کہ جس طرح سورہ فاتحہ کے بعد جو سورت چاہیں پڑھ سکتے ہیں، اسی طرح رکوع میں جو دعائیں چاہیں پڑھ سکتے ہیں، لیکن یہ واضح رہے کہ سبحان ربی العظیم کا پڑھنا زیادہ اہم ہے اس لئے کہ اس کا آپ نے حکم دیا ہے۔ اگر سورتوں کا اختلاف اعتراض پیدا نہیں کرتا تو دعاؤں کا اختلاف اعتراض کیوں پیدا کرتا ہے؟

غلط فہمی تو یہ ہے حدیث کی نماز! کیا آپ یہی نماز پڑھا کرتے تھے، اگر نہیں تو پھر کس منہ سے یہ کہا کرتے ہیں، کہ اگر حدیث نہ رہے، تو نماز کا نام و نشان مٹ جائے، آپ حدیث کی نماز سے کوسوں بھاگتے ہیں، اور پھر حدیث کو شارح صلوٰۃ بھی کہتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا، کہ بڑا معمہ کون سا ہے آپ یا آپ کی حدیث!! (دو اسلام ص ۲۵۱-۲۵۲)

ازالہ آپ کی تمام غلط فہمیوں کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے، لہٰذا حدیث کی نماز بالکل صحیح ہے، اور اسی طریقہ سے افراد جماعت حقہ عاملین بالحدیث نماز ادا کرتے ہیں، حدیث کی نماز سے کوسوں دور وہ بھاگتے ہیں جنہوں نے اپنے علیحدہ علیحدہ مذہب بنائے ہیں، اور جو اپنے مذہب کی خاطر طرح طرح کے حیلوں اور بہانوں سے حدیث کو رد کرتے ہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو فتنہ انکار حدیث کو جنم دینے والے یہی لوگ ہیں، اور اس فتنہ کی پرورش کرنے والے وہ لوگ ہیں، جو آج علی الاعلان میدان میں اتر آئے ہیں، برق صاحب اس جلی اور خفی انکار حدیث سے بچئے، فرقہ بندی سے علیحدہ ہو کر نماز کو سیکھئے، پھر آپ کو وہی نماز حاصل ہو گی، جو حدیث میں ہے۔

باب - ۱۱

"بہترین عمل"

غلط فہمی ؛ جب ملانے دیکھا، کہ مسلمان نپٹنے کے لئے جان دینا پڑتی ہے، تو اس نے بعض دیگر اعمال کی افضلیت پر احادیث گھڑنا شروع کر دیں، اور جہاد کی وقعت کو گھٹا کر کہیں تو اسے تیسرے یا چوتھے درجے کا عمل بنا دیا، اور کہیں اچھے اعمال کی فہرست ہی سے خارج کر دیا (مقام ۲۵)

ازالہ ؛ برق صاحب قرآن میں بھی ایسی متعدد آیات ہیں، جن میں جہاد کا ذکر نہیں ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

(۱) إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ	جن لوگوں نے کہا، ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے اور پھر اسی پر جمے رہے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، جو یہ کہتے ہیں، کہ نہ تم ڈرو، اور نہ غم کھاؤ، اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔
(حم سجدہ ۵)	

اس آیت کی رو سے بس "اللہ ربنا" کہہ لے، اور اسی پر جما رہے یعنی اسی کا ورد کرتا رہے تو وہ جنتی ہے، کتنی اچھی آیت ہے، کہ نہ مالی قربانی کی ضرورت۔ نہ میدان کارزار میں داد شجاعت دینے کی ضرورت، کیا یہ آیت بھی کسی ملا کی گھڑی ہوئی ہے ؟

(۲) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَ	مومن تو صرف وہی لوگ ہیں، کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے، تو ان کے دل دہل جائیں، اور جب ان کے سامنے آیات تلاوت کی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جائے، اور وہ اللہ پر توکل رکھتے ہیں، جو لوگ نماز کو قائم کرتے ہیں، اور ہماری دی ہوئی دولت میں سے خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ سچے مومن ہیں ان کے لئے اللہ

رِزْقٌ كَرِيْمٌ (انفال) کے ہاں درجات ہیں مغفرت ہے اور بہترین رزق ہے

اس آیت میں بھی جہاد کا ذکر نہیں بس دل کو نرم بنا لے، توکل کرے، نماز پڑھے، اور تھوڑا بہت کبھی خرچ بھی کرتا رہے، خواہ اس خرچ کا محل کچھ ہی ہو، اللہ کے لئے خرچ کرنا بھی ضروری نہیں ہے، بس وہ پکا مومن ہے حقیقی مسلمان وہی ہے، وہ جنت کا ٹھیکیدار ہے، کہئے اس آیت کے متعلق کیا خیال ہے

(۳) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ (المؤمنون)

بے شک نجات پائی ان مومنین نے جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں، اور جو لغو کاموں سے دور رہتے ہیں، اور جو زکوۃ ادا کرتے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے بیوی اور لونڈی کے، کہ ان کے حق میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں ہاں جو ان کے علاوہ تلاش کریں وہ حد سے گذرنے والے ہیں، اور جو لوگ امانتوں اور عہد کی حفاظت کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

برقی صاحب! دیکھا آپ نے اعمال صالحہ کی کتنی لمبی فہرست ہے، لیکن جہاد کا ذکر کہیں نہیں سورہ معارج میں کم وبیش انہی اعمال پر مشتمل پھر ایک لمبی فہرست ہے، لیکن اس میں بھی جہاد کا ذکر نہیں، باوجود اس کے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے" اولئك فی جنت مکرمون" (معارج) یہ لوگ جنت میں عزت والے ہوں گے، ان طویل فہرستوں میں جہاد کا ذکر تک نہ ہونا، یہ ثابت کرتا ہے کہ جہاد کوئی ایسی ضروری چیز نہیں جس کے بغیر جنت نہ مل سکے، کہئے ایسان آیات کے متعلق کیا خیال ہے، قرآن مجید میں اس قسم کی اور بھی بہت سی آیات ہیں، بخوف طوالت نقل نہیں کر سکتا، مشتے نمونہ از خروارے یہی کافی ہے۔

غلط فہمی: "عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں، کہ میں نے آنحضرت سے پوچھا، کہ سب سے بہترین عمل

کون سا ہے، فرمایا، نماز بہ پابندی وقت، اس کے بعد والدین کی خدمت، اور اس کے بعد جہاد (صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۹) دیکھا آپ نے نماز کو کہاں رکھا، اور جہاد کو کہاں جا پھینکا (دو اسلام صفحہ ۲۵۶)

ازالہ برق صاحب اوپر اعمال صالحہ کی سورہ مومنون اور سورہ معارج سے طویل قرآنی فہرستیں پیش کر چکے ہیں ان دونوں فہرستوں میں نماز سے آغاز ہوا ہے، اور نماز ہی پر اختتام ہوا ہے، گویا نماز پر بڑا زور دیا گیا ہے، رہا جہاد تو اس کا ان طویل فہرستوں میں ذکر تک نہیں، اب بتائیے، نماز زیادہ اہم ہے یا جہاد، اچھا وہ آیت سنیئے، جس میں جہاد کو سب سے پیچھے ڈال دیا گیا ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	بلکہ نیکی تو یہ ہے، کہ جو ایمان لایا اللہ تعالے پر
الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ	اور قیامت پر، اور فرشتوں پر کتابوں پر اور
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى	نبیوں پر، اور اللہ کی محبت میں رشتہ داروں
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	کو، یتیموں کو، مساکین کو، مسافروں کو، سائلین کو
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ	مال دیا، غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے خرچ کیا،
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ	اور جس نے نماز قائم کی اور زکوۃ ادا کی، اور جو عہد
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ	کو پورا کرنے والے ہیں، جب عہد کرلیں، اور جو صبر
فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ	کرنے والے ہیں غربت میں، بیماری میں، اور جہاد
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ	میں، یہی لوگ ہیں جنہوں نے سچ کہا (صدق دل
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرۃ)	سے ایمان لائے) اور یہی متقی ہیں۔

برق صاحب! دیکھا آپ نے کتنی طویل فہرست ہے، لیکن جہاد فہرست کے اختتام پر ہے، اللہ تعالے نے جہاد کو کہاں جا پھینکا ہے

غلط فہمی "حضرت عائشہ نے حضور علیہ السلام سے کہا،

نری الجہاد افضل العمل	کہ ہماری رائے میں جہاد بہترین عمل ہے، کیا
افلا نجاھد قال لا لکن افضل	ہم جہاد نہ کریں، فرمایا نہیں، بلکہ حج بہترین
الجہاد حج مبرور	جہاد ہے۔

چلو اہل عرب اور ہمارے سامراکی تو جہاد سے خلاصی ہوئی . . . بڑا ہی جہاد والے کو کیا پڑی ہے، کہ جان دے کر گھٹیا جہاد کرتا پھرے (دو اسلام صفحہ ۲۵۶ - ۲۵۷)

ازالہ: - برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا، صحیح ترجمہ یہ ہے:-

"ہم سمجھتے ہیں کہ جہاد افضل العمل ہے، تو کیا ہم جہاد نہ کریں، آپ نے فرمایا، تم عورتوں کے لئے بہترین جہاد حج مبرور ہے"

برق صاحب نے "لکن" کو "لکن" سمجھ کر ترجمہ کیا، اور یہی اصلی غلط فہمی ہے، حدیث کا مطلب صرف اتنا ہے، کہ ازواج مطہرات یا عام عورتوں کے لئے حج ہی جہاد ہے، ان کے لئے میدان کارزار میں مردوں کے دوش بدوش لڑنا، اور کافر مردوں سے گتھم گتھا ہونا مناسب نہیں، برق صاحب سمجھے کہ گویا یہ حکم مردوں کے لئے ہے، نہیں، ہرگز نہیں، پھر حدیث سے یہ تو ثابت ہوتا ہے، کہ جہاد بہترین عمل ہے، لیکن یہ کہاں ثابت ہوتا ہے، کہ حج جہاد سے بہتر ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے، کہ حج بھی ایک قسم کا جہاد ہے، اور عورتوں کے لئے یہی جہاد بہترین ہے۔

غلط فہمی "کسی نے حضور سے پوچھا، کہ بہترین عمل کون سا ہے، فرمایا، خدا ورسول پر ایمان، اس کے بعد جہاد، اور اس کے بعد حج"

اوپر والی حدیث کے مطابق بہتر عمل حج تھا، اور اس کے بعد جہاد، اس حدیث کے مطابق حج سے جہاد بہتر ہے" (دو اسلام صفحہ ۲۵۷)

ازالہ اوپر والی حدیث کا ترجمہ آپ سے غلط ہو گیا تھا، اس لئے آپ کو یہاں بھی الجھن پیش آئی، اس حدیث میں عورتوں کے لئے حج کو بہتر بتایا گیا، اور اس حدیث میں حکم عام ہے یعنی مردوں کے لئے جہاد حج سے افضل ہے

غلط فہمی "قرآن لاکھ چلائے، کہ ہم جہاد کے بغیر جنت نہیں دیں گے ... لیکن حدیث کہتی ہے، کہ اللہ نمازی اور روزہ دار کو بہشت میں بھیجنے پر مجبور ہے" (دو اسلام صفحہ ۲۵۸)

ازالہ قرآن تو صرف "ربنا اللہ" کا ورد کرنے پر جنت کی بشارت دیتا ہے، جنت میں لے جانے والی عملوں کی طویل فہرست بیان کرتا ہے، اور مکرر سہ کرر بیان کرتا ہے، لیکن کہیں جہاد کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ بغیر جہاد کے جنت ہی میں نہیں، بلکہ جنت الفردوس میں داخل کر دیتا ہے۔

نمازی اور روزہ دار کے لئے جو الفاظ حدیث میں آئے ہیں، وہ یہ ہیں:۔

کان حقا علی اللہ ان یدخلہ الجنۃ   اللہ پر حق ہے کہ وہ ان کو جنت میں داخل کرے

برق صاحب نے "کان حقا علی اللہ" کے یہ معنی کئے ہیں، کہ اللہ تعالے مجبور ہے، سنئے اللہ تعالے قرآن میں فرماتا ہے:۔

کان حقا علینا نصر المؤمنین (الروم) ہم پر مومنین کی مدد کرنا حق ہے

برق صاحب! آپ کے لحاظ سے تو آیت کے معنی یہ ہوئے، کہ اللہ تعالیٰ مومنین کی مدد کرنے کے لئے مجبور ہے۔ کہیئے کیا قرآن پر بھی یہ اعتراض ہوگا، اگر نہیں تو حدیث نے کیا قصور کیا ہے، بات دراصل یہ ہے، کہ اللہ تعالےٰ نے بعض اعمال کی ادائے گی پر جنت کا وعدہ کیا ہے، اور کیونکہ وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا، لہٰذا اس کے لئے وعدہ پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ کہئے اب وہ وعدہ پورا کرے یا نہیں، اگر کرتا ہے، تو گویا بقول آپکے مجبور ہے، اگر نہیں کرتا، تو وعدہ خلافی ہوتی ہے۔

غلط فہمی "ایک حدیث ملاحظہ ہو:۔

"کیا میں تمہیں بتاؤں، کہ سب سے بہتر عمل کون سا ہے، ایسا عمل جو تمہارے درجوں کو بلند کرے، جو سونے چاندی کی قربانی سے بہتر ہو، اور اس جہاد سے بھی اچھا ہو جس میں تم دوسروں کی گردنیں کاٹتے اور اپنی کٹاتے ہو، لوگوں نے کہا بتائیے، کہا اللہ کا ذکر"

سب سے زیادہ اللہ کا ذکر ایک بھکاری کرتا ہے، جو ایک ایک سانس میں دس دس مرتبہ اللہ کا نام لے کر بھیک مانگتا ہے، تو گویا اس حدیث کی رو سے بھکاری بہشت کے ٹھیکیدار اور سردار ہوں گے، اور ہم تم سب ان کی خدمت گار" (دو اسلام ص ۲۵۸-۲۵۹)

ازالہ برق صاحب اس حدیث کا جواب باب اول میں دیا جا چکا ہے، یہاں آپ نے اسے دوبارہ نقل کر دیا ہے، اور قرآنی آیات سے ثابت کیا گیا ہے، کہ کہیں تو دخول جنت صرف "ربنا اللہ" کے ورد پر مل جاتی ہے، اور کہیں اور اعمال کی ادائیگی پر جن میں جہاد کا ذکر نہیں، کہیئے ایک بھکاری جو صبح سے لے کر شام تک "ربنا اللہ" کا نعرہ لگائے وہ جنتی ہے؟ اگر ہے، تو پھر کیا قرآن پر بھی وہی اعتراض ہوگا جو حدیث پر ہے؟ درحقیقت یہ اعتراض ہی غلط فہمی پر مبنی ہے، تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو۔

غلط فہمی "یہ نہ سمجھئے، کہ فضیلت جہاد پر حضور کا کوئی قول موجود ہی نہیں، بہتیرے ہیں، لیکن ہمارے واعظین اور دینی راہنما انہیں چھپائے رکھتے ہیں (دو اسلام ص ۲۵۹)

ازالہ برق صاحب جو چھپاتے ہیں، وہ قابل مواخذہ ہیں، لیکن داد دیجیئے محدثین کو کہ انہوں نے جہاد کی فضیلت میں بے شمار احادیث اپنی کتابوں کی زینت بنا دیں، اور ان کو ملا کی طرح چھپایا نہیں، اور یہی وہ احادیث ہیں، جن کو فخر کے ساتھ آپ نے ص ۲۶۰ اور ص ۲۶۱ پر نقل فرمایا ہے۔

غلط فہمی "متقین کا مصدر ہے تقویٰ، جس کے معنی ہیں حفاظت، بچاؤ، ڈیفنس، یعنی متقی وہ لوگ ہیں جن کا ڈیفنس مضبوط ہو، جن کی سرحدیں مستحکم ہوں، جو مہیب عسکری طاقت کے مالک ہوں،

اور جن کا کردار اتنا بلند ہو کہ ان پر کسی قسم کا حملہ نہ کیا جا سکے" (دو اسلام ص ۲۶۲)

ازالہ برق صاحب ہو سکتا ہے کہ متقی کی تعریف میں یہ اوصاف بھی شامل ہوں، بہرحال ذرا مندرجہ ذیل آیت بھی ملاحظہ فرمالیں جس میں متقین کے کچھ اوصاف اللہ تعالےٰ نے بیان فرمائے ہیں، اور وہ آپ کے قیاسی اوصاف سے بہت زیادہ مستند ہیں۔

سَابِقُوا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَکَرُوا اللّٰهَ۔ (اٰل عمران)

اپنے رب کی مغفرت کی طرف سبقت کرو اور اس جنت کی طرف بھی جس کا عرض آسمان وزمین کی وسعت کے برابر ہے، وہ جنت متقی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے، یعنی وہ لوگ جو خوش حالی اور تنگ حالی ہر حالت میں خرچ کرتے ہیں، اور جو غصہ کو پی جاتے ہیں، اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے، اور وہ لوگ جو فحش کام کرنے کے بعد یا اور کوئی گناہ عظیم کرنے کے بعد اللہ تعالےٰ کا ذکر تے ہیں۔

خلاصہ باب کسی آیت میں کسی نیک عمل کا ذکر ہے، اور کسی آیت میں کسی کا، ان تمام آیات سے اعمال کی فہرست تیار ہوتی ہے، وہ اسلام ہے، بالکل اسی طرح کسی حدیث میں کسی عمل کی نفضیلت مذکور ہے، اور کسی میں کسی عمل کی، موقع اور محل کے لحاظ سے کہیں کسی کا ذکر ہے اور کہیں کسی کی اہمیت، ان تمام احادیث سے جو اعمال کی فہرست تیار ہوگی، وہ ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے، کسی ایک آیت یا کسی ایک حدیث کو مورد طعن ٹھہرانا یا صرف اسی آیت یا حدیث کے عمل پر تکیہ کر لینا کسی عالم کا قول ہے نہ فعل، اگر کسی ملا نے ایسا کہا ہے یا کیا ہے، تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے جس حدیث میں ذکر کو جہاد سے افضل کہا گیا ہے، وہاں ذکر میں وہ چیز بھی شامل ہے جس کو آپ کی اصطلاح میں "اللہ کا پروپیگنڈا" کہتے ہیں، یعنی توحید کی اشاعت، اللہ کی حاکمیت کا پرچار، قوانین الٰہیہ کی تبلیغ، اور جب یہ چیزیں بھی ذکر اللہ میں شامل ہوں، تو یقیناً وہ جہاد سے افضل ہے، کیونکہ جہاد تبلیغ کے بعد آیا کرتا ہے، اگر تبلیغ نہ ہو، تو جہاد کالعدم ہوگا، پھر جہاد میں جو تکلیف پہنچتی ہے، وہ بہت کم عرصہ کے لئے ہوتی ہے لیکن تبلیغ میں جو مصائب اور تکالیف جھیلنی پڑتی ہیں، وہ جہاد کی تکالیف

سے کہیں زیادہ ہیں، ایک آدمی ہوتا ہے اور سب اس کے مخالف، حکومت کے مظالم کا نشانہ صرف وہی ایک آدمی ہوتا ہے، نہ اس کے پاس دفاع ہوتا ہے، نہ قوت، کہ وہ حکومت اور عوام کا مقابلہ کر سکے، وہ بالکل مجبور ہوتا ہے، اور خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کرتا ہے، یہ ہے اللہ کا ذکر! کہاں جہاد اور کہاں یہ؟

(تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو)

باب - ۱۲

"اللہ کی عادت"

غلط فہمی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس بری حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا جواب صرف ایک ہے، کہ ملا اور اس کا حدیثی اسلام" (دو اسلام ص۲۶۶)

ازالہ بالکل غلط ہے، مسلمانوں کے زوال کا سبب حدیث نہیں، بلکہ قرآن و حدیث کو غلط سمجھنا اس کا سبب ہے، قرآن و حدیث پر عمل نہ کرنا اس کا سبب ہے، جتنی تحریکیں اب تک مسلمانوں میں مسلمانوں کی اصلاح کے لئے اٹھیں، ان سب کا دستور العمل حدیث تھی، لیکن باوجود اس کے ان تحریکوں کی تاریخ جہاد فی سبیل اللہ سے لبریز ہے، ہندوستان کی اصلاحی تحریک بہت مشہور ہے، آپ کا اصطلاحی ملا تو بے شک اس تحریک کو بدنام کرتا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ تحریک کے مقاصد کیا تھے اور علمبرداران تحریک کے اعمال کیا تھے، تاریخ گواہ ہے کہ اس تحریک کے علمبرداروں نے طاغوتی قوتوں کے خلاف جہاد کیا، اور نام نہاد مسلمانوں کی غداری کے نتیجہ میں داد شجاعت دیتے ہوئے بالاکوٹ کے میدان میں جام شہادت نوش فرمایا، یہ تحریک دہلی، بہار، صوبہ سرحد بلکہ پورے ہندوستان سے مجبوراً منتقل ہو کر پہاڑی علاقہ میں فروکش ہوئی، اور ۱۹۴۷ء تک کسی نہ کسی طرح انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہی، تحریک کے علمبرداروں پر جو مصائب و آزمائش کے پہاڑ ٹوٹے تاریخ کے اوراق اس کے گواہ ہیں، پھانسیاں بھی ہوئیں، کالے پانی بھی بھیجے گئے، اور نہ معلوم کیا کیا ہوا، یہ سب کچھ انگریزی حکومت اور نام نہاد مسلمان یا ملا کے ہاتھوں سے ہوا، افسوس کہ نام نہاد مسلمانوں نے پھر دھوکہ دے کر اس تحریک کو ختم کرا دیا، اور پہاڑی علاقہ سے ان کو پاکستان بلا کر تحریک کو موت کی نیند سلا دیا، لیکن اس تحریک کی صدائے بازگشت اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے، اس روحانی شعل کی چنگاریاں اب بھی سینوں میں سلگ رہی ہیں، کاش یہ چنگاریاں پھر روحانی مشعل بن کر دین و قوم کی خدمت کریں، مگر برق صاحب یاد رکھئے آپ سارا زور جہاد پر صرف کرتے ہیں، عبارت آرائی اور رنگین بیانی سے مضمون جہاد کو بڑے خوش نما انداز میں پیش کرتے ہیں، یہ صرف عبارت کی رنگینی ہوتی ہے جو قاری کو مرعوب کر دیتی ہے، اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسلام جہاد ہی کا دوسرا نام ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے، کہ جہاد مقصد اصلی نہیں، بلکہ مقصد کے حصول اور بقاء کا ایک ذریعہ ہے اگر یہ مقصد بغیر جہاد ہی کے حاصل ہو جائے، تو آخر پھر جہاد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اگر کوئی شخص ایسا ہو، کہ جسے جہاد کرنے کی نوبت ہی نہ آئے، خواہ وہ کہیں کا بھی رہنے والا ہو جنتی ہے، اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس کو آپ نے ص ۲۵۸ پر صحیح بخاری کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے ذرا غور فرمائیے، آپ کا مقصد تھا حصول پاکستان، کیا آپ نے اس کے لئے کوئی جنگ لڑی، ظاہر ہے کہ نہیں لڑی، بلکہ دوسرے ذرائع سے پاکستان حاصل ہو گیا، تو بتائیے یہ کامیابی ہے یا نہیں؟ یا کامیابی جب ہی ہوتی، کہ مخالفین پاکستان سے میدان کارزار میں لڑ کر پاکستان حاصل کیا جاتا؟ اسی طرح دین کے معاملہ میں اصلی مقصد اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور اس کا واحد آلہ وحاکم ہونے کا عقیدہ منوانا ہے اور اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون کی خلاف ورزی کا انسداد کرنا ہے، اگر اس کے لئے جنگ کی ضرورت پیش آئے، تو جنگ بھی کی جا سکتی ہے، اور اگر جنگ کے بغیر یہ چیز حاصل ہو جائے، تو فہو المراد، جنگ کرنا اسلام کا اصلی مقصد نہیں، بلکہ مسلمان بحالت مجبوری جنگ کرتا ہے، ارشاد باری ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا (حج)	مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس لئے دی جاتی ہے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ (البقرۃ)	اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا (النساء)	اور تم کیوں جنگ نہیں کرتے، حالانکہ کمزور مسلمان مرد، عورت اور بچے جو ظالموں کے شکنجہ میں گرفتار ہیں، یہ دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نجات دے، جس کے رہنے والے ظالم ہیں۔

برقی صاحب یہ ہیں، وہ حالات جن میں ایک مسلم تلوار اٹھاتا ہے، آپ چاہتے ہیں کہ وہ کچھ اور کرے ہی نہیں، بس لڑتا ہی پھرے، گویا لڑنا ہی اصلی مقصد ہے، برقی صاحب اس تیسری آیت کو ذرا پھر پڑھیئے، اور غور سے پڑھیئے، اس میں کمزور مسلمانوں کی دعا ہے، بتائیے یہ دعا قبول ہوتی

تھی یا نہیں، اگر ہوئی تھی، اور ضرور ہوئی تھی، تو ماننا پڑے گا، کہ دعا بھی کوئی اہم چیز ہے، اور محض دعا سے بھی کام بن جایا کرتے ہیں، ان کمزور مسلمانوں نے سوائے دعا کے اور کچھ نہیں کیا، اور اللہ نے انہیں نجات دلوادی، دعا ہی وہ چیز ہے، کہ جہاں اور تمام وسائل مفقود ہوں، وہاں وہی کام آتی ہے، بلکہ یہ تو ایسی چیز ہے، کہ اس کی ضرورت وسائل کی موجودگی میں بھی ضروری ہے، اور وسائل کے فقدان کی حالت میں بھی ضروری ہے، مسلمانوں نے میدان جنگ میں بھی دعا کی ہے، اور یہ دعا قرآن مجید میں منقول ہے

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ (البقرہ) اے اللہ ہم کو کافروں کے مقابلہ میں نصرت عطا فرما

دعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دیتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں، کہ وسائل کی تلاش نہ کی جائے، وسائل کی تلاش بھی ضروری ہے، اور دعا بھی ضروری ہے، آپ بلا وجہ دعا کے مخالف ہو گئے، یہ ہے دعا کی حقیقت جو نہ صرف حدیث بلکہ قرآن سے بھی ثابت ہے، آپ دعا کے اصلی منشار سے اعراض کر کے اس کو ملا کے سر تھوپ رہے ہیں، جدوجہد کو چھوڑ کر دعا پر تکیہ کرنا یہ ملا کا شعار سہی، اور بے شک یہ برا ہے لیکن مطلق دعا کا انکار، قرآن مجید کا انکار ہے کیونکہ قرآن دعاؤں سے مملو ہے۔

برق صاحب ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں، اور قدیم زمانہ سے موجود رہے ہیں، جو عدم تشدد کے حامل ہیں، جو جنگ و حرب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور بغیر جنگ کے انہوں نے تبلیغ کی، ان کی اس تبلیغ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ چین و جاپان تک متاثر ہوئے، اور ان کے مذہب کے ماننے والے آج بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، یہ کس طرح پھیلے، کس طرح ان کی حکومتیں قائم ہوئیں؟ یہ کون سی جنگ لڑے؟ کیا انہوں نے مقصد کو حاصل کیا یا نہیں؟ اگر کیا، اور ضرور کیا، تو آخر مقصد کے حصول کے بعد ذریعہ کی کیا اہمیت ہے؟ برق صاحب ذریعہ کو مقصد نہ بنائیے، یہ لوگ جو عدم تشدد کے حامی ہیں، اگر چاہیں تو ایسی ہی عبارت آرائی اور رنگینی مضامین سے جنگ و جہاد کے پرخچے اڑا سکتے ہیں، اور اپنے پڑھنے والوں کو محض مسجع و مقفی عبارت سے مرعوب کر کے جہاد سے متنفر کر سکتے ہیں، لیکن حقیقت عبارت آرائی میں نہیں ہوتی نہ جہاد بے حقیقت چیز ہے نہ جہاد ہی سب کچھ ہے، مثال کے لئے سنیئے ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب کا مصنف قرآنی آیت پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"قرآن کا خدا اور پیغمبر دونوں جنگجو تھے، جو لڑائی کا حکم دیتا ہے، وہ امن میں خلل انداز ہوتا ہے

رہائی تو اور حرم کی لڑائی سے خوف کرنے سے ہوتی ہے" (ستھیارتھ پرکاش باب ۷ صفحہ ۲۰۷)

ایک اور جگہ لکھتا ہے:۔

"یہ تحریر محمد صاحب نے اس مطلب سے کی ہو گی، کہ لڑائی میں نہ بھاگے، اور اپنی فتح ہو، اور مرنے سے کوئی نہ ڈرے، اپنا اقبال بڑھے، اور مذہب پھیلے" (صفحہ ۷۶)

برق صاحب دیکھا آپ نے یہ کس طرح قرآنی جہاد کا مضحکہ اڑا رہا ہے، اور یہ تو آریہ مذہب کی کتاب کا حال ہے، جو عدم تشدد کے قائل نہیں، اگر آپ بدھ مذہب اور جینی مذہب کے ماننے والوں کی کتابوں کو پڑھیں تو معلوم ہو گا کہ وہ اس جنگ کو سب سے زیادہ برا عمل سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ اس جہاد کا مذاق ہمارے زمانہ کے بہت بڑے سیاسی لیڈر گاندھی جی بھی اڑایا ہے، برق صاحب یہ ہے افراط تفریط یہ جہاد کو لغو فعل سمجھتے ہیں، اور آپ جہاد ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ ہو، جہاں مسلمانوں کے زوال اور اس کے اسباب پر قرآن سے استشہاد کیا گیا ہے۔

غلط فہمی

"دنیائے اسلام میں لاکھوں مساجد، ان میں لاکھوں ملا، اور ہر ملا صبح و شام مسلمانوں کو مندرجہ ذیل اسباق دے رہا ہے" (دو اسلام صفحہ ۲۶۶)

ازالہ

اس عبارت کے بعد برق صاحب نے اسباق درج کئے ہیں، ہم یہ اسباق ذیل میں درج کر رہے ہیں، اور ہر سبق کا جواب بھی ساتھ ساتھ دے رہے ہیں:۔

(۱) کہ صرف تم اللہ کے محبوب ہو، یہ امت بخشی بخشائی ہے" (دو اسلام صفحہ ۲۶۶)

جواب:۔ کسی عالم نے ایسا نہیں کہا۔

(۲) کہ ..... یہ دنیا مردار ہے، جس کے طالب کتے ہیں" (دو اسلام صفحہ ۲۶۶)

جواب:۔ اس کا مفصل و مدلل جواب تمہید میں ملاحظہ فرمائیں

(۳) کہ المؤمن لا ینجس. مومن جسم پہ کتنی ہی غلاظت مل لے وہ ناپاک نہیں ہوتا" (دو اسلام صفحہ ۲۶۶)

جواب:۔ اس عربی عبارت کا اگر یہی مفہوم ہے، جو آپ نے ترجمہ میں نقل کیا ہے تو اس سے مراد "روحانی غلاظت" ہے اور اگر آپ کو ایک حدیث پر اعتراض ہے، جس میں یہ جملہ وارد ہوا ہے، تو سنیئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ إِنَّهُمْ رِجْسٌ وَمَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ	جب تم واپس مدینہ منورہ پہنچو گے، تو منافق اللہ کی قسم کھا کر اپنے عذر پیش کریں گے، تاکہ آپ ان سے صرف نظر کریں، پس آپ ان سے صرف نظر

جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (التوبۃ) ہی کیجیے، بے شک وہ لوگ ناپاک ہیں، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، یہ ان کے اعمال کی سزا ہے۔

کہیے منافق اگرچہ کتنا ہی صابن سے نہلائیے ناپاک ہی رہے گا؟

(۲) يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ (التوبۃ) اے ایمان والو! بات درحقیقت یہ ہے کہ مشرک نجس و ناپاک ہیں

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ مومن نجس نہیں ہوتا، اور یہی حدیث کا مطلب ہے۔

(۳) وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (التوبۃ) اور جن لوگوں کے دل میں مرض ہے، اللہ نے ان کی گندگی پر اور گندگی کا اضافہ کر دیا، اور وہ کفر کی حالت میں مریں گے

(۴) وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (یونس) اور اللہ تعالیٰ گندگی، ان لوگوں کے حصہ میں کر دیتا ہے، جو عقل نہیں رکھتے۔

برق صاحب! یہ کونسی گندگی ہے؟ یہی وہ گندگی ہے، جو مومن میں کبھی نہیں ہوتی، یہی وہ روحانی گندگی ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے، اب تو غالباً حدیث کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا، حدیث کا مطلب حدیث والوں سے پوچھیے، نقلی موشگافیاں کرنے والے یہ عقل ملّا اس کا مطلب کیا جانیں۔

(۴) "کہ صرف کلمہ پڑھنے سے بہشت مل جاتی ہے" (دو اسلام ص۲۶۶)

جواب:- برق صاحب ایسا کہتا تو کوئی نہیں، اور جو کہتا ہے، وہ اس کا ذمہ وار ہے، یہ ضرور ہے کہ بعض احادیث سے بظاہر ایسا مطلب نکلتا ہے، اور غلط فہمی سے بعض لوگ اس کا دعوی کر بیٹھتے ہیں کہ صرف کلمہ پڑھنے سے جنت مل جاتی ہے، اور یہی غلط فہمی آپ کو بھی ہوئی

اچھا برق صاحب اب حدیث کا مطلب سنیے، فرض کیجیے، دو شخص ہیں ایک حکومت کا باغی ہے ملک میں فساد برپا کرتا ہے، فتنے اٹھاتا ہے، حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرتا ہے، آخر گرفتار ہوتا ہے کہیے اس کے ساتھ حکومت کا کیا سلوک ہوگا، کیا اس کے لئے کوئی دائمی سزا نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی، دوسرا شخص حکومت کا وفادار ہے، غداری نہیں کرتا، اتفاقاً اس سے کوئی جرم ہو جاتا ہے، جرم کرتے وقت اس کی نیت سرکشی کی نہیں ہوتی، بلکہ نادانی اور جہالت ایسی طاری ہوتی ہے، کہ وہ مدہوش ہو جاتا ہے اور جرم کر بیٹھتا ہے، پھر یہ بھی گرفتار ہوتا ہے کہیے کیا حکومت اس کو ویسی ہی سزا دے گی جیسے پہلے شخص کو دی ہے، کیا اس کی سزا دائمی ہوگی نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ حکومت اس کو سزا دے کر پھر رہا کر دے گی آخر

ان دونوں میں امتیاز پیدا کرنے والی کیا چیز ہے؟ پہلا وفاداری کا عہد نہیں کرتا، دوسرا دل سے وفاداری کا عہد کرتا ہے، غداری کی سزا دائمی سزا ہے، وفاداری کے جذبہ کے ساتھ کسی جرم کی سزا دائمی نہیں، یہی بات ہے، جو شخص دل سے کلمہ پڑھ کر اتفاقی گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے، تو اس کا جرم اتنا وزنی نہیں کہ ابدالآباد تک جہنم میں رہنے والوں کے ساتھ وہ بھی ہمیشہ کے لئے دوزخ میں بند کر دیا جائے، اور یہی مطلب ہے، اس حدیث کا جس کو غلط فہمی کی وجہ سے برقی صاحب قسم ص ۲۷۴ ، ۲۷۵ پر اعتراضاً نقل کیا ہے، اور وہ حدیث یہ ہے:۔

"حضرت ابوذر کہتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ میں آنحضرت کے پاس گیا۔ آپ نے فرمایا

ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم	جب کوئی شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے اور اس کی موت
مات علی ذلک الا دخل الجنۃ[۱]	اسی عقیدہ پر ہوتی ہے تو وہ جنت میں چلا جاتا ہے

میں نے پوچھا، اگر وہ زانی اور چور ہو، فرمایا پھر بھی جنت میں جائے گا"

مذکورہ بالا توضیح کے بعد آپ نے اس حدیث کا مطلب سمجھ لیا ہوگا، اس حدیث کا مطلب وہ نہیں، جو بطور خلاصہ آپ نے تحریر فرمایا ہے یعنی "کلمہ پڑھتا جائے، اور زنا اور سرقہ کے مزے بھی لوٹتا جائے، سیدھا جنت میں جائے گا" (دو اسلام ص ۲۷۵)

آپ کے خلاصہ سے سرکشی اور بغاوت ٹپکتی ہے، اور سرکشی و بغاوت کی نیت سے اگر گناہ کیا جائے، تو وہ معاف نہیں ہوتا، ہاں ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہے، اس کے احکام کا وفادار رہے، اور پھر کبھی اتفاقی گناہ ہو جائے تو یہ شخص اس عہد وفاداری کی وجہ سے قابل درگذر ہے، اور کبھی نہ کبھی اپنے جرم کی سزا بھگت کر جنت میں چلا جائے گا، اس حدیث کا خلاصہ یہی ہے، کہ وہ عہد وفاداری (یعنی کلمہ شہادت) کبھی نہ کبھی اس کو جنت میں پہنچا کر رہے گا، خواہ سزا کے بعد یا بغیر سزا کے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جرم کو معاف بھی کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ	بیشک اللہ شرک کو نہیں بخشے گا، اس کے علاوہ
مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء)	اور گناہوں کو بخشدے گا جس کے لئے چاہے گا۔

اس آیت کی روشنی میں حدیث کا مطلب سمجھنے کی کوشش کیجیے، حدیث کو نہ سمجھنے سے ساری خرابی پیدا ہوتی ہے، یہی وجہ ہے، کہ عام لوگوں کے سامنے اس قسم کی احادیث بیان کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے، مبادا وہ غلط مطلب سمجھ کر صرف کلمہ پر بھروسہ کرلیں مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ بس شرک معاف نہیں ہوگا، اور باقی گناہ تو انشاء اللہ

[۱] مشکوٰۃ

معاف ہو ہی جائیں گے، خوب گناہ کرتا پھرے، تو بتایئے اس میں آیت کا کیا قصور ہے، قصور تو اس کی سمجھ کا ہے، آیت میں صرف دوسرے گناہوں کی معافی کا امکان تو ضرور ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں اسی طرح حدیث میں کلمہ شہادت پڑھ لینے کے بعد دخول جنت کا امکان ہے، سزا کے معاف ہو جانے کی صورت میں یا سزا کی مدت ختم ہو جانے کے بعد، لیکن جو شخص کلمہ ہی نہیں پڑھتا، یعنی اللہ تعالےٰ کی حاکمیت ہی تسلیم نہیں کرتا، یا کلمہ پڑھ کر غداری کرتا ہے، یا اللہ کی حاکمیت کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اس حاکمیت میں شریک کرتا ہے، تو یہ صورتیں ایسی ہیں، کہ ان کی موجودگی میں جنت میں جانے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا، آیت اور حدیث کا خلاصہ مطلب یہ ہے، کہ شرک کی موجودگی اور وفاداری کے عہد کے فقدان کی صورت میں دخول جنت ناممکن ہے، اور توحید خالص اور وفاداری کے عہد کی موجودگی میں گنہگار کا جنت میں جانا ممکن ہے، معافی کے بعد یا سزا بھگتنے کے بعد، اب اس حدیث کی تائید مزید میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سنیئے :۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ	بے شک جن لوگوں نے کہا "ربنا اللہ" پھر اسی پر
اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ	جمے رہے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، جو ان
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ	سے کہتے ہیں کہ بے خوف ہو جاؤ، غمگین نہ ہو اور
(حم سجدہ ۴)	جنت کی بشارت سنو۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ صرف "ربنا اللہ" کہنے، اور اسی پر جمے رہنے سے جنت مل جاتی ہے اور یہی حدیث کا مطلب ہے، کہ صرف کلمہ پڑھنے اور اس پر جمے رہنے سے جنت مل جاتی ہے اگر آیت میں کچھ شرطیں محذوف ہیں، تو وہی حدیث میں بھی ہوں گی، اور اگر نہیں، تو پھر جو اعتراض حدیث پر ہے، وہی قرآن پر ہوگا، اور اگر قرآن پر اعتراض نہیں، تو حدیث پر بھی نہ ہوگا۔

(۵) "فقہ و حدیث کے بغیر باقی تمام علوم ناپاک ہیں، سائنس گناہ اور کائنات میں غور کرنا کفر ہے" (دو اسلام ص ۲۶۶ ص ۲۶۷)

جواب :۔ یہ کسی ملا ہی نے کہا ہوگا، علماء ایسا کوئی نہیں کہتا

(۶) "دنیا کا سب سے بڑا عمل رات کے وقت کے دو نفل ہیں رکعتین فی جوف اللیل خیر من الدنیا وما فیہا (رات کے وقت کے دو نفل دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں" (دو اسلام ص ۲۶۷)

جواب :۔ حدیث میں ان نفلوں کو دنیا و مافیہا سے بہتر فرمایا گیا ہے، یہ نہیں کہ اس سے بڑا کوئی عمل ہی نہیں، بہت سے اعمال ایسے ہیں، جو دنیا و مافیہا سے بہت بہتر ہیں، برقی صاحب نے جو تفصیل

کل کا صیغہ استعمال کیا ہے، یہ غلط فہمی کا نتیجہ ہے، یہاں اعمال کی تفضیل کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ ان دونوں نفلوں کا مقابلہ دنیا ومافیہا سے کیا گیا ہے، مطلب یہ کہ ان کا ثواب اتنا زیادہ ہے، کہ ان کے سامنے دنیا ومافیہا ہیچ ہیں۔

(۷) ہر تھوخیرا خواہ وہ چنگیز ہو یا ہٹلر اگر ہم پر حکومت کر رہا ہے، تو وہ ہمارا اولی الامر ہے، اور اس کی اطاعت ہم پر فرض ہے" (دو اسلام ص۲۶۷)

جواب:۔ کسی ملا نے کہا ہوگا، کوئی عالم ایسا نہیں کہتا۔

(۸) "خرقہ دنیا کا بہترین لباس ہے .... (حدیث) تم پشم کا لباس پہنا کرو، کہ ایمان کی لذت اسی میں ہے" (دو اسلام ص۲۶۷)

جواب:۔ یہ بھی کسی ملا کی گھڑت ہے، کسی عالم نے اس موضوع حدیث کو تسلیم نہیں کیا۔

(۹) "فلاں دعا ایک لاکھ حج اور لاکھ شہیدوں کا ثواب دلاتی ہے" (دو اسلام ص۲۶۷)

(۱۰) "مرشد پکڑے بغیر نجات ناممکن ہے" (دو اسلام ص۲۶۷)

(۱۱) "اللہ نے تمام اختیارات فلاں مردے کے حوالے کر دیئے ہیں" (دو اسلام ص۲۶۷)

جواب:۔ یہ سب کسی ملا کی گھڑت ہے، کسی عالم نے ایسا نہیں کہا۔

غلط فہمی "حصول علم صحیح حدیث کی رو سے کسی اجر کا مستحق ہی نہیں" (دو اسلام ص۲۶۸)

ازالہ ایسی کوئی حدیث نہیں ہے، نہ برق صاحب نے اس حدیث کو نقل فرمایا۔

غلط فہمی "ہر مرض، ہر افتاد اور ہر حادثہ کا علاج دعا سے کیا جاتا رہا" (دو اسلام ص۲۶۸)

ازالہ مطلق دعا کا انکار، قرآن مجید کا انکار ہے، تفصیل کے لئے اسی باب کے گذشتہ صفحات ۳۴۸/۳۴۹ ملاحظہ فرمایئے۔

غلط فہمی "غور کرو، کہ دنیا میں ہماری کیسی کیسی سلطنتیں قائم ہوئیں، وہ امیہ جو سندھ کے ریگستانوں سے فرانس تک چھائے ہوئے تھے، وہ عباسیہ جن کی ہیبت سے ایک عالم لرزتا تھا .... وہ تیموری جن کی بجلیاں دہلی پہ چمکتیں، تو قسطنطنیہ پر جا گرتی تھیں .... " (دو اسلام ص۲۶۹)

ازالہ برق صاحب جن لوگوں کا ذکر بڑے طمطراق سے آپ نے کیا ہے، یہ سب لوگ انہی احادیث کے متوالے تھے، لیکن بایں ہمہ وہ تخت وتاج کے مالک تھے، ہاں جب یہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے احادیث کی روح سے ناواقف ہو گئے، اور بقول آپ کے عیاش ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی داستان عظمت وحشمت کو افسانہ بنا دیا، کہئے اس میں حدیث کا کیا قصور ہے، اصلی حدیث والے

تو حکومت کرتے رہے

غلط فہمی حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں، کہ میں رسول اللہ صلعم کے ہمراہ ایک ہی سواری پر سوار تھا، آپ نے فرمایا، کہ جو شخص منہ سے لا الٰہ الا اللہ کہے گا اس پر جہنم کو حرام کر دیا جائے گا معاذ نے پوچھا کیا میں سب کو یہ بشارت سنا دوں، فرمایا، کہ لوگ اس پر اعتماد کر کے سست ہو جائیں گے، چنانچہ معاذ نے مرتے وقت یہ حدیث ظاہر کی (مسلم جلد ا ص۲۰۵)

معاذ نے تو مرتے وقت یہ حدیث ظاہر کی، اور اس لئے اس زمانہ کے لوگ اس سستی اور کاہلی سے بچ گئے جس کا خطرہ حضور نے فرمایا تھا، لیکن اب ہم کیا کریں، یہ حدیث گذشتہ ساڑھے تیرہ سو برس سے ہمارے سامنے ہے کروڑوں مسلمانوں کو کاہل بنا چکی ہے، اور قیامت تک بناتی جائیگی کیا ہمارے علماء اس مرض کا علاج سوچیں گے" (دو اسلام ص۲۷۲)

ازالہ برق صاحب اس زمانہ کے لوگ تو اس لئے سستی سے بچ گئے، کہ وہ اس حدیث سے ناواقف تھے لیکن کیا حضرت معاذ بھی سستی سے بچے تھے یا نہیں اگر بچے تھے، تو پھر دوسرے بھی بچ سکتے ہیں، بشرطیکہ حدیث کا مطلب وہ بالکل اسی طرح سمجھتے ہوں جس طرح حضرت معاذ سمجھتے تھے، اور غلط مطلب نہ سمجھ بیٹھیں، اسی غلط فہمی کے انسداد کے لئے تو اس حدیث کی اشاعت عام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا تھا یعنی حدیث کا اصلی مطلب تو سستی اور کاہلی پیدا کرنے کا سبب نہیں تھا، ہاں وہ غلط فہمی اس سستی اور کاہلی کا سبب بن سکتی تھی، برق صاحب، پھر آپ نے یہ بھی سوچا کہ حضرت معاذ کی وفات کے بعد سے صدہا سال تک مسلمانوں کی شوکت وحشمت کا ڈنکا بجتا رہا اس کی کیا وجہ ہے، کیا یہ لوگ بھی اس حدیث سے ناواقف تھے، نہیں بلکہ یہ لوگ بھی حضرت معاذ کی طرح حدیث کے اصلی مطلب سے واقف تھے، باقی جواب کے لئے اسی باب میں اوپر لکھا جا چکا ہے نمبر ۴ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

انتباہ برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا، حدیث زیر بحث میں منہ سے "لا الٰہ الا اللہ" کہنے کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ دل کی گواہی کا ذکر ہے، اور صحیح مسلم کی دوسری روایتوں میں اس کی تصریح بھی ہے پھر برق صاحب نے عبادہ بن صامت رض اور معاذ رض کی احادیث کے متون کو بھی گڈمڈ کر دیا ہے حضرت معاذ کی حدیث کا متن بالکل دوسرا ہے برق صاحب نے اسے نقل نہیں فرمایا، بلکہ حضرت عبادہ رض کی حدیث کا متن حضرت معاذ کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے

غلط فہمی "اس حدیث کا مفہوم رسالت اور الوہیت کا زبانی اقرار تھا اور چونکہ زبانی اقرار کی اتنی بڑی

جزا قوم کو بے عمل بنا سکتی تھی، اس لئے آپ نے اس حدیث کو بیان کرنے سے روک دیا تھا" (ص ۲۷۳)

ازالہ حدیث کا اصلی مفہوم یہ نہیں تھا، بلکہ دل سے گواہی دینا تھا، حدیث کے الفاظ ہیں "مَنْ شھد" جس نے گواہی دی، دوسری حدیثوں میں اس کی صراحت موجود ہے، ارشاد ہے۔

یشھدان لا الٰہ الا اللہ مستیقنا بھا قلبہ (صحیح مسلم) یعنی جو شخص "لا الٰہ الا اللہ" کی گواہی دے اور دل سے اس پر یقین کرے۔

پھر دل سے اس پر یقین کر کے گواہی دینے کے تقاضے بھی اس میں شامل تھے، کیونکہ لوگ اس کا مطلب غلط سمجھ کر اعمال چھوڑ دیتے، اس لئے اس کی اشاعت کو روک دیا گیا، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ نہیں تھا، کہ بے عمل آدمی جنت میں جائے گا، اور اگر یہی ہوتا، تو پھر "دنا چہ معنی دارد"، لہٰذا حدیث کا اصلی مطلب کلمہ پڑھ کر کلمہ کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔

غلط فہمی "ہمارے اس استدلال کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے" ایک مرتبہ حضور ایک باغ میں تشریف فرما تھے، کہ آپ کے پاس ابوہریرہؓ جا پہنچے، حضور نے فرمایا، کہ جاؤ جو شخص ملے اسے یہ بشارت دے دو، کہ کلمہ پڑھنے والا داخل جنت ہوگا ..... " (دو اسلام ص ۲۷۳)

ازالہ اس حدیث کے ترجمہ میں جگہ جگہ غلطیاں ہیں، ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا، پھر اس حدیث میں مستیقنا بھا قلبہ یعنی دل سے اس پر یقین ہو کے الفاظ موجود ہیں، لہٰذا یہ حدیث برق صاحب کے استدلال کی تائید نہیں کرتی، بلکہ تردید کرتی ہے مطلب اس حدیث کا بھی وہی ہے، جو اوپر بیان ہوا، اس حدیث پر مفصل بحث باب اول میں ملاحظہ ہو

غلط فہمی "حضرت ابوذر کہتے ہیں، کہ ایک دفعہ میں آنحضرت کے پاس گیا، آپ نے فرمایا ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علی ذلک الا دخل الجنۃ جب کوئی آدمی لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، اور اس کی موت اس عقیدہ پر ہو جاتی ہے، تو وہ جنت میں چلا جاتا ہے الخ" (دو اسلام ص ۲۷۴، ۲۷۵)

ازالہ اس حدیث پر مفصل بحث اسی باب میں ص ۱۷ کی ذیل میں گذر چکی ہے۔

غلط فہمی "ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے، کہ غماز، خائن، زانی، چور، جھوٹی قسمیں کھانے والا اور احسان جتانے والا، اور غرور سے دامن گھسیٹ کر چلنے والا بھی بہشت میں نہیں جائے گا، لیکن دوسری طرف ہمیں بتایا جاتا ہے، کہ اگر چور اور زانی کلمہ پڑھتے رہیں، تو وہ یقیناً بہشت میں جائیں گے" (دو اسلام ص ۲۷۶)

برق صاحب احادیث میں سب کچھ ہے، جرموں کی سزا کا بھی بیان ہے، اور ان کی معافی کا بھی ذکر ہے، اور یہ معافی کب ہو سکتی ہے، اور کس حالت میں ہو سکتی ہے اس کی بھی تفصیل احادیث میں موجود ہے، لہٰذا جب تک تمام احادیث کا علم حاصل نہ ہو کوئی شخص حقیقت تک بآسانی نہیں پہنچ سکتا یہی قرآن مجید کا حال ہے، قرآن مجید کی بعض آیات سے اسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، اس غلط فہمی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ اسلام کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے، اگر ایسا ہو جائے، تو پھر یہ آیات و احادیث غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر سکیں، بعض جرموں کا تعلق اللہ سے ہے بعض کا تعلق اللہ سے بھی ہے اور بندوں سے بھی، اول الذکر میں اگر شرک نہ ہو تو معافی کا امکان ہے بشرطیکہ اللہ سے وفاداری کا عہد دل سے ادا کرتا ہو صرف زبان سے نہیں، اور جب معافی کا امکان ہوا تو پھر دخول جنت کا بھی امکان باقی رہتا ہے، مؤخر الذکر میں جب تک بندہ معاف نہ کرے، نہ معافی کا امکان ہے نہ دخول جنت کا امکان، اور کیونکہ بندے کے معاف کرنے کا امکان بھی ہو سکتا ہے، لہٰذا دخول جنت کا امکان بھی ہو سکتا ہے، خلاصہ یہ ہوا، کہ علاوہ شرک کے کوئی گناہ ایسا نہیں کہ اس کی وجہ سے جنت میں جانا ناممکن ہو جائے، دوسرے گناہ معاف بھی ہو سکتے ہیں، اور ان کی سزا بھی مل سکتی ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر جرم کی سزا برابر ہو، اور اگر شرک کی سزا جو سب سے بڑا اور ناقابل معافی گناہ ہے، ابد الآباد جہنم ہے، تو بالکل ظاہر ہے، کہ دوسرے گناہوں کی سزا ابد الآباد جہنم نہیں ہو گی، اور ان گناہوں کی سزا بھگت کر ایک مسلم جنت میں داخل ہو جائے گا، کسی حدیث کا یہ مطلب نہیں، کہ جرموں کی سزا ہی نہیں ہے، اور ضرور ہے، اور یہی سزائیں آپ کی نقل کردہ احادیث میں موجود ہیں، یہ احادیث ہر جرم کی سزا بیان کرتی ہیں، لیکن نہیں بتاتیں، کہ مجرم سزا پاکر بھی جنت میں جائے گا یا نہیں، دونوں احادیث اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں جرموں کی سزا بھی مقرر ہے، یہ سزا مل بھی سکتی ہے، اور سزا سے پہلے معافی بھی مل سکتی ہے، غرض یہ کہ ہر مجرم و مشرک نہیں، کبھی نہ کبھی یقیناً جنت میں جائے گا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں، کہ ہم گناہ کریں اور یہ سمجھیں، کہ معاف ہو ہی جائے گا، ہو سکتا ہے، کہ ہمارا گمان غلط ہو اور سزا بھگتنی پڑے، اور سزا بھی ایسی کہ الامان والحفیظ، اس سزا کا تصور کرنے کے بعد ہم محض خوش عقیدگی کی بنا پر گناہ کرتے رہیں، تو یہ عقل سے بعید ہے، کوئی صاحب عقل و ہوش ایسا نہیں کرے گا، کہ معافی کی امید موہوم کی وجہ سے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دے، اور خطرہ بھی ایسا کہ اس کے بیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، رہے بے عقل و ناسمجھ لوگ، تو وہی ایسا کر سکتے ہیں لہٰذا ان کے سامنے ان کی عقل سے بالاتر چیز بیان ہی نہیں کرنی چاہیئے، یہی وجہ ہے، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کس و ناکس کے سامنے ان احادیث کو بیان کرنے سے روک دیا ہے

برق صاحب ان احادیث کو غلط فہمی کی وجہ سے وضعی سمجھتے ہیں، حالانکہ مندرجہ ذیل آیات ان احادیث کی تائید کرتی ہیں، کیا انہیں بھی موضوع کہا جا سکتا ہے، اگر تشریح و تاویل سے دوسرا مطلب لیا جائے گا تو پھر وہی مطلب حقیقت میں حدیث کا بھی ہوتا ہے، آپ آیات سنیئے :۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ	بے شک اللہ شرک کے علاوہ ہر گناہ جس کے لئے
مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (النساء)	چاہے گا معاف کر دے گا۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے :۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ	بے شک جن لوگوں نے صرف یہ کہہ دیا کہ ہمارا
اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ	رب اللہ ہے اور پھر اسی پر جمے رہے، تو ان پر
أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا	فرشتے نازل ہوتے ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ
بِالْجَنَّةِ (حم سجدہ)	غمگین ہو، اور جنت کی بشارت سنو۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا، کہ تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں، سوائے شرک کے، رہی توبہ، تو توبہ سے تو دوسرے گناہ کیا، شرک بھی معاف ہو سکتا ہے۔

دوسری آیت سے معلوم ہوا، کہ ربنا اللہ، کہنے والا جنت میں جائے گا، اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا، کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا جنت میں جائے گا" یہ ضرور ہے، کہ ربنا اللہ" کہنے کے بعد بھی چند شرائط ہیں جن کے بغیر صرف ربنا اللہ" قابل قبول نہیں، اور وہ سب اس قول کے تقاضے ہیں، اسی طرح لا الہ الا اللہ کے بھی چند تقاضے ہیں جن کے بغیر صرف لا الہ الا اللہ" مفید نہیں، پھر یہ بھی یاد رہے کہ کلمہ پڑھنے کے بعد بعض صورتیں ایسی بھی آجاتی ہیں، کہ صرف کلمہ ہی کافی ہو جاتا ہے مثلاً کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ کسی فرض کی ادائیگی کا وقت آئے، وہ شہید کر دیا جاتا ہے، یا اتفاقاً اپنی طبعی موت سے مر جاتا ہے، وہ شخص قطعی جنتی ہے، لہذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، کہ جنت کی کنجی کلمہ ہے جس نے اسے پڑھ لیا وہ جنت میں جائے گا۔

باب ۔ ۱۳

لفظ مغفرت کی تحقیق!

غلط فہمی

"مغفرت کا ماخذ غفر ہے، جس کے معنی ہیں چھپانا اور ڈھانکنا، ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہوتا ہے، جو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کوئی گناہ معاف نہیں ہو سکتا ہے، البتہ چھپ سکتا ہے" (دو اسلام ص ۲۷۹)

ازالہ

برق صاحب کسی لفظ کے ایک معنی تو لغوی ہوتے ہیں، اور ایک اصطلاحی، اب یہ کام اہل زبان کا ہے، کہ وہ یہ بتائیں، کہ کہاں وہ کسی لفظ کو اصطلاحی معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور کہاں لغوی معنوں میں، اور جہاں وہ کسی لفظ کو اصطلاحی معنوں میں استعمال کرتے ہیں، وہاں اس لفظ کے لغوی معنی لینا صحیح نہیں، مثلاً

(۱) "میں کیلا کھا رہا ہوں" اس جملہ میں "کھا رہا ہوں" اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن اس جملہ میں کہ

(۲) "میرا سر چکر کھا رہا ہے" "کھا رہا ہے" اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کہ نہ سر کھاتا ہے، نہ "چکر" کوئی مادی چیز ہے، جسے کھایا جا سکے، لہذا دوسرے جملہ میں "کھانا" کے لغوی معنی لینا کسی طرح ٹھیک نہیں، بالکل یہی حالت لفظ مغفرت کی ہے، اصطلاحی طور پر یہ لفظ معافی کے معنوں میں استعمال ہو رہا ہے، اور اب یہی اس کے عام فہم معنی ہیں، اور اگر اس کے لغوی معنوں پر ہی اصرار کیا جائے "یعنی ڈھانک دینا" تو بھی مراد یہی ہے، کہ کسی گناہ کو ڈھانک دیا گیا یعنی اب اس کے متعلق کوئی پوچھ گچھ نہیں ہو گی، اور اس لحاظ سے یہ معافی ہی کے مترادف ہوا۔

برق صاحب کا خیال ہے، کہ گناہ معاف نہیں ہوتا، اور اس سلسلہ میں انہوں نے چند مثالیں دی ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں:۔

"(۱) سینکڑوں ایسے صحابہ ہو گذرے ہیں، جنہوں نے آغاز میں حضور کی مخالفت کی ...... لیکن بعد میں حلقہ بگوش اسلام بن گئے، اور ان کے پچھلے گناہ اس نئے عمل کے پیچھے چھپ گئے" (دو اسلام ص ۲۷۹)

برق صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی کسی گناہ کا نتیجہ یہی نہیں کہ زمانہ حال میں واقع ہو، وہ نتیجہ مستقبل میں بھی واقع ہو سکتا ہے جس زمانہ میں صحابہ کافر تھے، گناہ کرتے تھے، ہو سکتا ہے، کہ ان کو اس گناہ کی سزا مل گئی ہو، اور بہت ممکن ہے، کہ نہ بھی ملی ہو، اور ظاہر یہی ہے، کہ اکثر صحابہ کو ان کے کفر کے زمانہ میں کوئی نقصان نہیں پہنچا، خیر بحث اس سے نہیں، کہ زمانہ ماضی میں کیا ہوا، سوال یہ ہے، کہ آیا زمانہ مستقبل میں بھی اس گناہ کی کوئی سزا مقرر ہے یا نہیں، اگر ہے تو اس سزا کو ضرور اس کا نیا عمل چھپا دے گا، اور یہ معافی نہیں تو اور کیا ہے، یہ کس نے کہا، کہ زمانہ ماضی میں جو سزا اسے مل چکی ہے، وہ معاف ہو جائیگی ہم تو یہ کہتے ہیں، کہ زمانہ مستقبل میں جو عذاب آنے والا ہے، وہ ٹل جائے گا۔

دوسری مثال برق صاحب یہ دیتے ہیں:۔

• فرض کیجیے کہ ایک نوجوان کسی عادت بد میں مبتلا ہو کر صحت کا جنازہ نکال لیتا ہے.... پھر دفعتہً سنبھل جاتا ہے.... صحیح الجسم نوجوان بن جاتا ہے، اس نے گویا تلافی مافات کر لی، اور اس کے پچھلے گناہ چھپ گئے، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں، کہ پچھلا گناہ معاف ہو گیا ہے، اس نے ایک گناہ کیا، اور اس کی باقاعدہ سزا بھگتی برسوں کمزوری اور بری صحت کا شکار رہا، عام نفرت کا نشانہ بنا... یہی اس گناہ کی سزا تھی، جو وہ بھگت چکا، اب اسے نیک اعمال کا صلہ مل رہا ہے" (دو اسلام ص۲۷۹ ص۲۸۰)

برق صاحب نے پھر وہی بات دہرائی ہے، کہ ماضی میں وہ سزا بھگت چکا، سوال یہ ہے، کہ اگر کچھ عرصہ اور وہ اپنی بری عادتوں کو جاری رکھتا، تو کیا وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا نہ ہو جاتا جس سے نجات ناممکن ہو جاتی، اور اگر ایسی حالت میں وہ اپنی بری عادت کو چھوڑ بھی دیتا، تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا، کیا یہ ترک بدعملی اس کو فائدہ پہنچاتی؟ نہیں، بلکہ اس کی وہ بری عادت مستقبل میں بھی اس کے لئے عذاب بن جاتی، اب بتائیے، کہ اس مرحلہ تک پہنچنے سے پہلے اگر وہ تائب ہو گیا، اور اپنی صحت کو ٹھیک کر لیا، تو وہ مستقبل میں آنے والی اور نہ ٹلنے والی مصیبت سے بچ گیا یا نہیں، اس مستقبل میں آنے والی مصیبت کی طرف اس کے قدم اٹھ چکے تھے، اور اس مصیبت کی عمارت کی بنیاد وہ رکھ چکا تھا لیکن اس کے سنبھل جانے کی وجہ سے یہ بنیاد بے کار کر دی گئی، اور مستقبل کی ساری مصیبتیں ٹل گئیں، لہذا جب ہم یہ کہتے ہیں، کہ فلاں شخص کا گناہ معاف ہو گیا، تو اس کے یہی معنی ہوتے ہیں، کہ مستقبل میں آنے والا عذاب معاف ہو گیا، نہ کہ ماضی میں گذرا ہوا عذاب، برق صاحب ہمارا مطلب ہی نہ سمجھے، لہذا انہیں اعتراض کرنا پڑا، غرض اگر کوئی شخص کوئی گناہ کرتا ہے، اور اپنی زندگی میں اس سے توبہ کر کے نیک

ل کر لیتا ہے، تو اس گناہ کی آنے والی سزا معاف ہو جائے گی، ہاں اگر وہ موت کے مرحلہ تک
پہنچ گیا، تو پھر نیک عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور تلافی مافات کی گنجائش نہیں رہتی، لہٰذا توبہ
قبول نہیں ہوتی۔

اب رہی یہ بات کہ کیا گناہ معاف ہوتا ہے یا نہیں تو خود قرآن مجید اس پر شاہد ہے کہ گناہ
معاف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ (الشوریٰ)	جو مصیبت تم پر آتی ہے، وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے، اور بہت سے گناہ تو وہ معاف ہی کر دیتا ہے

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ بعض گناہوں کی سزا مل جاتی ہے، اور بہت سے گناہ معاف ہو جاتے
ہیں، ان کی کوئی سزا ہی نہیں ملتی نہ ماضی میں نہ مستقبل میں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے:۔

اَوۡ يُوۡبِقۡهُنَّ بِمَا كَسَبُوۡا وَيَعۡفُ عَنۡ كَثِيۡرٍ (الشوریٰ)	یا تو ان کو ان کے گناہ کی سزا میں تباہ کر دے یا یہ کہ بہت سے گناہ معاف کر دے

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے "عَفُوٌّ" کا لفظ استعمال کیا ہے
یعنی "معاف کرنے والا" لہٰذا اس اسم گرامی کا تقاضا بھی یہی ہے، کہ وہ گناہوں کو معاف کر دے
اور یہی حقیقت بھی ہے، کہ وہ معاف کرتا رہتا ہے۔

غلط فہمی "سینکڑوں ایسے صحابہ ہو گذرے ہیں، جنہوں نے آغاز میں حضور کی مخالفت کی، تکلیفیں دیں
اور آپ پر چڑھائی کی لیکن بعد میں حلقہ بگوش اسلام بن گئے اور ان کے پچھلے گناہ اس
نیک عمل کے پیچھے چھپ گئے۔" (دو اسلام ص ۲۷۹)

ازالہ یہ تو تسلیم ہے، کہ ان کے برے اعمال نیک اعمال کے پیچھے چھپ گئے، لیکن سوال یہ ہے
کہ ان برے اعمال کی سزا انہیں ملی یا نہیں، اگر نہیں ملی، تو کیا دوزخ میں ان کو جانا پڑے گا،
اور اگر مل گئی، تو کیا ملی؟ اگر آپ فرمائیں کہ وہ نادم ہوئے، اور اسلام قبول کر لیا، بس یہ ندامت ہی ان
کی سزا ہو گئی، تو یہ قطعاً تسلیم نہیں کیا جا سکتا، کہ اتنے بڑے بڑے گناہ وہ کریں، صحابہ کو قتل کریں، اور
تکلیفیں پہنچائیں، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف پہنچائیں بازار طائف میں آپ پر پتھروں کی
بارش کریں، پھر زنا کرتے رہے، شراب پیتے ہوئے میدان کارزار میں حضور کے مدمقابل پہنچ جائیں اور

سزا نہیں کیا ملے، صرف ندامت، کیا اسے خلاف عقل نہ کہیں گے، برق صاحب کیا یہ قرآن کے خلاف نہیں! قرآن تو کہتا ہے:۔

مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (النساء) — جو شخص مومن کو قتل کرے، وہ ابدالآباد دوزخ میں رہے گا۔

بتا یئے ایک شخص تو اس جرم میں ابدالآباد جہنم میں جلتا رہے، اور دوسرا شخص اسی جرم میں صرف ندامت کے بعد چھٹکارا پالے، کیا یہ ناانصافی نہیں؟ اگر ان صحابہ کا گناہ یعنی مومنین کو قتل کرنا معاف نہیں ہوا، تو پھر لازماً ان کو وہی سزا بھگتنی چاہیئے، جو قرآنی قانون کے مطابق مقرر ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی کے لئے ندامت، اور کسی کے لئے ابدالآباد کا جہنم کا عذاب، یہ تو ہوسکتا ہے، کہ انہوں نے توبہ کرلی، گناہ معاف ہوگیا، لیکن یہ نہیں ہوسکتا (بقول آپ کے) گناہ تو معاف نہیں ہوا، لیکن سزا معاف ہوگئی، حیرت ہے، کہ آپ ایک شخص کے حق میں صرف ندامت کو سزا سمجھ لیں، اور دوسرے کے حق میں ابدالآباد جہنم، بات درحقیقت یہ ہے، کہ ندامت تو کوئی سزا ہی نہیں، اصل سزا تو وہی جہنم کی سزا ہے اور وہ معاف ہوگئی، لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے، کہ گناہ معاف ہوگیا

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت عثمان نے چند آدمیوں کو وضو کا طریقہ بتا کر کہا، کہ رسول اللہ صلعم اسی طرح وضو کیا کرتے تھے، جو شخص اس طرح وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھ لے، اس کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص باپ کو قتل کرنے کے بعد وضو کرکے دو رکعت پڑھ لے تو گناہ معاف یا کوئی طالب العلم سال بھر کام نہ کرے، اور آخر میں دو رکعت نماز پڑھ لے سستی کا گناہ معاف، اور وہ پاس، یا کوئی شخص درخت سے کود کر ٹانگیں تڑوالے، اور فوراً دو رکعت نفل پڑھے، تو گناہ معاف اور ٹانگیں واپس" (دو اسلام ص ۲۸۲)

ازالہ برق صاحب نہ تو حدیث کو سمجھے نہ اپنی مثالوں کو۔ یہ مثالیں اس حدیث پر چسپاں نہیں ہوسکتیں گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں، کبیرہ اور صغیرہ، اور یہ پہلے بتایا جاچکا ہے، کہ صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں، نہ کہ کبیرہ (تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ فرمایئے)

پھر ایک اور لحاظ سے بھی گناہ کی دو قسمیں ہیں، ایک صرف اللہ کا گناہ، دوسرا اللہ کے گناہ کے ساتھ بندہ کا گناہ، پہلا گناہ صرف اللہ کے اختیار میں ہے، کہ اسے چاہے تو معاف کردے، اور چاہے

تو اس کی سزا دے، مثلاً جب کبھی آپ سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے، تو آپ فوراً یا کچھ دیر بعد اس سے معافی مانگ لیتے ہیں، اور وہ معاف کر دیتا ہے، تو اس معافی میں کوئی اشکال نہیں نہ کوئی پیچیدگی ہے، نہ وہ مثالیں اس معافی کے منافی ہیں، جن کو برقی صاحب نے اوپر نقل فرمایا ہے (تفصیل کے لئے باب ۱۲ ملاحظہ فرمائیں) برخلاف اس کے دوسرا گناہ صرف اللہ کا گناہ نہیں بلکہ بندے کا بھی گناہ ہے، لہذا یہ گناہ معاف نہیں ہوتا، جب تک بندہ معاف نہ کر دے، یہ ہے اس قسم کی تمام احادیث کا خلاصہ۔

باپ کو قتل کرنا، باپ کا جرم ہے، باپ کے عزیز و اقارب کا جرم ہے، پھر یہ کبیرہ گناہ ہے لہذا بہر دو صورت اس کے معاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کوئی طالب علم سال بھر کام نہ کرے یا کوئی شخص درخت سے کود کر ٹانگیں تڑوا لے، تو یہ اس کا اپنا گناہ ہے، اس میں اللہ کا گناہ کون سا ہے، جو اللہ کو معاف کرنا پڑے، اور اگر کوئی گناہ ہے بھی تو اس کی جو سزا مستقبل میں ملنی والی ہے وہ معاف ہو سکتی ہے، نہ کہ زمانہ ماضی کی سزا، برقی صاحب خلط مبحث کر دیتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ آنے والی سزا معاف ہوتی ہے، برقی صاحب زمانہ ماضی کی سزاؤں کو بیچ میں لے آتے ہیں، حالانکہ ان سے تو ہم بحث ہی نہیں کرتے۔

پھر میں کہتا ہوں، کہ اللہ تعالےٰ کے لئے کوئی چیز مشکل نہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے، اگر وہ بندے کے گناہ معاف کرنے کا ارادہ ہی کرے، تو پھر کیا چیز مانع ہو سکتی ہے، باپ کے اعزہ و اقارب بھی معاف کر سکتے ہیں، اللہ تعالےٰ باپ کو بھی معافی دینے پر راضی کر سکتا ہے، جب اس نے خود قرآن مجید میں وعدہ فرمایا ہے، کہ سوائے شرک کے وہ ہر گناہ کو معاف کر دے گا، تو پھر کیا امر مانع ہے، کہ باپ کا قتل معاف نہ ہو سکے، اور یہ اس کی عادت اور قانون کے بھی خلاف نہیں، اس لئے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کو معاف کرنے کا قانون قرآن میں موجود ہے۔

اب رہ گیا طالب علم کا ناکام ہونا، تو یہ شخص تو سزا بھگت چکا، اب معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں اگر سزا سے پہلے یعنی دوسرے الفاظ میں امتحان سے پہلے وہ دعا کرتا، تو بے شک اللہ تعالےٰ اس بات پر قادر تھا، کہ اس کے لئے کامیابی کا سبب پیدا کر دیتا، لیکن امتحان ہو چکا، سزا مل چکی، اب وضو کر کے دو رکعت پڑھنا کیا فائدہ دے سکتا ہے، یعنی میدان محشر میں امتحان ہو چکا، سزا مل گئی، اور اب دوزخ میں پہنچ کر کوئی شخص معافی مانگے تو بے فائدہ ہے

برقی صاحب ہم کہتے ہیں، کہ زندگی میں معافی مانگے، اور آپ مثالیں ایسی دیتے ہیں، کہ گویا

مجرم دوزخ میں جاکر معافی مانگے، ظاہر ہے کہ دوزخ میں پہنچ کر معافی نہیں ہو سکتی، اور ہم اس میں آپ سے متفق ہیں، لیکن زندگی میں نیک اعمال کے صلہ میں معافی ہو سکتی ہے، ہم کہتے ہیں، کہ امتحان سے پہلے محنت کرے، اور آپ ہمیں الزام دیتے ہیں، کہ امتحان کے بعد محنت کرے، حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے، ہمیں الزام دیتے وقت براہ کرم اس فرق کو تو ملحوظ رکھ لیا ہوتا،

مزید گذارش برقی صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"مغفرت کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، اول اس گناہ سے بچنا دوم تلافی مافات کے لئے صحیح اور فطری کوشش" (دو اسلام ص۲۸۱)

برق صاحب ہمیں آپ سے اتفاق ہے، اب یہ بتایئے، کہ اگر کوئی شخص باپ کو قتل کر کے آئندہ اس گناہ سے بچے، تو ایک شرط تو مغفرت کی پوری ہو گئی، اب اگر وہ وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرے، تو یہ ایک نیک عمل ہوا، اور نیک عمل کے پیچھے بقول آپ کے پچھلے گناہ چھپ جایا کرتے ہیں، لہٰذا یہ نیک عمل اس گناہ کو چھپالے گا، یہ نیک عمل ایک صحیح اور فطری کوشش ہو گی، اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ خوش ہو جائے، اور گویا یہ عمل تلافی مافات کا کام کرے گا، لہٰذا دونوں شرطیں پوری ہو گئیں، کہیئے اب بھی گناہ معاف ہو گا یا نہیں؟ یہ ہے حدیث کا مطلب! قرآن تو اس سے بھی زیادہ عجیب بات کہتا ہے، سنیئے :۔

قُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ (البقرہ) تم حطہ کہو تو ہم تمہارے سب گناہ معاف کر دیں گے

اگر صرف حطہ (یا استغفر اللہ) کہنے سے تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں، تو دو رکعت نماز سے کیوں نہ معاف ہوں گے، اور اگر کوئی تاویل یہاں چل سکتی ہے، تو پھر وہی تاویل حدیث میں بھی کیوں نہیں چل سکتی۔

حدیث کا صحیح مفہوم ایک آدمی وضو کرنے بیٹھتا ہے، وہ وضو کیوں کر رہا ہے؟ اس سے پہلے وہ کس مشغلہ میں تھا؟ اسے کیوں چھوڑا؟ اپنے وقت عزیز کو وضو میں کیوں صرف کیا؟ کس چیز نے اس کو تمام کاروبار اور جرائم سے روک دیا؟ اور دفعتہً روک دیا؟ اب یہ تصور ہے، جو اس کے ذہن میں آتا ہے، وہ سوچتا ہے، کہ میں بندہ ہوں، میرا کوئی مالک ہے، میں مخلوق ہوں میرا کوئی خالق ہے، یہ وضو میں اس کے حکم سے کر رہا ہوں، اس کو راضی کرنے کے لئے کر رہا ہوں، پھر اسے خیال آتا ہے کہ اس سے پہلے میں فلاں گناہ کر کے، اسے ناراض کر چکا ہوں، حالانکہ اس وقت بھی میں اس کا بندہ تھا، وہ میرا آقا تھا، مجھ سے برا ہوا، کہ میں نے پہلے اپنے خالق کو ناراض کیا، اب ندامت

کا تصور پیدا ہوتا ہے، وہ کھڑا ہو جاتا ہے، اور دو رکعت نماز ادا کر کے اپنے مالک کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے، رحمت الٰہی جوش میں آتی ہے، اور اس نادم بندے کو ڈھانک لیتی ہے، یہ ہے حدیث کا مطلب، غالباً اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا، اور صرف یہی حدیث نہیں، بلکہ اس قسم کی جتنی احادیث آپ نے نقل فرمائی ہیں سب سمجھ میں آجائیں گی

ہر نیکی انابت الی اللہ کا جذبہ پیدا کرتی ہے، اس نیکی کی ادائیگی کے وقت بندے کو محسوس ہوتا ہے، کہ میں کہاں ہوں، کیا ہوں، مجھے کیا کرنا چاہیئے، یہ نیکی میں کس کے حکم سے کر رہا ہوں، کس کے خوش کرنے کے لئے کر رہا ہوں، اس کو میں نے پہلے ناراض تو نہیں کیا ہے، اگر کیا ہے، تو یہ مجھ سے اچھا ہوا یا برا ہوا، یہ تصورات اس کی کایا پلٹ دیتے ہیں، اور اس کی برائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور پھر وہ ایک نیک اور صالح انسان کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے، کہ احادیث میں جگہ جگہ نیکیوں کی ترغیب دی گئی ہے، بظاہر وہ نیکی اس قابل نہیں، کہ اس کے گناہوں کا بدل ہو سکے، لیکن اس کے یہ ذہنی تصورات، اور پھر ذہنی تبدیلی، گناہ سے نفرت، یہ ہے وہ چیز جو اس نیکی نے پیدا کی، لہٰذا مغفرت کا اصلی سبب وہ نیکی ہی بنی، اس نیکی ہی نے اس کو دوسری طرف موڑ دیا، اور اب وہ صراط مستقیم پر گامزن ہے، نیکی سے یہ تصور پیدا ہونا، گناہوں کا چھوٹنا قرآن سے بھی ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ	بے شک نماز بے حیائی اور تمام برے
وَالْمُنْكَرِ۔ (عنکبوت)	کاموں سے روکتی ہے۔

اب اگر کسی نمازی کی برائیاں دور نہ ہوں، تو یہ اس کا قصور ہے، کہ اس نے ایک نیک عمل تو کیا، لیکن اپنے ذہن کو نہیں بدلا، نماز پڑھتے وقت اس نے نہیں سوچا، کہ وہ کیا کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے، جس وجہ سے وہ یہ کام کر رہا ہے، کیا اس وجہ سے فلاں کام نہیں کرنا چاہیئے، فلاں کام نہیں چھوڑنا چاہیئے، یہ تصورات اس کے ذہن میں نہیں آئے، اس کی نماز نے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، لہٰذا برائیاں دور نہ ہوئیں، اس میں نماز کا کوئی قصور نہیں، نہ آیت قرآنی کا قصور ہے، یہی حال ان تمام نیکیوں کا ہے، جو احادیث میں بیان ہوئی ہیں، اور جن میں مغفرت ذنوب کا تذکرہ ہے، اگر ان نیکیوں کو کرنے کے بعد بھی نیکی کرنے والا برائیاں کرتا رہتا ہے، تو ظاہر ہے، کہ اس کے ذہن میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، نہ وہ تصورات آئے جو آنے چاہیئے تھے، لہٰذا اس کو اس نیکی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس میں نہ حدیث کا قصور ہے، نہ اس نیکی کا قصور ہے، بلکہ اس نیکی کے طریقہ

ادائیگی کا قصور ہے، اس کی نیکی ان تصورات سے خالی رہی، جو مغفرت ذنوب کا ذریعہ ہیں، لہذا مغفرت نہ ہو سکی۔

برق صاحب حدیث کا مطلب تو اب سمجھ میں آ گیا ہو گا، اگرچہ قرآن تو بغیر نیکی کے بھی مغفرت ذنوب کی خوشخبری سناتا ہے، اور یہ آیات اس باب میں، اور اس باب سے پہلے باب (ع ۱۲) میں نقل کر چکا ہوں اگر بغیر نیکی کے بہت سے گناہ معاف ہو جایا کرتے ہیں، تو پھر نیکی سے معاف ہو جانا کیا بعید ہے، لہذا حدیث زیر بحث اعتراض سے بالکل پاک و صاف ہے، حدیث اپنی جگہ پر صحیح ہے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جب چاہے، اور جس ذریعہ سے چاہے، گناہ کو معاف کر دے، حدیث کو سمجھنے کے لئے قرآن و حدیث کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے، ورنہ قدم قدم پر غلط فہمی سے سابقہ پڑتا ہے، مغفرت ذنوب پر ایک اور زاویہ سے بھی بحث کر چکا ہوں، براہ کرم باب اول ملاحظہ فرمائیے۔

غلط فہمی "گناہوں کا کتنا عجیب علاج بتایا ہے، کہ قتل کرو، تو ہاتھ دھو لو، اور قتل معاف، اب خیر سے ہمارے علما چلا رہے ہیں، کہ پاکستان میں شریعت نافذ کرو ..... اگر اس طرح کی شریعت جاری ہو گئی، تو پہلے ہی دن قیامت آ جائے گی، اس لئے کہ ہر آدمی قتل و زنا کے بعد ہاتھ، پاؤں دھو لے گا، اور سزا سے بچ جائے گا" (دو اسلام صفحہ ۲۸۴)

ازالہ اللہ تعالیٰ گناہ سے بیزار ہے لہذا اس کے سدباب کے لئے کچھ طریقے اختیار کرتا ہے، پہلا طریقہ ہے، دوزخ کے عذاب سے ڈرانا، دوسرا طریقہ ہے نیکیوں کے ذریعہ مجرم میں ذہنی انقلاب پیدا کرنا، تیسرا طریقہ ہے حدود و تعزیرات مقرر کرنا، کیونکہ پہلے دونوں طریقے ہر حالت میں کارگر نہیں ہوتے اس لئے بعض گناہوں کے روکنے کے لئے تیسرا ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے، اور کچھ سزائیں دی جاتی ہیں تاکہ ان سزاؤں کے خوف سے وہ آئندہ گناہ کا مرتکب نہ ہو، یہ تیسرا طریقہ اور وجہ سے بھی رائج ہے، وہ یہ کہ پہلے دو طریقوں سے صرف اس مجرم کی اصلاح کا امکان ہوتا ہے، لیکن تیسرے طریقہ سے دوسروں کو بھی عبرت ہوتی ہے، اور دوسروں کو اس جرم کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی

پھر ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ بعض گناہوں سے دوسرے انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے، اور جب تک ان کی حق تلفی دور نہ ہو، جرم کی معافی کوئی معنی نہیں رکھتی، لہذا اس حق تلفی کا مداوا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے، کہ یا تو وہ حق حق والے کو مل جائے، یا حق والا حق تلف کرنے والے کو سزا دلوا کر اپنا دل ٹھنڈا کرے، اور اپنے اشتعال انگیز جذبات کو بجھا دے، ورنہ پھر ایک اور جرم کا امکان باقی رہ جاتا

ہے، اور پھر اس سلسلہ میں جرائم کا ایک لامحدود سلسلہ قائم ہو جاتا ہے، جو نسلاً بعد نسلٍ جاری رہتا ہے، ان ہی وجوہات کی بناپر حدود مقرر ہیں، برقی صاحب تو یہ سمجھتے ہیں، کہ گناہ معاف ہی نہیں ہوتا، سزا مل کر ہی رہتی ہے، میں پوچھتا ہوں، دو آدمی قتل کرتے ہیں، ایک مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر دیتے ہیں، دوسرے مقتول کے ورثار قاتل کو قتل کروا دیتے ہیں، اور یہ دونوں چیزیں قرآن سے ثابت ہیں، تو پھر یہ بتایئے، کہ اس دوسرے قاتل کو تو سزا مل گئی، لیکن پہلے قاتل کو کہاں ملی، دونوں برابر کے مجرم تھے، ایک کو سزا نہیں ملی، دوسرے کو سزا ملی، آپ یہ کہیں گے، کہ اسے ندامت ہوئی، میں کہتا ہوں کہ کیا خبر ندامت بھی ہوئی یا نہیں، ورثار نے اپنی طرف سے خود ہی معاف کر دیا، اور اگر بالفرض ندامت بھی ہوئی، رسوائی بھی ہوئی، تو یہ بتایئے، کہ ایک ہی جرم کی سزا مختلف کیوں؟ ایک کو صرف ندامت و رسوائی کی سزا، دوسرے کو ندامت و رسوائی کے ساتھ قتل کی سزا، پس ثابت ہوا، کہ جرم ہو سکتا ہے اور معافی بھی مل سکتی ہے، یہ ضروری نہیں، کہ ہر جرم کی سزا مل کر ہی رہے، جب انسانوں میں یہ صفت پائی جاتی ہے، کہ وہ معاف کر کے خوش ہوتے ہیں، اور یہ ایک نفسیاتی چیز ہے، تو پھر ارحم الراحمین، عفوٌ غفور معاف کر کے کیوں خوش نہ ہوگا، برقی صاحب کیوں اللہ تعالٰے کو آپ غضب کا مجسمہ سمجھتے ہیں، کہ وہ گناہ کو معاف کرتا ہی نہیں، اس کو اس وقت تک چین نہیں آتا، جب تک وہ سزا نہ دے لے، یہ سراسر اس کی رحمت سے ناامید ہونے کی مثال ہے، وہ فرماتا ہے۔

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (زمر)	اے گنہ گار بندو، اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو، بے شک اللہ تعالٰے تمام گناہ معاف کر دے گا، بے شک وہ غفور ہے رحیم ہے۔

انسانوں کے متعلق فرماتا ہے:۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (الشوری)	جو صبر کرے اور معاف کر دے، تو یہ بہت اچھا ہے، اور بڑے عزم و حوصلہ کا کام ہے

دوسری جگہ متقین کی تعریف میں فرماتا ہے:۔

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران)	متقی وہ لوگ ہیں، جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔
وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (حم سجدة)	یہ چیز خوش قسمت لوگوں کو ہی ملا کرتی ہے۔

اپنے رسول کو حکم فرماتا ہے :-

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آل عمران) آپ انہیں معاف کر دیا کریں، اور ان کے لئے مغفرت طلب کیا کریں۔

جب معافی کی صفت اللہ تعالے اپنے رسول میں دیکھنا چاہتا ہے، اپنے بندوں میں دیکھنا چاہتا ہے، اس صفت کو وہ پسند کرتا ہے، تو پھر ارحم الراحمین ہو کر اس صفت سے وہ خود محروم ہو، یہ ناممکن ہے، نہ یہ اس کے شایان شان ہے، بلکہ وہ ضرور معاف کرتا ہے، جیسے کہ میں پہلے آیات قرآنی سے ثابت کر چکا ہوں، کہ وہ معاف کرتا رہتا ہے، معاف کرنے کو پسند کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے، کہ اس نے اپنے بندوں کو یہ دعا سکھائی ہے :-

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا (البقرۃ) ہمیں معاف فرما، ہماری مغفرت فرما۔

اگر وہ معاف ہی نہیں کرتا، تو معافی مانگنے کا حکم کیوں دیتا ہے، پس ثابت ہوا، کہ اللہ تعالے گناہ کو معاف کرتا ہے، اور یہ بھی ثابت ہوا، کہ دعا بھی کوئی حقیقت رکھتی ہے، کہ جس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اگر دعا کی کوئی حقیقت نہ ہوتی، تو اللہ تعالے کیوں فرماتا، کہ یہ دعا مانگو، اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں متعدد دعاؤں کی تعلیم دی گئی ہے، لہذا دعا اللہ کو بہت پسند ہے، اور دعا مطلب براری، اور گناہوں کی معافی کے لئے ضرور اثر رکھتی ہے۔

باب ۱۴۔

"مسئلہ شفاعت"

غلط فہمی: "قرآن حکیم کے طول و عرض میں کہیں مذکور نہیں کہ آنحضرت صلعم محشر میں شفاعت کریں گے" (ص ۲۸۵)

ازالہ: قرآن مجید میں مقام شفاعت کا ذکر موجود ہے، ارشاد باری ہے۔

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل) قریب ہے، کہ تیرا رب تجھے مقام محمود میں کھڑا کرے گا۔

یہ مقام محمود ہی تو مقام شفاعت ہے

غلط فہمی: "البتہ دنیا میں استغفار کا ذکر ضرور ہے" اگر یہ لوگ مغفرت طلب کریں، اور رسول بھی ان کے لئے مغفرت مانگے، تو پھر یہ اللہ کو تواب و رحیم پائیں گے" (قرآن)

مطلب یہ کہ جو لوگ تلافی مافات کے لئے کمربستہ ہو جائیں، اور حضور ان کی رہبری فرمائیں، تو ان کے پچھلے گناہ چھپ جائیں گے" (دو اسلام ص ۲۵۵)

ازالہ: استغفار کے معنی رہبری کرنا یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے، یہ معنی قطعاً صحیح نہیں، اس سے پہلے برق صاحب نے استغفار کے معنے چھپانے کے کئے ہیں (دو اسلام ص ۲۷۹) معلوم نہیں کہ کون سے معنی صحیح ہیں؟ اچھا برق صاحب یہ تو بتایئے، کہ وہ تلافی مافات بھی کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رہبری بھی فرمائیں، لیکن گناہ پھر بھی معاف نہ ہو، سزا مل کر ہی رہے، تو پھر تلافی مافات کا نتیجہ کیا ہے، تلافی مافات سے آئندہ کی اصلاح ہو گئی، گذشتہ گناہ کے لئے وہ تلافی کوئی فائدہ نہیں دے گی، لوگ تو خیر پچھلے گناہ بھول جائیں گے، لیکن اللہ تعالےٰ تو گناہ بھول بھی نہیں سکتا، اس سے کوئی چیز چھپ بھی نہیں سکتی، وہ بقول آپ کے سزا بھی ضرور دیتا ہے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ گناہ چھپ سکے نہ سزا ہی سے بچ سکے، یہ ہے مغفرت کے لغوی معنی اختیار کرنے کا نتیجہ۔

غلط فہمی: "اس مضمون کے علاوہ شفاعت کا کوئی اور تخیل قرآن میں موجود نہیں، بلکہ عدم شفاعت پر جا بجا اشارے ملتے ہیں" (دو اسلام ص ۲۸۵)

ازالہ: برق صاحب آپ نے صرف وہ آیتیں ہی لکھی ہیں، جن میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے

لیکن وہ آیتیں تحریر نہیں فرمائیں جن میں ایک شرط کے ساتھ شفاعت کا ثبوت ملتا ہے، اور وہ شرط ہے "اذن الٰہی" ارشاد باری ہے:۔

(۱) مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (البقرۃ)
اللہ تعالیٰ سے کوئی سفارش نہیں کر سکتا، مگر اس کی اجازت سے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کلیۃً شفاعت کی نفی نہیں ہے بلکہ اس شفاعت کی نفی ہے جو بغیر اجازت کے ہو، اس سلسلہ میں برق صاحب نے جو آیت پیش کی ہے، وہ مع ترجمہ درج ذیل ہے۔

وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْہَا شَفَاعَۃٌ
اس دن سے ڈرو، جب کوئی شخص اپنے آپ کو پیش کر کے دوسرے کو نہیں بچا سکے گا جب کوئی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی (دو اسلام ص۳۸۵)

برق صاحب نے "وَلَا یُقْبَلُ مِنْہَا شَفَاعَۃٌ" کا ترجمہ صحیح نہیں کیا، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ "انسان کی طرف سے کوئی سفارش قبول نہیں کی جائے گی" یعنی کوئی شخص چاہے، کہ میں کسی کو اپنا سفارشی خود بنا لوں، تو نہیں بنا سکتا، اس قسم کی شفاعت اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں ہوگی کہ مجرم خود کسی کو شفیع بنا کر لائے اور پھر اس کی شفاعت کو اللہ قبول فرمائے، شفیع بنانے نہ بنانے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہوگا، بمصداق آیت کریمہ

قُلْ لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا (الزمر)
کہہ دیجئے تمام سفارشوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے

دوسری آیت میں اس سے بھی زیادہ صفائی کے ساتھ شفاعت کا ثبوت ملتا ہے۔

(۲) یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَہٗ قَوْلًا (طٰہٰ)
قیامت کے دن شفاعت نفع نہیں دے گی ہاں مگر اس شخص کو نفع دے گی، جس کے لئے رحمٰن کی طرف سے سفارش کی اجازت مل جائے اور رحمٰن اس کے لئے سفارش کو پسند فرمائے۔

تیسری آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَہْدًا (مریم)
وہاں کوئی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتا، مگر ہاں جس نے رحمٰن سے اجازت لے لی ہو۔

چوتھی آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی (الانبیاء)
نہیں سفارش کرتے مگر جس کے لئے اللہ کی رضا ہو۔

پانچویں آیت ملاحظہ فرمائیے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (السباء)	اللہ کے ہاں شفاعت نفع نہیں دے گی، مگر اس کو جس کے لئے اللہ کی اجازت ہو۔

چھٹی آیت ملاحظہ فرمائیے۔

ولا یملك الذین یدعون من دونه الشفاعة الا من شهد بالحق و هم یعلمون (الزخرف)	اور خدا کے علاوہ جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں، وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے، مگر ہاں وہ جو حق کے ساتھ گواہی دیں، اور انہیں علم بھی ہو۔

مزید آیات مطالعہ فرمائیے۔

(۷) مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس)	کوئی سفارش نہیں کر سکتا، مگر اللہ تعالےٰ کی اجازت کے بعد
(۸) فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (المدثر)	منکرین قیامت کو سفارش کرنے والوں کی سفارش کام نہ آئے گی۔

ان تمام آیات سے ثابت ہوا، کہ شفاعت نفع دے گی، بشرطیکہ شفاعت کرنے والا شفاعت کی اجازت حاصل کرلے، اگر اجازت مل گئی تو پھر نفع دینا بھی یقینی ہے، کیونکہ اللہ تعالےٰ کے دربار میں ناانصافی اور ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا وہاں نجات اسی کو ملے گی، جو نجات کا اہل ہوگا اور جو نجات کا اہل ہوگا، اسی کے لئے شفاعت کی اجازت بھی دی جائے گی، برقی صاحب نے جو حدیث شفاعت نقل کی ہے، اسے پورا نقل نہیں فرمایا، حالانکہ اس میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

فیؤذن لی (صحیح مسلم)	پھر مجھے اجازت دی جائے گی

اللہ تعالےٰ فرمائے گا۔

اشفع تشفع	(اے محمد) شفاعت کرو، تمہاری شفاعت قبول ہوگی،

اس کے بعد حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

فیحد لی حدا (صحیح بخاری و مسلم)	پس میرے لئے حد مقرر کر دی جائے گی۔

یعنی میں صرف ان لوگوں کی سفارش کر سکوں گا، جن کے متعلق اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہوگا، کہ آپ ان لوگوں کی سفارش کر سکتے ہیں، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے حق میں سفارش کی اجازت ہی نہیں ملے گی الغرض اللہ تعالےٰ کے علم و قانون میں جو لوگ نجات کے اہل قرار پا سکتے ہیں، انہیں کے متعلق

سفارش کی اجازت ہوگی، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

الا من حبسہ القرآن (میری سفارش سے لوگ دوزخ سے نکالے جائینگے
(صحیح بخاری) مگر وہ لوگ جن کو قرآن نے روک لیا۔

حدیث مذکور سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، اور بغیر اجازت کے سفارش نہیں کریں گے

(۲) جن لوگوں کی آپ سفارش فرمائیں گے، ان کا تعین بھی اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوگا۔

(۳) آپ ان لوگوں کی شفاعت نہیں کرسکیں گے، جو قانون الٰہی کے ماتحت ایسی سزا کے مستوجب ہیں، جو معاف نہیں ہوسکتی۔

بتائیے ان تینوں میں سے کونسی بات ایسی ہے، جو قرآن یا دوسری صحیح احادیث سے ٹکراتی ہے

غلط فہمی "ابوہریرہ سے روایت ہے .... کہ قیامت کے دن سب سے پہلے لوگ حضرت آدم کے پاس جائیں گے، اور شفاعت کی التجا کریں گے، وہ کہیں گے، کہ میں نے تو دانہ گندم کھالیا تھا اس لئے اللہ کے سامنے جانے سے ڈرتا ہوں، پھر ابراہیم ؑ کے پاس جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں نے تین جھوٹ بولے تھے، اس لئے مجھے معاف کرو... آخر میں لوگ محمد صلعم کے پاس جائیں گے، اور آپ اللہ کے حضور میں روانہ ہوجائیں گے .....

کیا دلچسپ حدیث تراشی ہے، کہ رسول خدا صلعم کو اس ابراہیم ؑ سے بھی بڑھا دیا جن کی اتباع کا آپ کو بار بار حکم دیا گیا تھا " فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا " (تم موحد ابراہیم کے آثار قدم پر چلو) اور آپ پر تین جھوٹ بولنے کا الزام بھی لگا دیا" (دو اسلام ص۲۸۷ - ۲۸۸)

ازالہ پہلی غلط فہمی تو یہ ہے، کہ آیت کا ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا، صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ "تم اتباع کرو موحد ابراہیم کی ملت کا" اور ملت سے مراد اسلام ہے، اور یہ اللہ کا دین ہے، تو مطلب یہ ہوا، کہ اس اسلام کی پیروی کرو، جو ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا، نہ کہ وہ نام نہاد ملت ابراہیمی جس کو کفار مکہ یا اہل کتاب پیش کرتے تھے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے، کہ برق صاحب کے خیال میں ابراہیم علیہ السلام کا مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے، اور اس کے لئے بطور دلیل انہوں نے یہ آیت پیش کی ہے حالانکہ یہ آیت ایک الزامی جواب ہے، جو مشرکین عرب اور اہل کتاب کو دیا گیا ہے، کیونکہ یہ لوگ اس

بات کا دعویٰ کرتے تھے، کہ ہم دین ابراہیمی پر ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ اصلی دین ابراہیمی پر تو اے رسول تم ہو، اور تم اسی اصلی ملت کی پیروی کئے چلے جاؤ، ان کے کہنے کی پرواہ مت کرو، یہ لوگ مشرک ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام مشرک نہیں تھے، پھر یہ دین ابراہیمی پر کیسے ہو سکتے ہیں، اب آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

مَا کَانَ اِبْرَاھِیْمُ یَھُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (آل عمران)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی، بلکہ موحد مسلم تھے، اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ اور اہل کتاب کے دعویٰ کو باطل کر دیا، اور یہ ثابت کر دیا کہ ہمارا رسول ہی ابراہیمی دین پر ہے، اور اپنے رسول سے کہدیا، کہ تم ان کی ملامت کی پرواہ مت کرو اور اصلی دین ابراہیمی کی پیروی کئے چلے جاؤ۔

برق صاحب ایک اور آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ (الانعام)

تمام رسولوں کو اللہ نے ہدایت دی تھی پس اے رسول تم بھی انہی کی ہدایت کی پیروی کرو۔

یہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تمام رسولوں کے نقش قدم پر چلنے کا حکم دے رہا ہے، تو بتایئے کیا سب رسول، نبی آخرالزمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوئے، گویا جماعت مرسلین میں سب سے کم درجہ کے نبی آپ ہیں، اور یہ غالباً آپ بھی تسلیم نہیں کریں گے، ابراہیم علیہ السلام بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا راستہ ایک ہے یعنی اسلام، بس اس پر چلنے کی ہدایت کی جا رہی ہے اس میں افضل و مفضول کا کوئی سوال نہیں، اب رہا یہ سوال کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں یا نہیں، تو یہ بات خود قرآن سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (اسراء)

عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود میں کھڑا کرے گا۔

وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (الاحزاب)

آپ اللہ کے رسول ہیں، اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے۔

خاتم النبیین کے الفاظ خود بتا رہے ہیں، کہ آپ سب سے افضل ہیں، اور افضل سب سے بعد میں ہی آیا کرتا ہے، بادشاہ کی سواری جب نکلتی ہے، تو جلوس آگے آگے ہوتا ہے، اور بادشاہ

سب سے آخر میں، مشاعرہ میں سب سے بڑے شاعر کو سب سے آخر میں اپنا کلام سنانے کا وقت دیا جاتا ہے، جلسہ عام میں سب سے زیادہ معزز عالم کو سب کے آخر میں تقریر کا موقع دیا جاتا ہے اسی اصطلاح میں خاتم الشعراء اور خاتم المحدثین استعمال ہوتے ہیں، الغرض سب کے بعد میں آنے والا عاقب اسب سے افضل ہوتا ہے، بہت سے پیغمبر آئے، لیکن ان کے آنے کے بعد پیغمبر کی ضرورت باقی رہی، لہذا پیغمبر آتے رہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے پیغمبر بن کر آئے، کہ کسی پیغمبر کے آنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی، کیا یہ دلیل افضلیت نہیں۔

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الاعراف) — کہدیجئے، اے لوگو میں تم سب کی طرف اس اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں جو اللہ کہ تمام آسمانوں اور زمین کا بادشاہ ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سباء) — اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام اقوام عالم کے لئے رسول ہیں، بر خلاف اس کے آپ سے پہلے جتنے بھی نبی آئے، وہ اپنی اپنی قوم کی طرف رسول بن کر آئے، عیسٰی علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالے فرماتا ہے

رَسُولًا إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ (آل عمران) — وہ بنی اسرائیل کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے

خود ابراہیم علیہ السلام جن کو برق صاحب افضل الانبیا سمجھتے ہیں، اپنی قوم ہی کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اور دوسری قوموں کی طرف دوسرے رسول بھیجے گئے تھے۔

ارشاد باری تعالے ہے:۔

فَلَمَّا رَأَى أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَى قَوْمِ لُوطٍ (هود) — جب ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کو دیکھا، کہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تو ڈرے فرشتوں نے کہا ڈرو نہیں، ہم لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا، کہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں لوط علیہ السلام اپنی قوم کی طرف رسول تھے وہاں ابراہیم علیہ السلام کی رسالت نہیں تھی۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي — اے رسول کہدیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو،

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران) تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب بنا لے گا۔

بتائیے جس شخص کا متبع محبوب الٰہ ہو، وہ خود کتنا بڑا محبوب ہوگا، لہٰذا اگر ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل ہیں، تو آپ اللہ کے حبیب ہیں۔

احادیث میں آپ کی فضیلت کے متعلق بہت کچھ ہے، کاش آپ انہیں بھی تسلیم کریں۔

غلط فہمی "آپ پر جھوٹ بولنے کا الزام بھی لگا دیا" (دو اسلام ص۲۸۸)

ازالہ جھوٹ کا ذکر تو قرآن میں موجود ہے، ارشاد باری ہے:۔

تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ (الانبیاء)

ابراہیم علیہ السلام نے کہا، کہ اللہ کی قسم میں تمہارے ان بتوں کی گت بناؤں گا، جب تم لوگ چلے جاؤ گے، پس انہوں نے تمام بت توڑ ڈالے سوائے بڑے بت کے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں

پھر جب وہ مشرکین بت خانہ میں آئے تو بہت برہم ہوئے اور پوچھا:۔

ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰاِبْرٰهِيْمُ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (الانبیاء)

اے ابراہیم ہمارے ان معبودوں کے ساتھ یہ حرکت تم نے کی ہے، ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا، نہیں بلکہ یہ کام اس بڑے بت نے کیا ہے ان بتوں ہی سے پوچھو، اگر یہ بولتے ہوں

یہ قرآن کی آیات آپ کے سامنے ہیں، اگر یہ جھوٹ نہیں، تو معلوم نہیں پھر جھوٹ کس چیز کا نام ہے اگر یہ جھوٹ ہے، تو پھر اعتراض کا رخ قرآن کی طرف ہوگا، بتائیے کیا کیا جائے۔

غلط فہمی "اچھا مان لیا کہ آدم نے دانہ کھایا . . . لیکن حضرت عیسیٰ نے کیا قصور کیا تھا، کہ انہیں شفاعت کی اجازت نہیں مل سکی . . . . یوسف علیہ السلام میں کیا کمی تھی (دو اسلام ص۲۸۸)

ازالہ پہلی بات تو یہ یاد رکھیے، کہ عدم ذکر سے عدم شئے لازم نہیں آتا، دوسرے یہ ضروری نہیں، کہ ہر نبی اپنا قصور یاد کر کے ہی اس کام کا اپنے کو اہل نہ سمجھے، بلکہ ہو سکتا ہے، کہ بے قصور ہوں، پھر بھی وہ اپنے آپ کو اس کام کا اہل نہ سمجھیں، مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کے جواب میں صرف آتا ہے، کہ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے کسی قصور کا ذکر نہیں کیا پھر بھی خود کو اس کام کا اہل نہ سمجھا

حدیث میں صرف بڑے بڑے رسولوں کا ذکر ہے، باقی کو بھی ان ہی پر قیاس کیا جا سکتا ہے یہ نہیں

ہو سکتا، کہ حدیث میں فرداً فرداً لاکھوں پیغمبروں کے پاس جانا مذکور ہو، پھر یہ بھی ممکن ہے، کہ وہ لوگ خود ہی باقی انبیار کے پاس نہ جائیں، یہ سمجھ کر کہ جب اتنے بڑے بڑے نبیوں نے جواب دے دیا، تو دوسروں کے پاس جانا لاحاصل ہے، پھر اس غلط فہمی کا جواب خود حدیث میں موجود ہے، یعنی جب وہ لوگ عیسٰی علیہ السلام کے پاس جائیں گے، تو عیسٰی علیہ السلام اس شخص کی نشاندہی کریں گے، جس کے لئے یہ کام مخصوص ہے، اور اس طرح لوگ ہر نبی کے پاس جانے کی زحمت سے بچ جائیں گے، اور سیدھے ان کی ہدایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے، اس وقت آپ کو شفاعت کی اجازت ملیگی اور آپ شفاعت کریں گے

غلط فہمی

• حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق تو خود حضور کا ارشاد موجود ہے، کہ آپ اکرم الناس تھے .... ابوہریرہ سے روایت ہے، کہ حضور سے کسی نے پوچھا، کہ دنیا کا بہترین انسان کون ہے۔ فرمایا، سب سے بڑا پرہیزگار، کہا میرے سوال کا یہ مطلب نہیں تھا، فرمایا، تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام (بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۵۲)

حیرت ہے، کہ اس اہم کام یعنی شفاعت کے لئے دنیا کا بہترین انسان کیوں منتخب ہو سکا (صفحہ ۲۸۸)

ازالہ

حدیث مذکور میں خود اس غلط فہمی کا ازالہ موجود ہے، اکرم الناس تو آپ نے اسی کو فرمایا، جو سب سے زیادہ متقی ہو، اور یہی قرآن میں بھی ہے :۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات)	یعنی اللہ کے ہاں اکرم الناس وہ ہے، جو سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہے

ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے عقیدہ کے مطابق اور قرآن و حدیث کی صراحت کے بموجب سب سے زیادہ متقی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، لہٰذا شفاعت کبریٰ کا حق سوائے آپ کے اور کس کو ہو سکتا ہے، اب رہا یہ سوال کہ پھر یوسف علیہ السلام کس لحاظ سے اکرم الناس ہیں، تو اس کی وجہ دوسری ہے، وہاں مکرم سے مراد مکرم بلحاظ نسب ہے، اور یہ حدیث میں موجود ہے، صحابہ نے کہا، ہم یہ نہیں پوچھتے ہے، تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

فيوسف نبي الله ابن نبي الله ابن نبي الله ابن خليل الله (مشکوٰۃ)	بلحاظ نسب تو یوسف علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ خود بھی نبی، نبی کے بیٹے ہیں، نبی کے پوتے ہیں، خلیل اللہ کے پڑپوتے ہیں۔

یعنی بلحاظ نسب یوسف علیہ السلام کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، اس لئے کہ وہ خود بھی نبی ہیں، اور ان کی

تین پشتیں نبوت سے سرفراز ہیں، کیونکہ اللہ کے ہاں انساب کی کوئی اہمیت نہیں، بلکہ تقوی کی اہمیت ہے لہذا شفاعت کبریٰ اسی شخص کو مل سکتی ہے، جو تقوی کے زیور سے سب سے زیادہ آراستہ ہے

غلط فہمی "اگر کسی طالب العلم کو ایک سال پہلے یہ معلوم ہو جائے، کہ وہ امتحان میں کچھ لکھے یا نہ لکھے وہ بہر رنگ کامیاب ہو جائے گا، تو وہ یقیناً کام چھوڑ کر آوارہ گردی شروع کر دیگا" (دو اسلام ص۲۸۸)

ازالہ طالب علم کام کرنا اس وقت چھوڑ سکتا ہے، جب اسے کامیابی کا یقین ہو، شفاعت کے سلسلہ میں یقین نہ قرآن سے حاصل ہوتا ہے نہ احادیث سے، بلکہ قرآن و حدیث کی تصریحات کی بناء پر اصل چیز جس پر شفاعت کا دارومدار ہے، وہ انسان کا اپنا عمل ہے، پس نجات دو چیزوں پر موقوف ہوئی ایک عمل، دوسرے شفاعت، لہذا ایسا کون بے وقوف ہوگا، جو صرف ایک شرط کو پورا کرے گا، اور دوسری کو چھوڑ دے گا، حالانکہ شرط شفاعت تو شرط عمل ہی پر موقوف ہے، حدیث شفاعت میں یہ چیز موجود ہے، یعنی جن کو قرآن روک دے گا، ان کے حق میں شفاعت نہیں ہوگی لہٰذا کیا اعتراض ہے؟

غلط فہمی "رسول اللہ رو رہے تھے ... کہ اللہ نے جبریل سے کہا، اے جبریل محمد (صلعم) کے پاس جاؤ اور اسے ہماری طرف سے کہو کہ ہم تمہیں تمہاری امت کے متعلق خوش کریں گے، اور مغموم نہ ہونے دیں گے (مسلم) اس وعدہ کی رو سے ہم سب کو جنت میں تو پہنچ ہی جانا ہے، پھر کام کیوں کریں، نماز کیوں پڑھیں روزے کیوں رکھیں، اور جہاد کے خوفناک مصائب کیوں برداشت کریں (دو اسلام ص۲۸۹)

ازالہ ایک مسلمان کی یہ خواہش ہوتی ہے، کہ اللہ تعالےٰ کی رضا حاصل ہو جائے، وہ اللہ کی خوشی میں خوش ہوتا ہے، لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز ہی سے خوش ہوں گے، جس سے اللہ خوش ہوگا سفارش آپ اس ہی کی کریں گے، جس کی سفارش کرنے سے اللہ خوش ہوگا، لہذا ایسا موقع تو کوئی آئیگا ہی نہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفارش کرنا چاہیں، اور سفارش قبول نہ ہو، اور پھر سفارش قبول نہ ہونے پر آپ کو ملال ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو خود اسی کی سفارش سے خوش ہوں گے، جس کی سفارش کی اجازت ہوگی، اور جس کی سفارش کی اجازت نہ ہوگی، اس سے آپ خود بیزار ہوں گے، مثلاً ایک حدیث میں ہے، کہ امت کے بہت سے لوگوں سے آپ فرمائیں گے

سُحقًا سُحقًا (صحیح بخاری و مسلم) یعنی دور ہو جاؤ، دور ہو جاؤ

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ بعض لوگوں سے آپ کو نفرت ہوگی، اور آپ سفارش ہی نہ کریں گے، اور جن سے آپ کو محبت ہوگی، وہ وہی لوگ ہوں گے، جو اللہ کے بھی پیارے ہوں گے، اور ان ہی کے حق میں سفارش قبول ہونے کے بعد آپ خوش ہو جائیں گے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور انہوں نے نیک
اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ جَزَآؤُهُمْ	عمل کئے، وہ بہترین مخلوق ہیں، ان کی جزا باغ
عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ	عدن ہے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا	میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ اللہ سے راضی، اور
اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ	اللہ ان سے راضی ہوگا، یہ سب کچھ اس کے لئے
ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (البینة)	ہے، جو اللہ سے ڈرتا ہے

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ	اے نفس مطمئنہ جا اپنے رب کی طرف تو اس سے
اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ	راضی وہ تجھ سے راضی، اللہ کے بندوں میں داخل
فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر)	ہوجا، اور میری جنت میں داخل ہوجا۔

ان آیات سے ثابت ہوا، کہ ہر صالح مومن کو اللہ تعالیٰ راضی کر دے گا، تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ سید الاولین والآخرین کو اللہ تعالیٰ راضی نہ کرے گا، ضرور کریگا، لہٰذا حدیث زیر بحث بالکل قرآن کے مطابق ہے برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔

دوسرا جواب برق صاحب احادیث میں اگر شفاعت کا ذکر ہے، تو احادیث میں یہ بھی ہے، کہ آپ کا امتی کون ہے، اور امت سے خارج کون ہے، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

ﷺ من غش فلیس منی (مسلم) جو ہمیں دھوکہ دے، وہ ہم میں سے نہیں ہے

اسی طرح بے نمازی کو آپ نے کافر تک فرمایا ہے، قریب قریب یہی حال روزہ کا ہے، جہاد کے متعلق فرمایا ہے، کہ جو شخص نہ جہاد کرے، نہ جہاد کا ارادہ رکھے، تو یہ نفاق کی علامت ہے، اب ان حالات میں یہ بتائیے، کہ امتی کون ہے اور امت سے خارج کون ہے؟ بلکہ مختصر اور جامع الفاظ میں آپ نے فرما دیا:۔

من رغب عن سنتی فلیس منی (بخاری مسلم) جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں مطلب یہ کہ جو شخص آپ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرتا ہے، وہی امتی ہے، اور اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ آپ کو ناخوش نہ کرے گا، کہیئے اب حدیث زیر بحث پر کیا اعتراض ہے؟

باب - ۱۵

"قرآن سے متصادم احادیث"

غلط فہمی "حدیث ملاحظہ ہو ......

مجھے حکم دیا گیا ہے، کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں، جب تک کہ وہ خدا کو ایک مان کر میری رسالت کا اقرار نہ کریں، اور صلوٰۃ وزکوٰۃ کے پابند نہ ہو جائیں، اگر وہ ان باتوں کو مان لیں تو پھر میں ان کی جان اور مال سے کوئی تعرض نہیں کروں گا، ہاں جان ومال میں اللہ کے حقوق کسی طرح ساقط نہیں ہوں گے (بخاری جلد ۱ ص۸)

یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے:۔

اول:۔ قرآن حکیم نے بدامنی کو روکنے اور مظالم کے انسداد کے لئے جہاد کا حکم دیا ہے نہ کہ قرآن کی تعلیم زبردستی منوانے کے لئے" (دو اسلام ص۲۹۲)

ازالہ اس غلط فہمی کا ازالہ خود برق صاحب کی تحریر میں موجود ہے، برق صاحب فرماتے ہیں:۔

"قرآن میں بار بار یہی حکم دیا گیا ہے، کہ ظالموں، بدعہدوں سے لڑو، لیکن اگر مندرجہ ذیل چار صورتوں میں سے کوئی صورت پیدا ہو جائے تو جنگ ختم کردو۔

اول:۔ جب فتنہ اور بدامنی ختم ہو جائے .....

دوم:۔ جب دشمن سے صلح ہو جائے ......

سوم:۔ جب وہ جزیہ دینے پر راضی ہو جائے ....

چہارم:۔ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ اور اگر وہ توبہ کرنے کے بعد صلوٰۃ وزکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو پھر ان کے راستہ سے ہٹ جاؤ

(دو اسلام ص۲۹۲ ص۲۹۳)

برق صاحب یہ چوتھی وجہ جو آپ نے تحریر کی ہے، وہی حدیث مذکور میں ہے، اور اس آیت ہی کی تشریح اس حدیث میں ہے، بلا وجہ آپ نے اس حدیث کو مطلق سمجھ لیا ہے، میدان جنگ میں اگر کافر مسلمان ہو جائیں، اور اس کے عملی ثبوت کے لئے نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، تو ایسے لوگوں سے لڑائی بند کرنی ہوگی

ہاں اگر وہ صرف دھوکہ دینے کے لئے مسلمان ہوں، تو حدیث میں اس کی بھی تشریح ہے یعنی "حسابھم علی اللہ" اسلامی حکومت ظاہر کی بنا پر ان کو مسلمان سمجھے گی، اور ان کا اصلی حساب اللہ کے ذمہ ہوگا، اسلامی حکومت محض دھوکہ اور نفاق کے اندیشہ سے ان پر کفر کا اطلاق نہیں کرے گی، بلکہ اصل معاملہ کو اللہ تعالے پر چھوڑ دے گی۔

بالکل اسی طرح قرآن میں بھی ہے، جو وجہ دوم کے تحت برق صاحب نے لکھا ہے یعنی کافر اگر صلح چاہیں تو صلح کرلو، یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے، کہ ہوسکتا ہے کہ کافروں نے دھوکہ دینے کے لئے صلح کی ہو، تو ایسے موقع کے لئے اللہ نے اس کے آگے فرمایا "وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" یعنی صلح کرلو اور اللہ پر توکل کرو، ایسا نہ ہو، کہ وہ صلح کرنا چاہیں، اور تم دغا کے اندیشہ سے صلح نہ کرو، بلکہ صلح ان کے ظاہری مطالبہ پر ہی کرلی جائے، اور دلوں کے معاملہ کو اللہ تعالے پر چھوڑ دیا جائے، حدیث زیر بحث میدان جنگ ہی کے متعلق ہے، ورنہ "حسابھم علی اللہ" کے الفاظ نہ ہوتے، کیونکہ میدان جنگ میں ایسا ہوسکتا ہے، کہ دشمن دھوکہ دینے کے لئے مسلمان ہوجائیں، لہٰذا آپ نے فرمایا، کہ اس کا حساب اللہ لے گا، تم ان کے ظاہری ایمان کو تسلیم کرکے لڑائی سے باز آجاؤ،

برق صاحب قرآن مجید کی جو آیت آپ نے وجہ سوم میں نقل کی ہے، وہ بھی حدیث مذکور کی تائید کرتی ہے، مگر آپ نے اسے پورا نقل نہیں فرمایا، پوری آیت اس طرح ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبۃ)	ان اہل کتاب سے جنگ کرو، جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے، اور نہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور دین حق کی پیروی نہیں کرتے، یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھو، جب تک وہ ہار مان کر جزیہ دینے پر راضی نہ ہو جائیں۔

اس آیت میں جنگ جاری رکھنے کی تین وجہیں بتائی گئی ہیں۔

(۱) اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہ لانا

(۲) حرام چیزوں کو حلال سمجھنا۔

(۳) دین حق یعنی اسلام کی پیروی نہ کرنا

یعنی جن لوگوں میں یہ تینوں باتیں نہ ہوں، ان سے لڑنا چاہیئے، دوسرے لفظوں میں اس طرح

کہا جاسکتا ہے، کہ ان لوگوں سے لڑو، اس لئے کہ وہ مسلم نہیں ہیں، اب یا تو وہ ان تینوں باتوں کو مان کر مسلم بن جائیں، تو لڑائی رک سکتی ہے، ورنہ جزیہ دینا قبول کریں، اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ مسلمان کرنے کے لئے لڑنا فرض ہے، اور جو کافر قوم اسلام قبول کرنا نہیں چاہتی، تو پھر اس کو ذلیل ہو کر جزیہ دینے پر مجبور کیا جائے، ان دونوں باتوں میں سے ایک چیز انہیں مجبوراً اختیار کرنی ہوگی، یا اسلام یا جزیہ، کہئے یہ آیت کیا کہتی ہے، کیا زبردستی مسلمان بنانے کی ہدایت نہیں دیتی، کیا یہ آیت زبردستی لوگوں کو اپنا محکوم بنانے کی ہدایت نہیں دیتی، اگر اس میں ان دونوں باتوں کا حکم ہے، تو پھر حدیث نے کیا قصور کیا؟ جو اعتراض بظاہر اس آیت پر ہے، وہی بظاہر حدیث زیر بحث پر ہے برق صاحب غلط فہمی سے تو آیات میں بھی تصادم پیدا ہوسکتا ہے، آخری باب میں اس بات کی قدرے تفصیل ہے، کہ قرآنی آیات میں بظاہر کتنا تصادم ہے، اور وہ حدیث سے کہیں زیادہ ہے

دوسری آیت سنئے:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَۃً (التوبۃ)	اے ایمان والو! اپنے گرد و پیش کے کفار سے جنگ کرو، اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہیئے۔

برق صاحب اوپر اور نیچے کی آیات پڑھ لیجئے، اور پھر بتائیے، کہ ان کافروں سے لڑنے کی کیا وجہ ہے؟ کوئی وجہ آپ کو نہیں ملے گی، پس اگر حدیث مذکور اور قرآنی آیات میں تضاد ہے، تو یہ آیت بھی تو قرآن سے ٹکراتی ہے، اگر اس کا کوئی صحیح مقام ہے، تو وہی صحیح مقام حدیث مذکور کا بھی ہے اور سنیئے:۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ (تحریم)	اے نبی کفار اور منافقین سے جنگ کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

پوری سورہ تحریم پڑھ جائیے، آپ کو جنگ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ملے گی، لہٰذا کیا میں پوچھ سکتا ہوں، کہ یہ آیت بھی قرآن سے متصادم ہے یا نہیں؟ براہ کرم احادیث کو بالاستیعاب پڑھیئے، اور پھر ان کی روشنی میں کسی حدیث کا مطلب سمجھئے، برق صاحب یہ وہ حدیث ہے، جو صحابہ کی موجودگی میں پڑھی گئی، پڑھنے والے "حسبنا کتاب اللہ" کہنے والے یعنی فاروق رضی اللہ تعالے عنہ تھے، اور جن کے سامنے پڑھی گئی، وہ مرکز ملت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالے عنہ تھے، نہ مرکز ملت نے یہ کہا، کہ میں اس کو منسوخ کرتا ہوں، نہ انہوں نے نہ کسی اور صحابی نے یہ کہا، کہ یہ تو قرآن کے بھی

خلاف ہے، یہ صحابہ کرام کی جماعت ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کی تعریف آپ بھی اپنی کتاب میں کر آئے ہیں، اور جن کی تعریف قرآن میں موجود ہے، جن کو رضی اللہ عنہ کا خطاب دیا گیا، جن کے متعلق قرآن کا دعویٰ ہے

وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا — اللہ تقویٰ کو ان کے ساتھ چمٹا دیا گیا، اور وہ اس کے حقدار بھی ہیں اور اہل بھی۔

جب ان سچے اور اسلام کا صحیح فہم رکھنے والے مسلمانوں نے اس کو قرآن کے خلاف نہیں سمجھا، تو آپ کیوں اس کو قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں۔

غلط فہمی "دوم حضور علیہ السلام نے معاذ بن جبل کو اہل بحرین سے جزیہ وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا (بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۳۱) حالانکہ وہ لوگ غیر مسلم تھے، اور اس حدیث کی رو سے ان کے خلاف جہاد کرنا چاہیے تھا" (دو اسلام صفحہ ۲۹۴)

ازالہ یہ بھی غلط فہمی ہے، جہاد کی تو اس وقت ضرورت ہے، جب دشمن نہ اسلام قبول کرے، نہ جزیہ دے، اور اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ دشمن نے جزیہ دینا قبول کر لیا، لہٰذا جہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

غلط فہمی "سوم حضور علیہ السلام نے جنگ خیبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ .... انہیں اسلام کی طرف دعوت دو ..... یہ نہیں فرمایا کہ ہر غیر مسلم کو قتل کر دو، اور جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے، جنگ جاری رکھو" (دو اسلام صفحہ ۲۹۴)

ازالہ جنگ تو جاری تھی، لہٰذا جنگ جاری رکھنے کی ہدایت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہاں بجائے جنگ آپ نے فرمایا، کہ انہیں اسلام کی دعوت دینا، اگر وہ اسلام قبول کر لیں، تو اچھا ہے تاکہ جنگ بحسن و خوبی اختتام کو پہنچے، اور بلا وجہ خونریزی نہ ہو۔

غلط فہمی "چہارم مؤطا میں مذکور ہے ایک اعرابی نے حضور کے ہاتھ پر بیعت کی، اور پھر کہنے لگا، میں بیعت کو توڑتا ہوں تین مرتبہ یہی التجا دہرائی، لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا، اس کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا، تو آپ نے فرمایا مدینہ ایک بھٹی کی طرح ہے، جہاں خالص دھات باقی رہ جاتی ہے، اور کثافت نکل جاتی ہے" (مؤطا صفحہ ۳۵۹)

اس موقع پر حضور نے اس مرتد سے جنگ نہیں کی، بلکہ خاموش رہے، جس سے یہی نتیجہ نکلتا

ہے، کہ اسلام میں کسی کا مذہب بجبر تبدیل کرنے کی کوئی ہدایت موجود نہیں (دو اسلام ص۲۹۴-۲۹۵)
اس حدیث میں یہ کہاں ہے، کہ آپ نے اس سے جنگ نہیں کی۔

ازالہ دوم:- اس حدیث میں یہ کہاں ہے، کہ وہ سلطنت اسلامیہ میں ہی رہا، ہوسکتا ہے کہ وہ دار الحرب میں چلا گیا ہو، اور آپ اس پر قادر نہ ہو سکے ہوں، اور یہ بالکل قرین قیاس ہے، اس لئے کہ اسلامی حکومت اس وقت تک صرف مدینہ ہی تک محدود تھی، اور یہ اوائل اسلام کا زمانہ تھا، مدینہ کی آب و ہوا خراب تھی، اسی وجہ سے اس اعرابی کی صحت بھی خراب ہوگئی، اور اس نے بیعت توڑنی چاہی، کچھ عرصہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے مدینہ کی آب و ہوا اچھی ہوگئی تھی۔

سوم:- اس حدیث میں جو اصل مضمون ہے، وہ برقی صاحب نے چھوڑ دیا، اصل مضمون اس طرح ہے، کہ اس کو مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی، تو اس نے مدینہ سے باہر جانا چاہا، اور بیعت واپس کرنے کے لئے کہا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں "فاصاب الاعرابی وعك بالمدینة" یعنی وہ مدینہ میں کسی مرض میں مبتلا ہوگیا (صحیح مسلم باب المدینۃ تنفی شرارہا) پس ثابت ہوا، کہ وہ شخص محض مدینہ سے باہر جانا چاہتا تھا لیکن آپ نے اس کی اجازت نہیں دی، بلکہ خاموش رہے، حدیث کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس نے مدینہ میں رہنے کی بھی بیعت کی تھی، اس بیعت کو توڑ کر وہ چلا گیا، بتائیے اس میں ارتداد کا ذکر ہی کہاں ہے۔

غلط فہمی "اور یہ حدیث بھی وضعی ہے" من بدل دینہ فاقتلوہ" کہ جو شخص اسلام چھوڑ جائے اسے قتل کر ڈالو" (دو اسلام ص۲۹۵)

ازالہ پہلا جواب:- برقی صاحب کافر کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور کرنا، یہ از روئے آیت قرآنی ناجائز ہے، اور اسلام پر مسلمان کو قائم رہنے کے لئے مجبور کرنا، یہ از روئے حدیث ہے یہ دو مختلف مسئلے ہیں، دونوں ایک نہیں، قرآن میں جو کچھ ہے، وہ بھی صحیح ہے، اور جو کچھ حدیث میں ہے وہ بھی صحیح ہے، وہ اپنی جگہ پر اور یہ اپنی جگہ پر، لہٰذا تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تصادم وہاں ہوتا ہے جہاں مسئلہ ایک ہو، اور حکم دو اور متضاد، یہاں مسئلے دو ہیں لہٰذا حکم بھی دو ہیں۔

پہلا مسئلہ:- کافر کو اسلام لانے کے لئے مجبور کرنا،

دوسرا مسئلہ:- مسلمان کو اسلام پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرنا

پہلا مسئلہ "لا اکراہ فی الدین" کے مطابق ہے اور دوسرا مسئلہ "من بدل دینہ فاقتلوہ" کے مطابق ہے، لہٰذا حدیث قرآن کے خلاف نہیں۔

دوسرا جواب اس حدیث کی صحت کا ایک اور ثبوت بھی ہے، اور وہ ہے تاریخی ثبوت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین سے جنگ کی یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے، اور محدثین کے اصول پر بھی یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے، لہٰذا مسئلہ یہی ہوا، کہ مرتد سے قتال ضروری ہے اگر آپ اس مسلمہ واقعہ کا بھی انکار کر دیں، تو پھر یہ کہا جائے گا، کہ آپ حقائق کا بھی انکار کر دیتے ہیں، اور اس کی آپ سے توقع نہیں ہے۔

تیسرا جواب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (آل عمران)

اور اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا، کہ صبح کے وقت ایمان لے آؤ، اس چیز پر جو ایمان والوں پر نازل کی گئی ہے، اور شام کے وقت اس کا انکار کر دو، شاید مسلمان بھی اس طریقہ سے اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔

یہ بھی اہل کتاب کی ایک چال۔ مسلمان ہو جانے کے بعد اگر پھر کوئی شخص دوبارہ کافر ہو جاتے، تو دوسروں پر اس کا برا اثر پڑتا ہے، اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں، کہ اسلام میں کوئی نہ کوئی ایسی خرابی ہے، کہ مسلمان ہونے کے بعد لوگ پھر اس سے منحرف ہو جاتے ہیں، اور خود مسلمان بھی یہ گمان کر سکتے ہیں، کہ واقعی کوئی ایسی خرابی ہے، کہ لوگ مسلمان ہو کر پھر کافر ہو گئے، ان کے ایمان میں بھی تزلزل کا اندیشہ ہے، اور کافروں کے مسلمان نہ ہونے کا بھی خطرہ ہے، اور یہ چیز اسلامی معاشرہ کے لئے بڑی خطرناک ہے، اس سے اسلام کی ترقی رک جاتی ہے، اور اگر کہیں مسلمان ہو کر کافر ہو جانے والا شخص ذی حیثیت اور ذی علم ہو، تو پھر اس کا بہت ہی برا اثر پڑتا ہے، لوگوں کو گمان ہوتا ہے، کہ اتنا بڑا آدمی، اتنا بڑا عالم جب اسلام سے برگشتہ ہو گیا، تو ضرور کوئی مخفی خرابی ہے، جس کی وجہ سے وہ اسلام سے منحرف ہو گیا، یہ خطرہ کا بہت ہی خوفناک پہلو ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس سازش کی اطلاع اس آیت میں دی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دینی قانون نافذ کر دیا، کہ

من بدل دینہ فاقتلوہ — جو مرتد ہو جائے، اسے قتل کر دو۔

سازش کرنے والوں کے حوصلے پست ہو گئے، اور اسلام ترقی کے مراحل طے کرتا چلا گیا، یہ ہے حدیث کا پس منظر، کتنا معقول قانون ہے، جس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے، معلوم نہیں، اس قابل فخر قانون کو برق صاحب کیوں نہ سمجھ سکے، اور کیوں اس کی افادیت کا اندازہ نہ لگا سکے۔

کافروں کی گہری سازشوں کے سدباب کے لئے یہی قانون ہے، فللہ الحمد

یہ خطرہ اسلام اور اسلامی معاشرہ کو ہر وقت درپیش ہے، لہٰذا یہ حدیثی قانون بھی غیر متبدل ہے اگر یہ قانون نہ ہو، تو ارتداد کے دروازے کھل جاتے ہیں، اس قانون نے ارتداد کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، اور اسلام کو تمام خطروں سے بچا لیا، یہ ہے، اس حدیث کا سیاسی و نفسیاتی جائزہ!

چوتھا جواب کسی وقت بھی ہو سکتا ہے، کہ دشمن عناصر کسی مسلمان کا ایمان خرید لیں، یا دوسرے مذاہب کی تبلیغی جماعتیں محض روپیہ کے بل بوتہ پر مسلمانوں کو مرتد کرنے لگ جائیں جیسا کہ آج کل ہمارے ملک میں ہو رہا ہے، لہٰذا اس کے انسداد کے لئے بھی ضروری ہے، کہ اسلامی حکومت کے پاس کوئی غیر متبدل قانون ہو، جو اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکے، اور یہی وہ قانون ہے، جو حدیث مذکور کی صورت میں ہمیں دیا گیا ہے، یہ ہے اس کا دینی پہلو!

پانچواں جواب اسلام ایک عسکری نظام ہے، خانقاہی نظام نہیں ہے، اور مسلمانوں کا بچہ بچہ اسلامی فوج کا سپاہی ہے، یہاں آپ کے کان تلواروں کی جھنکار سنیں گے اور آپ کی آنکھ غازیوں کے وہ جھرمٹ دیکھے گی، جو شہادت کی لازوال دولت حاصل کرنے کے لئے جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود رہے ہیں، یہاں وہ پروانے نظر آئیں گے، جو کسی کے جمال جہاں آرا پر رہ رہ کر قربان ہو رہے ہیں، برق صاحب آپ کے نزدیک تو جہاد ہی روح اسلام ہے، لہٰذا اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا جائے گا، وہ تو آپ کو پسند ہونا ہی چاہیئے، یہ تو صحیح ہے کہ حکومت کسی شہری کو زبردستی فوج میں شامل نہیں کرتی، اور یہ لا اکراہ فی الدین کا ایک منظر ہے، لیکن جب کوئی شخص خود فوج میں شامل ہو جاتا ہے، تو پھر وہ خود فوجی خدمات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا، اور اگر وہ خود فوجی خدمات سے علیحدگی اختیار کرے، اور کسی فوجی ضابطہ کو ماننے سے انکار کر دے، تو حکومت کا فوجی قانون اس کو برداشت نہیں کر سکتا، حکومت فوراً اس کو سزائے موت دے گی، اور یہ من بدل دینہ فاقتلوہ" کا منظر ہے۔

بالکل اسی طرح اسلام ایک فوجی نظام ہے حکومت الٰہیہ کسی کو اس بات پر تو مجبور نہیں کرتی کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائے، لیکن جب کوئی شخص خود بخود اس فوجی نظام میں داخل ہو جاتا ہے، تو پھر اس کو علیحدگی کا اختیار باقی نہیں رہتا، اور اگر کوئی شخص خود علیحدگی اختیار کرے، تو اس کی سزا عام دنیاوی قانون کے لحاظ سے بھی، اور دینی قانون کے لحاظ سے بھی موت کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا اس اسلامی عسکری نظام میں سے جس وقت بھی کوئی شخص نکلے گا، اس کو موت کی سزا دی جائے گی، یہ ملازمت کی طرح عارضی چیز نہیں بلکہ

یہ چیز دائمی ہے، اور مسلمان عہد سے لے کر لحد تک اسلام کا ایک سپاہی ہے، وہ کسی وقت بھی خود اپنے آپ کو اس فوجی نظام سے علیحدہ نہیں کر سکتا، اور کیونکہ فوج کا سپاہی مقررہ میعاد تک کے لئے ملازم ہوتا ہے، اس میعاد کے بعد حکومت اس کو علیحدہ کر دیتی ہے، اور اگر وہ علیحدہ نہ کرے تو اس کا بھی اسکو اختیار ہے ٹھیک اسی طرح جو شخص ایمان لا کر اسلامی عسکری نظام میں شامل ہو جاتا ہے، وہ اپنی پوری زندگی اسلام کی وفاداری میں گزارنے کا عہد کرتا ہے، لہٰذا اس مقررہ میعاد میں وہ خود علیحدگی اختیار کرنا تو کجا اگر وہ علیحدہ ہونے کی درخواست بھی کرے، تو حکومت وقت کو اختیار ہے، کہ اسے علیحدگی کی اجازت نہ دے، اس اختیار کے استعمال پر اعتراض صحیح نہیں،

فوجی ملازمت کیونکہ عارضی ہوتی ہے، لہٰذا حکومت سوچ سکتی ہے، کہ اب فلاں سپاہی کو سبکدوش کر دیا جائے، تو مضائقہ نہیں، لیکن اسلامی فوج کی رکنیت عارضی نہیں بلکہ دائمی ہوتی ہے، لہٰذا حکومت کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کہ وہ کسی اسلامی سپاہی کو فوجی رکنیت سے علیحدہ کر دے، جو شخص اسلامی فوجی نظام میں داخل ہوتا ہے، وہ اس معاہدہ کی پابندی کے ساتھ داخل ہوتا ہے کہ اب موت تک اس نظام سے وابستہ رہے گا، اگر وہ اس معاہدہ کے ساتھ آنا نہیں چاہتا، تو نہ آئے، اس پر جبر نہیں کیا جائے گا، لیکن جب وہ آ جائے گا، تو پھر اپنے معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا، اور اگر کریگا تو یقیناً موت کی سزا پائے گا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ اگر مرتد کو بہ حیثیت ایک ذمی کے برداشت کر لیا جائے، تو کیا حرج ہے، اس کا جواب یہ ہے، کہ جب تک کوئی شخص فوج میں داخل نہ ہو، شہری کی حیثیت سے رہ سکتا ہے، وہ جہاں چاہے جائے آئے، اس پر کوئی پابندی نہیں، لیکن فوج میں داخل ہونے کے بعد اس کو اس قسم کی آزادی نہیں رہتی وہ ایک ضابطہ کا پابند ہوتا ہے، وہ فوجی اسرار سے واقف ہوتا ہے، اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، ذمی محض ایک شہری ہے، اور مسلم ایک سپاہی ہے، جو شخص مسلم ہے، وہ گویا اسلامی فوج کے اسرار سے بھی واقف ہے، اور جو ذمی ہے، وہ اسلامی فوج کا رکن بن ہی نہیں سکتا، لہٰذا وہ فوجی اسرار سے واقف بھی نہیں ہو سکتا، لہٰذا کسی ایسے شخص کا جو فوجی اسرار سے واقف ہو، خود فوج سے نکل جانا بڑا اہم معاملہ ہے یہ بغاوت کے مترادف ہے، وہ شخص اسلامی عسکری ضابطہ کا انکار کرتے ہی دوسری صف میں کھڑا ہو گیا، وہ کسی وقت بھی اسلامی نظام کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، لہٰذا اسلامی نظام کی بقاء کی خاطر اس کا قتل کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ اس کا قتل ضروری ہو جاتا ہے، اور یہی اس حدیث کا عسکری و سیاسی

پہلو ہے، برق صاحب حدیث کیا ہے، در بے بہا ہے، اسی قسم کے جواہر ہیں، جو امام بخاری، امام مسلم وغیرہ نے اپنی کتابوں میں جمع کر دیئے ہیں، ان کی قدر وہی کر سکتا ہے، جو اس کا قدر دان ہو" قدر گوہر شاہ بداند یا بداند جوہری" کیونکہ بمصداق مہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ" اور بفحوائے حدیث پاک "لا مالک الا اللہ" کوئی بادشاہ نہیں سوائے اللہ کے (صحیح مسلم) آپ بادشاہ تو بن نہیں سکتے، لہذا جوہری بننے کی کوشش کیجیے، اور اگر جوہری بھی نہیں بن سکتے، تو پھر کسی جوہری سے پوچھ لیا کیجیے، مگر افسوس جو جوہری آپ کو ملا، وہ آپ کا اصطلاحی ملا تھا۔

برق صاحب ایمان بالغیب، ایمان باللہ، ایمان بالرسول کا تقاضا یہی ہے، کہ جو کچھ ہمیں اللہ کی طرف سے بذریعہ رسول ملے، اس پر ایمان لائیں، اپنی عقلوں کو معیار نہ بنائیں، اگر ہم ایسا کریں تو پھر ہمارا ایمان رسول پر تو نہ ہوا، بلکہ عقل پر ہوا، پھر عقلیں ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ ہیں، ایک ہی بات کسی کی عقل میں آتی ہے، اور کسی کی عقل میں نہیں آتی، لہذا کسی ایک کی عقل کو معیار نہیں بنایا جا سکتا ہو سکتا ہے، کہ کسی علم کی مصلحت کسی بھی شخص کی سمجھ میں نہ آئے، لیکن اس کے باوجود ہمیں اس حکم کو تسلیم کرنا ہوگا، اس لئے کہ وہ حکم اس ہستی کی طرف منسوب ہے، جو مخفی مصالح سے واقف ہے، جہاں انسانی عقول کی رسائی نہیں ہو سکتی، ہمارا صرف اتنا فرض ہے، کہ ہم یہ دیکھ لیں، کہ جو حکم ہم تک پہنچ رہا ہے اس کا ذریعہ کیا ہے، اگر ذریعہ صادق القول، معتبر، پرہیزگار لوگوں کا ہے، تو پھر ہمیں اس کو تسلیم کرنا ہوگا محض عقل کی کسوٹی پر رکھ کر اس کا انکار کر دینا شکست خوردہ ذہنیت، احساس کمتری، بے ایمانی شقاق، ہٹ دھرمی، ہیچ میں دیگرے نیست کے سوا کچھ نہیں ہے۔

باب - ۱۶

"غلامی اور اسلام"

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"لارڈ ہیڈلے فاروق جب مسلمان ہوئے تو آپ نے انگلستان کی مسجد میں اسلام پر ایک تقریر کی، جس میں اسلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے، آخر میں کہا"

"قرآن میں ایک نقص بھی ہے، کہ وہ حکومت کرنے کے تو سب گُر بتاتا ہے، لیکن یہ نہیں بتاتا، کہ اگر مسلمان غلام ہو جائے، تو وہ کیا کرے، سارے قرآن میں غلام مسلمان کے لئے ایک ہدایت موجود نہیں"

بدیگر الفاظ لارڈ فاروق یہ کہہ گئے، کہ قرآن جہانبانوں کا دستور العمل ہے، نہ کہ غلاموں کا"

(دو اسلام صفحہ ۲۹۶)

ازالہ برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ قرآن مجید میں نہ غلام اور لونڈیوں کا تذکرہ ہے، نہ ان کے متعلق احکام ہیں، جو کچھ ہے، بس حدیث میں ہے لہٰذا حدیث ہی قابل اعتراض ہے، لیکن اس میں برق صاحب کی زبردست غلط فہمی ہے، بلکہ خوش فہمی ہے، لارڈ ہیڈلے نے بھی قرآن کا سرسری مطالعہ کیا، اور اسی طرح برق صاحب نے بھی، ورنہ قرآن کا عالم ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہے، اب میں غلامی کے سلسلہ میں قرآنی آیات پیش کرتا ہوں، سنیئے :۔

(۱) وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ (البقرۃ)

نیکی یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں مال خرچ کرے، اقرباء کو دے، یتامیٰ، مساکین، مسافر اور سائلین کو دے، اور غلاموں کے آزاد کرانے میں خرچ کرے۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ مسلمان غلام ہو سکتا ہے، اور اس کو آزاد کرانے میں روپیہ خرچ کرنا نیکی ہے، اور یہ بھی انفاق فی سبیل اللہ کی ایک مد ہے۔

(۲) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ

اے مسلمانو! تم پر قتل کے معاملہ میں قصاص فرض

عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (البقرة)

کر دیا گیا ہے، آزاد کے بدلے میں آزاد قاتل قتل کیا جائے، غلام کے بدلے میں غلام قاتل کو قتل کیا جائے، اور عورت کے بدلے میں قاتلہ کو قتل

یہ نہیں ہو سکتا، کہ قتل تو کرے آزاد، اور سزا میں کسی غلام کو قتل کر دیا جائے، یہ تفریق اسلام میں نہیں، جو قتل کرے، وہی سزا بھگتے، اس آیت سے ثابت ہوا، کہ اسلامی معاشرہ میں غلام ہو سکتے ہیں اور ان کے لئے قانون قصاص وہی ہو گا، جو آزاد مرد و عورت کے لئے ہے

(۳) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ (البقرة)

مشرکہ عورتوں سے نکاح مت کرو، جب تک وہ ایمان نہ لائیں، اور مومنہ لونڈی بہتر ہے مشرکہ سے، اگرچہ وہ مشرکہ تم کو اچھی ہی کیوں نہ معلوم ہو، اور مشرک مردوں سے نکاح مت کرو، جب تک وہ مومن نہ ہو جائیں اور مومن غلام بہتر ہے مشرک سے اگرچہ وہ مشرک تم کو اچھا ہی کیوں نہ معلوم ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ مسلم معاشرہ میں مسلمان لونڈی، غلام ہو سکتے ہیں، اور ان سے آزاد مرد و عورت کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔

(۴) وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء)

اگر تمہیں یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کرنے کا اندیشہ ہو تو دوسری عورتوں سے جو تمہیں پسند ہو نکاح کر لو، دو سے، تین سے، چار سے، اگر یہ اندیشہ ہو، کہ بیویوں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا لونڈی رکھ لو۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ لونڈیاں رکھی جا سکتی ہیں، ان سے صحبت کی جا سکتی ہے، ان کے درمیان مساوات رکھنا بھی لازم نہیں ہے، اور یہ لونڈیاں مسلمان ہی ہو سکتی ہیں، اس لئے کہ کافر اور مشرک عورت سے تعلق رکھنا حرام ہے

(۵) وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ

جن لوگوں کو آزاد عورتوں سے نکاح کا مقدور نہ ہو، وہ مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لیں، اللہ کو تمہارے ایمان کا خوب علم ہے، بعض تمہارے

فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیْھِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (النساء)

بعض سے ہیں، ان لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کیا کرو، اور قاعدہ کے مطابق ان کا مہر بھی دیا کرو، وہ لونڈیاں خفیہ یا علانیہ بدکاری کے لئے نہ رکھی جائیں جب وہ منکوحہ بن جائیں، اور پھر کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں، تو ان کو آزاد عورتوں کی سزا سے نصف سزا دی جائے۔

اس آیت سے بھی ثابت ہوا، کہ مسلم معاشرہ میں مسلمان لونڈیاں ہوسکتی ہیں، ان کے آقا ہی ان کے نکاح کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، ان لونڈیوں کو مہر بھی دینا چاہیئے، وہ اگر زنا کریں، تو ان کو نصف سزا دی جائے

کیا اب بھی آپ کہہ سکتے ہیں، کہ قرآن، لونڈی غلاموں کے احکام سے خاموش ہے،

(۶) حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّھٰتُکُمْ .... وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (النساء)

تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں ..... اور شوہر والی عورتیں بھی حرام ہیں، مگر لونڈیاں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

(۷) وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ..... وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (النساء)

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی قسم کا شرک مت کرو، والدین کے ساتھ احسان کرو .... اور لونڈی غلام کے ساتھ بھی احسان کرو۔

(۸) وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ (المعارج)

اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے بیویوں اور لونڈیوں کے کہ ان کے ساتھ صحبت کرنے میں وہ ملامت کے قابل نہیں

(۹) قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ .... وَلَا یُبْدِیْنَ

مسلمان عورتوں سے کہہ دیجیئے، کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں ...... اور اپنی زینت کو کسی

زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ	پر ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے خاوندوں کے یا اپنے
اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ . . . . اَوْ مَا	باپوں کے، یا خاوند کے باپوں کے . . . . .
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ (النور)	یا اپنے غلاموں کے۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ مسلمان عورتیں اپنے غلاموں کے سامنے اپنی زینت کا اظہار کر سکتی ہیں، ان سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۰) وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ	دنیا کمانے کی غرض سے اپنی لونڈیوں کو زناکاری
اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ	پر مت مجبور کرو، اگر وہ لونڈیاں پاک دامن
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (النور)	رہنا چاہیں۔

برقی صاحب اگر وہ پاک دامن نہ رہنا چاہیں، تو بظاہر آیت مذکورہ بالا سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پھر ان کو زناکاری پر مجبور کیا جا سکتا ہے، کیا اس سے قحبہ خانہ کھولنے کی اجازت نہیں نکلتی؟ کیا بظاہر اس آیت پر اعتراض وارد نہیں ہوتا؟ آخر غلط فہمی کا شکار صرف حدیث ہی کیوں ہے۔

(۱۱) وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا	اور جو لونڈی غلام مکاتب بننا چاہیں، تو ان کو مکاتب
مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ	بنا لیا کرو، بشرطیکہ تم یہ سمجھو کہ یہ ان کے حق میں بہتر
عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ	ہے اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے ان
مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ (النور)	مکاتبین کو بھی دیا کرو۔
(۱۲) وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ	اور جو غیر شادی شدہ ہوں، ان کا نکاح کر دیا
الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ	کرو، اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو صالح
(النور)	ہوں، ان کا بھی نکاح کر دیا کرو۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ مسلمان لونڈی، غلام کو صالح ہونا چاہیئے، اور یہ کہ صالح مومن بھی غلام ہو سکتا ہے، برقی صاحب اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے غلاموں کو اپنے آقا کا عبد کہا ہے، کیوں صاحب اگر یہی بات حدیث میں ہوتی، تو کیا ہوتا؟ کیا کہنے والا یہ نہ کہہ دیتا کہ کیونکہ یہ حدیث شرک کی تعلیم دیتی ہے لہٰذا یہ موضوع ہے، جعلی ہے، کہئے اب اس آیت کے متعلق کیا کہا جائے۔

(۱۳) وَلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ	کوئی حرج نہیں اگر تم اپنے گھروں میں سے کھاؤ
بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ	یا اپنے باپوں کے گھروں میں سے کھاؤ . . . .
اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ (النور)	یا جن کنجیوں کے تم مالک ہو۔

(۱۴) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ..... وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ	بے شک فلاح پائی مومنین نے، جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں ..... اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے بیویوں اور لونڈیوں کے، کہ ان کے بارے میں انہیں کوئی ملامت نہیں

(مومنون)

(۱۵) وَالَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا (مجادلہ)	جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں، پھر تلافی کرنی چاہیں، تو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کریں۔
(۱۶) فَکَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰکِیْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِیْکُمْ اَوْ کِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ	جو شخص قسم کھالے، تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مساکین کو اوسط درجہ کا کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے، یا ایک غلام آزاد کرے۔

(الانعام)

غرض یہ کہ قرآن مجید میں اس قسم کی بیسیوں آیات ہیں، جن میں لونڈی غلاموں کے متعلق احکام بیان کئے گئے ہیں، چند آیات بطور نمونہ اوپر نقل کی گئی ہیں، ان آیات سے مندرجہ ذیل احکام نکلتے ہیں

(۱) لونڈی غلاموں کی آزادی کے لئے روپیہ خرچ کرنا نیکی ہے

(۲) اگر غلام کسی کو قتل کر دے، تو وہ غلام ہی قتل ہوگا، نہ کہ آزاد آدمیوں میں سے کوئی دوسرا شخص

(۳) مسلمان لونڈی، غلام ہو سکتے ہیں، اور ان سے آزاد مرد و عورت نکاح کر سکتے ہیں

(۴) جنگ میں گرفتار ہونے والی لونڈیوں سے نکاح کیا جاسکتا ہے اور ان میں مساوات کرنا لازمی نہیں، نہ ان کی تعداد مقرر ہے

(۵) لونڈیوں سے صحبت کی جا سکتی ہے، اگرچہ وہ شوہر والی ہوں

(۶) مسلمان لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کیا جا سکتا ہے، لونڈیوں کو مہر بھی دینا چاہیے۔

(۷) لونڈی غلام اگر زنا کریں، تو ان کو نصف سزا ملے گی۔

(۸) لونڈی غلاموں کے ساتھ نیکی کرنی چاہیے۔

(۹) آزاد عورتیں اپنے غلاموں کے سامنے آ سکتی ہیں

(۱۰) لونڈیوں کو دنیا کمانے کے لئے زنا پر مجبور کرنا منع ہے خصوصاً جبکہ وہ پاکدامن رہنا چاہیں۔

(۱۱) لونڈی غلام کو مکاتب بنانا چاہیئے بشرطیکہ اس میں بہتری ہو،

(۱۲) صالح لونڈی، غلام کا نکاح کر دینا چاہیئے۔

(۱۳) مالک اپنے غلاموں کے گھر میں سے بغیر اجازت کھا پی سکتے ہیں۔

(۱۴) ظہار، قتل خطا، اور قسم کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا فرض ہے، وغیرہ وغیرہ۔

غرض یہ کہ اتنے احکام موجود ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرنا، کہ قرآن میں مسلمان لونڈی اور مسلمان غلام کے وجود کا سرے سے ذکر ہی نہیں بڑی زبردست غلط فہمی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا غلام تو ہو سکتا ہے، اور اس کا وجود بے شک قرآن سے ثابت ہے، لیکن ایک مسلمان ایک کافر کا غلام نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ "قرآن جہانبانوں کا دستور العمل ہے نہ کہ غلاموں کا" (دو اسلام صفحہ ۲۹۶) مطلب یہ کہ کوئی مسلمان کبھی محکوم ہو ہی نہیں سکتا، وہ ہمیشہ حاکم ہوگا، اور کافر محکوم، اور اس وجہ سے قرآن میں ایسا کوئی حکم نہیں، کہ مسلمان اگر غلام ہو، اور کافر آقا ہو، تو وہ کیا کرے، تو اس کا جواب سنیئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(۱) وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَاَتِهٖ اَكْرِمِيْ مَثْوَاهُ عَسٰى اَنْ يَّنْفَعَنَا اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (یوسف)	جس شخص نے مصر میں یوسف علیہ السلام کو خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کو اچھی طرح رکھنا شاید یہ ہمارے کام آئے یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔

ظاہر ہے کہ یوسف علیہ السلام فروخت ہوئے، اور عزیز مصر کے ہاں بہ حیثیت غلام کے رہے کیونکہ قرآن سے یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ اس نے ان کو بیٹا بنایا ہو، پھر کیا ہوا، سنیئے:۔

(۲) وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (یوسف)	اور جب وہ جوان ہوئے تو ہم نے ان کو علم و حکمت عطا فرمائی (یعنی نبوت یا کم از کم دولت ایمان سے سرفراز فرمایا)

اس کے بعد اس عورت کے عاشق ہونے کا قصہ شروع ہوتا ہے، پھر کیا ہوا، سنیئے:۔

(۳) وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ (یوسف)	شہر کی عورتوں نے کہا، کہ عزیز کی بیوی اپنے جوان (غلام) سے خواہش کرتی ہے

اس آیت سے بھی معلوم ہوا، کہ وہ غلام تھے، ورنہ عورتیں ان کو بیٹا کہتیں۔

(۴) يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (یوسف)

یوسف علیہ السلام نے کہا، اے قید خانہ کے ساتھیو، کیا کئی متفرق رب بہتر ہیں، یا ایک اللہ زبردست۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ یوسف علیہ السلام قید خانہ میں بھی رہے، اور یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک مومن کافروں کے ہاں قید ہو سکتا ہے۔

(۵) قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَائِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (یوسف)

یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا، کہ مجھے ملک کے خزانوں پر مامور کر دیجئے میں حفیظ اور علیم ہوں

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ مومن، کافر حکومت کا ملازم بھی ہو سکتا ہے

خلاصہ آیات بالا کا خلاصہ یہ ہوا، کہ مومن غلام بھی ہو سکتا ہے، قیدی بھی ہو سکتا ہے، اور محکوم بھی، مومن غلام اور مومن قیدی کے متعلق ان آیات کی روشنی میں مندرجہ ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں

(۱) مومن اگر غلام ہو جائے، تو صالح زندگی گذارے آقا کا وفادار رہے، خیانت نہ کرے، اللہ تعالیٰ کا بندہ بن کر رہے۔

(۲) مومن اگر کافروں کے ہاں قید ہو جائے، تو ایسے مقام میں بھی تبلیغ کرتا رہے۔

(۳) مومن اگر محکوم ہو جائے، تو امانت داری سے اپنے حاکم کے کام کی نگرانی کرے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے، کہ ممکن ہے، کہ عزیز مصر مسلمان ہو، تو اس کا جواب یہ ہے، کہ محض امکان سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی، اگر وہ مومن تھا، تو ظاہر ہے، کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ہی ایمان لایا ہوگا، اگر یہ صورت ہے تو نا ممکن ہے، کہ اپنے پیغمبر کو غلام رکھے یا قیدی، اور اگر وہ کسی دوسرے پیغمبر پر ایمان رکھتا تھا، اور ان کی پیغمبری سے انکار تھا، تو بھی وہ کافر ہوا، اگر یہ کہا جائے، کہ اس وقت تک یوسف علیہ السلام نبی نہیں ہوئے تھے، تو پھر یہ بتائیے، کہ وہ کب نبی بنائے گئے، قرآن سے تو یہی ثابت ہوتا ہے، کہ وہ جوان ہوتے ہی حکم اور علم دے دیئے گئے تھے، اور یہ نبوت کے خصائص میں سے ہے، خصوصاً "حکم" تو صرف نبوت ہی کا خاصہ ہے، نہ کہ مومن کا، قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ دونوں الفاظ صرف انبیاء کے متعلق استعمال ہوئے ہیں، الغرض نبوت کے بعد ہی اس عورت کے عشق اور قید و بندگی کہانی شروع ہوتی ہے، پھر تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے، کہ عزیز مصر بت پرست تھا، اس کے مکان کے ایک طاق میں بت رکھے رہتے تھے، جب اس کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو زنا کے لئے بلایا تھا، تو اپنے بتوں پر پردہ لٹکا

دیا تھا، لہذا یہ شبہ کہ عزیز مصر مسلمان تھا لغو ہے، پھر قرآن مجید سے بھی اس کا کافر ہونا ثابت ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّۃَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ کٰفِرُوْنَ وَاتَّبَعْتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ (یوسف)	یوسف علیہ السلام نے فرمایا میں نے اس قوم کے مذہب کو چھوڑ رکھا ہے، اس لئے کہ یہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، میں تو اپنے آباؤ اجداد ابراہیم اسحاق، یعقوب کی ملت کی پیروی کرتا ہوں

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ پوری قوم کافر تھی۔

دوسرا شبہ اور اس کا ازالہ

دوسرا شبہ یہ ہو سکتا ہے، کہ شاہ مصر مسلمان ہو، تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے، ارشاد باری تعالےٰ ہے:۔

مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ (یوسف)	یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کو اس بادشاہ کے دین کے مطابق قید نہیں کر سکتے تھے

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ بادشاہ کا قانون چل رہا تھا، ورنہ یہ کہا جاتا، کہ یوسف علیہ السلام کو جو شریعت دی گئی تھی، اس کے مطابق وہ اپنے بھائی کو قید نہیں کر سکتے تھے، پھر وہ قانون بادشاہ کی طرف منسوب نہ ہوتا، بلکہ اللہ کی طرف منسوب ہوتا، دوسرے یہ کہ اس صورت میں یوسف علیہ السلام اپنی منزل من اللہ شریعت کی خلاف ورزی بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اوپر قرآنی آیت سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے، کہ پوری قوم کافر تھی، لہذا بادشاہ بھی کافر تھا،

قرآن مجید سے مؤمنین کے قیدی ہونے کا دوسرا ثبوت

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّھُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ ھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ	کیا آپ نے بنی اسرائیل کی اس جماعت کی طرف نہیں دیکھا، جس نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد اپنے نبی سے کہا، کہ ہم پر ایک سپہ سالار مقرر کر دیجئے، کہ ہم اللہ کے راہ میں جہاد کریں، نبی نے فرمایا جہاد فرض کر دینے کے بعد، ڈر ہے کہ تم جہاد نہ کرو، کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ ہم اللہ کے راستہ

اللهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا (البقرۃ) ‏ میں نہ لڑیں، حالانکہ ہم اپنے وطن سے نکالے گئے اور ہماری اولاد ہم سے چھین لی گئی۔

یہ مومنین کی اولاد جو کفار کے قبضہ میں رہ گئی تھی، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ وہاں جہانبانی کرتی تھی یا جہانداری، اگر مغلوب و مقہور تھے، تو اسلام پر عمل کرتے تھے یا نہیں، ان کے متعلق قرآن کیا ہدایت دیتا ہے، اگر کوئی ہدایت نہیں دیتا، تو پھر بتائیے، کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے یا نہیں؟

تیسرا ثبوت

اب بھی اگر کچھ شبہ رہ گیا ہو، تو اور سنیئے:۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (النساء)

جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے، تو اس کو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیئے، اور اس کے ورثاء کو پورا فدیہ دینا چاہیئے، ہاں اگر وہ معاف کر دیں تو خیر، پھر اگر مقتول دشمن قوم سے ہو، لیکن مومن ہو، تو بھی ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیئے اور اگر مقتول کسی معاہد قوم سے ہو، تو بھی ایک مومن غلام آزاد کرنا ہوگا، اور پورا فدیہ ادا کرنا ہوگا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ:۔

(۱) مومن غلام بھی ہو سکتا ہے۔

(۲) مومن، دشمن و کافر قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے

(۳) مومن کسی معاہد کافر قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے

اب سوال یہ ہے، کہ دشمن تو کم کافر تو ہی ہوگا، جو دار الحرب میں رہتا ہو، جہاں اسلامی حکومت نہ ہو، بلکہ وہاں کی حکومت، اسلامی حکومت سے برسرِ پیکار رہتی ہو تو اب بتائیے، وہ مومن جو دار الحرب میں کافروں کی حکومت کے ماتحت رہتا ہے، مومن ہے یا نہیں، اگر ہے، تو کیا وہ وہاں جہانبانی کر رہا ہے، یا محکوم بن کر غلامی کے دن گذار رہا ہے، اگر محکوم بن کر غلامی میں اپنی زندگی گذار رہا ہے، تو پھر یہ کہنا، کہ مومن کبھی محکوم ہو ہی نہیں سکتا، نہ مومن کو قرآن محکومیت سکھاتا ہے، بلکہ جہانبانی ہی جہانبانی سکھاتا ہے، کتنی بڑی غلطی ہے، یہ چیز خوشنما تو ضرور ہے، لیکن اس کا وجود ہمیشہ ممکن نہیں، کیا مسلمان ہمیشہ

حاکم ہی ہوتا ہے محکوم ہو ہی نہیں سکتا؟ اس آیت کی روشنی میں، اور سورہ یوسف وغیرہ کی روشنی میں یہ عقیدہ ہی سرے سے باطل ہے، جو چیز آپ کو حدیث میں نظر آئی وہی قرآن میں بھی موجود ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کیونکہ کسی حدیث میں کسی مومن کے کافر کا محکوم یا غلام ہونے کا ذکر نہیں ہے، برخلاف اس کے قرآن میں مومن کے کافر کا غلام اور محکوم ہونے کی صراحت ملتی ہے، اگر حدیث قابل اعتراض ہے تو قرآن کا بھی مطالعہ فرمایئے، تاکہ حدیث پر سے اعتراض خود بخود رفع ہو جائے۔

چوتھا ثبوت

اس سلسلہ کی ایک اور آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا فَأُولَئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا (النساء)

جب فرشتے گنہگاروں کی روح قبض کرتے ہیں، تو کہتے ہیں تم کس حالت میں تھے، وہ کہتے ہیں ہم ملک میں کمزور تھے، فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی، کہ تم اس میں ہجرت کر کے چلے جاتے، بس ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور وہ بہت بری جگہ ہے، مگر ایسے کمزور مرد، عورتیں، بچے، جو کسی تدبیر پر قادر نہ ہوں، نہ ہجرت کی ان کے لئے کوئی سبیل ہو، تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالٰے معاف کر دے گا، کیونکہ اللہ تعالٰے معاف کرنے والا، اور مغفرت کرنے والا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ مسلمان مغلوب ہو سکتا ہے، اور ایسی حالت میں محکوم و مقہور بن کر رہ سکتا ہے، برق صاحب ایک بات پوچھتا ہوں، وہ یہ کہ اس آیت پر آج کل کیسے عمل ہو سکتا ہے وہ کون سی جگہ ہے، جہاں ہجرت کر کے جائیں، اور پوری شریعت پر عمل کر سکیں، اور مزید براں جہاد کے فرائض بھی انجام دے سکیں

دوسری بات یہ پوچھتا ہوں، کہ لارڈ ہیڈلے نے مسلمان ہو کر کس ملک کی حکمرانی کی؟ کہاں جہاد کیا کی، اور اگر وہ مسلمان ہو کر بھی کافر حکومت کے محکوم بن کر رہے، تو پھر مسلمان ہونے سے فائدہ کیا ہوا؟ مسلمان تو محکوم ہوتا ہی نہیں؟ اب یا تو وہ کافر ہی رہے، ان کا ایمان قبول کرنا عبث رہا، اور یا

یہ کہا جائے، کہ ایک مسلمان محکوم بھی ہو سکتا ہے؟ کاش لارڈ ہیڈلے اس کا جواب دیتے۔

غلط فہمی "آج سے تیرہ سو برس پہلے شہنشاہان روما بھی اس قسم کے وسائل سے کام لیتے تھے، انہوں نے بیشمار علماء خرید رکھے تھے جن کا کام احادیث تراشی تھا۔" (دو اسلام ص ۲۹۸)

ازالہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے، برق صاحب نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا، اور اگر صحیح بھی ہو، تو محدثین نے کسی احادیث تراش کو نہیں چھوڑا۔ ہر ایک کی نشاندہی کر دی ہے، براہ کرم فنون حدیث کا گہرا مطالعہ کیجیے:۔

غلط فہمی "للعبد الصالح ..... ایک نیک غلام دگنے اجر کا مستحق ہے، اللہ کی قسم اگر جہاد و حج مانع نہ ہوتے، تو میں موت تک غلام رہنا پسند کرتا"

"گویا یہ حدیث کہہ رہی ہے، کہ بہترین زندگی دوسروں کی غلامی ہے، یعنی ان کے پنکھے کھینچنا اور لکڑیاں کاٹنا ..... بوٹ صاف کرنا ..... لعنت ایسی زندگی پر" (دو اسلام ص ۲۹۸ ص ۲۹۹)

ازالہ اس حدیث کو سمجھنے میں برق صاحب کو دو مغالطے ہوئے، پہلا مغالطہ تو یہ کہ جو الفاظ راوی حدیث کے تھے، اس کو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنا دیا، دوسرا مغالطہ یہ کہ راوی کا جو منشاء تھا اسے صحیح طور پر سمجھ نہ سکے۔

پہلا مغالطہ یہ قول کہ "اللہ کی قسم اگر جہاد و حج مانع نہ ہوتے، تو میں موت تک غلام رہنا پسند کرتا" حدیث نہیں ہے، بلکہ راوی کا قول ہے، صحیح مسلم میں راوی کا قول ہونے کی صراحت موجود ہے، کاش برق صاحب تحقیق کر لیتے، تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

دوسرا مغالطہ راوی حدیث نے ایسا کیوں کہا؟ اس سلسلہ میں کچھ احادیث سنیے:۔

(۱) غلام سے اتنا ہی کام لیا جائے جتنی وہ طاقت رکھتا ہو (صحیح مسلم)

(۲) تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں، پس غلام کو وہی کھلاؤ، جو خود کھاؤ، اور وہی پہناؤ، جو خود پہنو، اس کو تکلیف دہ کام کرنے کے لئے نہ کہو، اگر کہو، تو اس کی مدد کرو (صحیح بخاری و صحیح مسلم) گویا اس مشکل کام میں آقا اور غلام دونوں شریک ہوں

(۳) جب خادم کھانا لے کر آئے، تو اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ (صحیح مسلم)

(۴) غلام اگر اپنے مالک کی خیر خواہی کرے، اور اللہ کی عبادت اچھی طرح کرے، تو اس کو دوہرا ثواب ہے (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۵) جو شخص غلام کو طمانچہ مارے اس کا کفارہ یہ ہے، کہ اسے آزاد کر دے (صحیح مسلم) ابو مسعود کہتے

ہیں، کہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا، میں نے کہا، یہ اللہ کے لئے آزاد ہے، آپ نے فرمایا، اگر ایسا نہ کرتا، تو دوزخ میں جلتا (صحیح مسلم)

(۶) غلام سے بدسلوکی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا (ترمذی)

(۷) غلام سے خوش اخلاقی سے پیش آنا باعث برکت ہے، اور اس سے بداخلاقی سے پیش آنا نحوست ہے (ابوداؤد)

(۸) ایک شخص نے پوچھا، کہ خادم کو کتنی مرتبہ معاف کیا جائے، فرمایا ہر روز ستر مرتبہ (ابوداؤد)

(۹) اگر غلام سے نباہ نہ ہو سکے، تو اس کو بیچ دو، یہ نہیں کہ اس کو ستاؤ (ابوداؤد)

(۱۰) غلام سے بدسلوکی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا، ان کو اسی طرح عزیز رکھو، جس طرح اپنی اولاد کو، اگر غلام نماز پڑھے، تو پھر وہ تمہارا بھائی ہے (ابن ماجہ)

یہ ہیں غلاموں کے حقوق مسلمانوں نے ان پر عمل کر کے دکھایا، غلام اپنے مالکوں سے اتنی محبت کرنے لگے، کہ آزاد کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے مالکوں کو نہیں چھوڑا، ان ہی کی خدمت میں رہنا پسند کیا، یہ تو وہ چیز ہے جس پر مسلمان ناز کر سکتے ہیں، یہ ہے ان کا ضابطہ، جس ضابطہ کے ماتحت وہ غلاموں کو رکھتے ہیں، کیا کوئی اور ایسی قوم ہے، جو اس ضابطہ احادیث کے موافق اپنا ضابطہ بنا سکے، اور پھر اس پر عمل بھی کر کے دکھا دے، افسوس جو چیز احادیث میں قابل فخر ہے، آپ اسی پر اعتراض کرتے ہیں، غلاموں کا وجود آپ کو اچھا معلوم نہیں ہوتا، بالکل صحیح، ٹھیک اسی طرح اسلامی شریعت کو بھی غلاموں کا وجود اچھا معلوم نہیں ہوتا، اور اسی لئے شریعت نے موقع بموقع غلاموں کا آزاد کرنا فرض کر دیا، اور دیگر مواقع پر ترغیب دے کر اس کو بہت ہی بڑا نیک عمل بنا دیا، ان کو آزاد کرنے کی فضیلت میں بہ کثرت احادیث موجود ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا، کہ :-

خلاصہ

(۱) غلام اگر نیک اور صالح ہو، تو اسے دوہرا اجر ملے

(۲) غلام اگر جرم کرے، تو اس کو نصف سزا دی جائے۔

(۳) غلام اسی طرح رہے، کھائے، اور پیئے، جس طرح مالک اور مالک کی اولاد۔

بتلایئے یہ زندگی کیا بری ہے، کہ دوہرا اجر اور نصف سزا، اور کھانے پینے کی تکلیف نہیں، بے فکری، دل جمعی، مساوات، کون ہے، جو اس ضابطہ پر قربان نہ ہو جائے، یہی وجہ ہے، کہ راوی کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے، یہ تو بہت ہی عمدہ زندگی ہے، کہ ایک مسلمان کی غلامی میں دن

کٹ جائیں ہو نیا کا فکر نہ ہو، اور عاقبت سدھر جائے

یہ راوی کی ایک نیک خواہش ہے، اور آپ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، راوی دین و دنیا میں سکون و بے فکری کی زندگی کا مشتاق ہے، اور اس سکون و بے فکری کی خواہش وہ کر رہا ہے کیا دین و دنیا میں سکون تلاش کرنا کوئی قبیح فعل ہے، اگر نہیں، تو پھر راوی کی اس پاکیزہ خواہش پر اعتراض کرنا فضول ہے، اس کو اس سکون کے لئے غلامی کی زندگی کو پسند کرنا پڑا، غلامی کی زندگی اس سکون و بے فکری کا محض ایک وسیلہ ہے، لہذا ایک بہت بڑے مقصد کے پیش نظر راوی نے غلامی کی زندگی کا اشتیاق ظاہر کیا، لیکن ایک اس سے بھی زیادہ بڑے مقصد کی خاطر اس سکون زندگی کو قربان کر دیا، اور آزاد رہنے ہی کو ترجیح دی، گویا راوی کے نزدیک بھی آزادی کو غلامی پر ترجیح ہے، لیکن معلوم نہیں کہ برق صاحب کیا سمجھ بیٹھے، عاقبت کی فکر، قیامت کی دہشت، خوف خدا یہ چیزیں بعض اوقات انسان کو ایسی ہی خواہش کی طرف راغب کر دیتی ہیں، کہ جس میں عاقبت کی فکر سے نجات مل جائے کوئی پھول بن جانے کی خواہش کرتا ہے، اور کوئی پتی، کوئی کہتا ہے

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب   کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو،

برق صاحب راوی تو مسلمان کی غلامی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے، اور آپ اس کو غیروں کی غلامی کی طرف کھینچ رہے ہیں، کہاں مسلمان کی غلامی، اور کہاں کافر کی غلامی، آپ نے دونوں کو گڈمڈ کر دیا، مسلمان کی غلامی ایک جنت ہے، نعمت ہے، کافر کی غلامی عذاب ہے، لعنت ہے راوی تو مسلمان کی غلامی کی خواہش کرتا ہے، لیکن پھر بھی اس نے غلامی کو اختیار نہیں کیا، آزادی ہی کو ترجیح دی، یہ ایسا ہی ہے، کہ کوئی کسی وقت یہ کہدے کاش میں پھول ہوتا، کہ لوگوں کے کام آتا، پھر مرجھا کر نابود ہو جاتا، نہ حساب ہوتا، نہ کتاب، نہ عاقبت کی فکر ہوتی، نہ دنیا کے مصائب میں الجھتا، لیکن کیا یہ حقیقت ہے، کہ ایسا کہنے والا پھول بننا ہی پسند کرتا ہے، اور انسانی زندگی پر اس کو ترجیح دیتا ہے، نہیں ہرگز نہیں، یہ آرزو ہونا، اور وہ بھی کسی خاص مقصد کی خاطر اور بات ہے، اور حقیقۃً اسے پسند کرنا اور بات ہے، اس کی یہ نیک خواہش دراصل درس عبرت ہے، جو دوسروں کو بھی عاقبت کی فکر کی طرف برانگیختہ کرتی ہے، غلامی کی خواہش کی طرف نہ جائیے، یہ خواہش دراصل درس عبرت ہے کہ انسان دنیا اور آخرت کے سکون کا متلاشی رہے، عیش و راحت میں خدا کو نہ بھول جائے، بلکہ خدا سے غافل کرنے والے عیش و آزادی سے ایسی غلامی کو ترجیح دے، جو خدا ترس بنا دے، برق صاحب راوی کی یہ خواہش فائدہ اٹھانے کی چیز ہے، نہ کہ اعتراض کرنے کی۔

غلط فہمی "پھٹکار اس جعلساز پر جس نے یہ حدیث تراش کر اسلام کے بنیادی مقصد پہ اس قدر خوفناک حملہ کیا، اور مسلمانوں کو سریر جہانبانی سے اٹھا کر غلامی کے متعفن سنڈاس میں پھینکنے کی کوشش کی" (دو اسلام ص ۲۹۹)

ازالہ حدیث تو یہ ہے نہیں! راوی کا قول ہے، لہٰذا جعلسازی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں یہ سوچیئے کہ نبی ہو، اور قید میں رہنے کی خواہش کر رہا ہو، محکومی کی زندگی گذارنا پسند کرے، اور ملازم ہو جائے، اور اپنے حاکم کے قانون پر چلتا رہے، کیا یہ زندگی کسی نبی کے شایان شان ہے؟ کیا یہ زندگی آپ کو پسند ہے؟ اگر پسند نہیں، تو پھر قرآنی آیات (سورہ یوسف) کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا آپ کو یہ پسند ہے، کہ مومن ہو کر دار الحرب میں رہے، کمزوری دبے بسی میں دن گذارے، یا اسلامی حکومت کے معاہد کافر قوم میں اپنی زندگی گذارے، ان کا محکوم بن کر رہے، ان کے قانون کی اطاعت کرے، اگر یہ باتیں آپ کو پسند نہیں، تو پھر سورہ نساء کی مذکورہ بالا آیات کے متعلق کیا خیال ہے؟ اور ان آیات کے متعلق کیا خیال ہے، جن آیات میں بنی اسرائیل کے فرعون کے غلام ہونے کا ذکر ہے، لڑکیوں کے قتل کا ذکر ہے، ان کی بے بسی اور لاچاری کا ذکر ہے، کیا وہ مسلمان تھے یا نہیں؟ اگر تھے تو ان کی جہانبانی کہاں چلی گئی۔

برق صاحب اگر غلط فہمی ہو جایا کرے، تو اعتراض کرنے سے پہلے سوچ لیا کیجیئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اعتراض کی زد دور تک پہنچ جائے، یا کہیں دار الٹا آپڑے، یوسف علیہ السلام کا قید و بند کی زندگی کو ترجیح دینا اس لئے تھا، کہ وہ پاک دامن رہنا چاہتے تھے، گویا ایک مبارک مقصد کی خاطر ایک گری ہوئی زندگی کو انہوں نے پسند کیا اسی طرح تبلیغ اسلام کی خاطر انہوں نے محکوم بننا پسند کیا، اور وزارت مالیات، وزراعت کے عہدہ کی خواہش کی، گویا تبلیغ اسلام کے مبارک مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے ایک گری ہوئی محکومیت کی زندگی کو پسند کر لیا، اگر مبارک مقاصد کی برآری کے لئے ایک پست قسم کی زندگی کو اختیار کرنا قابل اعتراض ہے، تو پھر برق صاحب یہ اعتراض قرآن پر ہوگا، اب سوچ لیجیئے، اور اگر مبارک مقاصد کی خاطر ان آیات کی روشنی میں محکومیت اور قید و بند کی زندگی کو اختیار کرنا عیب نہیں، بلکہ نیک عمل ہے، تو پھر ایک مبارک مقصد کی خاطر غلامی کی زندگی کی خواہش کرنا کون سا عیب ہے، کہ اس پر اعتراض کیا جائے۔

برق صاحب جب آپ گھڑی ہوئی احادیث نقل کر رہے تھے، تو ہم بھی آپ کے ساتھ تھے لیکن اب تو آپ صحیح احادیث نقل کر رہے ہیں، اور صرف اس وجہ سے آپ ان پر اعتراض کر رہے

ہیں، کہ ان کا منشا نہیں سمجھے، اور منشا اور مطلب صرف اس لئے نہیں سمجھ سکے، کہ آپ نے قرآن کو غور سے نہیں پڑھا، کوئی صحیح حدیث کسی قرآنی آیت کے خلاف نہیں ہاں غلط فہمی کی تو بات ہی دوسری ہے۔

غلامی کا انسداد غلامی کے انسداد کے متعلق کچھ لکھنا اگرچہ میرے موضوع سے خارج ہے، تاہم بعض لوگوں کے شبہ کے ازالہ کی خاطر اس مسئلہ کو بھی واضح کر رہا ہوں، اسلام کسی آزاد کو زبردستی غلام بنانے کی اجازت نہیں دیتا، نہ کسی آزاد کو پکڑ کر غلام کی حیثیت سے بیچنے کی اجازت دیتا ہے، حدیث میں اس کی سخت ممانعت ہے، لہذا کسی آزاد کو غلام بنانا یا اسکو بیچنا تو مسلمان کے لئے قطعاً حرام ہے، اور نہ کوئی اسلامی حکومت اس بات کی اجازت دے سکتی ہے کہ اس کے ملک میں آزاد لوگوں کو پکڑ کر اغوا کیا جائے، اور پھر ان کو غلام بنایا جائے، اور بیچا جائے، لہذا یہ جو مسائل قرآن و حدیث میں غلاموں کے متعلق بالتفصیل پائے جاتے ہیں، ان لوگوں کے متعلق ہیں، جو پہلے سے غلام چلے آ رہے ہوں، یا اسلام کے جنگی قوانین کے ماتحت غلام بنائے جائیں، اس رسم کا کلی انسداد اس لئے نہیں کیا گیا، کہ :-

(۱) دار الحرب میں اس پر پابندی لگانا اسلامی حکومت کے اختیار میں نہیں، وہاں اگر آزاد کو پکڑ کر غلام بنا لیا جائے، اور پھر اتفاقاً اس غلام کو اسلامی حکومت میں لا کر بیچا جائے، تو اب اس پر پابندی لگانا اسلامی حکومت کے اختیار میں ہے، حکومت چاہے، تو غلاموں کی درآمد بند کر دے، اور چاہے تو درآمد کی اجازت دے دے، لیکن اجازت دے دینا زیادہ مناسب ہے، اور اس کے بہت وجوہ ہیں۔

اول :- اگر وہ اسلامی حکومت میں نہ بیچ سکیں گے، تو پھر کسی کافر حکومت میں بیچیں گے، اور لازماً وہ ایسا کریں گے، اس لئے کہ ان کا تو پیشہ یہی ہے، لہذا ایک فرد جو ایک اسلامی معاشرہ میں رہ کر اسلامی معاشرہ کا ایک فرد بننے والا تھا، مسلمان اس سے محروم ہو گئے، اسلامی ممالک میں ان کا خرید لینا ہی مناسب ہے، تاکہ مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہے، ایک کافر جو اگر اسلامی حکومت میں نہ خریدا جاتا تو کافر ہی مرتا، اور ابدی عذاب میں گرفتار ہوتا، اس ابدی عذاب سے ان کو نجات دلانا انسانی و اسلامی فریضہ ہے پھر تبلیغ اسلام بھی اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے، اگر اس تبلیغ کا ایک ذریعہ یہ بھی ہو کہ کوئی شخص اسلامی معاشرہ میں چند دن گذار کر مسلمان ہو جائے، اور پھر اسلامی قانون کی رو سے وہ بہت جلد آزاد بھی ہو جائے، تو یہ کیا برا ہے، ایسے غلام کو خرید لینا ہی بڑے دوررس نتائج و مصالح کا حامل

ہے اور یہ اس مسئلہ کا دینی پہلو ہے

دوم۔ یہ لوگ ان غلاموں کے ساتھ انتہائی بے رحمی کا سلوک کرتے ہیں، لونڈیوں کو بیچتے ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ ہر قسم کی ناز یبا حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں اور کراتے ہیں ایک ہی لونڈی مختلف مقامات اور مختلف لوگوں کے ہاتھ بیچی جاتی ہے، اور پھر وہ کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے، ہر جگہ، ہر خریدنے والا، اس کی عصمت کو خراب کرتا ہے، اگر کوئی مسلمان ایسی لونڈی یا کسی مظلوم غلام کو خرید لے تو اس کے ساتھ یہ احسان ہوگا، وہ ظلم و استبداد کے پنجہ سے نجات پائے گا، اور اس کو مومن کی غلامی کے زیر سایہ راحت و سکون اور پاکدامنی کی زندگی میسر ہوگی، وہ بالکل اسی طرح رہے گا، کھائے گا، اور پہنے گا، جس طرح آقا اور آقا کی اولاد رہتے ہیں، کھاتے ہیں، اور پہنتے ہیں، ایسے غلام یا لونڈی کو خرید لینا انسانیت پر احسان عظیم ہے، یہ ہے اس کا اخلاقی پہلو۔

سوم: دوسرے نکاح پر قرآن بھی پابندی لگاتا ہے، اور برادری کا رسم و رواج بھی، کوئی شخص بہ مشکل ہی پہلی بیوی کی موجودگی میں اپنی بیٹی کو زوجیت میں دینا گوارا کرے گا، اس طرح یہ ہوگا، کہ مسلمان صرف ایک ہی بیوی کر سکیں گے، لونڈی کے سلسلہ میں یہ پابندی نہیں، لہذا باسانی لونڈی کو اپنی زوجیت میں لیا جا سکتا ہے، اس طرح تکثیر آبادی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے، اگر مسلمان اس تکثیر آبادی کے مسئلہ کو اہمیت دیتے، اور بیک وقت کئی نکاح کرتے رہتے، تو آج ہندوستان میں ان کی کثریت ہوتی، اور وہ کسی علاقہ سے نکالے نہ جاتے، یہ ہے اس مسئلہ کا سیاسی پہلو۔

(۲) جہاد قیامت تک کے لئے فرض ہے، لہذا میدان جنگ میں قیدیوں کا مسلمانوں کے قبضہ میں آنا ہمیشہ جاری رہے گا، اور کیونکہ یہ چیز بند ہونے والی نہیں، لہذا غلامی کا کلی انسداد بھی نامناسب ہے، یہاں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے، انہیں غلام بنایا ہی نہ جائے تو اس کا جواب یہ ہے، کہ یہ کام اللہ تعالٰے کے کرنے کا ہے، نہ کہ ہمارے کرنے کا، ہم تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں، اب رہی یہ بات کہ آخر اس میں اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت ہے، تو اپنی مصلحت کو وہ خود ہی خوب جانتا ہے، ہماری سمجھ میں صرف ایک بات آتی ہے، کہ اس طرح غلام و لونڈی کی حیثیت سے کافروں کو اپنے پاس رکھنا تبلیغ اسلام کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اور تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کی صحبت میں رہنے والے غلام الا ماشاء اللہ سب کے سب مسلمان ہو گئے، اور مسلمان آقاؤں کے اخلاق کریمانہ سے اتنے متاثر ہوئے، کہ آزاد ہونے کے بعد بھی آقا کی خدمت سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کیا، ان ہی کی صحبت میں رہے، علم دین حاصل کیا، انہی میں سے اکثر وہ لوگ ہیں

جو علم و فضل میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، اور دین کے سچے خدمت گار ثابت ہوئے، غلام بن کر آئے تھے، اور مسلمانوں کے امام بن کر دنیا سے گئے۔

یہی وجوہ ہیں، جن کی بنا پر غلامی کا کلی انسداد نہیں کیا گیا، کچھ عرصہ ہوا، کہ غلامی کے سلسلہ میں ایک صاحب سے میری گفتگو ہوئی، کافی بحث ہوئی لیکن وہ اس مسئلہ کو اسلام کے لئے باعث ننگ ہی سمجھتے رہے، اس گفتگو کے چند ہی روز بعد مسلمانوں کی ایک مملکت کے خاص دار الحکومت میں ایک شخص اپنی سالی کو اغوا کر کے لایا، اور اس کے ساتھ ناروا حرکات کا مرتکب ہوتا رہا، اس کو چکلے میں بٹھانے پر مجبور کرتا رہا، پھر کچھ دن کے بعد ایک بڑے افسر کے ہاں ملازم رکھ کر چلا گیا، اس عورت نے کچھ سکون کا سانس لیا، مہینہ بھر بعد پھر آیا، اس کو زبردستی تانگہ میں سوار کیا، وہ روتی رہی چلاتی رہی لیکن وہ دن دہاڑے افسروں کی بستی میں سے اسے کشاں کشاں لے گیا، اور وہ سب دیکھتے رہے، اور حالات سے واقف ہوتے ہوئے بھی، اس عورت کی امداد نہ کر سکے، بالآخر ایک صاحب نے اسے خرید لیا، اور اس طرح اس کی جان بچی۔

اب بتائیے، یہ عورت ظلم ناروا، اور بد افعالی کی لعنتوں سے بچ کر اگر ایک شخص کے رحم و کرم کے زیر سایہ، اسلامی قانون کے عطا کردہ اختیار و جواز سے اس کی ماتحتی میں رہے، تو یہ اس کے لئے بہتر ہے، یا اس ظالم کے ماتحت چکلے میں بیٹھنا اس کے لئے بہتر ہے؟ اس واقعہ کے بعد پھر ان صاحب سے گفتگو ہوئی، اب وہ اس مسئلہ کی اہمیت کے قائل ہو گئے، اور کہنے لگے، کہ بے شک ایسے حالات میں لونڈی یا غلام کا خرید لینا بہت زیادہ ضروری ہے، اور اس لونڈی یا غلام کے لئے یہ غلامی بھی بہت بڑی نعمت ہے، اگر ایسے ممالک میں ایسے حالات میں لونڈی، غلام کو نہ خریدا جائے تو یہ انسانیت پر ظلم ہے۔

غلاموں کی رہائی کے لئے اسلام نے کیا کیا

مسلمانوں کو یہ تو اجازت دی گئی ہے کہ وہ غلام خرید لیں، یا میدان جنگ کے قیدیوں کو غلام بنا لیں، لیکن پھر اسلام نے ساتھ ہی ساتھ ان کی آزادی کے ذرائع بھی فراہم کر دیئے بلکہ بعض حالات میں ان کی آزادی کو فرض قرار دیا، اب اگر کسی مسلمان کے قبضہ میں کوئی غلام آ جاتا ہے، تو اس کے لئے دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔

اول:۔ یا تو اسے آزاد کر دے، اور قرآن و حدیث میں اس کی بڑی ترغیب ہے، مسلمان اس ترغیب سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں، اور سینکڑوں غلام آزاد ہوتے رہے ہیں۔

دوم :- اسے غلام بنا کر رکھے۔ ایسے غلام کو آزادی کی منزل تک پہنچانے کے لئے بھی اسلام نے بہت سی سہولتیں مہیا کی ہیں، مثلاً :۔

ظہار، قسم، قتل خطا وغیرہ کے کفارہ میں غلام آزاد کیا جائے۔

غلام کو طمانچہ مارے، تو اسے آزاد کر دے

لونڈی سے بچہ پیدا ہو جائے، تو آقا کی وفات کے بعد وہ آزاد ہے، آقا کی زندگی میں بھی اس کو بیچنا منع ہے۔

سورج گہن یا چاند گہن کے موقع پر غلام کو آزاد کیا جائے

پھر مدبر اور مکاتب کرنے کی تدابیر بتائی گئیں۔

غرض کہ ان کی آزادی کے لئے کئی ذرائع مہیا کر دیئے، اور اگر وہ آزاد نہ بھی ہوں، تو ان کے ساتھ نیک سلوک کی وصیتیں فرمائی گئیں۔ مثلاً :۔

جو آقا پہنے وہی اسے پہنایا جائے، جو آقا کھائے وہی وہ کھائے، اور آقا کے ساتھ بیٹھ کر کھائے، اولاد کی طرح عزیز ہو، اس کو بھائی سمجھا جائے، اس کو مارا نہ جائے، اس کو ہلکا کام دیا جائے، اگر مشکل کام دیا جائے، تو آقا اس کے ساتھ کام کر کے اس کی مدد کرے، وہ صالح ہو، تو اس کا نکاح کر دیا جائے وہ گناہ کر بیٹھے، تو سزا آدھی ملے، نیکی کرے، تو دوہرا اجر پائے، دنیا کی فکر سے آزاد ہو۔

یہ ہے مومن کے غلام کی زندگی، کیوں نہ اس پر آزادی نثار ہو۔ اور کیوں نہ کسی راوی کے دل میں یہ خواہش گذرے، کہ میں غلام ہوتا، تو کیا اچھا ہوتا، مسلمان جب غلام کو خریدتا ہے، تو صرف ظلم ہی سے اس کو نجات نہیں دیتا، بلکہ اس کو یہ زندگی عطا کر کے اس کے لئے جنت کا سامان پیش کرتا ہے، کیا مسلمانوں کو روک دیا جائے، کہ وہ مظلوموں کو ایسی زندگی عطا کرنے سے باز رہیں، اگر ایسا کیا جاتا، تو یہ انسانیت پر ظلم کے مترادف تھا، اور بے رحمی کا انتہائی خوفناک مظاہرہ، اسی وجہ سے اسلام نے غلامی کو کلیتہً مسدود نہ کر کے عاقبت اندیشی کا ثبوت دیا، ناعاقبت اندیش ہیں وہ لوگ جو غلامی کو ظاہری نگاہ سے دیکھتے ہیں، نہ اس کے دینی پہلو پر غور کرتے ہیں، اخلاقی و انسانی پہلو پر، اور اسلام پر اعتراض کرنے لگتے ہیں، کاش اعتراض سے پہلے وہ ہر مسئلہ پر کافی غور و خوض کر لیتے۔

نوٹ :- صفحہ نمبر ۲۹۲ پر برق صاحب نے ایک حدیث کے متن کا کچھ حصہ چھوڑ دیا ہے، اور نیچے حاشیہ پر لکھا ہے، کہ "یہ لفظ نہ پڑھ سکا" اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ برق

صاحب نے حدیث کا گہرا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ انہیں معلوم ہوتا، کہ یہ لفظ کہاں سے، جو ان سے پڑھا نہیں گیا، پھر اگر صحیح بخاری میں پڑھا نہ جا سکا تھا، تو کیا حدیث کی کسی کتاب میں پڑھا نہ گیا، مگر معلوم ہوتا ہے، کہ برق صاحب باوجود ڈاکٹر ہونے کے تحقیقات سے روگردانی کرتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں، اللہ انہیں ہدایت دے، اور معاف فرمائے۔

باب ۔ ۱۷

"تقدیر"

غلط فہمی "اس مضمون پر قرآن میں بیسیوں آیات موجود ہیں، اور نوع انسانی کی ہزارہا سالہ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے، کہ یہ دنیا دار المکافات ہے، جہاں صرف اپنی محنت کام آتی ہے، اور بے عمل بدعمل، کاہل اور سہل انگار افراد و اقوام کا انجام ذلت و رسوائی کے بغیر اور کچھ بھی نہیں (دو اسلام ص۳۰۱)

..... یہ تھا تقدیر کا قرآنی تخیل، اب ذرا "حدیثی تخیل" ملاحظہ ہو:-

"حضور فرماتے ہیں، کہ نطفہ رحم میں پہنچ کر چالیس دن کے بعد منجمد ساخون بنتا ہے، پھر وہ لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس کے بعد اللہ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے، کہ جاؤ، اور لوتھڑے کے اعمال زندگی، رزق، موت اور سعادت و شقاوت کا فیصلہ ابھی لکھ لو، اور اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے" ....

اس حدیث تراش نے یہ نہ بتایا، کہ جب ایک شخص کے اعمال، رزق اور سعادت کا فیصلہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی ہو جاتا ہے، تو پھر اللہ نے انسانی ہدایت کے لئے اتنے پیغمبر کیوں بھیجے" (دو اسلام ص۳۰۲)

ازالہ برق صاحب یہ بتایئے، کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بچہ کو پیدا کرتا ہے، تو اسے علم ہوتا ہے، کہ بچہ دنیا میں کیا کرے گا یا علم نہیں ہوتا، اگر علم نہیں ہوتا، تو پھر اللہ عالم الغیب نہیں ایسا اللہ اسلامی اللہ تو ہو نہیں سکتا، یہ تو ایک عیب ہے، اور اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے، اگر یہ کہا جائے، کہ اللہ کو علم ہوتا ہے، تو پھر یہ بتایئے، کہ یہ علم ہونا، اس انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس کے علم کے مطابق کام کرے، اگر مجبور کرتا ہے، تو لکھ لینے کا پھر کیا قصور رہا، اور اگر یہ علم مجبور نہیں کرتا، تو پھر اس کا قبل از وقت لکھ لینا بھی مجبور نہیں کرتا، لہٰذا حدیث اعتراض سے بالکل پاک و صاف ہے۔

اب اس حدیث کی تائید میں قرآنی آیات سنیئے، بعد میں بتاؤں گا، کہ اصل معاملہ کیا ہے:-

(۱) وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۔ اللہ جانتا ہے، جو کچھ خشکی میں ہے اور جو کچھ

مَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (الانعام)

سمندر میں ہے، اور جو پتہ گرتا ہے اس کا بھی اس کو علم ہے، زمین کے اندھیروں میں جو دانہ پڑا ہوا ہے، وہ بھی اسے معلوم ہے، اور کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں جس کا حال لوح محفوظ میں نہ ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ اللہ کے علم میں ہر چیز ہے، لہٰذا اس کو یہ بھی علم ہوگا، کہ بندہ اپنی زندگی میں کیا کرنے والا ہے، اسی علم کی بنا پر اس نے سب کچھ لکھ لیا ہے، اب اگر لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہونے پر اعتراض نہیں، تو بوقت پیدائش قسمت میں لکھا جانے پر کیا اعتراض ہے۔

(۲) وَاِنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِیْدًا كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا (بنی اسرائیل)

کوئی بستی ایسی نہیں ہے جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا عذاب شدید میں مبتلا نہ کریں، اور یہ سب کچھ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

(۳) مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ (الحدید)

جو مصیبت دنیا میں آتی ہے یا تمہاری جانوں میں آتی ہے، وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب میں لکھی ہوتی ہے، اور بے شک یہ چیز اللہ کے لئے آسان ہے۔

بتائیے، جو مصیبت پہلے سے لکھی ہوئی ہے، وہ تو آ کر رہے گی، اس کو ٹالنے کی کوشش بیسود ہے، اگر وہ ٹل جائے، تو اللہ کا علم ناقص ہو جائے گا، اور یہ ناممکن ہے۔

(۴) اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ كِتٰبٍ (الحج)

کیا تم نہیں جانتے، کہ اللہ کو علم ہے، ہر اس چیز کا جو آسمان میں ہے، اور جو زمین میں ہے اور یہ سب کتاب میں مسطور ہے

(۵) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (ھود)

زمین میں رہنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمہ ہے، وہ جانتا ہے، کہ کہاں اس کا مستقر ہے، اور کہاں اس کی آخری آرام گاہ ہے، یہ سب کچھ روشن کتاب میں لکھا ہوا ہے

اب اگر رزق بھی لکھا ہوا ہے، تو پھر اس کی زیادتی کے لئے جدوجہد کیا معنے!!!

(۶) وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر)

اور ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم مقررہ مقدار ہی میں اسے نازل کرتے ہیں۔

اگر مقدار مقرر ہے، تو پھر اس کی زیادتی کے لئے جدوجہد بے کار ہے

(۷) وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعَادِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (الانفال)

اور اگر تم وعدہ کرتے، تو وعدہ میں اختلاف ہوتا، اور پھر یہ کام نہ ہوتا، لیکن اللہ کو وہ کام کرنا تھا جس کا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

ظاہر ہے، کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے تحریر کردہ فیصلہ کو بروئے کار لانے کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیئے، کہ مسلمانوں اور کافروں کے مابین لڑائی ہو کر رہی، یہ تحریر کردہ فیصلہ، اور اس کے لئے حالات کو ساز گار بنانا، تقدیر ہی تو ہے، اور یہی حدیث میں ہے۔

(۸) لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (الانفال)

اگر اللہ تعالےٰ نے پہلے سے یہ نہ لکھا ہوتا تو جو فدیہ تم نے لیا، اس پر عذاب عظیم نازل ہوتا۔

سوال یہ ہے، کہ وہ کیا چیز تھی، جو لکھی ہوئی تھی، اگر یہ لکھا ہوا تھا، کہ ہم معاف کر دیں گے، تو گویا یہ معافی ان کی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی، اور اگر فدیہ لینا قسمت میں لکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے مسلمان فدیہ لینے پر مجبور تھے، تو عذاب بھیجنا نامناسب تھا اور اسی وجہ سے ٹال دیا گیا، دونوں حالتوں میں تقدیر کے لکھے جانے کا ثبوت ہے۔

(۹) وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ (یوسف)

اس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو ملک میں ٹھکانا دیا، اور یا اس لئے کہ ہمیں اس کو احادیث کا علم دینا تھا، اور اللہ تعالےٰ اپنے کام پر غالب ہے

یعنی بھائیوں نے تو یوسف علیہ السلام کی ذلت کے لئے کیا کیا تدبیریں کیں، لیکن اللہ تعالےٰ نے جو فیصلہ کر لیا تھا، کہ ایسا کرنا ہے، وہ ہو کے رہا، اور ان کی تمام تدابیر بے کار ثابت ہوئیں، انہیں علم ملنا تھا، وہ مل کر رہا، انہیں نبوت ملنی تھی، وہ مل کر رہی، انہیں حکومت و عزت ملنی تھی، وہ مل کر رہی، تقدیر کا کتنا واضح ثبوت ہے، اور تدبیر کی ناکامی کا کتنا زبردست مظاہرہ۔

(۱۰) قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (التوبۃ) — اے رسول کہہ دیجئے، کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی، مگر جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے

اس آیت میں تقدیر کا کتنا کھلا ثبوت ہے، اور حدیث مذکور کی کتنی زبردست تائید ہے" تلك عشرة كاملة" اس قسم کی بہت سی آیات ہیں، جن سے تقدیر کا ثبوت ملتا ہے معلوم نہیں برق صاحب نے ان آیات کا مطالعہ کیوں نہیں فرمایا۔

تقدیر کا فائدہ تقدیر سے یہ نتیجہ نکالنا، کہ ہم مجبور ہیں، لہٰذا تدبیر کی ضرورت نہیں، تو یہ تقدیر کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، نہ تقدیر کے مسئلہ کا یہ صحیح استعمال ہے، ہاں اس کا ایک صحیح استعمال ہے، اور وہ خود اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (الحدید) — جو مصیبت دنیا میں آتی ہے یا تمہاری جانوں پر وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب میں لکھی ہوتی ہے، تاکہ کوئی نقصان ہو جائے، تو تمہیں افسوس نہ ہو، اور جو چیز اللہ تمہیں دے اس پر اترا نہ جاؤ، اور اللہ اترانے والے تکبر کرنے والے کو پسند نہیں فرماتا۔

اس آیت سے تقدیر کا استعمال معلوم ہو گیا اگر نقصان ہو جائے، تو یہ نہ ہو کہ بس اسی کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں، بلکہ یہ کہہ کر تسلی کر لیں کہ نقصان ہو گیا، تو کیا ہوا، تقدیر میں ایسا ہی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے جب نقصان ہو جاتا تھا، تو اپنے گھر والوں کو یہ کہہ کر تسلی دے دیا کرتے تھے، کہ ہو گیا، تو ہو گیا، تقدیر میں ایسا ہی تھا۔

اور اگر کوئی نعمت مل جائے تو یہ نہ سمجھے کہ میری قابلیت کی بنا پر مجھے ملی ہے، جیسا کہ قارون نے کہا تھا، اور اس پر وہ اترانے لگے، اللہ کو بھول جائے، بلکہ اس طرح کہے، کہ یہ سب کچھ اللہ کا فضل ہے، میں کس قابل ہوں، یوسف علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے نعمت الٰہی پانے کے بعد اسی قسم کے الفاظ کہے تھے، اور یہ الفاظ قرآن میں موجود ہیں۔

تقدیر کا اصلی مفہوم ایک پیشین گوئی کرنے والا پیشین گوئی کرتا ہے، اور اس کو چھپوا بھی دیتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ اسی طرح رونما ہوتا ہے، جس طرح اس نے پیشین گوئی کی تھی، لیکن اس واقعہ کے وقوع کے لانے کے سلسلہ میں اس پیشین گوئی کرنے والے کو کوئی دخل

نہیں ہوتا، وہ کسی کو مجبور نہیں کرتا، کہ اسی طریقہ سے کرے، جس طرح اس نے اپنی پیشین گوئی میں بیان کیا ہے یا تحریر کیا ہے۔ بالکل یہی حال تقدیر کا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنا پر جو کچھ ہونے والا تھا وہ سب لکھ لیا ہے، ہوتا سب کچھ اگرچہ اس کے موافق ہے، لیکن کرنے والا اس کام کے کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا، بلکہ جو کچھ وہ کرتا ہے، اپنے اختیار سے کرتا ہے، بات صرف اتنی ہے، کہ اس کا وہ فعل پہلے سے اللہ کے علم میں ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اللہ کی مدد و توفیق اور ہماری دعائیں بھی کچھ اثر انداز ہوتی ہیں جیسا کہ قرآن و حدیث میں اس کی صراحت ہے، اس سے زیادہ اس مضمون پر کچھ لکھنا، اور تقدیر کی گتھی کو سلجھانا اور اس کے پیچھے پڑ جانا، اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا ہے، بلحاظ آیت وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" اس حکم کے بموجب اس بحث کو ختم کرتا ہوں، بس صاحب یہ پیچیدہ مسائل ہیں سے ہے، اس میں ہاتھ نہ ڈالیئے، ہاں مسلمانوں نے جو غلط نتیجہ اس سے نکال رکھا ہے اس پر جتنا چاہے افسوس کر لیجئے اور بس۔

باب ۱۸

"متضاد احادیث"

غلط فہمی "دوران تقریر میں حضور نے فرمایا، جو تین بچے پیدا کرے گی، اللہ اسے نار جہنم سے بچائے گا، ایک عورت کہنے لگی، اور دو بچوں والی؟ فرمایا دو والی بھی جنت میں جائے گی" (دو اسلام ص۳۰۵)

ازالہ برق صاحب حدیث کا صحیح مطلب نہیں سمجھے "ما منکن امرأۃ تقدم ثلاثۃ من ولدھا" (صحیح بخاری کتاب العلم) اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ جس عورت نے تین بچے آگے بھیجے" (یعنی جس کے تین بچے مر گئے) اس عورت کو جس کے تین بچے مر جائیں، اس مصیبت پر صبر و شکر کرنے کا یہ اجر ملے گا، کہ وہ بچے دوزخ سے بچانے کا سبب بن جائیں گے، اگر برق صاحب ذرا آگے دیکھتے، تو ان کو اس روایت کے متصل وہ روایت بھی مل جاتی، جس میں یہ لفظ ہیں "لم یبلغوا الحنث" یعنی وہ بچے ایسے ہوں، کہ بلوغ کو نہ پہنچے ہوں یعنی معصوم ہوں، کیا ان لفظوں کی موجودگی میں "تین بچے پیدا کرے گی" صحیح مطلب ہو سکتا ہے؟ پھر یہی حدیث کتاب الجنائز میں بھی موجود ہے الفاظ یہ ہیں:-

ایما امرأۃ مات لھا ثلاثۃ من الولد (صحیح بخاری) یعنی جس عورت کے تین بچے مر جائیں۔

پھر اس ہی مضمون کی احادیث حضرت انس رض سے اس سے پہلے، اور حضرت ابوہریرہ رض سے اس روایت کے بعد صحیح بخاری کتاب الجنائز میں موجود ہیں، حضرت انس رض کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:-

ما من الناس من مسلم یتوفی لہ ثلاث لم یبلغوا الحنث (بخاری) جس کسی مسلمان کے تین نابالغ بچے فوت ہو جائیں۔

حضرت ابوہریرہ رض کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

لا یموت لمسلم ثلاث من الولد (بخاری) اگر کسی مسلمان کے تین بچے مر جائیں۔

الغرض حدیثوں میں "مر جانے" کا ذکر ہے، اور برق صاحب نے ترجمہ میں اس کے بجائے "پیدا کرنا" لکھ دیا، اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، برق صاحب نے بغیر تحقیق اور گہرے مطالعہ کے حدیث کا ترجمہ کیا، اور غلط فہمی سے ترجمہ غلط ہو گیا، کاش وہ پوری کتاب تحقیق کے بعد لکھتے۔

غلط فہمی "ایک طرف تو عورت کی عظمت کا یہ حقیقت افروز اعتراف، اور دوسری طرف اس پرستار محبت کی یہ توہین کہ . . . . آنحضرت فرماتے ہیں، کہ میں نے جہنم کو دیکھا، تو اس میں اکثر آبادی عورتوں کی نظر آئی۔ یعنی ایک طرف تو دنیا بھر کی والی ماؤں کو جنتی بنایا جا رہا ہے بلکہ ساری جنت ماں کے قدموں میں پھینکی جا رہی ہے، اور دوسری طرف اس کے جہنمی ہونے کا بھی ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے" (دو اسلام ص ۳۰۸)

ازالہ برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ اولاد کو اگر ماں باپ کی خدمت کے صلہ میں جنت مل سکتی ہے، تو وہ ماں ضرور جنتی ہے، واہ! یہ بھی خوب ہے! نیک عمل تو کرے اولاد، اور جنت میں جائے ماں! تو گویا ماں کے ذمہ نہ کوئی حساب ہے، نہ کتاب، بس اولاد نے اس کی خدمت کی اور وہ جنتی ہو گئی! برق صاحب اولاد کا جنت یا دوزخ میں جانا ان کے اپنے عمل کے باعث ہے اور عورت کا دوزخ میں جانا، یا جنت میں داخل ہونا، اس عورت کے اپنے عمل پر منحصر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر دوزخ میں بہت سی عورتوں کو دیکھا، تو اس کو اس مقصد سے عورتوں کے سامنے بیان کر دیا، کہ وہ احسان فراموشی اور غیبت وغیرہ جرائم سے باز رہیں، یہ ایک قسم کی ترہیب ہے اعتراض کی اس میں کیا بات ہے۔

غلط فہمی "چوریاں کریں تو مرد۔ ڈاکے ڈالیں تو مرد . . . . بوڑھوں اور عورتوں کو نہایت بیرحمی سے قتل کریں تو مرد . . . . لیکن جہنم میں جائیں تو عورتیں، کیوں؟ کیا اللہ کے عدل و انصاف کا یہی تقاضہ ہے" (دو اسلام ص ۳۰۸)

ازالہ برق صاحب دنیا کی پوری آبادی میں کتنے مرد ہیں، جو اس قسم کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، بمشکل دس میں سے ایک، اچھا اب یہ بتائیے، کہ دنیا کی آبادی میں کتنی عورتیں ایسی ہیں، جو شرک و بدعات، احسان فراموشی، غیبت، ترک نماز، بدگمانی وغیرہ سے ملوث ہیں آبادی کے ہر گھر کی عورتوں میں آپ کو یہ باتیں ملیں گی، بہت کم ایسی عورتیں ہوں گی، جو ان لغویات سے بچی ہوں گی، یہ باتیں اگرچہ مردوں میں بھی ہوتی ہیں، لیکن عورتوں کے مقابلہ میں بہت کم، نمازیں پڑھیں، تو مرد روزے رکھیں تو مرد، تبلیغ کریں تو مرد، حق کی خاطر جیل میں جائیں تو مرد، جہاد کریں تو مرد، نبوت

سے سرفراز ہوں تو مرد، ولی کامل ہوں تو مرد، عالم دین ہوں تو مرد، پھر کیوں نہ جنت میں مردوں کی کثرت ہو، برق صاحب ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بتائیے، کہ دوزخ میں کس کا تناسب زیادہ ہونا چاہیئے، مردوں کا یا عورتوں کا؟

غلط فہمی ۰ عورت کی نافرمانی کی مزید تشریح اس حدیث میں دیکھئے۔ ......

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو ہم بستری کے لئے بلائے، اور وہ انکار کر دے، اور شوہر ناراض ہو کر لیٹ جائے، تو اس عورت پر فرشتے صبح تک لعنت برساتے رہتے ہیں"

یہ تھا اصلی سبب، جس پر مولانا کو اتنی احادیث گھڑنا پڑیں، عورت کے انکار کی کئی معقول وجوہات ہو سکتی ہیں" (دو اسلام ص۳۰۹)

ازالہ برق صاحب کو یہ حدیث اس حدیث کے خلاف معلوم ہوتی ہے جس میں ہے، کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے، یا جس عورت کے دو یا تین بچے فوت ہو جائیں، تو اس کے لئے جنت ہے، بے شک عورت اگر بچوں کے مرنے پر صبر و شکر کرے، تو اس ابتلا کا اجر اسے ملے گا، اور اگر وہ ناشکری کرے، اور اس جرم کا پلڑا بھاری ہو جائے، تو پھر دوزخ نہیں، تو اور کہاں ملے گا، کیا یہ قرآن کا اٹل قانون نہیں ہے، عورت کا مرد کے بستر سے پرے رہنے سے انکار کرنا بھی اس کی ایک قسم کی ناشکری ہے، نافرمانی ہے۔

برق صاحب کا یہ فرمانا، کہ انکار کی کئی معقول وجوہات ہو سکتی ہیں، بالکل ٹھیک ہے، لیکن حدیث میں یہ کہاں ہے، کہ معقول وجوہات کی موجودگی میں انکار باعث لعنت ہے، برق صاحب کچھ تو غور کر کے لکھا کیجیئے، اچھا اگر کوئی معقول وجہ نہ ہو، تو پھر کیا حکم ہے؟ کیا خاوند اس کے ہر قسم کے حقوق ادا کرے اور جب اس کے حقوق ادا کرنے کا وقت آئے، تو وہ بغیر کسی معقول وجہ کے انکار کر دے، تو کیا یہ جرم و قبیح نہیں ہے، اگر ہے، تو پھر کیا اعتراض ہے؟ یہ تو برابر کے حقوق ہیں، اگر مرد بیوی کا حق ادا کرنے سے انکار کر دے، تو وہ مجرم ہو گا، اب قرآن کی سنیئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (بقرہ ۱۰) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ (النساء) عورتوں کو بستر سے علیحدہ سلاؤ، اور انہیں مارو

ایک جگہ تو ماں کی یہ عزت، کہ احسان کرو، جھڑکو مت، اف بھی مت کرو، اور دوسری جگہ اسی پیاری ماں کے متعلق یہ ارشاد کہ اسے مارو، برق صاحب کیا یہ بھی تضاد ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ پیاری ماں

کی سرخی جو برق صاحب نے قائم کی ہے، جذبات کو تو بھڑکا سکتی ہے لیکن حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔

غلط فہمی "جب حضرت ابوبکر رضہ صدیق نے اپنے عہد خلافت میں یزید بن ابو سفیان کو ایک فوج کا سپہ سالار بنا کر شام کی طرف روانہ کیا، تو ساتھ مندرجہ ذیل ہدایات بھی دیں"

"کسی عورت، بچے، اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کوئی پھل والا درخت نہ کاٹنا . . . نہ کسی درخت کو ہرگز نہ جلانا . . . . ."

لیکن بخاری میں مذکور ہے، کہ:-

حضور نے بنی نضیر کے کچھ درخت جلا دیئے تھے، اور کچھ کاٹ کر رکھ دیئے تھے" (ص۳۱۱)

ازالہ برق صاحب نے ان دونوں واقعات کو متعارض احادیث کی حیثیت سے پیش کیا ہے، پہلی غلط فہمی تو یہ ہوئی، کہ برق صاحب پہلی روایت کو بھی حدیث ہی سمجھ بیٹھے، حالانکہ وہ قول صحابی ہے، خیر، دوسری غلط فہمی یہ ہوئی، کہ وہ یہ سمجھے، کہ یہ دونوں ہدایات ایک ہی جیسے مواقع کے لئے ہیں، لہذا ان دونوں میں تضاد ہے۔

بات یہ ہے، کہ دونوں ہدایتیں علیحدہ علیحدہ مواقع اور محل سے تعلق رکھتی ہیں، علیحدہ علیحدہ کوائف اور حالات کے ماتحت ان دونوں پر عمل ہوگا، جنگلوں یا شہروں کے درختوں کا بغیر کسی معقول وجہ کے جلا دینا یا کاٹ دینا بے شک ممنوع ہے، لیکن وہ درخت جو میدان جنگ میں واقع ہوں، ان کے وجود سے اسلامی فوج کو نقصان پہنچتا ہو، اور دشمن فوج کو فائدہ پہنچتا ہو، جنگ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو، تو بتائیے کیا ایسے درختوں کا کاٹنا بھی جرم ہے، نہیں بلکہ جنگی مصالح کے مد نظر ایسا کرنا فرض ہے اب بتلائیے، ان دونوں میں کیا تضاد ہے، پھر یہ درخت جو کاٹے گئے، اللہ کے حکم سے کاٹے گئے معلوم نہیں آپ نے قرآن کا گہرا مطالعہ کئے بغیر اعتراض کیوں کیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (حشر)

جو درخت تم نے کاٹے، یا جو تم نے کھڑے رہنے دیئے، تو یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا تھا۔

لیجیے، اب تک تو حدیث پر اعتراض تھا اب وہی اعتراض قرآن پر آ گیا، اب کیا کیا جائے

غلط فہمی "پھر بلا وجہ اور بلا ضرورت درختوں کو کاٹنا، مسافروں کو سائے . . . سے محروم رکھنا، . . . . یہ رسول کے شایان شان تھا . . . . . اس لئے یہ حدیث قابل اعتماد نہیں

(دو اسلام ص۳۱۱)

ازالہ بغیر کسی وجہ کے تو کاٹے نہیں گئے، اگر آپ نے وجہ تلاش نہیں کی، تو اس میں حدیث کا کیا قصور ہے، یہ درخت اس لئے کاٹے گئے تھے، کہ مسلمان بغیر ان کے کاٹے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے اور کافروں کو ذلت و شکست نصیب نہ ہوتی، اگر تاریخ میں آپ نے نہیں پڑھا تھا تو قرآن میں دیکھ لیا ہوتا، اس کی وجہ تو خود قرآن بتاتا ہے

وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ (حشر) تاکہ اللہ فاسقوں کو ذلیل کرے

گویا درخت کاٹنے کی وجہ خود قرآن میں موجود ہے، یعنی کافروں کی شکست اور ذلت کا یہ ایک آسان ذریعہ تھا، میدان جنگ کھل جانے سے مسلمانوں کے لئے لڑائی آسان ہو گئی، اور ان کافروں کو بہت جلد شکست نصیب ہوئی۔

غلط فہمی "ابو ہریرہ کہتے ہیں، کہ رسول اللہ صلعم نے ہمیں ایک مہم پر روانہ کرنے سے پہلے فرمایا، کہ اگر فلاں فلاں مل جائیں، تو انہیں آگ میں جلا دینا، سو جب ہم چل پڑے، تو کہا، ان لوگوں کو جلانا مت، بلکہ قتل کر ڈالنا، اس لئے کہ آگ سے عذاب دینا، صرف اللہ کا کام ہے"

آگ سے عذاب دینا صرف اللہ کا کام ہے، لیکن

حضرت انس رضہ سے روایت ہے، کہ چند آدمی مدینہ میں آکر بیمار ہو گئے، حضور نے انہیں اجازت دے دی، کہ وہ سرکاری اونٹنیوں کا دودھ پئیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، جب وہ شفایاب ہو کر تر و تازہ ہو گئے، تو انہوں نے رکھوالے کو مار ڈالا، اور اونٹنیوں کو ہانک کر چل دیے . . . .

آپ نے انہیں مندرجہ ذیل سزائیں دیں

(الف) پہلے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے،

(ب) پھر لوہے کی سلائیں گرم کر کے ان کی آنکھوں میں پھیریں۔

(ج) اس کے بعد انہیں گرم ریت پہ پھینک دیا، وہ تڑپ تڑپ کر پانی مانگتے رہے لیکن کسی نے نہ دیا، اور ہلاک ہو گئے"

یہ بے رحمی رحمۃ للعالمین کی شان سے بعید ہے، مزید براں قرآن نے قاتل کے لئے صرف سزائے موت تجویز کی ہے، نہ کہ یہ تین سزائیں بہ یک وقت" (دو اسلام ص۳۱۱)

ازالہ برق صاحب کے نزدیک ان دونوں احادیث میں یہ تعارض ہے، کہ پہلی حدیث میں ہے کہ "آگ سے مت جلاؤ" اور دوسری میں ہے، کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوہے کی سلاخیں گرم کر کے آنکھوں میں پھیریں، اور گرم ریت پر انہیں ڈال دیا، برق صاحب ان دونوں میں

فرق تو ضرور ہے، دوسری میں آگ سے جلانے کا کوئی ذکر نہیں، کہاں آگ میں جلا کر مار ڈالنا اور کہاں گرم سلائی پھیرنا، مگر خیر آپ کی خاطر میں اس کو تضاد ہی مانے لیتا ہوں، اب سنیئے

پہلی حدیث میں ایک اسلامی قانون ہے، کہ کسی شخص کو کسی سزا میں جلانے کا اختیار حکومت کو نہیں ہے، دوسری حدیث میں ایک قرآنی قانون پر عمل ہے، اچھا اب یہ بتائیے، کہ اگر کسی ظالم نے کسی شخص کو آگ میں جلا کر مارا ہو، تو اس ظالم کی سزا کی کیا نوعیت ہوگی؟ قرآن کی آیت سنیئے:-

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ (البقرۃ)	جو شخص تم پر زیادتی کرے، تو تم بھی اس پر اس ہی جیسی زیادتی کرو (البقرۃ)

کہیئے اس قرآنی حکم کی تعمیل فرض تھی یا نہیں، اگر تھی، تو پھر یہ جلانے کا عذاب اللہ کی طرف سے ہوا، بندوں کی طرف سے نہیں، بندوں نے تو صرف اللہ کے حکم کی تعمیل کی، اور اگر آپ یہ فرمائیں، کہ اس جلانے والے ظالم کو صرف تلوار سے قتل کر دیا جائے تو پھر میں پوچھنے کا حق رکھتا ہوں، کہ کیا یہ برابری کا قصاص ہے، کیا اس سزا سے خوفناک مظالم کا انسداد ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ خوفناک مظالم کے انسداد کے لئے اسی جیسی خوفناک سزا ہونی چاہیئے، ورنہ ایک آدمی آگ میں جل کر جان دے اور دوسرا آناً فاناً تلوار کی ضرب یا بجلی کے جھٹکے سے مر جائے کیا یہ انصاف کا خون کرنا نہیں ہے کیا یہ قانون قصاص کا نقص نہیں ہے، اللہ تعالیٰ تو خود فرماتا ہے۔

اَلْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدہ)	آنکھ کے بدلے آنکھ پھوڑی جائے دانت کے بدلے دانت توڑا جائے، اور اسی طرح تمام زخموں کا قصاص لیا جائے۔

کہیئے، کیا قصاص کی یہ سزائیں بے رحمی کا مظاہرہ نہیں کرتیں، بے شک کرتی ہیں، لیکن ان بے رحمیوں کے انسداد کا یہی ایک ذریعہ ہے، اور اسی لئے رحیم و کریم اللہ کا یہ قانون ہے، کہ جیسا کرو ویسا بھرو، انہوں نے جیسا چرواہوں کے ساتھ کیا تھا، ویسا ہی ان کے ساتھ کیا گیا، حدیث میں موجود ہے۔

انما سمل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعین اولٰئک لانھم سملوا اعین الرعاء (صحیح مسلم باب حکم المحاربین)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی آنکھوں میں گرم سلائی اس لئے پھروائی تھی، کہ انہوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیری تھی۔

ایک اور حدیث میں ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اللھم عطش من عطش اٰل محمد (نسائی ج ۲ ص ۱۵ کتاب المحاربۃ)

اے اللہ ان لوگوں کو پیاسا مار جنہوں نے آل محمدؐ کو پیاسا مارا۔

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا، کہ ان لوگوں نے مسلمان چرواہوں کی آنکھوں میں گرم سلائی پھروائی تھی، اور ان کو پیاسا مارا تھا، اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے :۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ (المائدہ ۔ ۳۲)

جو لوگ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں، اور ملک میں فساد برپا کرتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کر دیئے جائیں، یا پھانسی دیئے جائیں، یا مخالف سمت کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے جائیں، یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔

دیکھا آپ نے قرآن میں قتل کے علاوہ بھی سخت سزائیں ہیں، کیا یہ بھی بے رحمی ہے۔

الغرض جو کچھ مظالم انہوں نے کئے تھے، وہی ان پر دہرائے گئے، لوٹ مار کی سزا میں قرآن کے حکم کے ماتحت ان کے پیر کاٹے گئے قتل کی سزا میں قتل کئے گئے، آنکھوں میں سلائی پھیرنے، اور دوسری زیادتیوں کی سزا میں بطور قصاص ان پر ویسی ہی سزا نافذ کی گئی، اور اس طرح قرآن کے ہر حکم پر عمل کیا گیا، یہ ہیں وہ عبرت ناک سزائیں جن سے امن عالم برقرار رہتا ہے، اور کسی کو کسی پر ظلم ڈھانے کی ہمت نہیں ہوتی، آپ سزاؤں کو تو دیکھتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے، کہ یہ ایک سزا اپنے جیسے سینکڑوں واقعات کا انسداد کرتی ہے، اگر ایک دفعہ کی بے رحمی سے متعدد بے رحمیوں کا استیصال ہوتا ہے تو یہ سودا بہت سستا ہے۔

نہ معلوم برق صاحب کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی، اور اگر آپ اس کو اب بھی بے رحمی ہی سمجھیں، تو کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ سو کوڑوں کی سزا بھی بے رحمی ہے آنکھ کے بدلے آنکھ پھوڑنا بھی بے رحمی ہے، چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنا بھی بے رحمی ہے، کیا آپ ان تمام سزاؤں کو قرآن میں سے نکال دیں گے؟ اگر نہیں، تو پھر ان سب بے رحمیوں کے ساتھ اس حدیث کی سزاؤں پر بھی صبر کیجئے آپ کو رحم آتا ہے، لیکن قرآن کو دیکھئے، کہ وہ سو کوڑوں کی سزا دیتے وقت رحم کرنے سے منع کرتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے، کہ بے رحمی کا حکم دیتا ہے ارشاد ہے :۔

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي

اللہ تعالےٰ کی اس سزا کو نافذ کرتے وقت تم کو

دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ (النور ۲)
ان دونوں پر کسی قسم کا رحم نہیں آنا چاہیے، اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

خلاصہ یہ ہے، کہ سزاؤں کا نافذ کرنا بے رحمی نہیں ہے، اور اگر رحم آبھی جائے تو اس رحم کی وجہ سے اللہ تعالٰی کی مقرر کردہ سزا کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

غلط فہمی "حضور نے فرمایا...... تین چیزیں منحوس ہیں گھوڑا، عورت اور مکان"...... اس ارشاد کا مقصد تو یہی ہو سکتا ہے، کہ لوگ ان منحوس چیزوں سے بچیں، لیکن لوگ کیسے بچ سکتے ہیں، جب خود حضور نے ایک گھوڑا، گیارہ بیویاں، اور نو مکانات اپنے قبضے میں رکھے تھے، اگر کوئی ہم سے پوچھ بیٹھے، کہ کیا یہ قول اسی رسول کا ہے..... جس نے فرمایا تھا، کہ "نکاح میری سنت ہے"..... تو ہم کیا جواب دیں گے" (دو اسلام ص۳۱۲، ص۳۱۴)

ازالہ قرآن مجید میں ہے:-

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ (البقرة)
سب لوگ ایک ہی جماعت تھے پس اللہ نے نبیوں کو بھیجنا شروع کر دیا۔

بتائیے جب سب ایک ہی راستہ پر گامزن تھے، متفق و متحد تھے، کہیں اختلاف و افتراق کا نام و نشان نہیں تھا، تو پھر نبیوں کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اختلاف پیدا کرنے کے لئے؟ قرآن کی اس آیت سے تو یہی نکلتا ہے؟ کیا یہ قرآن پر اعتراض نہیں ہے؟ لیکن قرآن کی دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے، کہ شروع میں لوگ متحد تھے، جب اختلاف کرنے لگے، تو نبیوں کی ضرورت محسوس ہوئی، اور نبی بھیجے جانے لگے، یہ آیات مذکورہ بالا آیت پر سے اعتراض کو دور کر دیتی ہے یا ایک آیت کی تشریح دوسری آیت کر دیتی ہے، اور غلط فہمی کا ازالہ کر دیتی ہے، یہی حال حدیث کا ہے، ایک حدیث کی تشریح دوسری جگہ موجود ہوتی ہے، اگر کہیں مجمل حدیث ہو، تو غلط فہمی کا امکان تو ضرور ہے لیکن اس کا ازالہ دوسری احادیث سے ہو سکتا ہے، جو آگے پیچھے موجود ہوتی ہیں، مگر اس کے لئے تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے، برق صاحب نے عبداللہ بن عمر رضی کی حدیث نقل کی ہے، ان ہی عبداللہ بن عمر رضی سے دوسری جگہ اس حدیث کی تشریح موجود ہے، عبداللہ بن عمر رضی فرماتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

ان كان الشوم فى شئ ففى الدار والمرأة والفرس (صحیح بخاری)
نحوست اگر کسی چیز میں ہوتی، تو ان تین چیزوں میں بھی ہوتی، گھر، عورت، گھوڑا۔

حضرت سہل کی روایت کا بھی یہی مضمون ہے، الفاظ یہ ہیں:۔

ان کان فی شیئ ففی الفرس والمرأۃ والمسکن (صحیح بخاری) — اگر نحوست کا کوئی وجود ہوتا، تو ان تین چیزوں میں بھی ہوتا، گھوڑا، عورت، گھر

اب اس حدیث کا پس منظر ملاحظہ فرمایئے، ایام جاہلیت میں لوگوں کا خیال تھا کہ فلاں فلاں چیزوں میں نحوست ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باطل عقیدہ کی تردید ان الفاظ میں کر دی، کہ نحوست کا کوئی وجود نہیں، اگر ہوتی، تو ان محبوب ترین چیزوں میں بھی ہوتی جن سے کنارہ کشی ناممکن ہے، کیا نحوست کی وجہ سے ان چیزوں کو چھوڑا جا سکتا ہے، ہرگز نہیں، جب یہ نہیں ہو سکتا، تو پھر محض نحوست کے وہم سے دوسری چیزوں کو چھوڑنا لایعنی ہے، یہ تو ہے حدیث کا منشا، ہاں قرآن میں ضرور نحوست کا ذکر ملتا ہے، قوم عاد پر جو عذاب بھیجا گیا تھا، وہ منحوس دنوں میں بھیجا گیا تھا، ارشاد باری ہے:

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (القمر) — ہم نے ان پر دائمی منحوس دن میں سخت آندھی کا عذاب بھیجا تھا۔

غلط فہمی "کیا جن عورتوں نے لاکھوں انبیاء و اولیاء پیدا کئے، جن کی گود میں لقمان و فلاطون کھیلے ..... وہ منحوس ہیں، اور ہم مسعود؟" (دو اسلام ص۳۱۴)

ازالہ یہ تو اوپر ثابت کیا جا چکا ہے، کہ عورت منحوس نہیں ہے، اور یہ کہ برق صاحب حدیث کا مطلب غلط سمجھے ہیں، تاہم ایک بات عرض ہے، کہ کیا یہ عبارت محض جذبات کو بھڑکانے کے لئے نہیں ہے، کیا اس میں مبالغہ و رنگینی نہیں ہے، برق صاحب یہ عبارت اس طرح بھی ترتیب دی جا سکتی ہے

"کیا جن عورتوں نے لاکھوں شیطان کے انبیاء اور اولیاء پیدا کئے جن کی گود میں فرعون و ہامان کھیلے، جنہوں نے کافر، چور، ڈاکو، بدمعاش، رہزن، سفاک، فجار، شرابی لوگوں کو جنم دیا، وہ مسعود ہیں؟ کیا جن عورتوں نے ابولہب، ابوجہل اور دیگر اشرار کو اپنے دودھ سے پرورش کیا، کیا وہ منحوس نہیں؟ اور سنیئے، عزیز مصر کی زبان سے قرآن کیا کہتا ہے:۔

إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ (یوسف) — اے عورتوں بے شک تمہارا مکر و فریب بہت زبردست ہوتا ہے۔

کیا یہ ان ہی عورتوں کے متعلق ہے جنہوں نے بڑے بڑے انسان پیدا کئے تھے، قرآن کہتا ہے:۔

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (الاحزاب) — بے شک انسان بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے

کیا یہ انہی انسانوں کے متعلق ہے، جن میں لاکھوں انبیاء اور اولیاء پیدا ہوئے، برقی صاحب حدیث پر اعتراض کرنے سے پہلے ذرا قرآن کا بھی مطالعہ کر لیا کیجئے قرآن کہتا ہے:۔
وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (کھف) انسان بڑا ہی جھگڑالو ہے۔
کیا ان انسانوں کے زمرے میں انبیاء بھی شامل ہیں، اگر نہیں، تو کیوں؟

غلط فہمی ابوہریرہ حضور سے روایت کرتے ہیں، کہ جب نماز کے لئے اذان دی جاتی ہے، تو شیطان پادتا ہوا بھاگ جاتا ہے، اور اذان کے بعد واپس آجاتا ہے . . . واپس آکر نمازی پر مسلط ہو جاتا ہے اسے بھولی ہوئی باتیں یاد دلانا شروع کر دیتا ہے، یہاں تک کہ نمازی بھول جاتا ہے، اور اسے یاد نہیں رہتا، کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں
شیطان کا اذان کی عربی عبارت سے گھبرانا . . . لیکن نماز کی لمبی چوڑی دعاؤں کی پروا نہ کرنا، اور نمازی پر سوار رہنا ایک ایسی منطق ہے، جو شاید کسی عقلمند کی سمجھ میں کبھی بھی نہ آسکے"

(دو اسلام ص ۳۱۴ ص ۳۱۵)

ازالہ اذان شعائر اسلام میں سے ہے اعلائے کلمۃ الحق ہے، اللہ وحدہ لاشریک لہ کی توحید کا اعلان ہے، اور اس اکیلے کی عبادت کی طرف دعوت عام ہے، یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بنا پر شیطان اذان سے دور بھاگتا ہے، یہ آواز اس کو بری لگتی ہے، اس سے اس کو ڈر محسوس ہوتا ہے، اور وہ خوفزدہ ہو کر بھاگتا ہے، اور نہیں چاہتا کہ اس دعوت توحید کا عام اعلان اس کے کان تک پہنچے اسی طرح جب اقامت ہوتی ہے، تو کیونکہ اس میں بھی وہی اعلان ہوتا ہے، اس لئے شیطان دور ہو جاتا ہے" (برقی صاحب نے لکھا ہے، کہ "جب نمازی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے" حالانکہ ترجمہ صحیح یہ ہے کہ "جب نماز کی اقامت ہوتی ہے")

اس کے علاوہ بھی اس میں کوئی اور مخفی راز ہو، تو ہم کو کیا علم، ہم لوگ غیب پر ایمان لانے والے ہیں اور عالم روحانیات و عالم مثال میں رسول کے بیان کی تصدیق کرتے ہیں، اور اس کو بے چون وچرا تسلیم کرتے ہیں، اس کے کنہ اور رموز سے واقف ہونا ہمارے لئے ضروری نہیں، اگر ہم رسول کی بات کو اس وقت تسلیم کریں، جب وہ ہماری عقل میں آجائے۔ تو پھر ہمارا ایمان عقل پر ہوا، نہ کہ رسول پر، بلکہ اس طرح تو رسول کی تکذیب ہوئی، کہ اگر کوئی بات ہماری سمجھ میں نہ آئے تو ہم یہ کہدیں، کہ ہمیں آپ کی یہ بات تسلیم نہیں، اور گویا آپ نے جو بات ہمیں بتائی ہے، وہ غلط ہے، کسی صحیح حدیث کو اس طرح جھٹلایا نہیں جاسکتا، کیونکہ اس اصول پر تو پھر قرآن بھی پورا نہیں اترتا، قرآن میں ہے، کہ مرتے وقت فرشتے

مرنے والے سے باتیں کرتے ہیں، وہ جواب دیتا ہے، لیکن یہ چیز ہماری عقل میں نہیں آتی، تو کیا اس کو تسلیم نہ کریں؟

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ برق صاحب نے اس کو مان لیا ہے، اس کے آگے وہ لکھتے ہیں:۔

غلط فہمی "چلو مان لیتے ہیں، کہ شیطان بلند آواز سے گھبراتا ہے، اس لئے بھاگ نکلتا ہے، لیکن یہ تو فرمایئے، کہ اگر نماز میں بھول صرف شیطانی تسلط کی وجہ سے ہوتی ہے، تو آنحضرت صلعم کیوں بھول جایا کرتے تھے . . . . کیا یہ شیطان رسول اللہ صلعم پر بھی تسلط پا سکتا تھا" (ص ۳۱۵)

ازالہ برق صاحب بھول شیطان کی طرف سے بھی ہوتی ہے، اور فطرۃً بھی ہوتی ہے، بھول سے صرف اللہ تعالیٰ مستثنیٰ ہے، قرآن میں ہے:۔

لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى (طٰہٰ)	میرا رب نہ بھٹکتا ہے نہ بھولتا ہے

شیطان کی طرف سے جو بھول ہوتی ہے، اس کی مثال مندرجہ ذیل آیت میں ہے:۔

إِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ۔ (الکہف)	موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نے کہا، کہ میں مچھلی کو بھول گیا، اور آپ سے اس کا ذکر کرنا مجھے شیطان ہی نے بھلا دیا۔

دوسری آیت میں ہے:۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ (الکہف)	موسیٰ علیہ السلام نے کہا، کہ جو بھول مجھ سے ہوئی اس پر میری گرفت نہ کیجیے۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ موسیٰ علیہ السلام بھی بھولتے تھے، ان کے ساتھی کی بھول شیطان کی طرف سے تھی، اور خود ان کی بھول فطرۃً واقع ہوئی تھی، اور اس لحاظ سے بھول کی دو قسمیں ہوئیں، لیکن دونوں آیتوں کو ملا کر نتیجہ نکالا جائے، تو یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ بھول جس طرح پہلی مرتبہ شیطان کی طرف سے تھی، دوسری مرتبہ بھی شیطان کی طرف سے تھی، تو پھر وہی اعتراض قرآن پر ہوگا، جو حدیث پر ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام پر شیطان تسلط پا سکتا تھا، ہم اس نتیجہ کے اخذ کرنے سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں، کہ موسیٰ علیہ السلام کی بھول فطری تھی، جو انسان کی تخلیق میں شامل ہے اس بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کہ نماز میں بھول شیطان کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے اور فطرۃً بھی ہو سکتی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھول فطرۃً تھی، نہ کہ شیطان کی وجہ سے، اور یہ چیز اس حدیث میں بھی موجود ہے، جس کا حوالہ برق صاحب نے دیا ہے، نماز کے بعد آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

انما انا بشر مثلکم انسی کما تنسون (صحیح بخاری و صحیح مسلم) — یعنی میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں، اسی طرح بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو،

گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود صراحت کر دی، کہ میری بھول انسانی فطرت کے تقاضہ سے واقع ہوئی تھی، برق صاحب حدیث میں اس کی صراحت موجود تھی، پھر بھی آپ نے اس کو شیطانی بھول سمجھ لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطری بھول کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ (الکھف) — اور جب آپ بھول جایا کریں، تو اللہ کا ذکر کیا کیجیئے

اور سنیئے قرآن کیا کہتا ہے:۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ (ص) — اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کیجیئے، جب انہوں نے اپنے رب سے کہا، کہ شیطان نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔

بتایئے ایوب علیہ السلام رسول تھے یا نہیں ؟ اگر تھے، تو ان پر شیطان کا تسلط کیسے ہو گیا، کیا شیطان ایوب علیہ السلام پر بھی تسلط (قابو) پا سکتا تھا، اب کیا کریں، اس آیت کو قرآن سے نکال دیں کیونکہ اس آیت سے ایک رسول کی توہین ہوتی ہے، کیا ایوب علیہ السلام کو یہ کہنا چاہیئے تھا، کہ اے اللہ یہ میرے اعمال کی وجہ سے ہے، کیونکہ تو فرماتا ہے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (الشوریٰ) — اور جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے، وہ تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

لہٰذا اے اللہ میرے گناہوں کو معاف فرما، اور اس مصیبت کو دور فرما، لیکن کہا تو یہ کہ شیطان نے مجھ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے، وہ مجھے عذاب یعنی سزا دے رہا ہے، ان کو تو یہ کہنا چاہیئے تھا، کہ اے اللہ یہ مصیبت (سزا) بھی تیری ہی طرف سے ہے، کیونکہ تو فرماتا ہے:۔

كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (النساء) — یعنی ہر راحت و مصیبت اللہ کی طرف سے ہے

اور تو ہی فرماتا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ (البقرۃ) — اور ہم ضرور تمہاری آزمائش کریں گے۔

تو اب یہ مصیبت تیری ہی طرف سے ہے، اور تیری آزمائش ہے، اے اللہ اب اس آزمائش کو

ختم کردے، لیکن ان الفاظ میں سے کچھ بھی نہیں کہا۔ بلکہ قرآن کی ان دونوں (بظاہر) متضاد باتوں کو چھوڑ کر یہ کہا، کہ شیطان نے مجھے نسیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ کیا یہ جملہ الہامی تعلیم کے خلاف نہیں ہے اگر ہے، تو بتایئے اس آیت کا ہم کیا جواب دیں، غیر مسلموں کو اس کا کیا مطلب بتائیں، برق صاحب درحقیقت غلط فہمی سے کچھ کا کچھ ہو جایا کرتا ہے، اور اس کی زد میں صرف حدیث ہی نہیں قرآن بھی آسکتا ہے، اللہ ایسی غلط فہمیوں سے پناہ میں رکھے، بلا وجہ حدیث پر اعتراض کرنے سے کیا فائدہ جب غلط فہمی سے اس سے زیادہ بڑا اعتراض قرآن پر ہو سکتا ہے

بقول برق صاحب "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" (دو اسلام ص ۳۱۹)

غلط فہمی

"آنحضرت کے سامنے کسی نے کہا، کہ فلاں شخص دن چڑھے تک سویا رہا، آپ نے فرمایا کہ شیطان اس کے کانوں میں موت گیا، اس لئے سویا رہا"

لیکن اسی جلد کے صفحہ ۷۷ پر یہ روایت دی ہوئی ہے

"عمران بن حصین کہتے ہیں، کہ ہم ایک مرتبہ حضور کے ہم سفر تھے، پچھلی رات تک ہم چلتے رہے سحر کے قریب لیٹ گئے، اور دیر تک سوئے رہے۔۔ ۔۔۔ سب سے پہلے حضرت صدیق بیدار ہوئے، آپ نے حضور کے سرہانے کھڑے ہو کر بلند آواز سے تکبیر کہنا شروع کر دی، چنانچہ آپ بیدار ہوئے، اور نماز پڑھائی ۔۔۔"

اگر کوئی پوچھ بیٹھے، کہ کیا حضور کے دن چڑھے تک سوئے رہنے کی وجہ بھی رہی تھی، جو اوپر والی حدیث میں دی گئی ہے، تو بغیر اس کے کیا کہیں گے کہ استغفر اللہ استغفر اللہ (دو اسلام ص ۳۱۵-۳۱۶)

ازالہ

برق صاحب دونوں حدیثوں کا موقع و محل علیحدہ علیحدہ ہے، آپ نے دونوں کو ایک ہی سیاق و سباق میں پیش کر دیا، اور یہی اصل غلط فہمی ہے، پہلی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

مازال نائما حتی اصبح ماقام الی الصلوۃ قال ذلک رجل بال الشیطان فی اذنہ (صحیح بخاری)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر ہوا، کہ فلاں شخص ہمیشہ دن چڑھے تک سوتا رہتا ہے نماز نہیں پڑھتا، آپ نے فرمایا، اس شخص کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا۔

یہ ہے اس شخص کی حقیقت ہے جو ہمیشہ دیر سے اٹھتا ہے، پھر یا تو نماز پڑھتا ہی نہیں، اور اگر پڑھتا ہے، تو بے وقت، تو گویا اس پر شیطان کا تسلط ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بھی اس مضمون کو ادا کیا ہے:۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ	اور جو اللہ کے ذکر سے غافل ہو جائے، تو ہم اس
نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ	پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں، پس وہی اس
قَرِيْنٌ (الزخرف)	کا ساتھی ہوتا ہے۔

اگر کوئی پوچھ بیٹھے، کہ ایوب علیہ السلام پر جو شیطان کو تسلط دیا گیا تھا، کیا وہ بھی اسی قبیل سے تھا، تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہیں گے، کہ استغفر اللہ استغفر اللہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نیند آگئی، اور آپ دیر سے اٹھے، وہ ایک دن کا واقعہ ہے، جو جہاد سے واپسی کے وقت سفر میں پیش آیا، کافی رات تک سفر جاری رہا، اور اس کے بعد آپ اور صحابہ کرام رضہ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے، کیونکہ ساری رات کے تھکے ہوئے تھے، لہذا فطرتاً آنکھ دیر سے کھلی، یہاں دیر سے آنکھ کھلنے کو اللہ کے ذکر سے غفلت برتنے پر کس طرح محمول کیا جاسکتا ہے، اور جب اللہ کے ذکر سے غفلت نہیں، تو شیطان کا تسلط کیسے ہو سکتا ہے، برخلاف اس کے جو شخص ہر زمانہ خواب غفلت میں پڑا رہتا ہے، اللہ کے ذکر سے جی چراتا ہے، جاگ کر بھی نماز نہیں پڑھتا (جیسا کہ حدیث اول میں ہے) تو ایسے شخص پر شیطان کا تسلط ہوتا ہے، یہ ہے ان دونوں احادیث کا مطلب

غلط فہمی "حضور کا ارشاد ہے" جب تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کے لئے بیٹھے، تو وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھ . . . . . اور یہ بھی ملاحظہ ہو:-

عبداللہ بن عمر رضہ کہتے ہیں، کہ میں حضرت حفصہ رضہ کے پاس والے مکان کی چھت پر چڑھا تو کیا دیکھتا ہوں، کہ حضور علیہ السلام قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے قضائے حاجت فرما رہے ہیں کس کو صحیح سمجھیں؟" (دو اسلام ص ۳۱۶)

ازالہ دونوں کو صحیح سمجھیے، کیونکہ دونوں صحیح ہیں، اور اپنے اپنے محل پر واجب العمل اور قابل عمل ہیں، ان ہی عبداللہ بن عمر رضہ نے جن کی روایت آپ نے نقل کی ہے، ان دونوں حدیثوں کے تعارض کو رفع کر دیا ہے، غالباً وہ وضاحت آپ کی نظر سے نہیں گذری، ایک صاحب نے عبداللہ بن عمر رضہ کو دیکھا، کہ انہوں نے اپنی اونٹنی کو بٹھایا، اور اس کو اپنے اور قبلہ کے درمیان کر کے پیشاب کرنے بیٹھ گئے، ان صاحب نے عبداللہ بن عمر رضہ سے کہا، کیا اس سے منع نہیں کیا گیا، عبداللہ بن عمر رضہ نے جواب دیا۔

بلى انما نهى عن هذا فى الفضاء	بے شک اس سے منع کیا گیا ہے، لیکن یہ
فاذا كان بينك وبين القبلة	ممانعت کھلی فضا میں ہے، اگر تمہارے اور

شیٔ یسترلہ فلا باس (ابوداؤد) — قبلہ کے درمیان کوئی چیز حائل ہو، تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ ممانعت اس وقت ہے، جب کوئی سترہ نہ ہو، اور جب کوئی سترہ سامنے ہو، تو پھر ممانعت نہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے پائخانہ میں قضائے حاجت فرما رہے تھے، لہٰذا آپ کے اور قبلہ کے درمیان دیوار حائل تھی، یہ تضاد کی صورت نہیں۔

غلط فہمی صعب بن جثامۃ اللیثی کہتے ہیں، کہ میں نے حضور کے پاس ایک گورخر بھیجا، آپ نے لوٹا دیا..... اور فرمایا کہ میں نے احرام باندھا ہوا ہے، ورنہ ضرور لے لیتا (مسلم ج ۱ ص ۲۳۳)

مطلب یہ کہ احرام میں شکار کا گوشت کھانا ناجائز ہے، اب دیکھئے یہ حدیث۔

سال حدیبیہ میں رسول اللہ صلعم کے ہمراہ ابو قتادہ بھی تھا، جس کے بغیر باقی سب نے احرام باندھا ہوا تھا، اثنائے سفر میں ایک گورخر نظر آ گیا، ابو قتادہ سوار ہو کر اس کے پیچھے دوڑ پڑا، اور آخر اسے پیچھے سے مار لیا، ذبح کر کے پکایا، اور صحابہ کو پیش کیا، صحابہ نے حضور سے پوچھا، کہ کیا ہم کھا لیں، فرمایا کھاؤ، یہ حلال ہے۔" (مسلم ج ۳ ص ۲۲۶) (دو اسلام ص ۳۱۷)

ازالہ آپ نے ان دونوں احادیث کو تعارض کی مثال میں پیش کیا ہے، حالانکہ تعارض بالکل نہیں ہے پہلی حدیث سے جو نتیجہ آپ نے نکالا ہے، وہ بھی صحیح نہیں، احرام میں شکار کا گوشت کھانا جائز ہے، بشرطیکہ (۱) خود شکار نہ کیا ہو (۲) شکار کے سلسلہ میں کسی قسم کی مدد نہ کی ہو، یا اشارہ نہ کیا ہو، اور (۳) شکار کرنے والے نے محرم کی نیت سے شکار نہ کیا ہو، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

صید البر لکم حلال وانتم حرم مالم تصیدوہ او یصد لکم (ابوداؤد) — بری شکار کا گوشت حالت احرام میں تمہارے لئے حلال ہے، بشرطیکہ تم نے خود شکار نہ کیا ہو، یا شکار تمہارے لئے نہ کیا گیا ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی محرم کو پیش کرنے کے لئے اگر شکار کیا جائے تو وہ شکار اس محرم کے لئے حرام ہے، حضرت صعب نے جو گورخر آپ کو پیش کیا تھا، وہ انہوں نے آپ ہی کے لئے شکار کیا تھا، اور اسی وجہ سے اس کا ایک حصہ نہیں، بلکہ سالم گورخر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا، اور اسی لئے آپ نے قبول نہیں فرمایا، اور جو گوشت ابو قتادہ نے پیش کیا، وہ کھا لیا، اس لئے کہ وہ شکار آپ کی نیت سے نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا تطبیق کی صورت تو دونوں حدیثوں میں موجود ہے، لیکن برق صاحب نے تحقیق نہیں کی،

غلط فہمی "یہی حدیث ذرا آگے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:۔
...... اور کچھ گوشت ہم حضور کے پاس لے گئے، آپ نے خود تو نہ کھایا لیکن صحابہ رضہ کو اجازت دے دی" ذرا آگے اسی واقعہ کو یوں پیش کیا گیا ہے
...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، کچھ باقی ہے؟ صحابہ نے کہا صرف ایک ٹانگ باقی ہے، چنانچہ آپ نے وہ ٹانگ لی، اور کھا گئے" (دو اسلام صفحہ ۳۱۷ - ۳۱۸)

ازالہ برق صاحب نے ان دونوں عبارتوں کو تضاد کی شکل میں پیش کیا ہے یعنی ایک جگہ ہے کہ آپ نے گوشت نہیں کھایا، دوسری جگہ ہے، کہ آپ نے کھایا، برق صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میں کون سی بات صحیح ہے، اور کون سی غلط؟ اس کے متعلق عرض ہے، کہ "آپ نے خود تو نہ کھایا" کے الفاظ حدیث میں تو ہیں ہی نہیں، آپ پوری صحیح مسلم پڑھ جائیے، ایسے الفاظ آپ کو کہیں نہ ملیں گے جن کا یہ ترجمہ ہو جو برق صاحب نے نقل کیا ہے، درحقیقت برق صاحب کو اس جگہ بڑا زبردست دھوکا ہوا ہے

غلط فہمی "ایک ہی بات کو اتنی متضاد صورتوں میں پیش کیا گیا ہے، کہ پڑھنے والا قیامت تک حقیقت کو نہ پا سکے، بایں ہمہ ہمارے ملا ہر طرف سے شور مچا رہے ہیں، کہ یہ وحی ہے خبردار جو اس کی صحت و صداقت پر شبہ کیا، ورنہ تمہیں کافر بنا کر جہنم میں اوندھا لٹکا دیں گے"
(دو اسلام صفحہ ۳۱۸)

ازالہ "آپ نے خود تو نہ کھایا" حدیث میں نہیں ہے، لہٰذا تضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر ترجمہ بھی برق صاحب نے صحیح طور پر پیش نہیں فرمایا، بعض صحابہ پہلے ہی کھا چکے تھے، اور بعض نے کھانے سے انکار کر دیا تھا، پھر یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، صحابہ نے مسئلہ پوچھا آپ نے فرمایا، کھا لو، صحابہ نے کھایا، کچھ دیر بعد آپ نے پوچھا "کچھ بچا ہے" لوگوں نے کہا ایک پنڈلی بچی ہے، آپ نے وہ پنڈلی لے کر تناول فرمالی، بتائیے، اس میں کیا تضاد ہے؟ لہٰذا کیوں نہ کہا جائے کہ یہ وحی ہے اگر تضاد ہوتا، تو وحی نہ کہتے، جب تضاد نہیں تو پھر وحی ماننے میں کیا عذر ہے

پھر برق صاحب یہ بھی یاد رکھیے، کہ یہ پورا واقعہ وحی نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اس پورے واقعہ سے جو نتیجہ نکلا وہ یہ مسئلہ ہے، کہ محرم بعض شرائط کے ساتھ شکار کا گوشت کھا سکتا ہے، اور یہ مسئلہ ہے جو من جانب اللہ وحی ہے، کہئے اس مسئلہ کے وحی ہونے سے کیا امر مانع ہے، اور اگر کچھ شبہ دہ گیا ہو، تو سنیئے قرآن کیا کہتا ہے:۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۔ وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (ھود)	اور اللہ نے نوح علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی، کہ تمہاری قوم کے لوگ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے بجز ان کے جو ایمان لا چکے، لہٰذا ان کے افعال پر تم غم مت کرو، اور ہمارے حکم سے ایک کشتی بناؤ اور ظالموں کے حق میں مجھ سے کچھ مت کہنا یہ سب غرق کئے جائیں گے

دوسری آیات سنیئے:۔

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (نوح)	اور نوح علیہ السلام نے کہا اے میرے رب روئے زمین پر ایک بھی کافر کو نہ رہنے دے، اگر تو ان کو زندہ چھوڑے گا، تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے، اور ان کی اولاد بھی فاجر اور کافر ہی ہو گی

سورہ ہود کی آیات سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضرت نوح علیہ السلام کو بذریعہ وحی خبر دی گئی، کہ اپنی قوم کے ایمان لانے سے ناامید ہو جاؤ، یہ ایمان نہیں لائیں گے، سورہ نوح سے معلوم ہوتا ہے، کہ خود حضرت نوح علیہ السلام ان کے اور ان کی اولاد کے ایمان لانے سے ناامید ہو گئے، تو بد دعا کر دی، پہلی آیات سے معلوم ہوتا ہے، کہ کہیں نوح علیہ السلام ظالموں کے لئے دعا نہ کر بیٹھیں، اس لئے اللہ نے دعا کی ممانعت کر دی، برخلاف اس کے دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے، کہ انہوں نے بہت سخت بد دعا کی، سوال یہ ہے، کہ اللہ کو تو ان کی نیت کا علم تھا، پھر ممانعت کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ تعالے نے تو خود کہہ دیا تھا، کہ یہ سب غرق ہوں گے، پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی، کہ ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑ دیجئے۔

برق صاحب کیا حقیقت کو آپ پا گئے؟ یہ وہ وحی ہے، جس کی صحت و صداقت میں آپ کو بھی کچھ شبہ نہیں، اب اگر غلط فہمی اس کی آیات میں تضاد کا گمان پیدا کر دے، تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہیں، کہ ہمارے فہم کا قصور ہے، نہ کہ آیات کا، یہی حال احادیث کا ہے، کاش آپ انصاف کریں اور تحقیق و تطبیق صحیح کے بعد لکھا کریں، آخری باب میں قرآن میں سے چند مزید تضاد پیش کروں گا، اور پھر بتلاؤں گا کہ یہاں تضاد کا رفع کرنا کتنا مشکل ہے لیکن پھر بھی ہم اس کو وحی مانتے ہیں۔

غلط فہمی • حضور کا فرمان ہے "احرام میں ایسے کپڑے مت پہنو جن پر زعفران یا اور کوئی خوشبو لگائی گئی ہو"

لیکن حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں، کہ احرام باندھتے اور توڑتے وقت میں حضور پر خوشبو چھڑکا کرتی تھی...... سوال پیدا ہوتا ہے، کہ احرام میں خوشبو لگانا جائز ہے یا ناجائز" (دو اسلام ص۳۱۸)

ازالہ پہلی حدیث کا مطلب یہ ہے، کہ حالت احرام میں ایسے کپڑے نہ پہنے جائیں، جو زعفران یا ورس سے رنگے گئے ہوں، ورس ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے، برق صاحب نے اس کا ترجمہ کوئی اور خوشبو" کیا ہے، یہ صحیح نہیں، اس حدیث میں خوشبو لگانے یا نہ لگانے کا کوئی ذکر نہیں، لہٰذا تضاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری حدیث میں برق صاحب نے خلوق کا ترجمہ خوشبو کیا ہے، یہ بھی صحیح نہیں، خلوق زعفران کی ایک مرکب خوشبو ہے، اور کیونکہ حالت احرام میں زعفرانی کپڑے کی ممانعت ہے، لہٰذا آپ نے اس شخص کو کپڑے اتارنے کا حکم دیا، نہ کہ دھونے کا جیسا کہ برق صاحب نے ترجمہ نقل کیا ہے، اور بدن پر جو خلوق لگی ہوئی تھی، اس کو دھونے کا حکم دیا، لیکن خوشبو کی وجہ سے نہیں، بلکہ زعفرانی رنگ کی وجہ سے، اور اس چیز کی صراحت حدیث میں موجود ہے، آپ فرماتے ہیں:-

اغسل عنك اثرالصفرة (مسلم) — اپنے بدن سے زردی کا اثر دھو ڈالو۔

اب جن حدیثوں میں ہے، کہ احرام باندھنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو لگایا کرتے تھے، ان میں اور ان میں کوئی تعارض نہیں، برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھنے کے بعد خوشبو نہیں لگاتے تھے، بلکہ احرام سے پہلے خوشبو لگایا کرتے تھے، جیسا کہ حدیث میں صراحت ہے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں:-

كنت اطيب رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم يطوف على نسائه ثم يصبح محرما ينضح طيبا (صحیح مسلم ج ۱ ص۳۸۹)	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوشبو لگایا کرتی تھی، پھر اس کے بعد آپ اپنی بیویوں سے ملنے جایا کرتے تھے، پھر صبح کو آپ احرام باندھ لیا کرتے تھے، اور خوشبو کی مہک آپ کے بدن مبارک سے آیا کرتی تھی

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ احرام سے پہلے اگر خوشبو لگائی جائے، اور خوشبو کی مہک احرام باندھنے کے بعد بھی آتی رہے، تو یہ جائز ہے، بلکہ سنت ہے۔

غلط فہمی "ابوذر نے حضور سے پوچھا، کہ کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے، فرمایا، ہاں میں نے دیکھا، وہ ایک نور ہے" (مسلم ج ۱ ص ۳۴۱)

لیکن یہی ابوذر اگلی حدیث میں کہتے ہیں۔

"میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، کہ کیا آپ نے اللہ کو دیکھا تھا، فرمایا ھونور انی اراہ" وہ نور ہے، میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں"

یعنی ایک حدیث میں دیکھنے کی نفی ہے، اور دوسری میں اثبات" (دو اسلام ص ۳۱۹)

ازالہ جس حدیث کو برق صاحب نے اگلی بتایا ہے، وہ پہلی حدیث ہے، اور جس کو برق صاحب نے پہلی حدیث کی حیثیت سے پیش کیا ہے، وہ اگلی حدیث ہے، برق صاحب نے دوسری حدیث کو پہلے نقل کیا، اور پہلی کو بعد میں، بات در حقیقت یہ ہے، کہ یہ ایک ہی حدیث ہے جس کو برق صاحب دو حدیثیں سمجھ رہے ہیں، اس حدیث کو امام مسلم نے تین سندوں سے بیان کیا ہے، حدیث زیر بحث کو حضرت قتادہ سے روایت کرنے والے تین محدث ہیں، ایک محدث نے اس روایت کو مختصر ذکر کیا ہے، اس اختصار ہی کی وجہ سے برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، امام مسلم نے اس غلطی کو دور کرنے کے لئے فوراً حضرت قتادہ کے دوسرے شاگردوں کی سندیں نقل کر دیں، اور یہ بتا دیا، کہ پہلے صاحب کی روایت میں یہ نقص ہے، جس کو دور کر لیا جائے، حدیث کے جس حصہ کو وہ صاحب چھوڑ گئے ہیں، دوسرے اصحاب نے اسے بیان کیا ہے، اور وہ حصہ امام مسلم نے آگے بیان کیا ہے، گویا اس طرح حدیث کا متن محفوظ ہو گیا، اب ذیل میں دونوں سندوں کے متن درج ذیل ہیں، مقابلہ کیجئے تضاد کہاں ہے۔

سند اول:۔ حضرت ابوذر پوچھتے ہیں، آپ نے اللہ کو دیکھا تھا، آپ فرماتے ہیں نور انی اراہ" وہ نور ہے، اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں۔

سند ثانی و ثالث:۔ ان سندوں میں وہ الفاظ جو پہلی سند میں رہ گئے ہیں مذکور ہیں، یعنی آپ نے یہ بھی فرمایا تھا "رأیت نورا" میں نے ایک روشنی دیکھی تھی

ان تینوں اسناد کو ملا کر حدیث کا پورا متن اس طرح ہوا "نورانی اراہ رأیت نورا" وہ تو نور مجسم ہے، میں اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں، ہاں میں نے ایک روشنی دیکھی تھی"

امام احمد کی مسند میں یہ دونوں ٹکڑے ایک ہی متن میں بیان ہوئے ہیں، الفاظ یہ ہیں:۔

قد رأیتہ نورا انی اراہ (فتح ربانی مع بلوغ الامانی یعنی مسند احمد جز ۲۰ ص ۲۰۹)

امام مسلم کی دانائی کی داد دینی چاہیئے، کہ پہلے تو انہوں نے مختصر حدیث کو مکمل کیا، پھر مزید غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے فوراً اس روشنی کی تشریح میں ایک اور حدیث نقل کر دی، جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"حجابہ النور" یعنی اللہ کا حجاب بھی نور ہے۔

گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو روشنی دیکھی تھی، وہ حجابات کی روشنی تھی، نہ کہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور کی روشنی، بتایئے کہاں تضاد ہے

برق صاحب نے جو یہ الفاظ نقل کئے ہیں "ہاں میں نے دیکھا تھا وہ ایک نور ہے"، معلوم نہیں یہ کن الفاظ کا ترجمہ ہے، صحیح مسلم میں اس قسم کی کوئی عبارت نہیں، جس کا یہ ترجمہ ہو، معلوم نہیں برق صاحب نے یہ ترجمہ کہاں سے نقل فرمایا ہے۔

غلط فہمی

"مشہور واقعہ ہے، کہ حضور نے اپنی ایک زوجہ کے ہاں جا کر شہد کھایا، چند دیگر ازواج نے سازش کر کے حضور سے کہا، کہ آپ کے منہ سے بدبو آتی ہے جس پر حضور نے قسم کھالی کہ میں آیندہ شہد نہیں کھاؤں گا، اور معاً یہ آیت نازل ہوئی "اے رسول ایک حلال چیز کو حرام کرنے کے اختیارات تمہیں کس نے دیئے ہیں، کیا تم بیویوں کو خوش کرنے کے لئے یہ کر رہے ہو (قرآن)

اس واقعہ کو تجرید بخاری ص ۸۵۶ کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے، کہ حضور نے زینب کے ہاں شہد کھایا، اور حضرت عائشہ و حفصہ نے سازش کی، لیکن ایک اور حدیث (تجرید البخاری ص ۸۹۳) میں بتایا گیا ہے، کہ شہد حفصہ کے ہاں کھایا گیا تھا، اور سازش حضرت عائشہ، حضرت سودہ اور حضرت صفیہ نے کی تھی، یہ اتنا بڑا واقعہ تھا، کہ اس پر تہدید بھی نازل ہوئی، لیکن پھر بھی ہمارے راوی نہ بتا سکے، کہ حقیقت کیا تھی، کیا انہی روایات کو وحی کہا جاتا ہے" (دو اسلام ص ۳۱۹-۳۲۰)

ازالہ

یہ سازش کس نے کی تھی؟ اگر یہ نہ معلوم ہو سکا، تو کون سا دینی حکم ناقص رہ گیا، بلکہ اس میں بھی اللہ کی مصلحت تھی، کہ سازش کرنے والی بیوی کا نام لوگوں کو معلوم نہ ہو، تاکہ کسی بیوی کو اس معاملہ میں دوسروں کے سامنے شرمندگی کا موقع نہ ہو، وہ ستار، اللہ تو پردہ پوشی فرماتا ہے، اور آپ چاہتے ہیں کہ راوی اسے ظاہر کر دیں، اور صحیح نام بتا دیں، یہ ناممکن ہے، اور اللہ کی مصلحت و ستاری کے منافی ہے قرآن نے بھی ناموں کی صراحت نہیں کی، نہ واقعہ کی تفصیل بیان کی، صرف ایک اصول اور حکم بیان کر دیا اور خاموش ہو گیا اب بتایئے یہ اصولی حکم دین کی جان ہے، یا وہ تفصیلات؟ قرآن و حدیث میں دین کی باتیں ہوتی ہیں، اور جہاں تک دین و عبرت کی باتیں ہوتی ہیں، وہاں تک ان میں تفصیل ہوتی ہے، اور جہاں اور جن باتوں سے دین و عبرت کا تعلق نہیں ہوتا، وہاں صرف اشارے ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات

حقیقت کو بالکل مستور رکھا جاتا ہے، مثلاً اصحاب کہف کی تعداد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مختلف اقوال بیان کئے، اور پھر بھی یہ نہیں بتایا، کہ وہ کتنے ہیں بس اتنا کہہ دیا، کہ ان کی صحیح تعداد کو صرف اللہ ہی جانتا ہے، سوال پیدا ہوتا ہے، کہ پھر یہ تین مختلف غلط اقوال بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی صرف صحیح تعداد بیان کر دی جاتی، تینوں مختلف اقوال کا بطلان بھی ہو جاتا، اور صحیح تعداد بھی معلوم ہو جاتی لیکن اتنا اہم واقعہ لیکن پھر بھی قرآن یہ نہ بتا سکا، کہ وہ کتنے تھے، کیا اب ہم یہ کہنے کے مجاز ہیں، کہ "یہی وہ وحی ہے جس پر ایمان لانے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے" ہرگز ہمیں یہ اختیار نہیں ہے، کہ ایسی باتیں منہ سے نکالیں، قرآن ایسی غیر ضروری چیزوں کو وقعت نہیں دیتا، تعداد کا تعلق دین سے نہیں ہے، لہٰذا اس سے خاموشی برتی گئی تو کوئی اعتراض نہیں، اسی طرح سازش کرنے والی بیوی کو آشکارا نہ کیا گیا، کیونکہ اس کا تعلق دین سے نہیں، اگر اس بیوی کا نام نہ بھی معلوم ہو، تو بھی دینی احکام میں کسی قسم کا نقص نہیں آتا۔

برقی صاحب جن احادیث کو وحی کہا جاتا ہے، وہ تو وہ احادیث ہیں، جن سے دینی احکام مستنبط ہوتے ہیں، جن کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول و فعل سے ہوتا ہے، بیویوں کا نام بیان کرنا یہ تو صحابہ کا فعل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نام بیان نہیں کئے، اب اگر یہ نام محفوظ نہ ہوں تو یہ کہا جاسکتا ہے، کہ بعض صحابہ کے گمان صحیح نہیں نکلے، انہوں نے اپنے قیاس سے نام تو بتلائے لیکن قیاس ٹھیک نہیں تھا، اور اللہ کو یہی منظور تھا، نتیجہ یہ نکلا، کہ بعض صحابہ کا ظن و تخمین اگر خلاف واقعہ ہو، تو اس سے حدیث نبوی پر کیا اثر پڑتا ہے، بلکہ ظن و تخمین تو اگر نبی کا بھی ہو، تو اس سے ان دینی احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا جن کو وہ نبی ظن و تخمین سے نہیں، بلکہ قطعی یقین کے ساتھ اللہ کی طرف سے خبردار کرتا ہے، کیا آپ یہ چاہتے ہیں، کہ احادیث میں جو کچھ ہو، بس صحیح اور مطابق واقعہ ہو، تو یہ نہیں ہو سکتا، یہ چیز تو قرآن میں بھی نہیں ہے، قرآن میں کافروں کے غلط اقوال نقل ہوئے ہیں، شیطان کا غلط قیاس موجود ہے بلکہ یہاں تک ہے، کہ "اَغْوَیْتَنِیْ" شیطان نے کہا، کہ اے اللہ تو نے ہی مجھے گمراہ کیا ہے، پھر نہ تو قرآن میں اس غلط قیاس کی تردید ہے، نہ اس گمراہی کے الزام کی تغلیط، اسی طرح اصحاب کہف کی تعداد کے سلسلہ میں تین غلط اقوال نقل کئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

پس ثابت ہوا، کہ اگر کوئی شخص غلطی کرے، اور اس غلطی کو ایک سچا آدمی نقل کر دے، تو اس سچے آدمی پر کوئی حرف نہیں آتا، لوگوں کے غلط اقوال نقل کرنے سے قرآن کو غلط نہیں کہہ سکتے، اسی طرح کسی شخص کی غلطی یا غلط فہمی بیان کرنے سے کتب حدیث غلط نہیں ہو سکتیں، صحابہ نے ناموں کے بتانے میں قیاس کیا، قیاس میں اختلاف ہو گیا، محدثین نے اس اختلاف کو نقل کر دیا، تو اس سے نفس حدیث پر کیا اعتراض

ہے، کسی شخص کے گمان کو وحی کسی نے نہیں کہا، ہاں وہ حدیث وحی ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے دینی احکام کی تشریح میں قولاً و فعلاً صادر ہوئی ہے، اور ایسی ہر حدیث بالکل محفوظ ہے، اور اس پر ایمان لانا لازمی ہے

برخلاف اس کے کسی شخص کے قیاس پر ایمان لانا ضروری نہیں، خواہ وہ حدیث کی کتاب میں ہو، یا قرآن میں، مثلاً شیطان کا یہ قیاس کہ میں آدم علیہ السلام سے بہتر ہوں، یا یہ کہ مجھے اللہ نے گمراہ کر دیا ان قیاسوں کی صحت پر ہمارا ایمان نہیں ہے، ہمارا ایمان محض اللہ تعالیٰ کی خبر پر ہے، یہ صحیح ہے، کہ شیطان نے یہ قیاس کیا تھا، اسی طرح یہ بھی صحیح ہے، کہ بعض صحابہ نے حضرت عائشہ کا نام بتایا تھا، لیکن ان دونوں قیاسوں کی صحت پر ہمارا ایمان نہیں، اور نہ ان غلط قیاسوں کے بیان کرنے والے یا نقل کرنے والی کتابیں ناقابل اعتبار ہیں، اس طرح غلط گمانوں، غلط قیاسوں کو نقل کرنے سے کتاب غیر معتبر ہو جائے، تو پھر یہ اعتراض قرآن پر بھی ہوگا۔ نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات۔

غلط فہمی "صفحات گذشتہ میں ہم حضرت انس کی یہ روایت نقل کر چکے ہیں، کہ کس طرح حضرت جبریل نے رسول اللہ صلعم کا سینہ بچپن میں چیر کر دل کا وہ حصہ کاٹ ڈالا تھا جس پر شیطان کا تسلط ہوا کرتا ہے، اس واقعہ کے متعلق ابوذر کہتے ہیں، کہ جبریل چھت پھاڑ کر گھر میں اتر آیا تھا، اور اس نے آپ کا سینہ چیرا تھا (مسلم ج ا ص ۳۲۴)

چھت پھاڑنے کی بھی خوب کہی، ایک نوری مخلوق، کہ جس کا نہ کوئی جسم ہے نہ وزن، چھت پھاڑنے کی کیا ضرورت تھی، اور اگر بالفرض وزن و جسم تھا، تو کیا گھر میں داخل ہونے کے لئے کوئی دروازہ موجود نہیں تھا؟ سب کچھ تھا" (دو اسلام ص ۳۳۰)

ازالہ برق صاحب آپ نے یہ نہیں بتایا، کہ رات کے وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا یا بند تھا اگر بند تھا، تو پھر چھت کو پھاڑ کے آنے میں کیا تعجب ہے، اگر بند نہیں، تو اس کا ثبوت کیا ہے، حوالہ دیجئے۔

دوسرا اعتراض برق صاحب کا یہ ہے، کہ نوری مخلوق کے لئے دروازہ کی ضرورت ہی کیا ہے، میں کہتا ہوں، کہ روشنی بھی ایک نور ہی ہے لیکن روشنی بغیر روشندان، سوراخ، دروازہ یا کھڑکی کے کمرہ میں داخل نہیں ہوتی، کیا کسی بند مکان میں آپ نے روشنی کو آتے دیکھا ہے، پھر روشنی کی شعاعوں کے لئے ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے، وہ ہے واسطہ (Medium) سائنسدانوں نے واسطہ کو ضروری سمجھا، اور جب ان کی سمجھ میں کوئی واسطہ نہیں آیا، تو ایک فرضی واسطہ بنا بیٹھے جس کا نام انہوں نے ایتھر

(Ether) دکھ لیا، بتائیے کیا نور کے لئے بھی کسی واسطہ کی ضرورت ہے؟ سائنس تو یہی کہتی ہے، کہ نور کے لئے شفاف واسطہ کی ضرورت ہے، لہٰذا نوری مخلوق کے لئے بھی واسطہ کی ضرورت ہے، آخر یہ کیا مشکل بات ہے، جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔

برق صاحب ذرا برق کو ملاحظہ فرمائیے، کتنی غیر مرئی چیز ہے، لیکن اس کو واسطہ اور راستہ کی ضرورت ہے، جب تک اس کے لئے برقی موصل نہ ہو، وہ گذر نہیں سکتی، اگر موصل ہو تو ٹھیک، ورنہ وہ چھتوں کو پھاڑتی ہوئی، دیواروں کو توڑتی ہوئی اپنا راستہ بنا لیتی ہے، اسی پر فرشتوں کو قیاس کر لیجیے، اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کی مصلحت کو اور چسپاں کر لیجیے، انشاء اللہ آپ کی سمجھ میں آجائے گا، رہا حکم کُنی تو وہ بھی قدرت کا ایک کرشمہ ہے اس کے ذریعہ سے ہر ناممکن چیز ممکن ہو جاتی ہے، اس حکم سے اس وقت بحث نہیں، اس وقت تو بحث سائنس کی روشنی میں ہو رہی ہے، اللہ تو سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن عادت الٰہی یہی ہے، کہ پہلے سبب پیدا کرتا ہے۔

غلط فہمی "لیکن جب تک ہمارے علماء داستان میں ڈرامائی رنگ نہ بھر لیں، انہیں تسلی نہیں ہوتی"

(دو اسلام ص۳۲۰ - ص۳۲۱)

ازالہ برق صاحب قرآن شریف میں ہے:۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (النمل)	ایک ذی علم شخص نے کہا کہ میں ملکہ سبا کے تخت کو اتنی دیر میں لا سکتا ہوں جتنی دیر میں آپ کی پلک جھپکے، اتنی دیر میں وہ تخت آگیا، تو اس کو دیکھ کر سلیمان علیہ السلام نے کہا، کہ یہ میرے رب کا فضل ہے

کیا یہ بھی ڈرامائی رنگ ہے؟ دوسری آیت ملاحظہ فرمائیے:۔

وَاٰتَیْنٰہُ مِنَ الْکُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَہٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَۃِ اُولِی الْقُوَّۃِ (القصص)	ہم نے قارون کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ آدمیوں کی ایک طاقتور جماعت کنجیوں کے بوجھ کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

یہ تو کنجیوں کا حال ہے، تو پھر خزانوں کے وزن کا اللہ ہی حافظ ہے، کیا یہ بھی ڈرامائی رنگ ہے؟ برق صاحب قرآن شریف کو آپ غور سے پڑھ لیں، تو کم از کم حدیث کے متعلق آپ کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، کیا مذکورہ بالا آیتوں کے بیان کو بھی آپ علماء کی رنگ آمیزی کہہ سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو آخر کیا

وجہ ہے، کہ حدیث میں ایسی بات آگئی، اور آپ کو تعجب ہوا۔

غلط فہمی "اسی واقعہ کو مالک بن صعصعہ رضہ خواب کا واقعہ بتلاتے ہیں، اور میرے خیال میں یہ صورت زیادہ قرین قیاس ہے" (دو اسلام ص۳۲۱)

ازالہ جب یہ بات تھی، تو بلا وجہ آپ نے اس حدیث پر اعتراض کیا۔

انتباہ برق صاحب نے اس شق صدر کو جو ایام طفولیت میں ہوا تھا اور اس شق صدر کو جو واقعہ معراج میں ہوا تھا، ایک ہی واقعہ سمجھا، اور اسی لئے انہوں نے ان دونوں احادیث کو بطور تعارض نقل کیا ہے، کیونکہ دونوں واقعات علیحدہ علیحدہ ہیں، اس لئے تفصیلات میں فرق ہونے سے تعارض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کاش لکھنے سے پہلے وہ اس پر غور کر لیتے۔

غلط فہمی "ابو موسیٰ حضور سے روایت کرتے ہیں، کہ مردوں میں بڑے بڑے کامل انسان ہو گذرے ہیں، لیکن عورتوں میں آسیہ زوجہ فرعون، اور مریم بنت عمران کے بغیر کوئی اور عورت درجہ کمال تک نہیں پہنچی، اور یاد رکھو، کہ جس طرح ثرید کھانوں کا سردار ہے، اسی طرح عائشہ تمام عورتوں کی سردار ہے (بخاری جلد ۲ ص۱۶۱)

خلاصہ یہ کہ حضرت عائشہ خیر النساء ہیں، لیکن ایک اور حدیث میں مذکور ہے:۔

کہ امت عیسیٰ کی بہترین عورت مریم تھی، اور میری امت کی بہترین خدیجۃ الکبریٰ ہیں (بخاری ص۱۶۴ ج۲)

یعنی خدیجۃ الکبریٰ خیر النساء ہیں

ایک اور حدیث میں حضرت فاطمہ کو جنتی عورتوں کا سردار قرار دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو بخاری ص۱۸۴ ج۲)

اب ہم کیا سمجھیں، کہ خیر النساء کون ہے (دو اسلام ص۳۲۱)

ازالہ یہ تو صحیح ہے، کہ پہلی حدیث کے مطابق حضرت عائشہ تمام عورتوں سے افضل ہیں، تمام اگلی اور پچھلی عورتوں کی سردار ہیں، اب دوسری حدیث کا مطلب سنیئے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

خیر نساءھا مریم بنت عمران	آسمان و زمین کی بہترین عورت مریم بنت
وخیر نساءھا خدیجہ بنت خویلد	عمران ہیں، اور بہترین عورت خدیجہ ہیں۔

قال ابو کریب واشار وکیع الی السماء والارض (صحیح مسلم)

اس حدیث میں تو یہ نہیں ہے، کہ حضرت خدیجہ رضہ تمام عورتوں کی سردار ہیں، یا حضرت مریمؑ تمام عورتوں کی سردار ہیں، ہاں دونوں کا شمار دنیا کی بہترین عورتوں میں ہے

تیسری حدیث جو حضرت فاطمہ رضؓ کے متعلق ہے، اس میں حضرت فاطمہ کی منقبت میں تین قسم کے جملہ ہیں، جو ایک دوسرے کی تشریح کرتے ہیں۔

(۱) سیدۃ نساء اھل الجنۃ — جنتی عورتوں کی سردار

(۲) سیدۃ نساء ھذہ الامۃ — اس امت کی عورتوں کی سردار

(۳) سیدۃ نساء المؤمنین — مومنین کی عورتوں کی سردار (یعنی اس حدیث کی روشنی میں ازواج مطہرات مستثنے ہوگئیں۔

تینوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہوا، کہ حضرت فاطمہ رضؓ اس امت کے مومنین کی عورتوں کی سردار ہونگی حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ تمام عورتوں کی سردار ہیں، اور حضرت خدیجہ رضؓ روئے زمین کی بہترین عورتوں میں سے ہیں، لہذا کوئی اشکال نہیں۔

دوسرا جواب ان تینوں کا جواب ایک اور طریقہ سے بھی ہو سکتا ہے، فرض کیجیے، حضرت مریم حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ عورتوں کی سردار ہیں، تو اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے یعنی ایک کمانڈران چیف تمام فوج کا سردار ہوتا ہے وزیر دفاع بھی فوج کا سردار ہوتا ہے وزیر اعظم بھی فوج کا سردار ہوتا ہے، اور پھر بادشاہ یا صدر بھی فوج کا سردار ہوتا ہے، ہر ایک کی سرداری میں فرق ہوتا ہے لیکن ہیں سب سردار، یہاں بھی اسی طرح آپ فرض کر سکتے ہیں، کہ حضرت فاطمہ بھی سردار اور ان سے اوپر حضرت مریم اور حضرت خدیجہ رضؓ بھی سردار، اور ان سب کے اوپر حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ بھی سردار، کہئے اب کیا اشکال رہا، اس اشکال کو دور کرنے کے بعد میں پوچھتا ہوں، کہ اگر یہ گتھی نہ بھی سلجھے تو آخر یہ دین کا کونسا ایسا حکم ہے، جس کو نہ سمجھنے سے عمل میں کوتاہی ہوگی، اگر ان تینوں احادیث کا خلاصہ ہم اتنا ہی مان لیں، کہ یہ چاروں عورتیں بہترین عورتین ہیں، تو بتائیے ہمارے ایمان میں کون سی کمی آجائیگی

تیسرا قرآنی جواب اچھا اب ان احادیث کا جواب قرآن کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے، قرآن میں ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (آل عمران) — تم بہترین امت ہو۔

دوسری آیت میں ہے:۔

وفضلناھم علی العلمین (جاثیہ) — ہم نے بنی اسرائیل کو تمام عالم پر فضیلت دی تھی

"عالمین" جملہ "رب العالمین" کا بھی ایک جز ہے، اور اس کا مفہوم کتنا وسیع ہے یہ آپ کو بھی معلوم ہے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا، کہ "خیر امت" امت محمدیہ ہے، اور دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ "خیر امت" امت موسوی ہے، اب بتائیے، کہ خیر امت (بہترین امت) کون ہے؟ جو تطبیق کی صورت آپ یہاں پیدا کریں گے، وہی احادیث میں بھی پیدا کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ آپ پیدا کرنے کی کوشش کریں، برق صاحب اسی لئے تو میں بار بار کہتا ہوں، کہ حدیث کو سمجھنے کے لئے قرآن کے بڑے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے فللہ الحمد

باب ۔ ۱۹

"چند دلچسپ احادیث"

غلط فہمی "آج گھر گھر ریڈیو موجود ہے، رات کے نو بجے پہلے ریڈیو کے پاس بیٹھ کر انگلستان لگائیے پھر ٹوکیو، اور اس کے بعد امریکہ، آپ کو فوراً یقین ہو جائے گا کہ زمین کا سایہ (رات) نصف دنیا پر ہے، اور نصف دیگر پہ آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے، اس حقیقت کی وضاحت کے بعد اب ذرا یہ حدیث دیکھیے۔

..... آپ نے فرمایا، کہ سورج بعد از غروب خدائی تخت (عرش) کے نیچے سجدہ میں گر جاتا ہے، رات بھر اسی حالت میں پڑا دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا رہتا ہے، چنانچہ اسے مشرق سے دوبارہ نکلنے کی اجازت مل جاتی ہے، لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اسے اجازت نہیں ملے گی، اور حکم ہو گا، کہ لوٹ جاؤ..... چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے نکلنا شروع کر دے گا" (دو اسلام ص۳۲۳)

ازالہ اگر سورج کے چلنے پر اعتراض ہے، تو یہ تو قرآن سے بھی ثابت ہے، ارشاد باری تعالےٰ ہے:۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (یٰس) سورج اپنے مستقر کی طرف چلتا رہتا ہے

اور جدید سائنس نے بھی اب اس زمانہ میں سورج کی حرکت کو تسلیم کر لیا ہے

اب رہا سجدہ کرنا، تو یہ بھی قرآن سے ثابت ہے، سنیے:۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ (الحج)

کیا آپ نے نہیں دیکھا، کہ آسمان و زمین کی تمام مخلوقات، سورج، چاند، تارے پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے آدمی اللہ تعالےٰ کو سجدہ کرتے ہیں۔

لہٰذا سجدہ کرنے کا جو اعتراض حدیث پر ہے، وہی قرآن پر ہو گا، نعوذ باللہ منہ،

غلط فہمی

اگر ہم رات کے دس بجے پاکستان ریڈیو سے دنیا کو یہ حدیث سنائیں، اور کہیں کہ اس وقت سورج عرش کے نیچے سجدہ میں پڑا ہوا ہے، تو ساری مغربی دنیا کھلکھلا کر ہنس دے، اور وہاں کے تمام مسلمان اسلام چھوڑ دیں" (دو اسلام ص ۳۲۴)

ازالہ

برق صاحب یہ عبارت اس طرح بھی تبدیل کی جا سکتی ہے، اگر ہم دن کے بارہ بجے بھارت ریڈیو سے یہ آیت دنیا کو سنائیں، اور کہیں کہ اس وقت سورج سجدہ میں پڑا ہوا ہے، اور ہمالیہ پہاڑ بھی سجدہ میں پڑا ہوا ہے، تو مغربی دنیا ہی نہیں ساری دنیا کھل کھلا کر ہنس دے، اور پھر کیا کہے، یہ آپ خود سوچ لیں۔

برق صاحب آپ نے یہ سمجھ لیا، کہ جس طرح ہم سجدہ کرتے ہیں، اسی طرح تمام مخلوق سجدہ کرتی ہے، بس یہی اصلی غلط فہمی ہے، ہر ایک مخلوق کی نماز تسبیح، سجدہ علیحدہ علیحدہ ہے، اللہ تعالےٰ خود فرماتا ہے:۔

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (نور) ہر چیز اپنی نماز اور تسبیح کو جانتی ہے

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (الاسراء) لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔

اب معلوم ہوا، کہ سورج و چاند اور پہاڑ وغیرہ سجدہ تو کرتے ہیں، لیکن ان کے سجدہ کی کیفیت کا ہمیں علم نہیں، لہٰذا حدیث اپنی جگہ پر صحیح ہے، لیکن کیفیت کا ہمیں علم نہیں، کہ سورج سجدہ کس طرح کرتا ہے عرش کے نیچے جانے کا کیا مطلب ہے؟ اجازت چاہنے کا کیا مطلب ہے؟ وغیرہ وغیرہ ان باتوں کا علم اللہ تعالےٰ کے سوائے کسی کو نہیں، اور نہ ان کے پیچھے پڑنا چاہیئے، برق صاحب آپ سائنس کی روشنی میں بھی اگر اس حدیث کا مطلب کرنا چاہتے، تو کر سکتے تھے، آپ نے تو نہیں کیا، لیکن میں کئے دیتا ہوں، ملاحظہ فرمایئے:۔

انھا تذھب	سورج غروب ہو جاتا ہے
حتی تسجد تحت العرش	اور اللہ کے حکم تکوینی اور قوانین حرکت کے ماتحت اپنی حرکت کو جاری رکھتا ہے،
فتستاذن فیوذن لھا	وہ ہر لمحہ اور ہر آن اذن الٰہی کا منتظر رہتا ہے اور کیونکہ آگے بڑھنے کی ممانعت نہیں ہوتی، لہٰذا اس کو آگے بڑھنے کی اجازت سمجھ کر وہ آگے بڑھتا رہتا ہے

ویوشك ان تسجد	لیکن قیامت کے قریب ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ وہ انہی قوانین حرکت کے ماتحت آگے بڑھنا چاہے گا
فلا یقبل منها	لیکن اب اس کو آگے بڑھنے کی منظوری نہیں دی جائے گی
فیقال لها ارجعی من حیث جئت	اور اس سے کہا جائے گا کہ اب اس مستقر سے واپس ہو جا، اور اسی طرف چلا جا جس طرف سے تو آ رہا ہے (یہ مستقر یا Turning Point وہ جگہ ہے جہاں رک کر وہ فوراً واپس ہو گا)
فتطلع من مغربها الخ	پس وہ مغرب سے طلوع ہوگا (قرآن کی آیت "والشمس تجری لمستقر لها" کی یہی تفسیر ہے)

بتلایئے ان معنوں میں کیا اشکال ہے، برق صاحب بات درحقیقت یہ ہے، کہ کچھ تو آپ سمجھے نہیں، اور کچھ مترجم نے رنگ آمیزی سے ترجمہ کیا، مثلاً "رات بھر اسی حالت میں پڑا دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا رہتا ہے" حالانکہ متن میں یہ عبارت نہیں ہے، پورا متن اوپر نقل کر دیا گیا ہے ملاحظہ فرمایئے:۔

برق صاحب مذکورہ بالا معنی میں نے کر تو دیئے ہیں لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا، کہ اللہ کے علم میں بھی یہی معنی ہیں، لہٰذا میں تو اس حدیث پر بلا کیف ایمان لاتا ہوں، اور اس کی تاویل کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں، یہ معنی مادی لوگوں کی خاطر کر دیئے گئے ہیں تاکہ وہ بجائے مذاق اڑانے کے، ان معنوں کے ماتحت ہی حدیث پر ایمان لے آئیں، تو بھی غنیمت ہے

قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ (الکہف)	ذوالقرنین جب وہاں پہنچے، جہاں سورج غروب ہوتا ہے، تو دیکھا کہ وہ کیچڑ کے ایک چشمہ میں غروب ہو رہا ہے۔

اب آپ فرمائیں، اس سائنس کے زمانہ میں ریڈیو پاکستان سے مغرب کے وقت یہ آیت اگر سنا دی جائے، تو کیا ہو گا، اللہ تعالےٰ غلط فہمی سے بچائے، آمین

غلط فہمی " ابن عمرؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں، کہ سورج نکلتے اور ڈوبتے وقت نماز نہ پڑھا کرو

اس لئے کہ سورج بوقت طلوع شیطان کے دو سینگوں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے (بخاری جلد ۲ ص۱۳۴)

سورج کی موٹائی ساڑھے تئیس ارب میل ہے، اگر اتنی بڑی چیز شیطان کے دو سینگوں میں سما جاتی ہے..... اتنا بڑا شیطان کھڑا کہاں ہوتا ہوگا؟ (دو اسلام ص۳۲۴)

الازالہ برق صاحب کو بڑی غلط فہمی ہوئی، انہوں نے مادی عینک سے اس حدیث کو دیکھا، ایسی حدیثوں پر بلا کیف و تاویل ایمان لانا چاہیئے، نہ کہ مادی دنیا کے فاصلے ناپنے لگ جائیں، حدیث کا مطلب اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے، کہ ہم یہ فرض کریں، کہ شیطان سورج کے سامنے اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے، کہ دیکھنے والے کو سورج اس کے دو سینگوں کے درمیان دکھائی دے، اگر ہم اپنی دو انگلیوں کو علیحدہ کر کے آنکھ سے ذرا دور سورج کی طرف کرلیں، تو سورج دو انگلیوں کے بیچ میں دکھائی دے گا، بس اسی طرح وہ دو سینگوں کے درمیان میں بھی دکھائی دے سکتا ہے، اگرچہ ہماری آنکھیں ان سینگوں کو نہیں دیکھتیں، لیکن کیونکہ ہم رسول پر ایمان لا چکے ہیں، لہٰذا مخبر صادق کی اس بات پر بھی ہمارا ایمان بالغیب ہے، اگر ہم ہر بات پر مشاہدہ اور عقل کی رٹ لگائیں، تو پھر "یؤمنون بالغیب" (قرآن) کا مقصد ہی فوت ہو جائے، ہمارے لئے اتنا کافی ہے، کہ ہم یہ یقین کرلیں، کہ یہ شیطانی اوقات ہیں، ان ہی اوقات میں شیطان کے اولیا شیطان کی عبادت کرتے ہیں، حدیث کے الفاظ ہیں

وحینئذ یسجد لہا الکفار (مسلم) اس وقت کفار سورج کو سجدہ کرتے ہیں

کیونکہ یہ وقت سورج پرستوں کی عبادت کا ہے، اور ان سے مشابہت نازیبا ہے، لہٰذا اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے ممانعت فرمادی ہے، یہ ہے عمل کی چیز اور اسی سے ہم کو کام ہے، باقی رہا اس حدیث کی تاویل، تو وہ اللہ ہی کو معلوم ہے ہمیں اس سے کیا بحث، شیطان کے طول و عرض سے ہمارے عمل کا کوئی تعلق نہیں۔

جدید سائنس کے مطابق خلا کے فاصلے لامحدود ہیں، ایک ایک تارا سورج سے کئی گنا بڑا ہے، اور وہ ایک سیکنڈ میں کروڑوں روشنی کے سال چلتا ہے، اور روشنی کے سال کا ایک ایک سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کے برابر ہے، لہٰذا خلا کی پہنائیوں کا اندازہ لگانا بالکل ناممکن ہے، اب آپ سمجھ سکتے ہیں، کہ شیطان کے کھڑے ہونے کی جگہ اس فضا میں موجود ہے یا نہیں۔

برق صاحب اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے، کہ اس چشمہ کا طول و عرض کیا ہے، جس میں از روئے قرآن سورج غائب ہو جاتا ہے، تو ہمارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ کیا سورج کا چشمہ میں غائب ہو

جاننا آج کل کی سائنس کے مطابق ہے؟ جب اس مشاہدہ کی چیز اور مادی دنیا کے حوادثات کے متعلق قرآن کا یہ بیان ہو، اور بغیر تاویل کے اس کا صحیح مطلب سمجھا نہ جا سکتا ہو، تو پھر جو حدیث روحانیات سے تعلق رکھتی ہو، جس کا مشاہدہ اور مادیت سے کوئی تعلق نہ ہو، اس کو بغیر تاویل اس طرح ظاہر ترجمہ سے کس طرح سمجھا جا سکتا ہے، انصاف کیجئے

غلط فہمی "حدیث کا علم الافلاک آپ پڑھ چکے" (دو اسلام ص ۳۲۵)

ازالہ اب قرآن کا علم الافلاک پڑھیئے، قرآن کہتا ہے، اور ہمارا ایمان ہے، کہ بالکل سچ کہتا ہے:۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ ۨالْكَوَاكِبِ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ (الصافات)

آسمان دنیا کو ہم نے ستاروں سے زینت دی ہے، اور ان ستاروں کو سرکش شیطان سے حفاظت کا سبب بنایا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ (الملک)

اور ان ستاروں کو ہم نے شیاطین کے مارنے کے لئے پتھر بنایا ہے۔

کہیئے، کیا سائنس بھی یہی کہتی ہے۔

غلط فہمی "ابوہریرہ آنحضرت سے روایت کرتے ہیں، کہ ایک مرتبہ جہنم نے خدا کے پاس شکایت کی، کہ میرا دم گھٹ چکا ہے اس لئے مجھے سانس لینے کی اجازت دیجئے، اللہ نے کہا، تم سال میں صرف دو سانس لے سکتے ہو، چنانچہ اس کی ایک سانس سے موسم گرما، اور دوسری سے موسم سرما پیدا ہو گیا (بخاری جلد ۲ ص ۱۴۳)

لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا، کہ ہر سال گرمیوں کے موسم میں صرف وہی علاقے اس سانس کی لپٹ میں کیوں آتے ہیں، جو خط استوا کے قریب ہیں" (دو اسلام ص ۳۲۶)

ازالہ ہو سکتا ہے، کہ جہنم کا تعلق براہ راست ہماری دنیا سے نہ ہو، بلکہ سورج سے ہو، اور سورج کا تعلق براہ راست ہماری دنیا سے ہو، لہٰذا سردی، گرمی، جو ہم محسوس کرتے ہیں، وہ سورج کے اثر سے کرتے ہیں، اور اسی کی طرف اس سردی گرمی کو منسوب کرتے ہیں، حدیث میں گرمی و سردی کے اصل سبب کا بیان ہے، دوزخ کے سانسوں کا اثر سورج قبول کرتا ہے، اور پھر وہ اثر قرب و بعد کے لحاظ سے ہماری دنیا کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے۔

حدیث میں یہ نہیں ہے، کہ موسم جہنم کے سانس سے پیدا ہوتے ہیں، حدیث میں تو صرف اتنا ہے، کہ جاڑوں کے موسم میں جب سخت سردی، اور گرمیوں کے موسم میں جب سخت گرمی پڑتی ہے تو اس کا سبب جہنم کا سانس ہوتا ہے (برق صاحب نے حدیث کا صحیح ترجمہ نقل نہیں فرمایا) یہ دونوں مواقع زیادہ سے زیادہ چند دن رہتے ہیں، نہ کہ چار پانچ مہینے

ہمارا ایمان صرف مشاہدات اور تجربات پر ہی نہیں ہوتا، بلکہ غیب پر بھی ہوتا ہے، لہٰذا جو کچھ حدیث میں ہے، اس پر بھی ہمارا ایمان ہے صحیح تاویل کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں، لہٰذا اس میں کوئی بھی اشکال نہیں، قرآن میں بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں، جن پر ہم ایمان بالغیب لاتے ہیں، خواہ وہ ہماری سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آنا، فرشتوں کا وجود، سدرۃ المنتہیٰ ہوا کا سلیمان علیہ السلام کے تابع ہونا، اور ان کے حکم سے چلنا، اصحاب کہف کا بے آب ودانہ صدہا سال تک سوتے رہنا، کھانے کا سو سال تک نہ سڑنا، حضرت خضر کا خلاف عقل ونقل اور خلاف شرع ایک معصوم بچے کو ایسے گناہ پر قتل کر دینا جس کا وہ ابھی مرتکب نہیں ہوا تھا، ستاروں سے شیطان کو مارنا وغیرہ وغیرہ، بس اسی طرح ہم اس حدیث پر بھی ایمان لاتے ہیں، جہنم سے سورج کا کیا تعلق ہے، یہ قدرت کا ایک خفیہ راز ہے، جس کا کھوج ممکن ہے آئندہ کبھی سائنس کی روشنی میں لگایا جاسکے، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ٹیلی ویژن، کہ اس میں اور جس کی وہ تصویر ہے اس میں کیسا خفیہ تعلق ہے، اور آج سے پچاس سال پہلے ہم اس خفیہ راز سے قطعاً ناآشنا تھے،

غلط فہمی "حدیث کہتی ہے:۔
اگر مکھی شربت وغیرہ میں گر جائے، تو اسے پوری طرح غوطہ دے کر باہر نکالو، اس لئے کہ اس کے ایک پر میں بیماری ہوتی ہے، اور دوسرے میں شفا"

مکھی بیت الخلاء سے اڑ کر آتی ہے، پر اور ٹانگیں غلاظت سے لتھڑی ہوئی ہیں، اور مولانا اس کے دوسرے پر میں شفا تلاش کر رہے ہیں (دو اسلام ص ۳۲۷ ص ۳۲۸)

ازالہ یہ تو سب مانتے ہیں، کہ مکھی جب گندگی پر بیٹھتی ہے، تو بہت سے جراثیم اس کے پروں میں چمٹ جاتے ہیں، البتہ شک اس بات میں ہے، کہ اس مکھی میں جراثیم کش دوا بھی ہے اس شک کی بنا لاعلمی پر ہے، علامہ عبداللہ القصیمی لکھتے ہیں:۔

"موجودہ دور کے ایک مشہور ڈاکٹر نے ایک سال پیشتر "جمعیۃ الہدایۃ الاسلامیۃ" میں ایک مفصل مضمون اس بارے میں نقل کیا تھا، جس کا ماحصل یہ ہے:۔

مکھی گندگی اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں پر بیٹھتی ہے، جو ان جراثیم سے بھرے ہوتے ہیں، جو طرح طرح کی بیماریوں کے پھیلانے کا باعث بنتے ہیں، ان جراثیم میں سے بعض اس کے پہلوؤں سے چپٹ جاتے ہیں، اور کچھ اس کے پیٹ کے اندر پہنچ جاتے ہیں، اس سے اس کے جسم کے اندر ایک زہریلا مادہ پیدا ہو جاتا ہے، اس مادہ کا نام اہل طب کی اصطلاح میں مبعد البکتیریا ہے، لیکن اس مادہ کی خصوصیت یہ ہے، کہ وہ بہت سی بیماریوں کے جراثیم کو ختم کر دیتا ہے اور مبعد البکتیریا کے موجود ہونے کی صورت میں ان جراثیم کا زندہ رہنا، یا انسانی جسم میں کچھ اثر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، نیز مکھی کے ایک پر کا خاصہ یہ ہے، کہ وہ مبعد البکتیریا کو اس کے پیٹ سے ایک پہلو کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے، لہٰذا مکھی جب کسی کھانے یا پینے کی چیز پر بیٹھتی ہے، تو پہلو سے چمٹے ہوئے جراثیم اس میں ڈالتی ہے تو مبعد البکتیریا میں سے جو مادہ قریب ہوتا ہے، ان جراثیم کو فنا کر دیتا ہے، ان جراثیم سے بچانے والی سب سے پہلی چیز وہ مبعد البکتیریا ہے، جسے مکھی اپنے پیٹ میں اپنے ایک پر کے پاس اٹھائے ہوتی ہے، لہٰذا چمٹے ہوئے زہریلے جراثیم کو ہلاک، اور ان کے عمل کو بے کار کرنے کے لئے یہ چیز کافی ہے، کہ پوری مکھی کو کھانے میں ڈبو کر باہر پھینک دیا جائے" (یہ ہے موجودہ زمانہ کے ایک مشہور ڈاکٹر کے بیان کا خلاصہ)

اس کے علاوہ انگلستان کے مشہور طبی رسالہ (Doctorian Experiments) اپنے نمبر ۱۰۳۷ (شائع شدہ ۱۹۲۷ء) میں لکھتا ہے:۔

"مکھی جب سبزیوں اور کھیتوں پر بیٹھتی ہے، تو اپنے ساتھ مختلف بیماریوں کے جراثیم اٹھا لیتی ہے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ جراثیم مر جاتے ہیں اور ان کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور ان کی جگہ مکھی کے پیٹ میں بکتیوفاج نامی ایک مادہ پیدا ہوتا ہے جو زہریلے جراثیم کو ختم کرنے کی خصوصیت رکھتا ہے، اگر تم کسی نمکین پانی میں مکھی کے پیٹ کا مادہ ڈالو، تو تمہیں وہ بکتریوفاج مل سکتا ہے، جو مختلف بیماریاں پھیلانے والے چار قسم کے جراثیم کا مہلک ہے، اس کے علاوہ مکھی کے پیٹ کا یہ مادہ بدل کر بکتریوفاج کے بعد ایک ایسا مادہ بن جائے گا، جو چار مزید قسم کے جراثیم کو فنا کرنے کے لئے مفید ہوگا"

(بینات ترجمہ مشکلات الاحادیث النبویہ ص ۱۱۹-۱۲۰)

الغرض حدیث شک و شبہ سے پاک ہے، اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک علمی معجزہ ہے۔

غلط فہمی "یہ حدیث کسی ایسے ہی مکھی چوس ملا کی ایجاد معلوم ہوتی ہے" (دو اسلام ص ۳۲۸)

ازالہ برق صاحب اگر بہت ہی قیمتی کوئی چیز آپ تیار کر رہے ہوں، مثلاً حلوا سوہن، خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا، اور اتفاق سے جب وہ رقیق حالت میں ہو، اس میں مکھی گر جائے تو انصاف سے بتایئے آپ کیا کریں گے، کیا وہ ساری چیز آپ پھینک دیں گے، یا مکھی نکال کر پھینک دیں گے، اور وہ چیز استعمال کر لیں گے، پہلی صورت میں تو بہت بڑا مالی نقصان ہوگا، اور غالباً شاید ہی کوئی ایسا کرے، اور دوسری صورت میں اس چیز میں مضر جراثیم کی آمیزش ہوگی لہٰذا وہ چیز بجائے فائدہ پہنچانے کے نقصان پہنچائے گی، حدیث نے ایسے موقع کے لئے آپ کو ایک سستا نسخہ دے دیا ہے، کہ نہ مالی نقصان ہو، اور نہ صحت کا نقصان، ایسے موقع پر آپ اس نسخہ کو استعمال کر سکتے ہیں، اور اگر آپ اس کو پانی کے ہر گلاس پر استعمال کرنا چاہیں، تو پھر آپ کو اختیار ہے، حدیث آپ پر پابندی نہیں لگاتی۔

غلط فہمی "مرد کا نطفہ سفید ہوتا ہے، اور عورت کا زرد، انزال کے بعد یہ ہر دو قسم کے نطفے مل جاتے ہیں، اگر یہ مرکب مائل بہ سفیدی ہو، تو بچہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ بچی (مسلم ج ۱ ص ۱۶۸)

ماہرین تولید اس امر پر متفق ہیں، کہ عورت کا نطفہ مقدار میں بے حد کم...... اس صورت میں چاہیئے تو یہ تھا، کہ مجامعت سے ہمیشہ لڑکا پیدا ہوتا، لیکن حالت یہ ہے، کہ لڑکیاں زیادہ پیدا ہو رہی ہیں، اور لڑکے کم" (دو اسلام ص ۳۲۸ ص ۳۲۹)

ازالہ برق صاحب نے ترجمہ صحیح نہیں کیا ہے، متن مع صحیح ترجمہ درج ذیل ہے۔

فعلا منی الرجل منی المرأۃ	اگر مرد کا نطفہ عورت کے نطفہ پر غالب آجاتا
أذکرا باذن اللہ واذا علا منی	ہے، تو اللہ کے اذن سے لڑکا ہوتا ہے،
المرأۃ منی الرجل آنثا باذن	اور اگر عورت کا نطفہ مرد کے نطفہ پر غالب
اللہ۔ (صحیح مسلم)	آجاتا ہے، تو اللہ کے حکم سے لڑکی ہوتی ہے

یعنی اصل چیز جو کارفرما ہے، وہ اللہ کا حکم ہے" اور یہی وہ راز ہے، جس کے متعلق برق صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ فطرت کے وہ رموز ہیں جنہیں کوئی ماہر فطرت آج تک نہیں سمجھ سکا" (دو اسلام ص ۳۲۸)

اس موقعہ پر پہنچ کر میں سوال کرتا ہوں، کہ جب ان رموز کو آپ سمجھ ہی نہ سکے، تو آپ نے حدیث پر اعتراض ہی کیوں کیا، دوسری بات یہ ہے، کہ یہ غلبہ باذن الٰہی ہوتا ہے، لہٰذا مقدار کو اس میں کوئی

دخل نہیں، اگر آپ نے علم کیمیا (Chemistry) پڑھی ہے، تو آپ نے دیکھا ہوگا، کہ ٹائیٹریشن (Titration) کرتے وقت ایک قطرہ ایک بہت بڑے محلول پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے، لہذا غلبہ قوت کے تناسب سے ہوتا ہے، نہ کہ مقدار کے تناسب سے۔

غلط فہمی "محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے، مجامعت کے وقت اگر مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو، تو بچہ باپ پر جاتا ہے، ورنہ ماں پر (بخاری ج ۲ ص ۱۴۹)
داد دیجیے اس ملا کو، کہ فطرت کے ایک نہایت مخفی راز کو کس بے تکلفی، صفائی اور آسانی سے بے حجاب کر دیا ہے۔" (دو اسلام ص ۳۲۹)

ازالہ برق صاحب نے سبق، کے معنی سبقت انزال کر دیئے، حالانکہ یہ معنی صحیح نہیں، دوسری حدیث ہی میں اس کی تشریح ہے، ارشاد گرامی ہے:۔

اذا علا ماء الرجل ماءھا یعنی جب مرد کا نطفہ غالب ہوتا ہے، تو بچہ باپ کے مشابہ ہوتا ہے۔ (صحیح مسلم)

برق صاحب اگر یہ مخفی راز ہے، تو آپ کو کیسے معلوم ہو گیا، کہ حدیث قابل اعتراض ہے، آپ اس کو حدیث کا علم التولید کہہ کر متعجب ہیں، لیکن قرآن کے علم التولید سے متعجب نہیں، کہ بغیر مرد کے نطفہ کے بچہ پیدا ہو گیا۔

بچہ کی مشابہت ماں یا باپ سے ہونا، ایک ایسی بات ہے، جس کو عام الفاظ میں ادا کرنا کوئی آسان بات نہیں، اگر آپ علم توالد و تناسل (Genetics) کے ابواب کا مطالعہ کریں، تو معلوم ہوگا، کہ والدین کی خصوصیات جو بچہ میں منتقل ہوتی ہیں، اس کا طریقہ انتہائی دقیق ہے، اور اس کا سمجھنا عام انسان تو کجا تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بھی جنہوں نے باقاعدہ علم الحیات کا مطالعہ نہ کیا ہو ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، لیکن اس پورے دقیق اور پیچیدہ طریق کا لب لباب یہی ہے، کہ اگر مردانہ خصوصیات کے حامل ذرے (Genes) غالب رہتے ہیں، تو لڑکا پیدا ہوتا ہے، اور اگر اس کے برعکس ہو، تو لڑکی پیدا ہوتی ہے، ایک سائل نے جب اس کے متعلق حضور سے سوال کیا، تو آپ نے ان عام فہم الفاظ میں اس گتھی کو سلجھا دیا، سائل کی بھی تشفی ہو گئی، اور حقیقت کے بھی خلاف نہ ہوا۔

غلط فہمی "اگر آپ چاہتے ہیں، کہ آپ کے ہاں ایسی اولاد پیدا ہو، جو فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ اور ابلیس کی زد سے بالکل باہر ہو، تو لیجیے نسخہ حاضر ہے
ابن عباس رضہ حضور سے روایت کرتے ہیں، کہ جب کوئی شخص مجامعت کرنے لگے، تو یہ

دعا پڑھ لے " بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطان وجنب الشیطان ما رزقتنا "
(اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو شیطان سے بچا) اس کی اولاد کو شیطان کبھی گمراہ نہیں کر سکے گا (بخاری)
کتنی امرت دھارا قسم کی دعا ہے، کہ نہ قرآن کی ضرورت باقی رہی نہ رسول کی، اس لئے کہ قرآن
و رسول کا کام تو ہدایت ہے، اور جس بچے کے گمراہ ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہا ہو، تو قرآن
اور رسول اس کے کس کام کے" (دو اسلام صفحہ ۳۲۳)

ازالہ ہمارا کام دعا کرنا ہے، قبول کرنا نہ کرنا اللہ کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔
اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن) مجھ سے دعا مانگو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا
دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ	میں دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں،
(البقرۃ)	جس وقت بھی دعا مانگے

لہذا اگر ایسے موقع پر جب کہ جذبات کی رو میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے، کوئی شخص اللہ کو نہ بھولے اس سے گڑگڑا کر دعا مانگے، تو کیا تعجب ہے، کہ قبول ہو جائے، اور اگر قبول ہو جائے تو بچہ کا شیطان سے محفوظ رہنا کیا مشکل ہے، اور جو شخص شیطان سے محفوظ رہے گا، اس ہی کے کام رسول آئیگا، قرآن بھی آئے گا، حدیث بھی آئے گی، اور جو شخص شیطان کے نرغہ میں پھنس گیا، پھر وہ ہدایت پا ہی کیسے سکتا ہے، اس کے لئے تو اللہ اور رسول، اور ان کی ہدایت سب بے کار ہے، قرآن مجید میں ہے :۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ	جو رحمٰن کے ذکر سے غافل ہوا، تو ہم اس پر
نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ	شیطان مسلط کر دیتے ہیں، بس پھر وہی اس
قَرِينٌ (زخرف)	کا ساتھی ہوتا ہے۔

کہیے اس شیطان سے بچنے کے لئے اللہ کو یاد کیا جائے یا نہیں، اور اگر پھر بھی اعتراض باقی رہے تو یہ بتائیے، کہ قرآن نے " اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم " پڑھنے کا حکم کیوں دیا ہے؟

غلط فہمی مرغ کیوں بانگ دیتا ہے، گدھا کیوں ہینگتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ شیر کیوں دھاڑتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔
ان تمام سوالات کا حل تو مشکل ہے، البتہ ایک دو سوالات کے جوابات حاضر ہیں۔

ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، کہ جب تم مرغ کی صدا سنو، تو اللہ سے فضل کی دعا مانگا کرو، اس لئے کہ اس وقت مرغ کو فرشتہ نظر آیا کرتا ہے، اور جب

گدھے کی آواز سنو، تو شیطان سے پناہ مانگو، اس لئے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر ہینگتا ہے"

(دو اسلام صفحہ ۳۳۰ صفحہ ۳۳۱)

ازالہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مرغ کو فرشتے دکھائی دیتے ہیں، اور جب وہ کسی فرشتے کو دیکھتا ہے، تو اس وقت اذان دینے لگتا ہے، لہذا جب تم اسے اذان دیتے سنو، تو اللہ کا فضل طلب کرو، قرآن میں ہے:-

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ (الاحزاب) یعنی اللہ اور اس کے فرشتے تم پر رحمت بھیجتے ہیں لہذا ایسے وقت میں فضل تلاش کرنا، جب کہ فرشتے فضل و رحمت تقسیم کر رہے ہوں زیادہ مناسب ہے، اسی طرح گدھے کو شیطان نظر آتے ہیں، اور ان کو دیکھ کر اس پر بھی شیطنت سوار ہو جاتی ہے، لہذا ایسے وقت میں جب کہ شیطان کی آمد و رفت ہو، شیطان سے پناہ مانگنا بہت مناسب ہے۔

یہ چیزیں امور غیب سے ہیں، اور ان پر اعتراض لایعنی ہے، مرغ کا فرشتہ کو دیکھنا، اور گدھے کا شیطان کو دیکھنا بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر آپ غور کریں، تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے، کہ جانوروں میں بعض باتوں کا ادراک انسان سے زیادہ ہوتا ہے، چیل کے انتہائی بلندی پر اڑنے کے باوجود مرغی کو اس کی موجودگی کا ادراک ہو جاتا ہے، اور بچوں کی حفاظت کے لئے عجیب سی آواز نکالتی ہے، چیونٹی کی قوت شامہ، مور کی قوت سامعہ، اور چیل کی قوت باصرہ، انسان سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں، مور میلوں دور کی آواز سن لیتا ہے، چیونٹی بہت دور سے خوشبو سونگھ لیتی ہے، چیل بہت اونچائی سے چھوٹی سی بوٹی دیکھ لیتی ہے، جب کوئی آفت آنے والی ہوتی ہے، تو سیال گاؤں کے قریب آکر تمام رات روتے ہیں، دیہاتیوں نے اس کا بارہا تجربہ کیا ہوگا اکثر دیکھا گیا ہے، کہ جب کوئی شدید طوفان یا زلزلہ آنے والا ہوتا ہے، تو اس کے آنے سے پہلے جنگلی جانور اس مقام کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ بعض جانوروں میں بعض غیر مرئی اشیاء کو دیکھنے یا محسوس کرنے کی قوت ہوتی ہے، تو پھر کیا عجب ہے، کہ مرغ فرشتہ کو دیکھ لیتا ہو، اور گدھا شیطان کو۔

غلط فہمی اگر کوئی شخص کسی محفل میں جا کر تین مرتبہ سلام کرے، اور ہر بات کو تین تین دفعہ دہرائے تو آپ اسے کب تک برداشت کریں گے

..... انس رض کہتے ہیں، کہ حضور کی یہ عادت تھی، کہ وہ تین مرتبہ سلام کہتے، اور ہر بات کو تین مرتبہ دہراتے تھے" (دو اسلام صفحہ ۳۳۱)

ازالہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، تین مرتبہ سلام کرنے کا یہ مقصد نہیں، کہ ایک شخص کو تین مرتبہ سلام کیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے، کہ جب آپ کسی کے ہاں تشریف لے جاتے، تو باہر کھڑے ہو کر سلام کرتے، اگر جواب مل جاتا، تو خیر ورنہ دوسری مرتبہ سلام کرتے، اب بھی اگر جواب نہ ملتا، تو تیسری مرتبہ سلام کرتے، اگر تیسری مرتبہ بھی جواب نہ ملتا، تو واپس چلے آتے اور اگر پہلی مرتبہ سلام کرنے کے بعد جواب مل جاتا، تو پھر ملاقات کے وقت دوسرا سلام کرتے اور پھر رخصت ہوتے وقت تیسرا سلام کرتے، اسی طرح جب آپ کو کوئی بات سمجھانی ہوتی تو اس کو تین مرتبہ دہراتے، تاکہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

جس حدیث کو برق صاحب نے نقل کیا ہے، اس کے ذرا آگے یہ حدیث بھی ہے، عبداللہ بن عمر رضہ کہتے ہیں، کہ عصر میں ہم لوگوں کو دیر ہو گئی تھی، لہٰذا ہم لوگ جلدی جلدی وضو کرنے لگے، اور پیروں پر مسح کرنے لگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا، تو بلند آواز سے دو تین مرتبہ فرمایا:۔

ویل للاعقاب من النار (مشکوٰۃ) یعنی خشک ایڑیوں کے لئے آگ ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ خاص خاص جملے آپ مکرر سہ کرر ارشاد فرماتے تھے، تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں، اور سمجھ میں آجائیں، برق صاحب یہ دینی مسائل ہیں، اور مسائل کو تین تین مرتبہ دہرانا، تاکہ سب لوگ سن لیں اور یاد رکھیں، قابل اعتراض نہیں ہے، بلکہ یہی مناسب ہے، یہ تقریر و تحریر نہیں، جس میں یہ بات معیوب سمجھی جائے، اس تشریح کے بعد وہی حدیث جس کو برق صاحب نے مختصر نقل کیا ہے، پوری سنیئے:۔

عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثا حتی تفہم عنہ واذا اتی علی قوم فسلم علیہم ثلاثا (صحیح بخاری)	حضرت انس رضہ کہتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی مسئلہ بیان فرماتے تو تین دفعہ اس کو دہراتے، تاکہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے، اور جب کسی قوم سے ملنے جاتے، تو تین مرتبہ سلام کرتے۔

اس تشریح کے بعد اعتراض تو رفع ہو گیا، تاہم میں چاہتا ہوں، کہ قرآن مجید سے بھی اس کا جواب دے دوں، قرآن میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو بار بار دہرایا گیا ہے، آدم علیہ السلام کے قصہ کو سات مرتبہ دہرایا گیا ہے، اور ہر مرتبہ وہی مضمون، اسی طرح بہت سے انبیاء کے قصص

بار بار دہرائے گئے ہیں، آخر یہ کیوں؟ کیا یہ بھی عجیب ہے یا نہیں؟ آپ کہیں گے الفاظ تو بدل گئے ہیں، لیکن یہ بھی صحیح نہیں، بعض جگہ تو الفاظ بھی وہی ہوتے ہیں، مزید براں سورۂ قمر میں ایک دفعہ نہیں دو دفعہ نہیں پورے چار مرتبہ اللہ تعالےٰ نے ان الفاظ کو دہرایا ہے

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ (القمر) — ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے، ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے۔

سورہ مرسلات ایک چھوٹی سی سورت ہے۔ اس میں ایک ہی جملہ

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ — جھٹلانے والوں کے لئے ویل ہے۔

کو دس مرتبہ دہرایا گیا ہے، اور تو اور سورہ الرحمٰن جیسی چھوٹی سی سورت میں

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ — اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے

کو اتنی مرتبہ دہرایا گیا ہے، کہ الامان والحفیظ، بات درحقیقت یہ ہے، کہ جس بات پر زور دینا مقصود ہوتا ہے، وہی بار بار دہرائی جاتی ہے، لہٰذا اس قسم کی تکرار اگر قرآن میں ہو تو کوئی عیب کی بات نہیں، اور اگر حدیث میں ہو، تو بھی کوئی عیب کی بات نہیں ہے،

غلط فہمی "حضور علیہ السلام کے بے شمار اقوال و خطبات ہمارے سامنے موجود ہیں، کہیں بھی کسی بات کو تین تین مرتبہ دہرایا نہیں گیا" (دو اسلام صفحہ ۳۳۱)

ازالہ بے شمار کلمات ہیں، جن کو آپ نے دہرایا ہے، ایک مثال تو اوپر بیان ہو چکی، اور مثالوں کے لئے کتب احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

غلط فہمی "حذیفہ کہتے ہیں، کہ حضور علیہ السلام کھاد کے ایک ڈھیر کے قریب آئے، اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا" (بخاری ج ۱ صفحہ ۳۶)

امام بخاری میں ہی یہ جرأت تھی، کہ اس معلم کائنات و مہبط الوحی کی طرف یہ فعل منسوب کر دیا، ورنہ ہم تو حضور کے متعلق اس قسم کی کوئی بات خیال تک لانا گناہ سمجھتے ہیں" (صفحہ ۳۳۳)

ازالہ برق صاحب نے ترجمہ میں دو غلطیاں کی ہیں۔

اول:- آپ نے حضرت حذیفہ رضؓ کے سامنے پیشاب کیا، حالانکہ یہ قطعاً صحیح نہیں، بلکہ حضرت حذیفہ رضؓ فرماتے ہیں۔

فقمت عند عقبه حتى فرغ — میں آپ کے پیچھے کھڑا رہا یہانتک کہ آپ فارغ ہوئے

دوسری طرف دیوار تھی، حدیث کے الفاظ ہیں:-

اتی سباطۃ قوم خلف	یعنی آپ ایک قوم کے کھاد کے ڈھیر کے پاس
حائط فقام	آئے، دیوار کے پیچھے آپ کھڑے ہو گئے

لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیوار کی طرف منہ کیا، اور حضرت حذیفہ کو اپنے پیچھے کھڑا کیا، اور پھر کھڑے ہو کر پیشاب کیا

دوم:۔ دوسری غلطی یہ ہے، کہ برق صاحب نے "بال" کا ترجمہ "پیشاب کر دیا" کیا ہے، حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے، کہ "پیشاب کیا" برق صاحب اگر آپ کی مادری زبان اردو نہیں ہے، تو خیر آپ قابل معافی ہیں، ورنہ "بال" کا ترجمہ "پیشاب کر دیا" کر کے آپ نے حد ہی کر دی، کسی اردو دان سے پوچھ لیجیئے "پیشاب کیا" اور "پیشاب کر دیا" میں کتنا بڑا فرق ہے۔

برق صاحب کا اعتراض اس حدیث پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے متعلق ہے، یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرتے تھے، اور سوائے ایک مرتبہ کے آپ کا کبھی کھڑے ہو کر پیشاب کرنا ثابت نہیں، اور اس مرتبہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی وجہ بھی حدیث میں موجود ہے:۔

انما النبی صلی اللہ علیہ وسلم	یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے
بال قائما من جرح کان بمابضہ	کھڑے ہو کر پیشاب کیا تھا، کہ آپ کے
(البیہقی)	گھٹنے کے اندر کی طرف زخم تھا۔

بتائیے ایسے عذر کی حالت میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا ناجائز ہے؟ پھر جو شخص تہبند باندھے ہوئے کھلی جگہ میں بیٹھ کر پیشاب کرے، تو اس کی رانیں وغیرہ کھل جائیں گی، اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا ایک یہ عذر بھی ہو سکتا ہے، برق صاحب آپ تو اسے معیوب سمجھ رہے ہیں، اور یہ صحیح بھی ہے لیکن ذرا کسی مغرب زدہ، تجدید مذہب کے دلدادہ شخص سے پوچھئے، تو وہ اس حدیث کو سن کر خوش ہو گا، اور ملا کو برا بھلا کہے گا، کہ اس نے یہ پابندیاں لگا رکھی ہیں، ورنہ حدیث میں تو کھلی چھٹی ہے

غلط فہمی

"آپ شاید اس حقیقت سے بے خبر ہوں گے، کہ زلزلے آسمانوں میں بھی آیا کرتے ہیں اور اس زور سے کہ اللہ کا تخت تک کانپنے لگتا ہے۔ . . . .

"آنحضرت صلعم فرماتے ہیں، کہ سعد بن معاذ کی موت پر خدائی تخت کانپنے لگ گیا تھا"

سعد کی موت پر عرش کیسے ہل گیا تھا؟ اسے سمجھنے کے لئے قیامت کا انتظار کیجیئے"

(دو اسلام صـ۳۲۳)

ازالہ برقی صاحب آپ نے صحیح بات کہہ دی، یہ حدیث ایسی نہیں، کہ اسے سمجھا جاسکے، نہ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، جس طرح قرآن میں آیات متشابہات ہوتی ہیں، اور ان پر صرف ایمان لایا جاتا ہے، اسی طرح بعض احادیث بھی متشابہات ہوتی ہیں، اور ان پر صرف ایمان لایا جاتا ہے ان کے اصل مفہوم کا ادراک عقل انسانی نہیں کر سکتی، لہٰذا اس حدیث کو سمجھنے کی کوشش ہی آپ کو نہ کرنی چاہیئے، قرآن میں ہے۔

وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (ھود) اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر ہے

بتایئے اس آیت کو کس طرح سمجھیں، دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (الحاقہ) قیامت کے دن تیرے رب کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے۔

بتایئے اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ کیا اللہ تخت پر بیٹھتا ہے؟ کیا اللہ کو فرشتے اٹھا سکتے ہیں، ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا ہم تو اس کا مطلب اللہ کے حوالہ کرتے ہیں، آپ بھی ایسا ہی کیجیئے اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل) جس چیز کا علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت پڑو، لہٰذا ان چیزوں کے پیچھے پڑنا حرام ہے۔

ہو سکتا ہے، کہ حدیث میں عرش کے ہل جانے سے حاملان عرش کے رنج وملال کا اظہار ہو، ہو سکتا ہے، کہ حقیقۃً عرش ہی کو رنج ہوا ہو، کیونکہ قرآن سے ثابت ہے، کہ پتھروں میں خشیت الٰہی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (البقرہ) بعض پتھر اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں

قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد باری ہے:۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (دخان) ان کی موت پر آسمان اور زمین نہیں روئے۔

گویا بعض لوگوں کی موت پر آسمان اور زمین روتے ہیں، یعنی ان کو رنج وغم ہوتا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے، کہ عرش کے رنج وملال کرنے پر تعجب کا اظہار کیا جائے، جو مطلب ان آیات کا کیا جائے گا وہی مطلب حدیث کا بھی ہو سکتا ہے، لہٰذا اعتراض ہی فضول ہے

یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ عرش کا ہل جانا، کوئی محاورہ ہو، جو انتہائی غم کے موقع پر استعمال ہوتا ہو مثلاً انتہائی غم کے موقع پر یہ محاورہ "زمین کا پاؤں کے نیچے سے نکل جانا" استعمال ہوتا ہے

غور کیجیے، اور انصاف فرمائیے۔

غلط فہمی "اگر کوئی شخص آپ سے کہے، کہ سعدی نے گلستاں سات زبانوں میں لکھی تھی تو آپ کیا سمجھیں گے؟ یہی کہ انہوں نے گلستاں کے سات نسخے تیار کئے تھے، ایک فارسی میں، دوسرا عربی میں . . . . وعلیٰ ہذا القیاس، لیکن اگر کوئی شخص فارسی کی گلستاں کے متعلق یہ کہے، کہ سات زبانوں میں لکھی ہوئی ہے، تو آپ اسے یہی کہیں گے، کہ سر پر ٹھنڈا پانی ڈال لو . . . . .

• حضور نے فرمایا، کہ قرآن سات زبانوں میں اتارا گیا ہے" (مسلم ج ۱ ص ۳۶۳)

کیا سات زبانوں میں اتارنے کا مفہوم یہی ہے، کہ ایک ہی آیت سات مختلف زبانوں میں اتری تھی، تو پھر وہ باقی چھ زبانوں کے قرآن کہاں چلے گئے" (دو اسلام ص ۳۳۳ ص ۳۳۴)

ازالہ حدیث کا مطلب سمجھنے میں برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی، ذیل میں متن حدیث مع ترجمہ درج کیا جاتا ہے

عن ابی بن کعب قال کنت فی المسجد فدخل رجل یصلی فقرأ قرأۃ انکرتہا علیہ ثم دخل اٰخر فقرأ قرأۃ سوی قرأۃ صاحبہ	ابی بن کعب فرماتے ہیں، کہ میں مسجد میں تھا ایک شخص داخل ہوا، اور نماز پڑھنے لگا پس اس نے ایسی قرأت پڑھی، کہ مجھے بری معلوم ہوئی، پھر دوسرا شخص داخل ہوا، اس نے دوسرے طریقہ سے قرأت کی۔

(صحیح مسلم جلد اول، باب بیان ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف)

حدیث مذکورہ سے صاف ظاہر ہوا، کہ اختلاف پڑھنے کے طریقوں میں ع . . . . و لہجہ میں اختلاف تھا، ان پڑھنے والوں کا لہجہ قریش کے لب و لہجہ سے مختلف تھا، لہٰذا حضرت ابی بن کعب کو اس طرح پڑھنا ناگوار گذرا، پھر یہ قضیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا، آپ نے ان دونوں کی قرأت کو درست فرمایا، اس پر حضرت ابی بن کعب کے دل میں تکذیب کا خیال پیدا ہوا، اس کے آگے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

فلما رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما قد غشینی ضرب فی صدری ففضت عرقا وکانما	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ حالت ملاحظہ فرمائی، تو میرے سینے پر ہاتھ مارا، میں پسینہ پسینہ ہو گیا، اور ایسا معلوم

انظر الی اللہ عزوجل فرقا — ہونے لگا، گویا میں اللہ عزوجل کو دیکھ رہا ہوں
(صحیح مسلم) — ڈرتے ہوئے۔

پھر آپ نے جو کچھ فرمایا، اس کا خلاصہ یہ ہے، کہ عربی زبان کے ساتوں لہجوں میں قرآن پڑھنے کی اجازت اللہ کی طرف سے ہے، ایک اور حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:۔

ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ — یہ قرآن سات قراتوں پر نازل ہوا ہے، بس
احرف فاقرؤا ما تیسر منہ — جو قرأت تمہیں آسان معلوم ہو اس قرأت
(صحیح مسلم) — سے تم تلاوت کر سکتے ہو۔

اس حدیث کی بنا پر قرآن مختلف طریقوں سے آج تک پڑھا جاتا ہے، ہندوستان کی قرأت علیحدہ ہے، مکی قرأت علیحدہ ہے، مصری قرأت علیحدہ ہے، علی ہذا القیاس، مختلف ممالک میں مختلف طریقوں سے پڑھا جاتا ہے، ہماری اردو زبان کو دیکھئے، کہ یہ زبان تقریباً تمام ہندو پاکستان میں بولی جاتی ہے، لیکن دہلی اور یوپی کے لہجہ میں ہر جگہ نہیں بولی جاتی، پنجابیوں کا لہجہ علیحدہ ہے سرحدیوں کا علیحدہ ہے، بنگالیوں کا علیحدہ، اور حد تو یہ ہوگئی، کہ حیدر آباد دکن کا لہجہ بالکل علیحدہ ہے، بعض لہجے ایسے ہیں، کہ کانوں پہ بار گذرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود زبان ایک ہی ہے، لہجے بدل رہے ہیں، برق صاحب نے لہجہ کو زبان سمجھ لیا، حالانکہ حدیث میں زبان کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور یہی غلط فہمی کا اصل موجب ہے۔

غلط فہمی "سینکڑوں حفاظ نے حضور کی مقرر کردہ ترتیب کے مطابق قرآن یاد کر لیا تھا، اور ایک نسخہ حضرت عائشہ رض کے گھر میں موجود تھا، جو چمڑے کے ٹکڑوں، پتھروں اور پتوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا، جب حضرت صدیق کے زمانہ میں حفاظ قرآن کی ایک خاصی تعداد جنگ یمامہ میں شہید ہوگئی، تو آپ نے نسخہ رسول سے ایک نیا نسخہ تیار کرایا" (دو اسلام ص۳۳۵)

ازالہ یہ قطعاً صحیح نہیں، کہ حضرت عائشہ صدیقہ کے گھر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتب کیا ہوا قرآن موجود تھا، یہ بھی قطعاً صحیح نہیں، کہ اسی نسخہ سے حضرت ابوبکر صدیق نے ایک نیا نسخہ تیار کرایا تھا، یہ چیزیں بالکل بے ثبوت ہیں، برق صاحب نے بے حوالہ ان کو نقل کیا ہے، بلکہ احادیث و تاریخ دونوں اس کی تکذیب کرتی ہیں۔

غلط فہمی "جابر بن عبداللہ کہتے ہیں، کہ مسجد نبوی میں ایک درخت تھا، جس کے پاس کھڑے ہو کر حضور وعظ فرمایا کرتے تھے، جس روز منبر تیار ہوگیا، اور آپ منبر پر چڑھ کر وعظ کہنے لگے

تو اس درخت نے رونا شروع کیا...... حضورؐ منبر سے اترے، اس درخت پہ ہاتھ پھیرا، اور وہ چپ ہو گیا"

حضورؐ مکہ سے نکلے، تو نہ ان کا گھر رو دیا، نہ درخت نہ کوئی پتھر..... پھر اس مسجد والے درخت کو کیا خاص صدمہ پہنچا تھا" (دو اسلام ص۳۳۶ ص۳۳۷)

ازالہ برق صاحب یہ معجزہ ہے، اور معجزے شاذ و نادر ہی صادر ہوا کرتے ہیں، یہ نہیں، کہ ساری زندگی ہی معجزہ بن جائے۔

غلط فہمی "رونے کے لئے احساس، دل، دماغ، پھیپھڑوں، گلے اور دقیق نظام جسمانی کی ضرورت ہے یہ سب کچھ اس درخت میں کہاں سے آگیا تھا" (دو اسلام ص۳۳۷)

ازالہ برق صاحب قرآن میں ہے:۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ (الانبیاء) — اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا، وہ پہاڑ تسبیح کیا کرتے تھے۔

کہیئے جناب پڑھنے کے لئے منہ کی، زبان کی ضرورت ہے یا نہیں، اگر ہے، تو منہ اور زبان پہاڑوں میں کہاں سے آگئی تھی، اور سنیئے، اللہ تعالے فرماتا ہے:۔

وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ (البقرۃ) — اور بے شک بعض پتھر ایسے ہیں کہ اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔

بتایئے، ڈرنے کے لئے دل و دماغ کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ہے، تو پھر بغیر دل و دماغ کے پتھروں میں خشیت الٰہی کہاں سے آگئی ہے، برق صاحب یہ معجزہ ہے، اگر درخت کے دل و دماغ و پھیپھڑے ہوتے، تو پھر اس کو معجزہ کون کہتا؟ معجزہ تو یہی ہے، کہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہ ہو، اور پھر درخت روئے، پھر موسیٰ علیہ السلام کے عصا پر غور کیجیئے، وہ کس طرح سانپ بن گیا، اور سانپ بن کر تمام جادو کے سانپوں کو نگل گیا تھا، نگلنے کے لئے بھی منہ، گلے، پھیپھڑے، اور احساس کی ضرورت ہے یہ چیزیں لکڑی کے عصا کو کہاں میسر؟ معجزہ کہتے ہی اس بات کو ہیں، جو خلاف عادت واقع ہو لہٰذا درخت کے رونے پر اعتراض محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

غلط فہمی "اگر آپ کہیں، کہ یہ معجزہ تھا، تو رسول اللہ صلعم نے کفار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کر دیا تھا، اور صاف صاف کہہ دیا تھا، هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا" میں ایک انسان ہوں، جس کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا ہے، نہ کہ معجزے دکھانا" (دو اسلام ص۳۳۷)

الزام برق صاحب "نہ کہ معجزے دکھانا" کن الفاظ کا ترجمہ ہے، قرآن مجید کے متن میں تو ایسی کوئی عبارت نہیں، کیا اسی طرح عصائے موسیٰ اور ید بیضا کے معجزہ ہونے کا بھی انکار کیا جا سکتا ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کا کام بھی یہ نہیں تھا، کہ معجزے دکھائیں۔

سورہ بنی اسرائیل کو پڑھ کر دیکھیے، کفار مکہ نے کتنے معجزوں کا مطالبہ کیا تھا، یہ کر دیجیے، وہ کر کے دکھائیے، آپ ہمارے سامنے آسمان پر سیڑھی لگا کر چڑھ جائیے وغیرہ وغیرہ، اللہ تعالےٰ نے فرمایا آپ یہ کہدیں کہ معجزہ دکھانا میری قدرت میں نہیں ہے، میں تو صرف ایک آدمی اور اللہ تعالےٰ کا رسول ہوں، معجزے دکھانا اللہ کے اختیار میں ہے، وہ ان مطالبات کو پورا کرنے سے عاجز نہیں، وہ اس کمزوری سے پاک ہے، وہ دکھا سکتا ہے، جب وہ چاہے گا، ان معجزات کا ظہور ہو جائے گا بغیر اس کی مشیت کے میں اس مطالبہ کے پورا کرنے سے عاجز اور قاصر ہوں

سُبْحَانَ رَبِّیْ — میرا رب اس عجز سے پاک ہے

اس کے بعد یہ الفاظ ہیں:۔

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا — میں تو بس ایک انسان اور رسول ہوں

میرے ذمہ رسالت کے فرائض انجام دینے ہیں، مجھے اللہ تعالےٰ نے مختار کل بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ بغیر اس کی اجازت کے تمہیں معجزے دکھاؤں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اللہ تعالےٰ نے کفار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کر دیا تھا اس کی وجہ اللہ تعالےٰ نے اسی سورت میں بیان فرمادی ہے، ارشاد ہے۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ	اور ہمیں معجزہ دکھانے سے یہ امر مانع ہے، کہ
اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَاٰتَيْنَا	ان سے پہلے لوگ معجزوں کو جھٹلا چکے ہیں،
ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا	ثمود کو بطور معجزہ وہدایت ہم نے اونٹنی دی
بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا	تھی، لیکن انہوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا، اور
تَخْوِيْفًا (بنی اسرائیل)	ہم تو معجزے تخویف کے لئے بھیجا کرتے ہیں۔

اس آیت سے واضح ہو گیا، کہ پہلی قوموں نے معجزے مانگے، پھر معجزوں کو دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہ لائے، اسی طرح یہ لوگ بھی ایمان نہیں لائیں گے، اور کیونکہ معجزہ تخویف یعنی عذاب الٰہی کے لئے نہائیہ Ultimatum ہوتا ہے، لہذا اگر منہ مانگا معجزہ دکھا دینے کے بعد وہ قوم ایمان نہیں لاتی، تو پھر عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے، گذشتہ قوموں کو اللہ تعالےٰ نے اسی طرح ہلاک کر دیا، کیونکہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو تباہ کرنا اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھا، اور کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ان میں سے اکثر لوگ بعد میں ایمان لانے والے ہیں، اور ابھی وقت مقررہ سے پہلے ایمان نہیں لا سکتے لہٰذا یہ بھی تکذیب کر دیں گے، اور ہلاک ہو جائیں گے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ازراہ ترحم، منہ مانگا معجزہ نہ دکھایا، اور پوری قوم کو عام تباہی سے بچا لیا، ہاں جن لوگوں کو بعد میں شق القمر کا معجزہ دکھایا، تو پھر ان کو بہت جلدی بدر کے میدان میں موت کے گھاٹ اتار دیا، یہ بھی اللہ کی رحمت تھی، کہ پوری قوم کو شق القمر کے معجزہ میں شریک نہیں کیا، بلکہ اس میں صرف وہی لوگ شریک تھے، جن کی قسمت میں ایمان نہ تھا۔

پھر یہ بھی قطعاً غلط ہے، کہ آپ نے کافروں کو کوئی معجزہ ہی نہیں دکھایا، ہاں منہ مانگا معجزہ نہیں دکھایا، اس لئے کہ وہ عذاب کے لئے نہایہ ہوتا ہے، دوسرے معجزوں کا ثبوت قرآن میں موجود ہے، ارشاد باری ہے:۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا (الاعراف)	اور جب آپ انہیں کوئی معجزہ نہیں دکھاتے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ معجزہ آپ نے کیوں نہیں دکھایا، یعنی مطالبہ کے مطابق معجزہ کیوں دکھایا

آپ نے اس کا جواب دیا:۔

اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (الاعراف)	میں تو حکم الٰہی کا اتباع کرتا ہوں یعنی جس معجزہ کا حکم ہوا دکھا دیا، دوسرا نہیں دکھا سکتا

اس کے بعد منہ مانگے معجزہ کا وعدہ فرمایا گیا:۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (یونس)	کافر کہتے ہیں، کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا، آپ کہہ دیجیے کہ غیب کا علم اللہ کو ہے، پس ایسے معجزہ کے لئے تم بھی انتظار کرو، میں بھی منتظر ہوں

کافروں نے جلدی کی، تو جواب دیا:۔

سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ (الانبیاء)	جلدی مت کرو، میں عنقریب معجزے دکھانے والا ہوں۔

اس کے بعد وہ معجزہ دکھایا گیا جس کا ذکر ان آیتوں میں ہے:۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ . . . (القمر ۱)

قیامت قریب آگئی، اور چاند شق ہو گیا، کافر تو جب کبھی کوئی معجزہ دیکھتے ہیں، تو اس سے اعراض کیا ہی کرتے ہیں، اور یہی کہہ دیتے ہیں، کہ یہ تو جادو ہے، جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، ان کافروں نے بھی شق القمر کو جھٹلایا، اور اپنی خواہشات کی پیروی کی، اور ہر بات کا ایک وقت مقرر ہے، اور بے شک ان کو عبرت ناک قصوں کا علم ہو چکا ہے، ان سے ان کو نصیحت ہو سکتی تھی، لیکن یہ ڈرانا بھی ان کے لئے مفید ثابت نہ ہوا، لہٰذا اب آپ بھی ان سے روگردانی فرمائیے۔

یعنی منہ مانگا معجزہ ڈرانے کے لئے ہوتا ہے، ایسا معجزہ دیکھ لیا، پھر بھی انہیں عبرت نہیں ہوئی اور ایمان نہیں لائے، تو اب ان کو نصیحت کرنا لاحاصل ہے، اب مقررہ عذاب کا وقت قریب آگیا اے رسول اب آپ بھی ان سے منہ موڑ لیں، یہ باز آنے والے نہیں۔

غلط فہمی

"مسلمانوں کے لئے معجزہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی، وہ تو پہلے ہی سے ایمان لا چکے تھے؟" (دو اسلام ص ۳۳۷)

ازالہ

مسلمانوں کو معجزہ دکھانا ازدیادِ ایمان اور اطمینانِ قلبی کے لئے ہوتا ہے، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (البقرۃ)

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اے رب تو کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا، اللہ نے فرمایا کیا تو ایمان نہیں لایا، عرض کیا ایمان تو لے آیا، لیکن اطمینان قلبی کے لئے، اللہ نے فرمایا چار پرندے پالو، پھر انہیں اپنے سے ہلا لو، پھر ہر پہاڑ پر ایک جزو رکھ دو، پھر پکارو، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے، اور جان کہ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کہا تھا، کہ کیا اللہ تعالیٰ ہمارے لئے آسمان سے ایک دسترخوان نازل فرما دے گا، عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو، حواریوں نے جواب دیا۔

نُرِيدُ أَن نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَن قَدْ صَدَقْتَنَا (المائدۃ)

ہم چاہتے ہیں، کہ ہم اس میں سے کھائیں، ہمارے دلوں کو اطمینان ہو جائے، اور ہم سمجھ لیں، کہ جو آپ نے بتایا بالکل سچ ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا، کہ معجزہ کا ظہور اطمینان قلبی اور ازدیاد ایمان کا باعث ہوا کرتا ہے اور نہ صرف مسلمان بلکہ نبی تک اس کی خواہش کرتے ہیں، قرآن مجید میں ہے، کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی، پھر ان کی امت نے بھی اللہ کو دیکھنے کی خواہش کی، تجلیات ربانی کا ظہور ہوا، پھر جو کچھ ہوا، وہ سب کو معلوم ہے، بنی اسرائیل کو بہت سے معجزات دکھائے گئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ (البقرۃ)

بنی اسرائیل سے پوچھئے، کہ ہم نے کتنے روشن معجزے ان کو دکھائے تھے۔

پھر ارشاد باری ہے:۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ (البقرۃ)

اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا، اور تم پر من وسلویٰ نازل فرمایا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ (الاعراف)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل پر پہاڑ کو اٹھا کر سائبان کی مانند کر دیا، اور وہ سمجھے کہ اب یہ ہم پر گرنے والا ہے۔

غرض یہ کہ مسلمانوں کو بھی معجزے دکھائے جاتے رہے ہیں، لہٰذا اعتراض لاعلمی پر مبنی ہے۔

غلط فہمی "آیہ وضو میں صرف ایک اختلاف کی بنا پر کسی نے "اَرْجُلَكُمْ" کو "اَرْجُلِكُمْ" پڑھ دیا، پورا ایک فرقہ پیدا ہو گیا" (دو اسلام ص۳۳۶)

ازالہ جی نہیں! صرف یہی اختلاف نہیں، وہ تو پورے قرآن کو صحیفہ عثمانی کہتے ہیں، اور موجودہ قرآن میں سے صرف دس پاروں کو اصلی مانتے ہیں، اور وہ بھی بیس جعلی پاروں میں خلط ملط کر دیئے

گئے ہیں، اس طرح ان کے نزدیک تیس پارنے ضائع ہو گئے، اور دس پارے مخلوط ہو گئے (ملاحظہ ہو اصول کافی ملخصًا)

پھر ایک فرقہ اور بھی ہے، جو سورہ یوسف کو قرآن سے خارج کر دیتا ہے، الغرض قرأت کے معمولی اختلاف سے فرقہ پیدا نہیں ہوتا، ہاں تقلیدی اختلاف سے ہو سکتا ہے

غلط فہمی "ام شریک راوی ہیں، کہ حضور نے چھپکلی کو مارنے کا حکم دیا تھا، اس لئے کہ یہ اس آگ کو پھونکوں سے بھڑکاتی تھی، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھینکا گیا تھا (بخاری ص۱۵۲)

بھلا حضرت ابراہیم نے چھپکلی کا کیا بگاڑا تھا؟ ...... اس کے نفس میں اتنی طاقت کہاں تھی، کہ وہ آگ کے شعلوں میں ذرہ بھر بھی اضافہ کر سکتا" (دو اسلام ص۳۳۷)

ازالہ حضرت عائشہ صدیقہ کہتی ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ پانچ جانور فوسیق یعنی موذی ہیں، ان کو حرم میں بھی قتل کر دیا کرو، چوہا، بچھو، چیل، کوا، اور پاگل کتا (بخاری)

اسی طرح حضرت عائشہ فرماتی ہیں:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال للوزغ الفویسق (بخاری)	یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپکلی کو بھی فویسق فرمایا۔

جس طرح ان پانچ جانوروں کے موذی ہونے کی وجہ سے قتل کا حکم دیا، اسی طرح چھپکلی کے موذی ہونے کی وجہ سے اس کے بھی قتل کا حکم دیا، جیسا کہ حضرت سعد اور حضرت ام شریک رضی کی روایتوں میں صاف مذکور ہے، یعنی

امر بقتلہ (بخاری جز۲ ص۱۵۱)	آپ نے اس کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔

ام شریک کی ایک روایت میں حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:۔

امر بقتل الوزغ وقال کان ینفخ علی ابراھیم علیہ السلام (بخاری جز۲ ص۱۵۱)	آپ نے چھپکلی کو مارنے کا حکم دیا، اور آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی آگ کو پھونکتی تھی۔

اس حدیث سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ قتل کی وجہ آگ پھونکنا ہے، بلکہ قتل کی وجہ تو وہی ہے، جو اوپر مذکور ہوئی، یعنی اس کا فویسق (زہریلا، موذی) ہونا، ہاں یہ اس کی خباثت کا مزید ثبوت ہے، کہ ابراہیم علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر پر آگ پھونکتی تھی، اگر صرف آگ پھونکنا قتل کا سبب ہوتا، تو الفاظ حدیث اس طرح ہوتے "امر بقتل الوزغ فانہ کان ینفخ علی ابراھیم

علیہ السلام، جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث میں ہے:۔

اقتلوا ذا الطفیتین فانہ یطمس البصر (بخاری جزو ۲ ص۱۴۵)	آپ نے فرمایا ذو طفیتین سانپ کو قتل کر دیا کرو کیونکہ وہ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔

دیکھیے یہاں قتل کا سبب بیان کیا، تو "فانہ" فرمایا، اور چھپکلی کو مارنے کا حکم ہوا، تو "فانہ" نہیں فرمایا، ہاں اس کے قتل کے حکم کے ساتھ ایک دینی جذبہ کو ملحق کر دیا، تاکہ اس جذبہ کے ماتحت اس کے قتل میں سعی بلیغ کی جائے، یہ جملہ معطوفہ کا نفسیاتی پہلو ہے

"بھلا حضرت ابراہیم نے چھپکلی کا کیا بگاڑا تھا" یہ ایسا ہی سوال ہے، جیسے کوئی پوچھے کہ بھلا حضرت آدم علیہ السلام نے ابلیس کا کیا بگاڑا تھا، جو اس نے ان کو بہکایا، اس کی ذلت تو اللہ تعالیٰ نے کی تھی، کہ سجدہ کرنے کا حکم دیا، اور پھر اس کو بہکا کر سجدہ کرنے سے باز رکھا، جیسا کہ خود ابلیس نے کہا تھا۔

فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ (الاعراف)	اس لئے کہ تو نے مجھے بہکایا، میں ان کے لئے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھ جاؤں گا۔

بتائیے آدم علیہ السلام کا کیا قصور تھا، ابلیس نے بہکانے کا الزام اللہ تعالےٰ پر لگایا، اللہ تعالیٰ نے کہیں قرآن میں اس الزام کی تردید نہیں کی، تو اب بتائیے آدم علیہ السلام تو بے قصور تھے، پھر ابلیس نے ان سے اور ان کی اولاد سے بدلہ کیوں لیا، یہی وہ فطری شیطنت تھی، جس نے چھپکلی کو مجبور کیا، کہ ابراہیم علیہ السلام کی آگ کو پھونکے، ان کا قصور ہو یا نہ ہو، اس کے اس فعل سے فطری شیطنت ظاہر ہوتی ہے، بعض جانور فطرۃً شریف ہوتے ہیں، مثلاً گھوڑا، اور بعض جانور فطرۃً بد طینت ہوتے ہیں، مثلاً گرگٹ، بچھو وغیرہ، چھپکلی کی کوشش کتنی ہی ناکام سہی، لیکن اس نے حتی المقدور کوشش کی، یہ اس کی نیت ہے، جو اس کے باطن کی خباثت کا پتہ دیتی ہے، اور نیت ہی پر تمام اعمال کا دارومدار ہے کامیابی اور ناکامی سے نیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غلط فہمی

"ایک اور حقیقت" ملاحظہ ہو۔

ابن مسعود کہتے ہیں، کہ میں نے جبرئیل کو دیکھا تھا اس کے چھ سو پر تھے (بخاری)

صرف ابن مسعود ہی کیا خوبی تھی، کہ انہیں جبرئیل نظر آیا، کسی اور صحابی کو کیوں دکھائی نہ دیا یہ چھ سو پر آپ نے کیسے گن لئے تھے، اور جبرئیل کے لئے پروں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ ایک نوری جسم ہے، پرواز نور کی فطرت ہے، جس طرح ہوا، آگ اور بادلوں کو پروں کی ضرورت

نہیں ہوتی، اسی طرح نور بھی وسائل پرواز سے بے نیاز ہوتا ہے" (دو اسلام ص۳۳۸)

ازالہ برق صاحب بہت بڑی غلط فہمی آپ سے ہوئی، حضرت عبداللہ بن مسعود نے اپنے متعلق نہیں کہا تھا، کہ میں نے جبریل کو دیکھا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا تھا، پوری حدیث اس طرح ہے:۔

سمعت زرا عن عبد الله فكان قاب قوسين او ادنى فاوحى الى عبده ما اوحى قال حدثنا ابن مسعود انه رای جبريل له ست مائة جناح

امام شیبانی کہتے ہیں، کہ میں نے حضرت زر کو حضرت عبداللہ بن مسعود رض سے اس آیت "فکان قاب قوسین او ادنیٰ الخ" کی تفسیر میں بیان کرتے ہوئے سنا، کہ اس آیت میں جس طرف اشارہ ہے، وہ جبریل ہیں، اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تھا، ان کے چھ سو پر تھے۔

دوسری حدیث اسی کے آگے کتنے صاف الفاظ میں ہے، امام شیبانی کہتے ہیں، کہ میں نے حضرت زر سے اس آیت (فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى) کے معنی پوچھے، تو حضرت زر نے فرمایا:۔

اخبرنا عبد الله ان محمدا صلى الله عليه وسلم رای جبريل له ست مائة جناح

ہمیں ابن مسعود رض نے خبر دی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کو دیکھا تھا ان کے چھ سو پر تھے

(یعنی بقول آیہ کریمہ دو کمان بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ حضرت جبریل سے تھا، نہ کہ اللہ تعالیٰ سے جیسا کہ بعض لوگ کہا کرتے ہیں) (بخاری تفسیر سورہ والنجم)

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ رؤیت محمدی مراد ہے، نہ کہ رؤیت ابن مسعود رض کاش برق صاحب تحقیق فرما لیتے۔

دوسری بات جو برق صاحب نے کہی، وہ اس بھی زیادہ بڑی غلط فہمی ہے، کاش وہ قرآن کو غور سے پڑھتے، فرشتوں کے پروں کا ذکر تو قرآن میں موجود ہے سنیئے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ

سب تعریف اللہ کے لئے ہے، جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے، اور جس نے فرشتوں کو پیغام رساں بنایا ہے، جن فرشتوں کے دو، دو

يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (فاطر)	تین تین، چار چار پر ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ کرتا ہے پیدائش میں جس کو چاہے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے، کہ فرشتوں کے بازو ہوتے ہیں، دو، تین، چار اور زیادہ بھی۔ برق صاحب یہ بھی آپ نے خوب کہا، کہ ہوا، آگ اور بادلوں کو پروں کی ضرورت نہیں ہوتی کیا آپ کو معلوم نہیں، کہ یہ چیزیں بھی آسمان تک نہیں پہنچ سکتیں، ان کی رسائی محدود ہے، اگر یہ چیزیں بے پر کے اڑتی ہیں، تو پھر ہوا آسمان تک کیوں نہیں پہنچ جاتی، کیوں پانچ چھ میل کے بعد ختم ہو جاتی ہے آگ سطح زمین سے بے تعلق نہیں ہوتی، ان چیزوں کا اوپر جانا بھی ایک خاص اصول کا پابند ہے، وہ اس سے آزاد نہیں۔

غلط فہمی "حضرت ابو ہریرہ رض حضور سے راوی ہیں، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ختنہ اسی برس میں ہوا تھا" (بخاری ج ۱ ص ۱۵۳)

راوی نے یہ نہ بتایا، کہ پورے اسی سال تک اس مبارک کام میں کونسی رکاوٹ حائل رہی، جو زنانت سے عین پہلے دور ہوئی، اور آپ باآں ضعف و پیری حجام کے سامنے جا بیٹھے ختنہ کا مقصد صفائی صحت اور جنسی لذتوں میں اضافہ ہوتا ہے، اسی برس کے بعد یہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے، تو پھر ختنہ سے فائدہ؟ (دو اسلام ص ۳۳۸)

ازالہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک کافر گھرانے میں پیدا ہوئے، لہذا بچپن میں ختنہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر نبوت ملی، تو توحید کا وعظ شروع کر دیا، تمام انبیاء علیہم السلام کا یہ دستور رہا ہے، کہ پہلے صرف توحید کی اشاعت کا حکم ہوتا ہے، اور سارا زور اسی پر صرف ہوتا ہے دوسرے احکام بہت بعد میں نازل ہوتے ہیں، مکہ معظمہ میں ایک طویل مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی صرف توحید کا درس دیتے رہے، دوسرے شرعی احکام بہت بعد میں نافذ ہوئے، لہذا ابراہیم علیہ السلام کو بھی توحید کی تبلیغ میں کافی عرصہ لگا ہوگا، اور جب اسی سال کے ہوئے ہوں گے، تو دیگر احکام شرع کے ساتھ ختنہ کا حکم بھی ملا ہوگا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (البقرہ ۱۵)	اور جب ابراہیم علیہ السلام کے رب نے چند باتوں میں ان کی آزمائش کی، تو وہ ان سب میں پورے اترے۔

لہٰذا ختنہ کے حکم کی تعمیل میں بھی وہ پورے اترے، اور ختنہ کر لی، ہر حکم کے لئے اللہ تعالےٰ کے ہاں ایک وقت مقرر ہے، اور اس حکم کے لئے یہی وقت مقرر تھا، اس میں اعتراض کی کیا بات ہے، دیکھیے ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ جاتے ہیں، لیکن اس وقت کعبہ کی تعمیر نہیں کرتے، حالانکہ اس وقت اس کی زیادہ ضرورت تھی، پھر ایک عرصہ دراز کے بعد ان کو اس بچے کے ذبح کا حکم ہوتا ہے، پھر کافی عرصہ کے بعد وہ کعبہ تعمیر کرتے ہیں، اور اسمٰعیل علیہ السلام بھی اس کام میں ان کی مدد کرتے ہیں، پھر اس کو پاک و صاف رکھنے کا حکم ملتا ہے، یہ سب باتیں قرآن میں موجود ہیں، اور بتدریج انجام پا رہی ہیں، اسی طرح ختنہ کا حکم بھی مصلحت الٰہی کے مطابق اپنے وقت پر تھا اسی سال کی عمر اس زمانہ میں کچھ زیادہ عمر نہیں سمجھی جاتی تھی، قرآن میں ہے، کہ حضرت نوح علیہ السلام نے صرف تبلیغ میں ۹۵۰ سال صرف کئے، خود ابراہیم علیہ السلام کئی سو سال تک زندہ رہے، قاضی محمد سلیمان صاحب سابق مجسٹریٹ درجہ اول ریاست پٹیالہ تحریر فرماتے ہیں :-

"پھر حضرت ابراہیم نے حضرت اسحاق کی شادی ربقہ بنت میتوایل بن نخور برادر حقیقی حضرت ابراہیمؑ سے کی، حضرت ابراہیم نے ۱۷۵ سال کے بعد انتقال فرمایا" (رحمۃ للعالمین ج ۲ ص ۳۵)

اس بیان سے معلوم ہوا، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر بہت زیادہ ہوئی، قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ "۷۵ سال کے تھے، جب خدا کے حکم سے اپنی زاد بوم اور باپ کے وطن سے نکلے" (حوالہ مذکور ص ۳۳)

لہٰذا اسی سال کی عمر میں ختنہ بالکل قرین قیاس ہے، کیونکہ ہجرت کے بعد ہی احکام شریعت کا نزول شروع ہوا ہوگا، پھر ختنہ کے چھ سال بعد حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے، یعنی ۸۶ سال کی عمر میں، اور اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام بالکل جوان تھے، ابراہیم علیہ السلام کے بڑھاپے میں، تو حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے ہیں، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :-

قَالَتْ يَا وَيْلَتَىٰ أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَٰذَا بَعْلِي شَيْخًا (ھود)	(حضرت سارہ کو جب حضرت اسحاق کی بشارت دی گئی تو) کہنے لگیں، ہائے افسوس اب میرے بچہ ہوگا، حالانکہ میں بڑھیا ہوں، اور یہ میرے خاوند بھی بوڑھے ہیں۔

لہٰذا ختنہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام بوڑھے نہیں تھے، نہ وہ کسی حجام کے سامنے بیٹھے، بلکہ انہوں نے اپنی ختنہ خود کی حدیث کے الفاظ ہیں :-

اختتن ابراھیم علیہ السلام	حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کی،

لہٰذا حجام کے سامنے بیٹھنا ایک مفروضہ تھا، جو غلط نکلا۔

اب برق صاحب کی سمجھ میں آگیا ہوگا، کہ اسی سال تک اس کام میں کیا رکاوٹ تھی، ورنہ کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ کم و بیش ۲۰۰ سال تک کیا رکاوٹ تھی، کہ حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے، اور جب دونوں ماں باپ بوڑھے ہوگئے، اور صرف بوڑھے ہی نہیں، بلکہ حضرت سارہ کے الفاظ میں

عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ (الذاریات) میں بوڑھی بانجھ ہو چکی

تو ایسے وقت میں حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے، بھلا عورت بانجھ ہو، اور خاوند بوڑھا ہو، تو بچہ کیسے ہو سکتا ہے، برق صاحب یہ چیز بھی تو سائنس کے خلاف ہے، عقل کے خلاف ہے، فطرت انسانی اس سے ابا کرتی ہے، لیکن قرآن میں ایسا ہی ہے، اب بتائیے کس ملا کو برا کہیں، میں کہتا ہوں، کہ کسی کو برا کہنے کی ضرورت نہیں، ہر چیز کا انکار کیجیئے، اور قرآن کو تسلیم کیجیئے، اور اسی طرح حدیث کو بھی، اگر سائنس اور عقل و فطرت انسانی کے خلاف قرآن کو صحیح تسلیم کرنا لازمی ہے، تو پھر حدیث نے کیا قصور کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی مصلحت اللہ ہی جانتا ہے، آپ کو اور ہم سب کو ایسے معاملات میں خاموش رہنا چاہیئے، کہیں ایسا نہ ہو، کہ ایمان سلب ہو جائے۔

غلط فہمی "ابوہریرہ رضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں، کہ ایک دفعہ حضرت سلیمان نے کہا، کہ آج رات میں اپنی تمام بیویوں سے جن کی تعداد ایک سو ایک یا ننانوے تھی، مجامعت کروں گا ہر بیوی سے ایک شہسوار پیدا ہوگا، جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا، کسی نے کہا، انشاء اللہ بھی ساتھ کہیئے، لیکن آپ نے پرواہ نہ کی، چنانچہ تمام بیویوں کے پاس گئے، اور بغیر ایک کے کوئی حاملہ نہ ہوئی"

حضرت سلیمان عہد تاریخ کے انسان ہیں، عام انسانوں جیسا قد، اتنی ہی عمر اور طاقت، ہم یہ کیسے یقین کرلیں، کہ وہ پوری ایک سو بیویوں کے ساتھ مجامعت کی طاقت رکھتے تھے، پھر یہ بھی تو سوچیئے، کہ اگر ایک بیوی کے ساتھ مجامعت کے لئے کم از کم پندرہ منٹ درکار ہوں، تو تمام کے پاس جانے کے لئے پچیس گھنٹے چاہئیں" (دو اسلام ص۳۳۸ ۳۳۹)

ازالہ برق صاحب قرآن کہتا ہے :-

غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ (الانبیاء) سلیمان علیہ السلام کا تخت اتنی تیزی سے اڑتا تھا، کہ صرف صبح کے وقت وہ ایک مہینہ کی مسافت طے کرتا تھا، اور شام کے وقت بھی ایک مہینہ کی مسافت طے کرتا تھا۔

اگر حضرت سلیمان علیہ السلام عہد تاریخ کے انسان ہیں، تو بتائیے عہد تاریخ میں کہیں آپ کو ایسا تخت ملا ہے، کیا اس زمانہ میں ہوائی جہاز ایجاد ہو چکے تھے؟ کیا اس کا کوئی ثبوت ہے؟ ہرگز نہیں اور سنیئے :-

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ (النمل)

ایک شخص نے جس کو کتاب کا علم تھا، کہا کہ میں بلقیس کے تخت کو آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے لا دوں گا۔

کیا ایسا کوئی آدمی عہد تاریخ میں ملتا ہے، جس میں یہ کمال ہو، کیا تورات یا قرآن کا کوئی عالم ایسا ہے جس نے کبھی ایسا کر کے دکھایا ہو، تیسری آیت سنیئے، سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں۔

عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ (النمل) ہم کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

کیا عہد تاریخ میں کوئی انسان ایسا ہے جس کو پرندوں کی بولی آتی ہو، اگر یہی باتیں حدیث میں ہوتیں تو برق صاحب آپ کو غلط فہمی ہو جاتی، اور آپ پھر یہ فرما دیتے، کہ ہمارے علماء جب تک حدیث میں ڈرامائی رنگ نہ بھر دیں، انہیں مزہ نہیں آتا، اب یہ تو قرآن ہے، اسے کیا کہا جائے، غرض یہ کہ اس قسم کی عجیب و غریب باتیں اگر ان میں اور ان کے اصحاب میں پائی جاتی ہوں، تو کیا تعجب ہے، کہ ان میں بے انتہا مردانہ قوت بھی ہو، اور وہ بیک وقت سو بیویوں کے پاس جا سکتے ہوں۔

دوسرا اعتراض برق صاحب کا یہ ہے، کہ ۱۲ گھنٹے کی رات میں یہ کیسے ممکن ہے، برق صاحب نے اس کام پر کم از کم پندرہ منٹ لگائے ہیں، حالانکہ کم از کم تو ایک منٹ بھی ہو سکتا ہے، اور زیادہ سے زیادہ تین چار منٹ لگتے ہیں، اگر اوسطاً تین منٹ کا حساب رکھا جائے تو کل وقت ۱۰۰×۳ = ۳۰۰ منٹ = ۵ گھنٹہ، یعنی ۱۲ گھنٹوں میں سے صرف ۵ گھنٹے صرف ہوں گے، ۹ گھنٹے پھر بھی فاضل بچ جائیں گے غرض یہ کہ حساب کے لحاظ سے بھی حدیث پر کوئی اعتراض نہیں۔

انتباہ ترجمہ میں برق صاحب نے "لَمْ یَقُلْ" کا ترجمہ "آپ نے پرواہ نہ کی" کیا ہے، حالانکہ اس کے صرف یہ معنی ہیں، کہ آپ نے "ان شاء اللہ نہ کہا" پہلے تو وہ بھول گئے، اور بھولنا بھی مشیت الٰہی کے ماتحت تھا، جب انہیں یاد دلایا گیا، تو جس طرح ایک انسان انتہائی جوش و خروش میں دوسروں کی بات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح سلیمان علیہ السلام پر غلبہ جذبہ جہاد طاری تھا، اور اس میں وہ اس قدر محو تھے، کہ یاد دلانے والے کی آواز کی طرف متوجہ نہ ہوئے، تقدیر الٰہی یہی تھی واللہ غالب علی امرہ۔

اگر تعدد ازواج پر اعتراض ہے تو سنیئے، اکثر بادشاہ متعدد حرم میں رکھا کرتے تھے، اور یہ کوئی غیر معروف چیز نہیں تھی جس پر اعتراض کیا جا سکے، اعتراض تو ناجائز اور غیر معروف کاموں میں ہوتا ہے، پھر ازواج کی کثیر تعداد کا ذکر تو تورات میں بھی موجود ہے، اور جس کو برق صاحب بالکل من و عن محفوظ سمجھتے ہیں لہٰذا حدیث

بھی محفوظ ہے، ورنہ یہ اعتراض تورات پر بھی ہوگا، اگر یہ اعتراض ہو، کہ سلیمان علیہ السلام دنیا دار بادشاہ نہیں تھے، کہ دنیاوی عیش و عشرت کے سامان جمع کرتے، بلکہ رسول تھے، لہٰذا ان کی زندگی عام انسانوں سے بالاتر نہیں ہو سکتی، تو یہ اعتراض بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ سلیمان علیہ السلام کے محل کا ذکر تو قرآن میں موجود ہے محل بھی اتنا شاندار کہ اس کا فرش بھی شیشہ کا تھا، ارشاد باری ہے۔

قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَأَتْهُ	ملکہ سبا سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ، پس
حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا	جب ملکہ نے اسے دیکھا، تو اس کو پانی سمجھا،
قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُمَرَّدٌ مِنْ قَوَارِيرَ	اور اپنی پنڈلیاں کھول دیں، حضرت سلیمان علیہ
(النمل)	السلام نے فرمایا، یہ تو شیشہ کا محل ہے

محل کے ذکر کے ساتھ ان کے خاصے کے گھوڑوں کا ذکر بھی قرآن میں ہے، بلکہ قرآن میں تو یہاں تک ہے، کہ ان کی وجہ سے وہ یاد الٰہی سے غافل ہو گئے، سنیئے:۔

إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصَّافِنَاتُ	شام کے وقت جب سلیمان علیہ السلام کے سامنے
الْجِيَادُ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ	خاصے کے گھوڑے پیش کئے گئے، تو کہنے لگے،
الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي حَتَّى تَوَارَتْ	میں اس مال کی محبت میں اپنے رب کی یاد سے
بِالْحِجَابِ (ص)	غافل ہو گیا، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا،

غور کیجیئے مضمون بظاہر کس قدر قابل اعتراض ہے، اگر یہی چیز حدیث میں ہوتی، تو غلط فہمیاں پیدا ہوتیں، اور اسے ملّا کی اختراع سمجھ لیا جاتا، غرض یہ کہ مذکورہ بالا آیتوں سے ثابت ہوا، کہ سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام شاہانہ کروفر سے رہا کرتے تھے، اگر اس شاہانہ کروفر پر کوئی اعتراض نہیں، تو بیویوں یا حرموں کی کثیر تعداد پر کیا اعتراض ہے، حرموں کی کثیر تعداد بھی شاہانہ کروفر کا ایک جزو ہے

غلط فہمی "کہاں تک گنوں صاحب! بات لمبی ہو رہی ہے، ورنہ صحاح ستہ میں اس نوع کی سینکڑوں اور احادیث موجود ہیں" (دو اسلام ص ۳۳۹)

ازالہ اول تو آپ نے چن چن کر تمام مشکل احادیث کو جمع کر دیا، اور اللہ کے فضل سے ہم نے ان سب کا جواب قرآن مجید اور عقل سلیم کی روشنی میں دے دیا، اب اس قسم کی احادیث باقی تو نہیں ہیں، لیکن اگر آپ کے خیال میں کچھ اور احادیث باقی رہ گئی ہیں، تو پیش کیجئے ان شاء اللہ اطمینان بخش جواب دیا جائے گا۔

غلط فہمی "میرا مقصد احادیث پر تنقید نہیں ہے" (دو اسلام ص ۳۳۹)

ازالہ میرا بھی یہی خیال ہے، کہ تنقید آپ نہیں کر رہے، بلکہ آپ کو غلط فہمی ہو گئی۔

غلط فہمی "بلکہ یہ دکھانا ہے، کہ جن مجموعوں کو 'صحیح' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان میں بھی ایسے ایسے اقوال بھرے پڑے ہیں، جنہیں سن کر تہذیب کانوں پر ہاتھ دھرے، عقل سلیم تلملا اٹھے اور کتاب الٰہی کلیجہ تھام کے رہ جائے" (دو اسلام ص ۳۳۹ تا ص ۳۴)

ازالہ ان تمام احادیث کا جواب قرآن، تہذیب اور عقل و سائنس کی روشنی میں دیا جا چکا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں، کہ ان مجموعوں میں کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ہے، جس پر کسی قسم کا اعتراض ہو سکے۔

غلط فہمی "نمونہ آپ نے دیکھ لیا، انصافاً کہیئے، کہ ان اقوال کو وحی سمجھ کر ان پر کیسے عمل کریں" (دو اسلام ص ۳۴)

ازالہ نمونۃً میں نے بھی قرآنی آیات پیش کر دی ہیں، جو ان احادیث سے مماثل ہیں، بلکہ ان سے زیادہ حیرت انگیز، کچھ اور آخری باب کے جواب میں ان شاء اللہ پیش کروں گا، اگر بایں ہمہ ان آیات کو وحی سمجھ کر عمل کیا جا سکتا ہے، تو پھر ان احادیث کو بھی وحی مان کر عمل کیا جا سکتا ہے۔

غلط فہمی "اور اس دستور العمل کو کیسے چھوڑ دیں، جس کی ہر ہدایت روشن، ہر نغمہ حقیقت، ہر حرف صداقت" (دو اسلام ص ۳۴)

ازالہ چھوڑیئے نہیں، بلکہ احادیث کی روشنی میں اس کا مطلب سمجھیئے، یہ نہیں، کہ صلوٰۃ کے معنی بقول محمد احمد "پریڈ" کر لئے جائیں، یا پھر بقول غلام احمد پرویز "نظام ربوبیت" کر لئے جائیں، بلکہ اس کے معنی وہی لئے جائیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں، اور جس پر امت متواتر عمل کرتی آئی ہے، قرآن چند اوقات میں نماز فرض کرتا ہے، لیکن ان اوقات کی تصریح اور تعداد حدیث میں آتی ہے، لہٰذا قرآن کو بھی پکڑیئے، اور حدیث کو بھی، نماز پڑھیئے، لیکن پانچ وقت وعلیٰ ہذا القیاس۔

سوالات (۱) برق صاحب فرماتے، کہ "قرآن کی ہر ہدایت روشن ہے" میں بھی مانتا ہوں لیکن کیا غلط فہمی کی بنا پر میں سوال کر سکتا ہوں، کہ یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ (الحجر) ہم مجرمین کے دلوں میں اسی طرح یہ بات ڈال دیتے ہیں (کہ وہ رسول کا مذاق اڑائیں)

اس میں کون سی روشن ہدایت ہے؟ کیا اللہ ان کے دلوں میں ڈالتا ہے، کہ وہ رسول کا مذاق کریں؟

(۲) برق صاحب فرماتے ہیں "قرآن کا ہر لفظ حقیقت، ہر حرف صداقت" میں بھی اس پر ایمان رکھتا ہوں، لیکن کیا میں غلط فہمی سے پوچھ سکتا ہوں "کٓهٰیٰعٓصٓ" کے ان پانچ حرفوں میں کیا صداقت ہے، اس لفظ کی کیا حقیقت ہے؟ یہ مہمل ہے یا موضوع؟

(۳) برق صاحب فرماتے ہیں "ہر حکم دنیوی واخروی فلاح کا ضامن" میرا بھی اس پر ایمان ہے، لیکن کیا میں غلط فہمی سے پوچھ سکتا ہوں، کہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں جو حکم ہے، کہ

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ (البقرۃ) — اور اپنے سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔

اس میں کیا دنیاوی مفاد ہے؟ جوئیں سر میں پڑ جائیں تو بھی نہ منڈ لئے، بلکہ یہاں تک ہے، کہ :-

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ (البقرۃ) — اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا سر میں جوئیں وغیرہ ہو جائیں، تو سر منڈانے کا فدیہ دے

یعنی ایسی مجبوری کی حالت میں بھی سر منڈلنے کا جرمانہ ادا کرے، آخر اس میں کیا راز ہے؟ پھر یہ حج کا حکم اضاعت مال کا سبب نہیں؟ کیا حج میں ایک مکان اور دو پہاڑوں کا طواف توحید کے خلاف تو نہیں؟

(۴) برق صاحب فرماتے ہیں، کہ قرآن کا ہر قول تمام شبہات سے ورار الورا، میں بھی اسے تسلیم کرتا ہوں، لیکن کیا میں غلط فہمی سے پوچھ سکتا ہوں، کہ قرآن کا یہ حکم کہ تم پر نماز چند اوقات میں فرض ہے تو یہ اوقات کتنے ہیں، اور کون کون سے ہیں؟ کیا جس صلوۃ کے متعلق قرآن میں سینکڑوں مرتبہ حکم یا ترغیب دی گئی ہو، اس کی کوئی ترکیب بھی اس میں موجود ہے

(۵) برق صاحب فرماتے ہیں" ہم نے قرآن کی ہر بات کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھا، فطرت کی میزان میں تولا، اور اعمال خدا سے اس کا مقابلہ کرکے دیکھا، ہمیں ہر جگہ صرف حقیقت اور ٹھوس حقیقت نظر آئی" (دو اسلام ص ۳۴۰)

برق صاحب بات تو صحیح ہے لیکن کیا میں غلط فہمی سے سوال کر سکتا ہوں، کہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں، ایک آدمی پلک جھپکنے میں تخت بلقیس کو ہزاروں میل دور سے کیسے لے آیا تھا؟ عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے کیسے پیدا ہو گئے تھے؟ گہوارہ میں انہوں نے کیسے بات کی تھی؟ والدہ کے بڑھاپے میں، اور بانجھ ہونے کے باوجود حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کیسے پیدا

ہو گئے تھے؟ قارون کا آخر کتنا خزانہ تھا، کہ ایک بڑی جمعیت بھی اس کی کنجیاں اٹھا نسکی متحمل نہ ہو سکتی تھی؟ یوسف علیہ السلام میں وہ کون سا حسن تھا، کہ تمام عورتیں ان پر فریفتہ ہو گئی تھیں، اور ان کو دیکھ کر اتنی بدحواس ہو گئی تھیں، کہ اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے؟ کیا یہ سب چیزیں سائنس اور فطرت کے مطابق ہیں اور اگر ہیں تو یقین رکھیئے، کہ احادیث میں بیان کردہ عجائبات بھی ٹھوس حقائق ہیں، اور سائنس اور فطرت کے عین مطابق ہیں، اگرچہ ظاہر میں خلاف ہی کیوں نہ معلوم ہوں، ہماری عقل کی رسائی وہاں تک نہ ہو سکے تو اس میں حیرت و استعجاب کی کونسی بات ہے، آخر ہماری عقلیں بھی تو ناقص ہیں، رسول پر ایمان لانا عقل کی ٹھوکروں سے بچنے کا ذریعہ ہے،

(۶) برق صاحب فرماتے ہیں "قرآن حقائق سے بحث کرتا ہے" ہمیں اس سے اتفاق ہے لیکن کیا میں غلط فہمی سے یہ پوچھ سکتا ہوں، کہ ذوالقرنین کا سورج کو کیچڑ کے چشمہ میں ڈوبتے دیکھنا، کونسی حقیقت ہے؟ کیا یاجوج ماجوج قوم تاریخی حقیقت ہے؟ کیا حضرت خضر کا معصوم بچہ کو قتل کر دینا حقائق میں سے ہے؟ کیا جرم سے پہلے اس بچے کا قتل حقائق میں سے ہے؟ کیا اس بچہ کو سیفٹی ایکٹ (جس کے خلاف آج کل بھی ہم آواز اٹھاتے رہتے ہیں) کے ماتحت قتل کر دینا جائز تھا؟ اس کو پیدا کرنے میں کیا مصلحت تھی؟ کہ پیدا کر کے قتل کرا دیا گیا! کیا اللہ کے رسول کی بے عزتی کرنا، اس کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ کر گھسیٹنا، اور ان افعال کو کسی انسان کی طرف منسوب کر کے پھر اس انسان کو برگزیدہ ماننا دینی حقیقت ہے؟ کیا کتاب الٰہی کو زمین پر پٹخنے والا اللہ تعالیٰ کے ہاں صاحب وجاہت ہو سکتا ہے؟ کیا یہ ٹھوس دینی حقیقت ہے؟

اگر ان سب باتوں کے باوجود بظاہر اچھی نظر نہیں آتیں، قرآن قرآن ہے، تو اس سے کم درجہ کی باتوں پر جو غلط فہمی احادیث میں ہوتی ہے، اس غلط فہمی سے احادیث پر کوئی آنچ نہیں آتی، وہ بھی قرآنی حقائق ہی بیان کرتی ہے، ہمارے نزدیک حقائق ہی وہ ہیں، جو قرآن وحدیث میں ہیں اور ان حقائق کے خلاف اگر کوئی بات کہیں ملے، تو وہ باطل ہے، دھوکہ ہے، خواہ یہ قرآنی وحدیثی حقائق عقل کے خلاف نظر آئیں، تاریخ کے خلاف معلوم ہوں، سائنس کے معیار پر پورے نہ اتریں، نیز ان فطرت کے مخالف ہوں،

حق وصداقت کا معیار ایک مؤمن کے لئے صرف قرآن وحدیث ہے، نہ کہ ان کو چھوڑ کر دوسری چیزیں، اگر دوسرے معیاروں پر پورا اترنے کے بعد ہم نے قرآن وحدیث کو مانا، تو پھر یہ ایمان بالغیب نہیں جس کا قرآن مطالبہ کرتا ہے، بلکہ اپنی عقل ناقص، غلط تاریخ، نامکمل سائنس پر اصل ایمان ہے اگر

رسول کی بات ان کے خلاف نہ ہو، تو صحیح ورنہ غلط، یہ ایمان کی شان نہیں، اس معیار پر پرکھ کر تو ہر کس و ناکس کی بات تسلیم کی جا سکتی ہے، رسول کا امتیاز ہی کیا باقی رہا، یہ تو کفر کی شان ہے، مومن کے لئے قرآن و حدیث کی بات عین ایمان ہے، اور وہ اپنی صداقت کے لئے غیر کی محتاج نہیں ہے، ایمان کی تکمیل ہی جب ہوتی ہے، کہ ہم ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف رسول کی باتوں کو مانیں، ہماری عقل تو ہمیں یہ بتاتی ہے، کہ قرآن ایسا ہونا چاہیئے تھا، اس طرح اس کی ترتیب ہوتی، مضامین میں تسلسل ہوتا، تکرار نہ ہوتی، کوئی حرف مہمل نہ ہوتا وغیرہ وغیرہ، مگر کیا کریں، اللہ نے اپنی مصلحت کے مطابق جیسا ترتیب دے دیا ہمیں تو اب اسی پر ایمان لانا ہے، اور اگر اسی حالت میں ایمان نہیں لاتا، تو پھر اللہ تعالے کو بھی ہمارے ایمان کی پرواہ نہیں ہے۔

مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف) — جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔

باب ۲۰

"صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا"

غلط فہمی ۱ برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

• خلفائے راشدین احادیث کو ڈھونڈ کر جلاتے رہے" (دو اسلام ص۳۴۱)

ازالہ یہ بالکل غلط ہے تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو، اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر یہ بتائیے، کہ یہ احادیث کہاں سے آگئیں، جن کے متعلق آپ کے باب کا عنوان ہے "صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا" (دو اسلام ص۳۴۱)

غلط فہمی ۲ برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

• حضور نے کتابت احادیث سے منع فرما دیا تھا" (دو اسلام ص۳۴۱)

ازالہ یہ بھی صحیح نہیں، تفصیل کے لئے باب اول ملاحظہ ہو، اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے، تو پھر معصیت رسول کے جرم پر ناز کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے، برق صاحب لکھتے ہیں :۔

" یہ تمام تفاصیل حدیث میں ملتی ہیں، اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پر ہم نازاں ہیں (ص۳۴۳)

برق صاحب لوگ رسول کی نافرمانی کریں، اور آپ اس پر ناز کریں، غور فرمایئے :۔

غلط فہمی ۳ برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

• اڑھائی سو برس تک احادیث ہر کہ ومہ کی زبان پر جاری رہیں، اور بگڑتے بگڑتے خدا جانے کیا سے کیا بن گئیں" (دو اسلام ص۳۴۱)

ازالہ یہ بھی غلط ہے، تفصیل کے لئے باب اول و دوم ملاحظہ ہو،

قولہ برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

• لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں" (دو اسلام ص۳۴۱)

تائید بالکل سچ فرمایا

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

• صحیح حدیث کے دو مفہوم ہیں، اول یہ کہ کسی حدیث کی نسبت آنحضرت صلعم کی طرف

صحیح ہو یعنی ہم بدلائل ثابت کر سکیں، کہ یہ قول حضور کی زبان مبارک سے واقعی نکلا، ان معنوں میں کوئی حدیث یقینی طور پر صحیح نہیں، البتہ ظن غالب یہ ہے، کہ بعض اقوال صحیح ہوں گے" (دو اسلام ص۳۴۱)

ازالہ بے شمار احادیث یقینی طور پر صحیح ہیں، اور اگر آپ اسے تسلیم نہیں کرتے، تو خیر ظن غالب ہی سہی، یہ کیا کم ہے، قرآن مجید کے متعلق بھی صحیح یقین کا کون سا خارجی ذریعہ ہے، یہاں بھی وہی شکوک ہیں، اور وہ بھی کئی اعتبار سے خصوصاً مسلمانوں کے ایک بہت بڑے فرقہ کا اس کی صحت سے انکار کرنا، تضاد آیات، حروف مقطعات وغیرہ۔

برق صاحب کیا اسی اسلام پر آپ کو ناز ہے، جس کے پیغمبر کا ایک قول بھی یقینی طور پر صحیح محفوظ نہیں، براہ کرم غور کیجیے۔

قولہ برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"دوم۔ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو، اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں" (ص۳۴۱)

تائید ہم آپ کی تائید کرتے ہیں احادیث کے سلسلہ میں الفاظ اتنے ضروری نہیں، جتنا کہ ان کا مفہوم، اس لئے کہ الفاظ کا مدعا قرآن مجید کی تفسیر ہے، اگر قرآن کی آیات کا صحیح مطلب سمجھ میں آگیا، تو بس کافی ہے، مدعا پورا ہو گیا، مفہوم حدیث اگر محفوظ ہے، تو مقصود حاصل ہو گیا، یہ بھی کیا کم ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس صورت میں ہمیں صرف یہ دیکھنا پڑے گا، کہ حدیث قرآن سے تو نہیں ٹکراتی (وغیرہ وغیرہ) (دو اسلام ص۳۴۱)

ازالہ اس کا جواب آگے آرہا ہے:۔

غلط فہمی برق صاحب حدیث کی صحت کے لئے چند شرائط مقرر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"پس ہر ایسی حدیث صحیح ہے، خواہ اس کا راوی ابوہریرہ ہو، یا بابا رتن" (دو اسلام ص۳۴۲)

ازالہ صحیح بات تو بے شک صحیح ہے، خواہ اسے بیان کرنے والا کوئی ہو، اگر اس بات کی صحت کسی دوسرے ذریعہ سے ثابت ہو چکی ہے، تو پھر اگر کوئی کذاب و دجال بھی اس کو بیان کرے، تو وہ بات اس کے بیان کرنے سے جھوٹ نہیں ہو جائے گی، اس کی صحت کے لئے دوسرے شواہد ہیں، اور ان ہی کی وجہ سے وہ صحیح ہے، ہاں اگر کسی بات کی صحت کے لئے دوسرے شواہد موجود نہ ہوں، اور بات ایسی ہو، کہ اس کے قبول کرنے میں بظاہر کوئی حرج بھی نہ ہو، تو ایسی بات ہرگز کسی کذاب کے بیان کرنے

سے قبول نہیں کی جائے گی، یہاں دیکھا جائے گا، کہ راوی ابوہریرہ ہیں یا بابا رتن، اگر ابوہریرہ رضؓ ہیں، تو قبول کی جائے گی، اور اگر بابا رتن ہے، تو مسترد کر دی جائے گی، مثلاً بابا رتن اگر یہ بیان کرے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، کہ "ظہر کی نماز میں سورہ نساء پڑھا کرو" یہ بات ایسی ہے، کہ برقی صاحب کے پیش کردہ تمام معیاروں پر پوری اترتی ہے، کیا ہم اس کو تسلیم کر لیں؟ برق صاحب ایسے موقع پر آپ ضرور کہیں گے کہ بابا رتن ثقہ بھی ہے یا نہیں، اور اگر نہیں، تو آپ اس حدیث کو فرضی قرار دیں گے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ بابا رتن کو کذاب تسلیم کرنے کے بعد بھی اس حکم کو امت کے سر پر رکھ دیں، لہٰذا یہ کہنا کہ سچا اور جھوٹا راوی دونوں برابر ہیں بالکل لغو ہے۔

دوم- ہر سچی بات کو تسلیم کرنے سے یہ کہاں لازم آتا ہے، کہ وہ سچی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، ہر اچھی بات کو خواہ مخواہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تو منسوب نہیں کیا جا سکتا، ایک عالم کے منہ سے نکلی ہوئی سچی بات، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلی ہوئی بات میں ایک مومن کے لئے تو بڑا فرق ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی بات میں جو تقدس اور خیر ہے، وہ دوسرے کی بات میں کہاں ہو سکتا ہے، اور اگر دونوں برابر ہوں، تو پھر کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بھی اچھی اور سچی ہے، لیکن میں اس معاملہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ زیادہ قرین مصلحت ہے، لہٰذا میری پیروی کرو، نہ کہ حدیث رسول کی، بتلائیے، کیا ایک مومن اسے برداشت کر سکتا ہے۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر کوئی انگریز کہہ دے، کہ خدا ایک ہے، چوری، زنا، اور قمار بازی گناہ ہیں، تو کیا کسی مسلمان میں یہ جرأت ہے، کہ وہ ان اقوال کے صحیح ہونے سے انکار کر دے" (دو اسلام ص ۳۴۲)

ازالہ کوئی مسلمان ان کا انکار نہیں کرے گا، اس وجہ سے، کہ یہ باتیں اس کے بیان کرنے سے پہلے قرآن میں موجود ہیں، اور قرآن پر اس کا ایمان ہے، یہ اس انگریز کی تصدیق نہیں ہے، بلکہ در حقیقت قرآن کی تصدیق ہے، اگر وہ انگریز

(۱) قیامت کے متعلق ایسی باتیں بیان کرے، جو قرآن و حدیث میں نہیں ہیں۔

(۲) میدان محشر کے حالات بیان کرے۔

(۳) دوزخ کے عذاب کا حال بیان کرے۔

(۴) جنت کی نعمتوں کا ذکر کرے۔

(۵) نماز عید اور جمعہ کے فضائل بیان کرے۔

(۶) نماز استسقاء کے لئے بعض شرائط مقرر کرے۔

(۷) آیندہ واقعات کی پیشین گوئی کرے۔

(۸) گذشتہ اخبار کو بیان کرے

(۹) ساتوں آسمانوں کے رنگ بیان کرے۔

(۱۰) تاروں کی مخلوقات کا ذکر کرے۔

(۱۱) نماز کے نواقض میں کچھ اضافہ کرے

(۱۲) صفا و مروہ کے طواف کو لغو کہے، اور اسے شرک بتلائے، یا

(۱۳) صفا و مروہ کے گرد طواف کرنے کو صحیح قرار دے، اور ان کے مابین دوڑنے کو بلحاظ لغت وقرآن غلط قرار دے وغیرہ وغیرہ

اور ان چیزوں کی وضاحت اللہ کے رسول نے بیان نہ کی ہو تو بتایئے کیا ان سب چیزوں کو ہم تسلیم کرلیں، صرف اس لئے کہ یہ باتیں قرآن سے نہیں ٹکراتیں، نہ تاریخی وجغرافیائی حقائق کے خلاف ہیں نہ حقائق کونیہ کا انکار کرتی ہیں، برق صاحب میرا تو حسن ظن یہی ہے، کہ آپ بھی یہ باتیں تسلیم نہیں کریں گے کیونکہ ان باتوں کی صحت کے لئے راوی کا ثقہ ہونا ضروری ہے

لہذا ثابت ہوا کہ حضرت ابوہریرہ اور بابا رتن کی مرویات میں بڑا فرق ہوگا "چہ نسبت خاک را باعالم پاک" یہ دو اور دو چار والا معاملہ نہیں، کہ جو کہے تسلیم کرلیا جائے، پھر دو اور دو کو بھی تسلیم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی فرمایا ہو کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، یا آپ اپنے اصحاب کو حساب سکھایا کرتے تھے، ہر صحیح بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، آخر یہ بھی تو غلط بیانی ہے، پھر کیا وجہ ہے، کہ غلط بیانی کو ہم صحیح بیانی تسلیم کرکے خود بھی غلط بیانی کے مرتکب ہوں، اور خلاف واقعہ بات یعنی کذب کو صدق سمجھ لیں، اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کریں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں، کہ اگر کوئی شخص یہ بیان کرے، کہ نیوٹن کے حرکات قوانین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تھا، یا فلوجسٹن کے نظریہ احتراق پر ہمفری ڈیوی سے بہت پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرب کاری لگائی تھی، تو کیا آپ ان باتوں پر صرف اس لئے یقین کرلیں گے کہ یہ باتیں صحیح ہیں، میں دعوی سے کہہ سکتا ہوں، کہ آپ یقین نہیں کریں گے، بلکہ سند ثبوت طلب کریں گے

پس ثابت ہوا، کہ صحیح بات کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا، اور اگر کوئی کریگا تو اس کو اپنی ثقاہت اور سند ثابت کرنا ہوگی، ورنہ اس کی بات مسترد کر دی جائے گی، خلاصہ یہ ہوا، کہ اصل چیز راوی کی ثقاہت اور سند ہے، نہ کہ کچھ اور۔

قولہ برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمارے محدثین اسناد و روایت پر تکیہ کرتے رہے، اور انہیں کرنا بھی چاہیے تھا" (دو اسلام ص۲۴۲)

قولی بہت خوب! آپ نے بہت صحیح بات کہی، اور اسی کو ہم نے اوپر ثابت کیا ہے

قولہ برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"آخر کسی قول کو آنحضرت کی طرف منسوب کرنے کے لئے روایت کا سلسلہ ضروری تھا" (ص۲۴۲)

قولی ہم بھی آپ کی تائید کرتے ہیں، لیکن ایک بات دریافت طلب ہے، وہ یہ کہ اگر کسی قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کے لئے سلسلہ روایت ضروری ہے، تو پھر یہ سلسلہ روایت سچوں کا ضروری ہے، یا جھوٹوں اور کذابوں کا سلسلہ بھی کافی ہے، غالباً آپ یہی کہیں گے، کہ جھوٹا اور سچا کیسے برابر ہو سکتا ہے، اگر جھوٹوں کا سلسلہ کافی اور مستند سمجھا جائے، تو پھر اس سلسلہ اسناد کی ضرورت ہی کیا ہے، پھر تو سلسلہ اسناد کا پیش کرنا یا اس کا مطالبہ کرنا ہی لغو اور لایعنی ہے، اگر بات یہ ہے، اور درحقیقت یہ ہے، تو پھر صادق اور کاذب راوی برابر نہیں ہو سکتے اور اسی بنا پر حضرت ابو ہریرہ رضی اور ہارون کی مرویات برابر نہیں ہو سکتیں۔

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضور پر بذریعہ وحی صرف قرآن نازل ہوا تھا" (دو اسلام ص۲۴۳)

ازالہ میں تمہید میں ثابت کر چکا ہوں، کہ احادیث بھی بذریعہ وحی نازل ہوتی تھیں، تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمائیں، ذیل میں کچھ مزید معروضات پیش کرتا ہوں، انصاف فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (آل عمران)	اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم بے شک اللہ نے تجھے منتخب کر لیا ہے، اور تجھے پاک کر دیا ہے اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھے برگزیدہ کیا ہے اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری کرتی رہ، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرتی رہ۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ :۔

(۱) حضرت مریم کے پاس فرشتے آیا کرتے تھے۔

(۲) فرشتے حضرت مریم سے باتیں کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کا پیغام حضرت مریمؑ کو پہنچایا کرتے تھے۔

(۳) شرعی احکام بھی فرشتوں کے ذریعہ حضرت مریم کے پاس آیا کرتے تھے،

اب سوال یہ ہے، کہ ان فرشتوں کے ذریعہ جو پیغامات الٰہیہ اور احکام شرعیہ حضرت مریم کو پہنچتے تھے، وہ کیا اللہ کی کتاب تھی، جو حضرت مریم کو دی گئی تھی، اور کیا اس کتاب کے ذریعہ حضرت مریم کو اللہ تعالےٰ نے اصلاح قوم اور اس کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تھا، کیا حضرت مریم اللہ کی رسول تھیں، کیا وہ نبیہ تھیں؟ کیا وہ قوم کو تبلیغ کرتی تھیں، ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً برق صاحب کو بھی اس سے اتفاق ہوگا، پس ثابت ہوا کہ کتاب اللہ کے علاوہ بھی فرشتوں کے ذریعہ وحی آیا کرتی ہے، اور جب ایک غیر نبی پر فرشتوں کا نزول ہو، اور وحی آئے تو کیسے ممکن ہے، کہ ایک اولوالعزم نبی پر سوائے قرآن کے فرشتوں کا نزول ہی نہ ہو سوائے قرآن کے دوسری وحی ہی نہ آئے، الغرض کتاب اللہ کے علاوہ بھی وحی آتی رہی ہے، اور آسکتی ہے، اور سنیئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ (اٰل عمران)	اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تم کو بشارت دیتا ہے ایک بیٹے کی، جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔

گویا اللہ تعالےٰ بار بار حضرت مریم کی طرف وحی بھیجتا رہا، حضرت مریم پوچھتی ہیں، کہ بغیر باپ کے بیٹا کیسے ہوگا، جواب ملتا ہے :۔

كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ (اٰل عمران)	اللہ تعالےٰ اسی طرح پیدا کرے گا، وہ جو چاہے پیدا کرسکتا ہے۔

پھر جب انہیں درد زہ شروع ہوا، تو فرمایا :۔

لَا تَحْزَنِىْ (مریم)	اے مریم غمگین نہ ہو،

پھر ارشاد فرمایا :۔

وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ	اے مریم کھجور کے تنے کو ہلاؤ تم پر تازہ

عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (مریم) کھجوریں جھڑیں گی۔

پھر ارشاد فرمایا:۔

كُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا (مریم) کھاؤ، پیو، اور خوش رہو،

غرض یہ کہ مختلف حالات میں مختلف مقامات پر اللہ تعالےٰ حضرت مریمؑ پر وحی بھیجتا رہا، اور یقیناً یہ کتاب اللہ کی وحی نہیں تھی، اور سنیے:۔

إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ○ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ (طٰہٰ) اور اے موسیٰ جب ہم نے تمہاری والدہ کی طرف وحی کی جو کی، وہ یہ کہ اس بچہ کو تابوت میں رکھ کر دریا میں بہا دو۔

ان آیات سے معلوم ہوا، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کے پاس بھی وحی آیا کرتی تھی، اور یقیناً یہ وحی تورات میں نہیں تھی، بلکہ تورات سے پہلے نازل ہوئی تھی، اور تورات کے علاوہ تھی، دوسری جگہ ارشاد باری ہے:۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ (القصص) اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کی طرف وحی بھیجی، کہ ان کو دودھ پلاؤ، پھر جب تمہیں خوف ہو تو ان کو دریا میں ڈال دینا، اور نہ ڈرنا نہ غمگین ہونا، ہم تمہارے پاس انہیں واپس لے آئیں گے اور ہم اس کو رسول بنائیں گے۔

کیا ان آیات میں صراحت کے ساتھ وحی کا ذکر نہیں، وحی کو دل میں ڈالنے کے معنوں میں ہرگز نہیں لیا جا سکتا، اس لئے کہ اس میں وعدہ ہے، اور آئندہ کی خبر ہے، اور یہ چیز بغیر وحی کے معلوم نہیں ہو سکتی

نتیجہ اگر غیر نبی کے پاس کتاب الٰہی کے علاوہ وحی آسکتی ہے، تو ایک نبی کے پاس بھی کتاب الٰہی کے علاوہ وحی آسکتی ہے، آخر اس میں اشکال ہی کیا ہے، تمہید میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن اس زاویہ سے اس پر بحث نہیں ہوئی تھی، لہٰذا اس کی تکمیل یہاں کر دی گئی۔

غلط فہمی "چونکہ قرآن میں صرف مہمات مسائل سے بحث کی گئی ہے، اور چھوٹی چھوٹی تفاصیل کو انسانی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے، اس لئے حضورؐ تمام غیر الہامی مسائل میں صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے" (دو اسلام ص۳۴۳)

ازالہ کسی دینی معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مشورہ نہیں لیا، اور نہ کوئی دینی کام مشورہ

سے طے پایا، کیا آپ بتا سکتے ہیں، کہ پانچ وقت کی نماز مشورہ سے طے کی گئی، نمازوں کی رکعات، نمازوں کی ہیئت، کیا یہ سب مشورہ سے طے ہوئیں، ہرگز نہیں، بلکہ نماز کے تمام طریقہ کو اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، ارشاد ہے:۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ)

نمازوں کی حفاظت کرو، خصوصاً بیچ والی نماز کی، اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے رہا کرو، پھر اگر دشمن کا خوف ہو، تو سوار یا پیدل جس طرح ہو سکے نماز پڑھ لو، لیکن جب امن ہو، تو پھر نماز کو اسی طرح ادا کرو، جس طرح اللہ نے تمہیں سکھایا ہے، اور جس طریقہ کو تم نہیں جانتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ حالت امن میں نماز پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے، جس طریقہ سے نماز ادا کی جاتی ہے، اور اس طریقہ سے نماز کی ادائیگی بحالت خوف ممکن نہیں، اگر یہ طریقہ مشورہ سے طے پایا تھا، تو اللہ تعالےٰ اسے اپنی طرف منسوب نہ کرتا، نہ یہ فرماتا کہ اس طریقہ کو تم تو جانتے ہی نہ تھے، پس معلوم ہوا، کہ یہ طریقہ اللہ تعالےٰ نے سکھایا، اور بذریعہ وحی سکھایا، لہٰذا قرآن کے علاوہ وحی کا آنا ثابت ہے۔

غلط فہمی "اگر ہم یہ فرض کر لیں، کہ حضور کی ہر حرکت، ہر قول، اور ہر اقدام تابع وحی ہوا کرتا تھا، تو پھر شَاوِرْهُمْ (تم صحابہ سے مشورہ کر لیا کرو) کی ہدایت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے"

(دو اسلام ص۳۴۳، ص۳۴۴)

ازالہ "شَاوِرْهُمْ" کے آگے "فِي الْاَمْرِ" ہے، جس سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ سیاست میں مشورہ کا حکم دیا جا رہا ہے، نہ کہ دین میں، امور سیاست میں بھی صرف اس شعبہ میں مشورہ کا حکم ہے، جس کا تعلق قوانین دینیہ سے نہیں، بلکہ جو شعبہ امور دنیا اور مصالح ملکی سے تعلق رکھتا ہے مثلاً ان احکام میں مشورہ نہیں لیا گیا، کہ

کن کافروں سے لڑا جائے، کب اور کن مہینوں میں لڑا جائے، لڑائی میں کون کون سے کام جائز ہیں، حرم میں لڑا جائے یا نہیں، حرام مہینوں میں اور حرم میں کس حالت میں جنگ جائز ہے، ان اصول واحکام کا تعلق براہ راست قوانین الٰہیہ سے ہے، لہٰذا ان احکام میں کوئی مشورہ نہیں لیا گیا

آپ فرمائیں گے، کہ یہ احکام تو قرآن میں موجود ہیں، لیکن جناب قرآن میں یہ تفصیل کہاں ہے، کہ

عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو مت قتل کرو، پھلدار درخت مت کاٹو، ناک، کان و دیگر اعضا مت کاٹو، آگ میں مت جلاؤ، سفیر کو قتل نہ کرو، جاسوس کو قتل کردو، وغیرہ وغیرہ، ان تمام احکام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مشورہ نہیں کیا، ہاں مشورہ کیا، تو صرف یہ کیا، کہ مدینہ میں رہ کر لڑیں، یا باہر نکل کر، ظاہر ہے کہ اندر رہ کر لڑنا، یا باہر جا کر لڑنا یہ کوئی اصولی و دینی حکم کی حیثیت نہیں رکھتا، اس کا تعلق دنیاوی مصالح سے ہے، لہٰذا اس پر مشورہ لیا گیا، اور مشورہ پر عمل بھی کیا گیا، دینی احکام میں قطعاً کبھی آپ نے مشورہ نہیں لیا، نہ زکوٰۃ کے نصاب کے متعلق مشورہ ہوا، نہ زکوٰۃ کی مقدار کے متعلق، نہ عیدین کے انعقاد کے سلسلہ میں مشورہ ہوا، نہ نماز استسقا کے متعلق، نہ نماز کسوف کے متعلق، ان میں سے کوئی کام بھی مشورہ کی بنا پر مقرر نہیں ہوا۔

یہاں تک کہ امیر المؤمنین اور حکمران کی حیثیت سے بھی دیکھا جائے، تو آپ بغیر صحابہ کے مشورہ کے حکمران بنے تھے، اور جب کبھی آپ نے سپہ سالار اور گورنر مقرر کئے، تو کبھی مشورہ نہیں لیا، بلکہ اگر لوگوں نے کسی کی سپہ سالاری پر اعتراض بھی کیا، تو آپ نے اس اعتراض کی کوئی پرواہ نہیں کی، بلکہ جو چاہا عمل کیا اور ہمارے لئے یہ دستور العمل مرتب فرما دیا کہ اگر حاکم وقت کسی شخص کو کسی عہدہ کے مناسب سمجھے تو رعایا کو حق حاصل نہیں ہے، کہ اس میں مداخلت کرے، یہ تھا اصول دین، اور اس اصول دین کے نفاذ میں بھی کسی سے مشورہ نہیں لیا گیا، پھر خلفائے راشدین ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتب کردہ اصول اور سنن ہی کی پیروی کرتے رہے انہوں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا، کہ یہ اصول و فروع کیونکر مشورہ سے طے ہوئے تھے، لہٰذا مشورہ ہی سے پھر طے کئے جا سکتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے، کہ اذان کے متعلق مشورہ کیا گیا، میں کہتا ہوں، کہ مشورہ کی حیثیت شروع میں بالکل دنیاوی تھی، یعنی لوگوں کو اطلاع کرنے کا ذریعہ کیا ہونا چاہیئے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی، کہ اس اطلاع و اعلان کو بھی دینی حیثیت دے دی جائے، لہٰذا بذریعہ وحی و بذریعہ خواب اس اعلان و اذان کی تعلیم دی گئی، اور اسی وحی کی بنا پر اذان مشروع ہو گئی

اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے، کہ جزئیات کو آپ نے مشورے سے متعین فرمایا، پھر بھی اس نافذ شدہ مشورہ کو ماننا شرعاً لازم ہے، اس لئے کہ اس مشورہ پر اللہ تعالیٰ کی نگاہ تھی، اگر وہ مشورہ غلط ہوتا، تو فوراً بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی جاتی، جیسا کہ اسیران بدر کے سلسلہ میں بذریعہ وحی اصلاح کی گئی اور آئندہ کے لئے اس مشورہ کے مطابق عمل کرنے سے روک دیا گیا،

غرض یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ سے مشورہ کرنا، اور اس مشورہ کے مطابق لائحہ عمل بنانا اور پھر اس لائحہ عمل کے خلاف وحی کا نہ آنا، یہ بھی وحی ہی کی ایک صورت ہے، کہ اللہ تعالے اس لائحہ عمل کو شرف منظوری بخش کر برقرار رکھتا ہے، لہذا الغرض محال جو تفصیلی احکام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مرتب کئے، یا مشورہ کے بعد نافذ فرمائے، بہرحال ان کو اللہ تعالے کی منظوری حاصل ہے، اور جب اللہ تعالے کی منظوری حاصل ہے، تو گویا وہ اللہ تعالے کو پسندیدہ ہیں، لیکن کسی دوسری تفصیل و تشریح کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا، کہ وہ اللہ تعالے کو پسند ہے یا نہیں، صحیح ہے یا نہیں، لہذا ایسی غیر یقینی چیز کے مقابلہ میں یقینی چیز کو چھوڑ دینا یقیناً حق سے انحراف کرنا ہے، اور یہ عقلاً بھی محال ہے، اور نقلاً بھی، اس لئے کہ اللہ تعالے نے خود فرما دیا ہے

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (النجم) — محض گمان سے حق کو ذرا بھی چھوڑا نہیں جا سکتا۔

جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، وہ یقیناً حق ہے، اور اس کو چھوڑنا یقیناً اللہ کے پسندیدہ لائحہ عمل کو چھوڑنا ہے، اور اللہ تعالے کے پسندیدہ لائحہ عمل کو چھوڑنا یقیناً گمراہی ہے، اسی لئے اللہ تعالے نے صاف اعلان فرما دیا ہے:۔

وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (الاعراف) — رسول کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت یاب ہو جاؤ۔

غلط فہمی "حدیث میں کئی ایسے واقعات موجود ہیں، کہ حضور نے کچھ کہا، صحابہ نے کچھ اور مشورہ دیا اور وحی نے صحابہ کی تائید کر دی" (دو اسلام ص ۳۴۴)

ازالہ احادیث میں ایسا ایک بھی واقعہ موجود نہیں، جس میں وحی نے صحابہ کی تائید کی، اور آپ کی تردید کی ہو، اسیران بدر کا جو واقعہ آپ نے پیش کیا ہے، وہ اس کی نظیر نہیں، اس واقعہ میں تو جو کچھ طے پایا، وہ صحابہ کی اکثریت کا فیصلہ تھا، اور وحی نے اقلیت کی تائید کی تھی، یعنی اکثریت کے فیصلہ کو وحی الٰہی نے رد کر دیا، اس واقعہ سے تو الٹا یہ ثابت ہوتا ہے، کہ اللہ تعالے کے نزدیک مشورہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے، اکثریت کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، اور صحیح بھی، لہذا اس کا فیصلہ کہ صحابہؓ کا مشورہ صحیح ہے یا غلط بذریعہ وحی ہوگا، اگر بذریعہ وحی تردید نہ ہو، تو وہ فیصلہ صحیح سمجھا جائے گا، اور اگر بذریعہ وحی اس کی تردید ہو جائے، تو وہ فیصلہ کالعدم ہو جائے گا۔ گویا اصل اہمیت اللہ تعالیٰ کی منظوری کو ہے، اب خواہ وہ اس منظوری کو بذریعہ وحی جلی ظاہر فرما دے، یا بذریعہ وحی خفی یا محض خاموشی سے اس کو برقرار رہنے دے۔

غلط فہمی "اسیران بدر کا واقعہ آپ کے سامنے ہے، کہ حضور فدیہ لینے کا فیصلہ کیا تھا حضرت فاروقؓ نے قتل کا مشورہ دیا، اور اللہ نے حضرت عمرؓ کی تائید فرمادی" (دو اسلام ص ۲۴۴)

ازالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا، اور کثرت آراء کے فیصلہ پر فدیہ لیا گیا، حضرت عمرؓ کی رائے تھی، کہ قتل کر دیا جائے، لیکن ان کا مشورہ اکثریت کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کیا گیا، اب اگر مشورہ کو دینی حیثیت حاصل تھی، تو پھر وحی نے اکثریت کے خلاف فیصلہ کیوں دیا، اکثریت کا فیصلہ غلط تھا، اور کیونکہ معاملہ محض دنیاوی تھا، لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ذاتی رحم و کرم کے بنا پر کثرت رائے سے اتفاق فرمایا، لیکن اللہ تعالٰے نے مشورہ سے کیا ہوا فیصلہ ناپسند فرمایا، کیونکہ اس وقت یہ فیصلہ دینی سنت اختیار کر رہا تھا، وہ یہ کہ فدیہ لے کر چھوڑنے کے شرائط کیا ہونے چاہئیں اور کب فدیہ لے کر چھوڑا جا سکتا ہے، اگر اس فیصلہ پر اللہ تعالٰے خاموش رہتا، تو یہ سنت بن جاتی، کہ کسی حالت میں بھی اسیران جنگ کو قتل کیا جا سکتا ہے، یا فدیہ لے کر رہا کیا جا سکتا ہے، حالات کے تقاضہ سے اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا، ہر حالت میں اکثریت کا فیصلہ نافذ ہوگا، لیکن اللہ تعالٰے نے بتایا، کہ نہیں، ہر حالت میں مشورہ پر عمل نہیں ہوگا، بلکہ ہم اصول دین کی حیثیت سے یہ بات نافذ کرنا چاہتے ہیں، کہ جب تک دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل نہ دیا جائے، اور خوب خونریزی کے بعد اسلامی حکومت کا رعب غالب نہ ہو جائے، اس وقت تک اسیران جنگ کو رہا نہ کیا جائے۔

بہر حال اللہ تعالٰے نے اکثریت کے فیصلے کو برقرار رکھا، اپنے گذشتہ نازل کردہ حکم کی رو سے جو سورہ محمدؐ میں ہے، اسی فیصلہ کو سند جواز بخشا، اللہ تعالٰے نے ناراضگی کا اظہار صرف اس لئے کیا تھا، کہ بعض لوگوں کی نیت اچھی نہیں تھی، جیسا کہ اللہ تعالٰے نے خود فرمایا ہے۔

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا (الانفال) تم لوگ دنیا کے مال کے طالب تھے۔

یعنی اکثر لوگوں نے محض دنیاوی لالچ سے ایسی رائے دی تھی، للہیت نہ تھی۔

برق صاحب آپ اس واقعہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے حجت شرعیہ نہ ہونے کے منافی سمجھ رہے ہیں، حالانکہ اس واقعہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فیصلہ خواہ مشورہ سے ہو یا بغیر مشورہ کے صحیح ہوتا تھا، اور اگر صحیح نہیں ہوتا تھا، تو فوراً وحی کے ذریعہ اس کی تصحیح کر دی جاتی تھی، لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلوں پر اللہ تعالٰے کی مہر تصدیق ثبت ہے، اور یہی وجہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلے اللہ تعالٰے کے فیصلے سمجھے جاتے ہیں

اگر یہ فیصلے غلط ہوتے، تو اللہ تعالیٰ کبھی خاموش نہ رہتا، اللہ تعالیٰ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو دیکھتے رہنا، غلط فیصلہ پر ٹوک دینا، یہ وحی قولی ہے، جلی ہو یا خفی، صحیح فیصلہ پر خاموش رہنا، یہ وحی تقریری ہے، اور حدیث کا ایک بہت بڑا حصہ اس وحی تقریری پر بھی مشتمل ہے، علاوہ اس تقریری وحی کے بیشمار مرتبہ قولی وحی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتی تھی، اور یہ قرآن کے علاوہ تھی، ان کا انکار تواتر کا انکار ہے، اس قسم کی احادیث جن میں وحی کا نزول موجود ہے، حد تواتر کو پہنچ چکی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے، کہ علاوہ قرآن کے بھی وحی آیا کرتی تھی تفصیل کے لئے تمہید ملاحظہ فرمالیں۔

غلط فہمی

"اللہ نے قرآن میں صرف اہم قوانین و ضوابط سے بحث کی ہے، اور غیر اہم مسائل انسانی اجتہاد پر چھوڑ دیئے ہیں، آنحضرت صلعم تمام ایسے معاملات میں اجتہاد سے کام لیا کرتے تھے، اور احادیث کا بیشتر حصہ انہی اجتہادات پر مشتمل ہے" (دو اسلام ص ۳۴۴)

ازالہ

ہمیں اس کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں، اگر آپ نے بعض مسائل میں اجتہاد سے فیصلہ کیا ہے پھر بھی ان کے حق ہونے میں شبہ نہیں، ان کی صحت پر اللہ تعالیٰ کا سکوت سند ہے اور یہ وحی تقریری ہے، اور جس طرح وحی قولی حجت شرعیہ ہے، اسی طرح وحی تقریری بھی حجت شرعیہ ہے اگر آپ کا اجتہاد غلط ہوتا، تو وحی قولی سے راہ نمائی نازل ہوتی، جیسا کہ ایک دو مرتبہ ہوا، اور کیونکہ ساری زندگی میں دو ایک ہی اجتہادی غلطیاں ہوئیں، اور وہ صحیح کر دی گئیں، لہٰذا اب آپ کی پوری زندگی میں کوئی دغدغہ نہیں، اور آپ کے اجتہادات بالکل صحیح ہیں، اور وہ قرآن کی ایسی تشریح ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کی رضا سند ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہم بے کھٹکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی پیروی کر سکتے ہیں، اور وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (اعراف) کے مطابق ہدایت یاب ہو سکتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جس کو عصمت انبیاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور یہی وہ معصوم ہستیاں ہیں، جن کو منتخب کر کے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے نمونہ مقرر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نمونہ کو چھوڑ کر دوسرے کو نمونہ بنانا، اللہ تعالیٰ کے کام میں مداخلت بے جا ہے، اور یہی شرک فی الرسالت ہے، رسول کے اقوال و افعال پر اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے، اور بعض احکام براہ راست وحی کے ذریعہ رسول تک پہنچتے ہیں، لہٰذا رسول کا ہر قول و فعل وحی الٰہی ہوتا ہے، شریعت ہوتا ہے حکم الٰہی ہوتا ہے، اگر رسول کے اقوال و افعال کے علاوہ، یا ان کو چھوڑ کر دوسرے کے اقوال و افعال کو مشعل ہدایت بنایا جائے تو گویا ان کے اقوال و افعال کو احکام الٰہی کا درجہ دینا ہے، اور یہ شرک فی الحکم

ہے، اور شرک فی الرسالت ہے، تقلید کی بدعت بھی اسی شرک فی الرسالت و شرک فی الحکم کی ذیل میں آتی ہے۔

غلط فہمی "یہ فرض کر لینا کہ رسول اللہ صلعم ملکۂ اجتہاد سے عاری تھے، اور وحی کے بغیر نہ کچھ سوچ سکتے تھے نہ کچھ کر سکتے تھے، رسالت پناہ کی انتہائی توہین، اگر کوئی شخص آپ کے متعلق یہ کہدے، کہ آپ ہر معاملہ میں اپنے کسی دوست یا بیوی کے مشورہ پر چلتے ہیں، تو کیا آپ اسے اپنی توہین نہیں سمجھیں گے؟" (دو اسلام ص ۳۴۴ ص ۳۴۵)

ازالہ اگر کوئی شخص یہ کہدے، کہ یہ قرآن تو اللہ کا کلام ہے لیکن خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا بھی نہ ہو سکا، کہ کوئی ایسی جامع مانع کتاب تصنیف کر دیتے، جو دوسرے مصنفین کی تصنیف پر بھاری ہوتی، معلوم ہوا، کہ وہ خود تو نہ کچھ لکھ سکتے تھے نہ بول سکتے تھے، بس وحی کے تابع تھے، وحی آگئی تو بات کر لی" ماینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی" کا مصداق تھے، تو بتلایئے، کیا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قابلیت پر طنز نہ ہوگا، کیا اسے آپ کی توہین نہ تصور کیا جائے گا۔

برق صاحب! محض رنگ آمیزی سے کام نہیں چلتا حقیقت حقیقت ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا، یہ قرآن کی آیات آپ کے سامنے ہیں، یہ حقائق ہیں، ان کی رو سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بغیر وحی کے آپ بات ہی نہ کرتے تھے، اب اگر یہ توہین ہے، تو وہ بھی توہین ہے، کہ بغیر وحی کے آپ قرآن کی تشریح و تفصیل نہ کرتے تھے، برق صاحب بیوی کی راہ نمائی میں کام کرنا توہین ہو سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی کو توہین سمجھنا عقل سے بعید ہے، اللہ تعالےٰ کی راہ نمائی ہی تو رسول کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتی ہے، اور آپ اس کو توہین سمجھ رہے ہیں

تعجب ہے، کہ آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں، کہ آپ ہر کام صحابہ کے مشورہ سے کرتے تھے، اور اس کو توہین نہیں سمجھتے لیکن اگر کوئی دوسرا یہ کہتا ہے، کہ آپ ہر کام اللہ کے مشورہ سے کرتے تھے تو آپ اس کو توہین سمجھ لیتے ہیں، یعنی صحابہ کے مشورہ کا پابند تو قابل تعریف، اور اللہ تعالےٰ کے اشارات کا پابند قابل توہین، خدارا انصاف کیجیے۔

پھر ہم یہ کب کہتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملکۂ اجتہاد سے عاری تھے: ہم تو یہ کہتے ہیں، کہ آپ کے اجتہادات پر خدا کی نظر تھی، وہ اللہ تعالےٰ کو منظور تھے، لہٰذا وہ حجت شرعیہ ہیں، کہئیے اس میں کیا الجھن ہے؟

غلط فہمی "ہمارے علماء نے بھی سرورِ کائنات کے متعلق کچھ اس قسم کا تصور قائم کر رکھا ہے، کہ ان کا ہر قول وحی تھا، یعنی ردّ ملی مانگتے (آخر یہ بھی قول ہے) تو وحی کا انتظار کرتے، اگر یہ پوچھنا ہوتا، کہ "میرا دوسرا جوتا کہاں ہے" تو جبریل کی راہ دیکھتے رہتے، کہ وہ آئے، میرے لئے فقرہ تجویز کرے، اور میں بولوں" (دو اسلام ص۳۴۵)

ازالہ یہ غلط مبحث ہے، سوال ہے دینی احکام کا، قرآن کی تشریحات کا، اس سے ردّی مانگنے اور جوتا پوچھنے کا کیا تعلق ہے، احکام قرآنی کی تشریح میں آپ جو کچھ فرماتے تھے، وہ یا تو وحی قولی ہوتا تھا، یا وحی تقریری، اور ان وحیوں کے مجموعہ کو علماء دین نے وحی خفی کا نام دے دیا ہے، آپ چاہیں، تو خفی کے بجائے کچھ اور کہہ دیجیے، مگر بہر حال ہے وہ وحی۔

علماء کے متعلق برق صاحب کو غلط فہمی ہو گئی، علماء کا تو صرف اتنا تصور ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا اس کو دوہرا دیا، یہ تصور کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وحی تھا، اللہ تعالیٰ کے کلام سے ماخوذ ہے، اب آپ جو کچھ چاہیں، اللہ تعالیٰ کو کہیئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا	اور رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا، وہ
وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم)	جو کچھ بولتا ہے، وحی ہوتی ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وحی ہے، کہیئے اب بھی آپ کے ہر قول کو وحی ماننے سے انکار ہے۔

ہر مرتبہ جبریل کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ نے القا کیا وہی لفظ زبان پر آگئے، یہ بھی تو وحی کی ایک قسم ہے

برق صاحب کو یہ غلط فہمی ہو گئی، کہ وحی کی بس ایک قسم ہے یعنی قولی، حالانکہ وحی کی کئی قسمیں ہیں، قولی (الفاظ کا نزول)، فعلی (جبریل علیہ السلام کا کسی کام کو کر کے جانا، مثلاً نماز کا طریقہ اور اوقات نماز کی تعلیم اسی قسم میں شامل ہے)، تقریری (آپ کے تمام اجتہادات بعض فیصلے و تشریحات اسی کے ذیل میں آتے ہیں، برق صاحب کو غالباً اس وحی کا خیال نہیں رہا، ورنہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں)، القاء و الہام، خواب اور بالمشافہہ کلام بھی نبی کے لئے وحی کی قسمیں ہیں۔

غلط فہمی "قرآن کے بغیر حضور کو اور کسی ذریعہ وحی نہیں دی گئی تھی"

اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ ۔ تمہیں گناہوں سے بچانے کے لئے مجھے بذریعہ

لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ (قرآن) وحی یہ قرآن دیا گیا ہے (دو اسلام ص۳۴۶)

ازالہ برقی صاحب قرآن کی آیت تو آپ کی تائید نہیں کرتی، اگر کوئی یہ کہدے، کہ حضرت خالدؓ صحابی ہیں، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں، کہ حضرت جابرؓ صحابی نہیں، اسی طرح مذکورہ بالا آیت سے یہ تو ثابت ہوتا ہے، کہ قرآن وحی ہے، لیکن یہ کہاں ثابت ہوتا ہے، کہ "حدیث" وحی نہیں ہے بلکہ سورہ نجم کی آیات جو میں نے ابھی اوپر نقل کی ہیں، ان سے صاف یہ ثابت ہوتا ہے، کہ آپ کا ہر قول وحی ہے، لہٰذا حدیث بھی وحی ہے

برقی صاحب آخر ان آیات کے مضمون کو تسلیم کرنے سے آپ کیوں گریز کرتے ہیں، آخر یہ بھی تو قرآن کی آیات ہیں، آپ کہیں گے، کہ پھر آپ کے بعض قول غلط کیوں نکلے، میں کہتا ہوں کہاں نکلے قرآنی تشریحات میں آپ کا ایک قول بھی غلط نہیں نکلا، اور جو دو ایک اجتہادات یا فیصلے غلط نکلے وہ قرآنی تشریحات کے سلسلہ میں نہیں تھے، بلکہ اس سلسلہ میں قرآنی آیات کا نزول ہی بعد میں ہوا گویا کہ قرآنی قانون کی عدم موجودگی میں کیا ہوا فیصلہ غلط نکلا، نہ کہ قرآنی قانون کی روشنی میں کیا ہوا فیصلہ غلط نکلا۔

دوسرے یہ کہ جو غلط فیصلہ ہوا، وہ قائم کب رہا؟ اس کو برقرار کب رکھا گیا، فوراً اس کی تصحیح ہو گئی لہٰذا جو قول یا فیصلہ آپ کا برقرار رہنے دیا گیا، وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا، اور جو تصحیح کے بعد برقرار رکھا گیا وہ بھی صحیح ہوا، لہٰذا آپ کا ہر وہ قول جو باقی رہنے دیا گیا یا برقرار رکھا گیا وہ وحی ہے اور یہی ان تمام آیات میں تطبیق کی صورت ہے۔

تیسرے یہ کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہی، اس میں غلطی کا امکان نہیں، غلطی کا امکان صرف اجتہادات میں ہو سکتا ہے، اور ایسا صرف دو ایک مرتبہ ہوا، اور فوراً اس اجتہاد کو وحی تقریری کے ذیل سے نکال کر وحی جلی کی تحویل میں دے دیا گیا، اللہ تعالیٰ کی اس تنقیدی نظر کی وجہ سے آپ کے اجتہادات بھی غلطی سے پاک ہے اور اس طرح یہ اجتہادات مع دوسرے اقوال و افعال کے جو پہلے ہی غلطی سے پاک تھے دینی نمونہ قرار پائے،

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب) بے شک رسول اللہ کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

غلط فہمی

اس مضمون پر ایک مشتبہ سی حدیث بھی ملتی ہے،
ابوجحیفہ نے حضرت علی سے پوچھا، کہ آپ کے پاس قرآن کے بغیر کوئی اور وحی موجود ہے
فرمایا، خدا کی قسم اس صحیفہ کے بغیر اور اس فہم کے بغیر جو وحی کے متعلق ہر مسلمان کو حاصل ہے، ہمارے
پاس کوئی اور وحی موجود نہیں (بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۱۱)

میں نے اس حدیث کو مشتبہ اس لئے کہا، کہ اس میں حضرت علی رض قرآن کے بغیر ایک اور
صحیفہ کو بھی الہامی سمجھتے ہیں، نسائی میں اس صحیفہ کی تفصیل یہ دی ہوئی ہے، کہ حضور علیہ السلام
نے اہل بیت کے لئے چند خاص وصایا ارشاد فرمائی تھیں، جو اس صحیفہ میں درج تھیں اور
جسے حضرت علی رض نیام ذوالفقار میں رکھا کرتے تھے، علامہ صنعانی کہتے ہیں، کہ یہ وصایا جعلی
تھیں، اور ان کا واضع حماد بن عمرو النصیبی تھا، سیوطی فرماتے ہیں، کہ بعض وصایا عبداللہ بن زیاد
بن سمعان نے تراشی تھیں (تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۹۴ (دو اسلام صفحہ ۳۴۹ - صفحہ ۳۴۲)

ازالہ

برق صاحب یہ بھی کوئی انصاف ہے، کہ جہاں کوئی روایت آپ کے مفروضہ کے
خلاف ہوئی، آپ نے اسے مشتبہ کہہ دیا، حالانکہ یہ حدیث آپ کے مفروضہ
کہ خلفائے راشدین احادیث کو جلاتے رہے کے خلاف نص قاطع ہے، اور آپ کے اس
مفروضہ کے بھی خلاف ہے، کہ ڈھائی سو سال تک احادیث لکھی نہیں گئیں۔

برق صاحب نے جو عبارت بحوالہ نسائی لکھی ہے، در حقیقت اس میں یہ عبارت سرے
سے ہے ہی نہیں، معلوم نہیں برق صاحب نے نسائی کا حوالہ کیسے دے دیا ہے، نسائی میں البتہ
اس صحیفہ صحیحہ کا ذکر موجود ہے، جو حضرت علی نے خود مرتب فرمایا تھا، اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کا منظور شدہ تھا، نسائی میں اس صحیفہ کا ذکر جو وصایائے نبوی کے نام سے موسوم ہے قطعاً نہیں ہے
یہ صحیفہ بے شک جعلی ہے، صحیفہ "وصایائے نبوی" حضرت علی رض کا لکھا ہوا نہیں ہے، بعد میں کسی
شخص نے وضع کیا ہے۔

تذکرۃ الموضوعات جس کا حوالہ برق صاحب نے دیا ہے، اس میں بھی "وصایائے نبوی" ہی کا
ذکر ہے، اس ہی صحیفہ "وصایائے نبوی" کو تذکرۃ الموضوعات کے مصنف نے جعلی کہا ہے، اس صحیفہ
کے جعلی ہونے سے وہ صحیفہ جو خود حضرت علی نے لکھا تھا کیسے جعلی ہو سکتا ہے، وہ تو کتب صحاح میں
موجود ہے، اور "وصایائے نبوی" کتب صحاح کے مؤلفین ہی کے نزدیک جعلی ہے، کمال ہو گیا، کہ
برق صاحب نے دونوں کو ایک سمجھ لیا۔

غلط فہمی "بہر حال اس حدیث سے اتنا تو واضح ہو گیا، کہ قرآن اور اس صحیفہ کے بغیر کوئی اور وحی موجود نہیں اس لئے احادیث کو وحی خفی کہنا نہ عقلاً درست ہے، اور نہ نقلاً" (دو اسلام ص ۳۲۴)

ازالہ حضرت علی رضہ کے متعلق سبائی جماعت نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ ان کے پاس وصایا نبوی ہیں، جو اور مسلمانوں کے پاس نہیں ہیں، اور یہ بھی مشہور کر دیا تھا کہ حضرت علی رضہ تمام مسلمانوں میں کوئی ممتاز مقام رکھتے ہیں، اسی شبہ کو دور کرنے کے لئے لوگوں نے آپ سے سوال کیا، مثلاً ابو جحیفہ سوال کرتے ہیں:۔

ھل عندکم کتاب قال لا الا کتاب اللہ او فھم اعطیہ رجل مسلم او ما فی ھذہ الصحیفۃ (صحیح بخاری، کتاب العلم)	کیا آپ (اہل بیت) کے پاس کوئی کتاب ہے، حضرت علی رضہ نے جواب دیا نہیں سوائے کتاب اللہ کے، اور اس فہم کے جو ہر مسلم کو ملتا ہے، اور جو کچھ اس صحیفہ میں ہے (پھر انہوں نے اس صحیفہ کی احادیث سنائیں)

ابو ابراہیم تیمی کے سوال پر حضرت علی جواب دیتے ہیں:۔

ماعندنا الا کتاب اللہ وھذہ الصحیفۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (صحیح بخاری باب حرم المدینۃ)	ہمارے پاس کچھ نہیں سوائے کتاب اللہ کے، اور اس صحیفہ کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجھے دستیاب ہوا ہے۔

جس حدیث کا ترجمہ برق صاحب نے نقل فرمایا ہے، اس میں بھی یہ سوال ہے:۔

ھل عندکم شئ من الوحی الا ما فی الکتاب (صحیح بخاری)	آپ (اہل بیت) کے پاس کتاب اللہ کے علاوہ بھی کوئی وحی ہے۔

حضرت علی نے جواب دیا، "نہیں سوائے کتاب اللہ کے، اور اس صحیفہ احادیث کے" یعنی یہ جو مشہور ہو گیا تھا، کہ اہل بیت کو وحی کی ایک خاص قسم عطا ہوتی ہے، جو عام مسلمانوں کو نہیں ملی، حضرت علی رضہ اس کی تردید فرما رہے ہیں، کہ ہمارے پاس کوئی چیز نہیں، سوائے کتاب اللہ کے، اور اس صحیفہ کے، اور اس صحیفہ میں فلاں فلاں احادیث ہیں، یعنی کوئی خاص چیز ہمارے پاس نہیں ہے، علامہ سندھی لکھتے ہیں۔

الخطاب لاھل البیت والمراد	یہ خطاب اہل بیت سے ہے، اور مراد

هل عندکم علم مخصوص بکم مکتوب اولا خصکم النبی صلی اللہ علیہ وسلم بہ کما یقول	یہ ہے، کہ کیا اہل بیت کو کسی علم کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، جیسے کہ شیعہ کہتے ہیں۔

الشیعۃ (بخاری کتاب العلم حاشیہ صنۃ ۲)

یہ غلط بات جو سبائی جماعت نے تراش لی تھی، اس کے متعلق لوگ اپنے شبہات دور کرنے کے لئے سوال کر رہے تھے، حضرت علی رضہ نے خطبہ دیا، اور اس کی تردید کر دی، فرمایا۔

من زعم ان عندنا شیئا نقرأہ الا کتاب اللہ وھذہ الصحیفۃ فقد کذب (صحیح مسلم باب فضل المدینۃ)	جو شخص یہ دعوی کرتا ہے، کہ ہمارے پاس کوئی خاص کتاب ہے، جس کو ہم پڑھتے ہیں، سوائے کتاب اللہ اور اس صحیفہ کے وہ جھوٹ کہتا ہے۔

مالک اشتر کہتے ہیں، میں نے حضرت علی رضہ سے کہا:۔

ان الناس قد تشغع بھم ما یسمعون فان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عھد الیک عھد فحدثنا بہ قال ما عھد الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یعھدہ الی الناس غیر ان فی قراب سیفی صحیفۃ (نسائی ج ۲ کتاب الدیات)	لوگ جو سنتے ہیں اس کی اشاعت کرتے ہیں پس اگر واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خاص وصیت آپ کو کی ہے، تو ہمیں بتا دیجئے، حضرت علی نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایسی کوئی بھی وصیت نہیں کی، جو دوسرے لوگوں کو نہیں کی، سوائے اس کے کہ میری تلوار کے دستہ میں ایک صحیفہ ہے۔

پھر حضرت علی نے اس صحیفہ کا مضمون سنایا، یہ مضمون بھی کتب صحاح میں محفوظ ہے، اس میں وہی احادیث تھیں، جو دوسرے مسلمانوں کے پاس بھی موجود تھیں

اس تمام بیان سے واضح ہوا، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان وصایا ئے مخصوصہ کا انکار کر رہے ہیں، جو ان کے پاس نہیں تھیں، لیکن لوگ کہتے تھے، کہ ہیں، اس انکار اور تردید کے باوجود ان کی وفات کے بعد کسی مفتری نے یہ "وصایا ئے نبوی" گھڑ لیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف ان کو منسوب کر دیا۔

بہر حال اس حدیث سے بھی ثابت ہوا، کہ حضرت علی رضؓ احادیث کو بھی وحی سمجھا کرتے تھے کیونکہ وحی کی ذیل ہی میں انہوں نے اس صحیفہ احادیث کا تذکرہ فرمایا تھا، اور سوال میں بھی وحی کے متعلق ہی سوال تھا، برق صاحب! حدیث کے ایک ٹکڑے سے استدلال کرنا، اور دوسرے کا جو آپ کے خلاف ہو انکار کر دینا انصاف سے بعید ہے، غور کیجئے گا۔

غلط فہمی "ایک سلیم الفطرت مسلمان کا وطیرہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر ایسی حدیث کو تسلیم کرے جو قرآن سے متعارض نہ ہو خواہ وہ بخاری میں ہو، یا کسی مسند میں، اور ہر ایسی حدیث کو بلا دریغ ٹھکرا دے، خواہ وہ بخاری ہی میں ہو، جو . . . . ." (دو اسلام)

ازالہ محض قرآن سے متعارض نہ ہونا صحت کی دلیل نہیں، مثلاً "ہر نماز میں سورہ اخلاص پڑھا کرو" یہ قرآن سے متعارض نہیں ہے، تو کیا یہ حدیث ہو جائے گی۔

صحت احادیث کے لئے برق صاحب کے تجویز کردہ معیار
قرآن کی روشنی میں

کتاب دو اسلام کے ختم کرنے سے پہلے برق صاحب نے حدیث کو پرکھنے کے لئے چند معیار درج فرمائے ہیں، ان معیاروں کا سلسلہ وار جواب درج ذیل ہے، لیکن جواب سے پہلے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ

سوال اگر ان معیاروں پر قرآن مجید بھی پورا نہ اترے، تو پھر یہ معیار سچے ہیں، یا قرآن؟ اگر قرآن سچا ہے، اور درحقیقت قرآن ہی سچا ہے، تو پھر یہ معیار یقیناً باطل ہیں، اور ان میں سے کسی معیار کو حتمی سمجھ کر حدیث کو پرکھنا سراسر ظلم ہے۔

برق صاحب کا تجویز کردہ پہلا معیار

"تعلیمات قرآنی کے منافی ہونا" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جو حدیث تعلیمات قرآنی کے منافی ہوگی، وہ حدیث جعلی ہوگی، یہ معیار اگرچہ صحیح ہے لیکن اس میں تفصیل ہے، مثلاً قرآن ہر مردار کو حرام کرتا ہے، لیکن حدیث میں ہے، کہ مردار مچھلی حلال ہے، تو کیا یہ حدیث قرآن کے منافی کہلائے گی، نہیں بلکہ قرآنی حکم عام کو خاص کرنے والی کہی جائے گی، لہٰذا یہ حدیث موضوع نہیں ہوگی۔

پھر اس اصول و معیار کو کلیتہً تسلیم کرنے سے ایک اور امر بھی مانع ہے، وہ یہ کہ کوئی نفسر پرور اٹھے اور قرآن کی کسی آیت کے معنی اپنے رنگ میں کرلے، اور جب اس سے کہا جائے کہ حدیث میں اس طرح ہے، تو وہ فوراً کہہ دے، کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے لہٰذا جعلی ہے میں اسے نہیں مانتا، حالانکہ وہ حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہوگی، بلکہ اس کے مخترعہ معنوں کے خلاف ہوگی۔

مثلاً کراچی میں ایک فرقہ ابھی نکلا ہے، جو "لقمانی" کہلاتا ہے، اس فرقہ کے بانی سید رضا لقمان ابھی زندہ ہیں۔ اس فرقہ کا عقیدہ ہے، کہ حضرت جبرئیل رسول اعظم بن کر آنے والے ہیں، جب ان کے ایک مبلغ کے سامنے میں نے "خاتم النبیین" والی آیت پڑھی، تو اس مبلغ نے جواب دیا کہ بیشک

اس آیت کی رو سے نبی ختم ہو گئے لیکن رسول ختم نہیں ہوئے، رسول آتے رہیں گے، میں نے حدیث پڑھی، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ رسالت اور نبوت دونوں منقطع ہو گئیں، اب میرے بعد نہ کوئی رسول بن سکتا ہے، نہ نبی، تو وہ مبلغ کہنے لگے، کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے قرآن میں تو رسول کے آنے کا ذکر ہے، لہٰذا یہ حدیث موضوع ہے، اب قرآن کی جس آیت کو انہوں نے اپنی دلیل میں پیش کیا، وہ یہ ہے، اور جو ترجمہ انہوں نے کیا، وہ بھی آیت کے مقابل درج ہے

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ	اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر
الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ	ہیں، یہ باز نہیں آ سکتے، جب تک ان کے
حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُولٌ مِّنَ	پاس دلیل نہ آئے، یعنی اللہ کا رسول جو پاک
اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (بینہ)	صحیفے پڑھتا ہو۔

اب تک مسلمان اس کا مطلب یہ سمجھتے رہے ہیں، کہ یہ کافر باز آنے والے نہیں تھے، جب تک ان کے پاس اللہ کا رسول نہ آتا، تو گویا اب آگیا، تو یہ لوگ باز آ گئے، گویا تمام مسلمانوں کے نزدیک اس آیت میں رسول سے مراد حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کے آنے سے بہت سے کافر اپنے کفر سے باز آ گئے، وہ مبلغ کہنے لگے، کہ سب کافر کہاں باز آئے، اور آیت میں یہ ہے، کہ سب باز آ جائیں گے، لہٰذا کوئی ایسا رسول آنا چاہیئے، جس کے آنے کے بعد سب باز آ جائیں اور یہ رسول سب سے بڑا رسول ہو گا، یعنی "رسول اعظم" اور یہ خود حضرت جبریل علیہ السلام ہوں گے، یہ تھا، ان کا مخترعہ مطلب، اور اس مطلب کے خلاف حدیث پڑھنا، گویا گھڑی ہوئی حدیث پڑھنا ہے کیونکہ وہ قرآن کے خلاف ہے، حالانکہ درحقیقت حدیث قرآن کے خلاف نہیں، بلکہ ان کے ایجاد کردہ معنی کے خلاف ہے۔

تیسری بات، جو اس سلسلہ میں مجھے عرض کرنی ہے، وہ یہ کہ اس معیار پر تو قرآن کی بعض آیات بھی پوری نہیں اترتیں، مثلاً قرآن کی تعلیم یہ ہے، کہ قرآن لوگوں کے لئے ہدایت ہے، لیکن ایک آیت میں ہے، کہ:۔

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا (البقرۃ) اللہ اس کے ذریعہ بہت لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے

یعنی قرآن ذریعہ گمراہی بھی ہے، اور یہ قرآنی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے، کہ قرآن لوگوں کو گمراہ کرے، لہٰذا یہ آیت معیار پر پوری نہیں اترتی، تو اس آیت کے متعلق کیا کہیں۔

(۲) قرآن مجید میں متعدد جگہ حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے، ہر جگہ یہی ہے، کہ

ابلیس فرشتہ نہ تھا، مثلاً :-

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ (البقرۃ) — جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے

لہٰذا اس آیت اور اس جیسی اور کئی آیات سے ثابت ہوا، کہ ابلیس فرشتہ نہ تھا، یہ ہے تعلیمات قرآنی اب اس تعلیمات قرآنی کے خلاف ہمیں یہ آیت ملتی ہے۔

کَانَ مِنَ الْجِنِّ (الکہف) — ابلیس جنوں میں سے تھا۔

بتائیے، کیا یہ آیت بھی قرآنی تعلیمات کے منافی ہونے کی وجہ سے جعلی ہو گئی ؟

(۴) اللہ تعالٰے کا کام ہدایت کرنا ہے، اور اس نے اپنے ذمہ اس کو فرض کر لیا ہے، اللہ تعالٰے فرماتا ہے :-

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی (واللیل) — ہدایت دینا ہمارے ذمہ واجب ہے

تو گویا تعلیمات قرآنی کا مسلمہ اصول ہے، کہ اللہ تعالٰے ہدایت کرتا ہے، گمراہ نہیں کرتا، اب یہ آیت سنیئے :-

اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَھْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ (النساء) — کیا تم اس کو ہدایت کرنا چاہتے ہو جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا۔

گویا یہ آیت بھی معیار پر پوری نہیں اترتی، اس لئے کہ اس میں اللہ کو گمراہ کرنے والا بتایا گیا ہے، اسی قسم کی یہ آیت ہے۔

وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ (الانعام) — اور جس کو اللہ تعالٰے گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے گویا ہدایت پر آنا اس کے لئے اتنا مشکل ہو جاتا ہے، جتنا آسمان پر چڑھنا۔

یہ آیت بھی تعلیمات قرآنی کے خلاف ہے، بھلا وہ رحمٰن و رحیم اللہ، جو ہزارہا انبیاء کو لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجے، وہ ایسا کر سکتا ہے، کہ بعض لوگوں کو خود ہی ہدایت سے روک دے اور ان کے سینے کو ایسا تنگ کر دے، کہ ہدایت پر آنا ان کے لئے ناممکن ہو جائے۔

(۵) قرآن کی تعلیمات یہ ہے

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ — اللہ تعالٰے کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

یعنی وہ بے مثل ہے، لاثانی ہے، بے جسم ہے، اس کو جسم والوں سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی اب یہ آیت سنیئے:۔

بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوطَتٰنِ — اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے، کہ وہ کوئی جسم رکھتا ہے، جس میں ہماری طرح دو ہاتھ ہیں، لہٰذا یہ آیت سراسر شان الوہیت اور قرآنی تعلیمات کے منافی ہے، اب اس آیت کو کیا کہیں؟ کیا وہی الفاظ استعمال کر سکتے ہیں، جو ایسی حدیث کے متعلق برق صاحب استعمال فرما رہے ہیں، اس قسم کی تقریباً سو آیات میں پیش کر سکتا ہوں، جو تعلیمات قرآنی کے خلاف نظر آتی ہیں، تو کیا وہ اس مجوزہ معیار پر پوری نہ اترنے کے باعث جعلی کہی جاسکتی ہیں، اور اگر جعلی نہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے، تو پھر یہ معیار جعلی ہے، باطل ہے، کلیہ بنانا محض دھوکا ہے، اور اگر ان آیات کا با وجود قرآنی تعلیمات کے منافی ہونے کے کوئی مقام ہے، اور کوئی مطلب ہے، تو وہی مقام اور وہی مطلب حدیث کے لئے بھی ہو سکتا ہے، یہ کیا، کہ اگر آیت معیار پر نہ اترے، تو تاویل کر کے اس کو تعلیمات قرآنی کے مطابق بنا لیا جائے، اور حدیث پوری نہ اترے، تو اسے مسترد کر دیا جائے، کیا یہ انصاف ہے،

(۲) برق صاحب کا مجوزہ دوسرا معیار

قرآن میں تحریف

برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جو حدیث قرآن میں تحریف تسلیم کرتی ہو، وہ جعلی ہے، لیکن یہ معلوم نہیں، کہ تحریف سے برق صاحب کی کیا مراد ہے اگر یہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جو قرآن تھا، بعد میں اس میں تحریف ہو گئی تو اس تحریف کی خبر دینے والی حدیث یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تو ہو گی نہیں، کسی اور کا قول ہو گا، اور اس معیار کی زد میں وہ قول آئے گا، نہ کہ حدیث، لہٰذا اس معیار سے حدیث کو پرکھنا کسی حالت میں صحیح نہیں ہو سکتا۔

اور اگر برق صاحب کا یہ مطلب ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں قرآن میں تحریف ہوئی، اور اس سے مراد ان کی یہ ہے، کہ قرآن کی بعض آیات منسوخ ہو گئیں، تو بے شک یہ چیز حدیث میں ملتی ہے، اور وہ حدیث صحیح ہے، یہ معیار صحیح نہیں، وجہ یہ ہے کہ جس نبی نے یہ کہا، کہ اس آیت کو قرآن کی آیت سمجھو، اور تلاوت کرتے رہو، اگر وہی نبی یہ کہے، کہ اب یہ آیت منسوخ ہو گئی، اس کی تلاوت منسوخ کر دو، تو کیا وجہ ہے، کہ ہم اسے سچا نہ سمجھیں، اگر آپ کہیں، کہ نبی

ایسا کہہ ہی نہیں سکتا، یہ تو بعد میں لوگوں نے اس کی طرف منسوب کر دیا ہے، تو اس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے، پھر اس معیار پر تو بعض آیات قرآنی بھی نہیں اترتیں، مثلاً

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا — جب ہم کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، تو اس سے بہتر یا اسی کے مثل نازل کر دیتے ہیں۔ (البقرۃ)

اگر آپ یہ فرمائیں، کہ اس سے مراد قرآنی آیت نہیں، بلکہ شریعت ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر آپ یہ مان لیجیے، کہ تورات و انجیل منسوخ ہو گئیں، یا بھلا دی گئیں لیکن یہ آپ بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ آپ تو یہ کہتے ہیں، کہ تورات و انجیل محفوظ ہیں، اور غیر منسوخ ہیں، اور صرف تورات یا انجیل پر ایمان لاکر، اور اس پر عمل کر کے انسان نجات پا سکتا ہے، قرآن پر ایمان لانے کی، اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں، اب اس اشکال کو آپ کیسے دفع کریں گے، پھر یہ بھی تو بتایئے، کہ آیت کے معنی شریعت کرنا کس دلیل سے ہے، کیا اللہ تعالےٰ کو شریعت کا لفظ معلوم نہ تھا، جو آیت کا لفظ استعمال کیا، لہٰذا اس بات کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں، کہ آیت سے مراد قرآنی آیت ہے اور یہ کہ وہ منسوخ بھی ہو سکتی ہے، اور بھلائی بھی جا سکتی ہے، تو کیا اب اس آیت کو بھی جعلی کہہ سکتے ہیں، جس سے قرآنی آیات کا نسخ اور طاق نسیاں ہونا ثابت ہوتا ہے، دوسری آیت ملاحظہ فرمایئے:۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ — (اے رسول) ہم آپ کو پڑھائیں گے پس آپ نہیں بھولیں گے، سوائے اس کے جو اللہ ہی آپ کو بھلانا چاہے (الاعلیٰ)

اس آیت سے بھی قرآنی آیات میں کمی بیشی ہونے کا امکان پایا جاتا ہے، اب بتایئے، کیا یہ آیت بھی جعلی ہے؟ کیونکہ اس سے تحریف کا امکان ثابت ہوتا ہے، اس قسم کی اور بھی آیات ہیں جن سے قرآنی آیات کا نسخ ثابت ہوتا ہے، تو کیا ان سب کو جعلی کہا جائے گا، اگر نہیں تو کیوں؟ کیا یہ معیار غلط ہے۔

آخر میں اتنا اور عرض کرتا ہوں، کہ اصطلاح شریعت میں تحریف اس تغیر و تبدل کا نام ہے جو بعض لوگ کتب الٰہیہ میں کرتے رہتے ہیں، لیکن جو تغیر و تبدل اللہ تبارک و تعالےٰ خود کر دے، وہ تحریف کی تعریف میں نہیں آتا، لہٰذا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں، کہ اللہ تعالےٰ نے

فلاں آیت یا حکم منسوخ کر دیا، تو یہ تحریف نہ ہوگی، اس کو تحریف کہنا ہی غلطی ہے۔

(۳) برق صاحب کا مجوزہ تیسرا معیار

رسول اکرم، ازواج مطہرات، اور صحابہ کرام کی توہین برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، یا کسی زوجہ مطہرہ یا کسی صحابی کی توہین ہو، وہ حدیث موضوع ہوگی، میں پوچھتا ہوں، اگر یہ معیار درست ہے، تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں، کہ اس معیار پر قرآن پورا اترتا ہے، ہرگز نہیں ملاحظہ فرمایئے:۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین اور قرآن مجید اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰى۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (عبس) — رسول نے تیوری چڑھائی، اور منہ پھیر لیا جب کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا۔

لیجئے کیا اس آیت میں شانِ رسالت کی توہین نہیں، کہ اخلاق کریمانہ کے مجسمہ کو بداخلاق بنایا گیا ہے، پھر یہ آیت قرآنی تعلیمات کے بھی خلاف ہے، قرآن کی تعلیم اس آیت میں بیان ہوئی ہے، جو درج ذیل ہے:۔

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم) — اے رسول آپ کے اخلاق عظیم الشان ہیں

لہٰذا سورہ عبس کی مذکورہ بالا آیات دو طرح سے محل نظر ہے، اول توہین رسول کے لحاظ سے دوم قرآنی تعلیم یعنی سورہ قلم کی مذکورہ بالا آیت سے متعارض ہونے کے لحاظ سے۔

(۲) يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ (التحریم) — اے نبی تم اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو کیوں حرام کرتے ہو، تم اپنی بیویوں کی رضا کے متلاشی ہو۔

کیا اس آیت میں توہین رسول نہیں ہے، وہ یہ کہ اللہ کا مقدس رسول محض اپنی بیویوں کی رضا کی خاطر شریعت بدل دیا کرتا تھا، حلال کو حرام کر دیا کرتا تھا، پھر بیویوں کی رضا کا طالب اور جویا ہونا یہ خود بھی ایک معیوب سی بات ہے۔

(۳) اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا — ہم نے آپ کو فتح مبین دے دی ہے تاکہ

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (الفتح) — اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ (محمد) — اپنے گناہوں کی معافی مانگیے

تیسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (اذا جاء) — اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیے، بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے

ان تینوں آیات کا خلاصہ یہ ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ گنہ گار تھے، کیا یہ توہین نہیں، اگر ہے تو بتایئے ان آیات کے متعلق کیا خیال ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی توہین اور قرآن مجید

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

عَصٰى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوٰى (طٰہٰ) — آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی، اور گمراہ ہو گئے

وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (طٰہٰ) — ہم نے آدم میں عزم نہیں پایا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توہین اور قرآن مجید

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے بت توڑ ڈالے تو کفار نے پوچھا:۔

أَأَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِآلِهَتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ (الانبیاء) — اے ابراہیم ہمارے بتوں کے ساتھ یہ معاملہ تم نے کیا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا:۔

بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هٰذَا (الانبیاء) — نہیں، بلکہ یہ کام اس بڑے بت نے کیا ہے

یعنی ابراہیم علیہ السلام نے خلاف واقعہ بات کہی، بتایئے ابراہیم علیہ السلام کی طرف کذب کی نسبت کرنا، ان کی توہین نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توہین اور قرآن مجید

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے دیکھا، ایک ان کی قوم کا فرد تھا، اور دوسرا دوسری قوم کا فرد تھا۔

فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَکَزَهٗ مُوْسٰی فَقَضٰی عَلَیْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ (القصص)

ان کی قوم کے آدمی نے موسیٰ علیہ السلام کی دشمن قوم کے آدمی کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی، پس موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ایسا مکا مارا کہ اس کا کام تمام ہو گیا موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ شیطانی کام ہے

گویا موسیٰ علیہ السلام حمیت قومی کے جذبہ میں سرشار تھے بے سوچے سمجھے، بغیر تحقیق کئے انہوں نے دوسرے آدمی کو مار ڈالا، بعد میں پچھتائے، اور اپنے اس فعل کو شیطانی فعل سمجھے، کیا اس آیت میں ان کی توہین نہیں ہے۔ اور سنیئے:۔

وَاَلْقَی الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗ اِلَیْهِ (الاعراف)

موسیٰ علیہ السلام نے تورات کو پٹخ دیا، اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کا سر پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔

حضرت ہارون علیہ السلام بالکل بے قصور تھے، انہوں نے کہا۔

لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ (طٰہٰ) میرے سر اور داڑھی کو نہ پکڑیئے۔

میں بالکل بے قصور ہوں، انہوں نے میرا کہا نہ مانا، اور بچھڑا پوجا وغیرہ وغیرہ، کہیئے کیا ان آیات میں موسیٰ علیہ السلام کی توہین نہیں ہے، کہ غصہ میں آ کر کتاب الٰہی کو دے پٹخا، اور اللہ کے ایک مقدس پیغمبر کو مارا، اس کی بے عزتی کی، اور یہ سب کچھ بغیر تحقیق و تفتیش کے کر ڈالا۔

حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کی توہین اور قرآن مجید

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (یوسف)

یوسف علیہ السلام نے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور وہ سب حضرت یوسف کیلئے سجدہ میں گر گئے

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ ماں باپ نے بھی بیٹے کو سجدہ کیا، پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:۔

یٰاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ (یوسف) اے ابا جان یہ میرے خواب کی تعبیر ہے۔

بچپن میں انہوں نے خواب میں دیکھا تھا، کہ گیارہ تارے اور سورج و چاند ان کو سجدہ کر رہے ہیں

تو یہ گویا اس خواب کی تعبیر تھی، سورج سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام، چاند سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ محترمہ، اور گیارہ تاروں سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی تھے کمال ہو گیا، ایک رسول نے دوسرے رسول کو سجدہ کیا، بلکہ رسول نے اپنے بیٹے کو سجدہ کیا، کیا یہ ان انبیاء کی توہین نہیں، کہ نعوذ باللہ اس قسم کے شرک کا ارتکاب کرتے رہے، کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے دور میں جو سجدہ بادشاہ کو کیا جاتا تھا، اس کا ماخذ یہی قرآنی آیات تھیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کی توہین اور قرآن مجید حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے مقابلہ میں فرمایا:۔

لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ

کاش مجھے تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی، یا میں کسی مضبوط قلعہ میں پناہ گزین ہوتا۔

کیا یہ توہین نہیں ہے، کہ اللہ کا نبی بجائے اللہ کا سہارا ڈھونڈھنے کے دنیاوی وسائل کا سہارا تلاش کر رہا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی توہین اور قرآن مجید اللہ تعالےٰ فرماتا ہے، کہ جب ایوب علیہ السلام مبتلائے مصیبت ہوئے تو انہوں نے فرمایا:۔

اِنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ (ص)

مجھے شیطان نے اس مصیبت اور عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔

کیا شیطان کا یہ تسلط توہین رسول نہیں ہے؟

خلاصہ الغرض ان آیات اور ان جیسی دوسری آیات سے جن کو بخوف طوالت قلم انداز کر رہا ہوں) توہین انبیاء ظاہر ہو رہا ہے، کوئی اللہ کی نافرمانی کر رہا ہے، کسی کا جھوٹ بولنا ثابت ہو رہا ہے، کوئی حمیت قومی میں سرشار، کوئی کتاب الٰہی اور رسول اللہ کی توہین و تذلیل کرتا نظر آ رہا ہے کوئی غیر اللہ کو سجدہ کرتے دکھایا گیا ہے، کوئی اللہ کے بجائے قوت اور قلعہ کی پناہ تلاش کر رہا ہے کوئی اپنے اوپر شیطان کا تسلط تسلیم کر رہا ہے، کوئی سانپ سے ڈر کر بھاگ رہا ہے، کوئی انسانوں سے ڈر رہا ہے، کوئی کسی کی جدائی میں روتے روتے بینائی کھو دیتا ہے، کوئی گھوڑوں کو دیکھتے دیکھتے نماز عصر کھو دیتا ہے، کوئی ہر وقت عبادت خانہ میں مصروف عبادت ہے، کوئی بغیر اجازت کفار کی بستی چھوڑ کر ہجرت کر جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ کہیے ان آیات کے متعلق کیا خیال ہے؟

ازواج مطہرات کی توہین اور قرآن مجید

دو ازواج مطہرات کے بارے میں قرآن کہتا ہے :-

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا (التحریم)

اگر تم توبہ کر دو تو اچھا ہے اس لئے کہ تمہارے دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔

تمام ازواج مطہرات کے متعلق قرآن کا بیان سنیئے :-

إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَ أُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (الاحزاب)

اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کی خواہش مند ہو، تو آؤ میں تم سب کو مال و دولت دے کر اچھی طرح رخصت کر دوں۔

گویا ازواج مطہرات نے کوئی نہ کوئی بات دنیا طلبی کی کی ہوگی، یہ وہ عورتیں ہیں جن کے متعلق قرآن ہی کہتا ہے :-

لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (احزاب) تم کسی عورت کے مثل نہیں ہو۔

یعنی یہ وہ جماعت ہے جو تمام عورتوں سے افضل ہے، ان میں ہی وہ زوجہ مطہرہ صدیقہ بھی شامل ہیں، جو دنیا کی بہترین عورت ہیں، کیا یہ آیات جن سے ازواج مطہرات رضی اللہ تعالےٰ عنہن کی طمع، دنیا طلبی، اور قلوب کی کجی ظاہر ہوتی ہے، قرآن ہی کی آیات ہیں، اور اگر یہ آیات قرآن ہی کی آیات ہیں، تو برق صاحب کا مجوزہ معیار غلط ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم کی توہین اور قرآن مجید

اللہ تبارک و تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (آل عمران)

اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا، جب تم اس کے حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے نامردی دکھلائی، اور حکم رسول میں اختلاف کیا، اور خاطر خواہ فتح آجانے کے بعد تم نے اس کی نافرمانی کی تم میں سے بعض دنیا کے طالب اور بعض آخرت کے طالب ہیں۔

یہ جنگ احد کا بیان ہے، اور اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ سب مسلمانوں ہی کے متعلق ہے اس لئے کہ منافقین تو لڑائی میں شریک ہی نہیں ہوئے تھے، وہ تو لڑائی سے پہلے ہی مدینہ منورہ واپس چلے آئے تھے، اور اس نافرمانی اور دنیا طلبی کی وجہ سے جو مصیبت آئی تھی، اس میں وہ شریک نہیں تھے، اس مصیبت کا ذکر مذکورہ بالا الفاظ کے آگے سورہ آل عمران ہی میں بیان ہوا ہے

(۲) إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ (آل عمران)

تم میں سے جن لوگوں نے میدان جنگ سے منہ موڑا، یہ اس لئے ہوا، کہ شیطان نے ان کے بعض گناہوں کے سبب ان کو بہکا دیا اور تحقیق اللہ نے انہیں معاف کر دیا، بے شک اللہ غفور اور حلیم ہے

گناہ کئے شیطان نے بہکایا، میدان چھوڑ کر بھاگ گئے، یہ سب کچھ صحابہ نے کیا، اور پھر مزہ یہ کہ اللہ نے بغیر توبہ کے معاف کر دیا، اور برق صاحب یہ فرماتے ہیں، کہ اللہ تعالے معاف ہی نہیں کرتا، اگر آپ کہیں کہ سزا دے کر معاف کر دیا، تو پھر وہ معافی ہی کیا ہوئی، سزا دے کر معاف کرنا بھی کوئی معافی ہے۔

(۳) ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (آل عمران)

پھر اللہ نے غم کے بعد امن نازل فرمایا، ایک اونگھ نے تم میں سے ایک جماعت کو ڈھانک لیا اور تم میں سے ایک جماعت کو اپنی جان کی فکر تھی، وہ اللہ تعالے کے متعلق جاہلیت کا گمان رکھتے تھے۔

(۴) وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا (الجمعة)

اور یہ لوگ جب کوئی تجارت یا تماشہ دیکھتے ہیں، تو اس کی طرف چلے جاتے ہیں، اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔

(۵) وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا ...... ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ (التوبة)

جب حنین کی لڑائی میں تم نے اپنی کثرت پر ناز کیا، اور پھر کوئی چیز تمہارے کام نہ آئی ...... پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔

(۶) اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (الانفال)	مومنین کی ایک جماعت جہاد سے نفرت کرتی تھی، وہ حق ظاہر ہو جانے کے بعد حق کے معاملہ میں اے رسول آپ سے جھگڑا کر رہے تھے، گویا ان کو آنکھوں دیکھے موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔

یہ ہے جنگ بدر میں صحابہ کی ایک جماعت کا نقشہ، برخلاف اس کے حدیث میں ہے کہ صحابہ نے کہا، ہم سمندر میں کود پڑیں گے، ایسا کریں گے، ویسا کریں گے، کون سی چیز ان دونوں میں صحابہ کے شایان شان ہے؟

(یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ منافقین اس جنگ تک وجود میں نہیں آئے تھے)

(۷) عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (البقرۃ)	اللہ تعالیٰ نے معلوم کر لیا، کہ تم اپنی جانوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے، پس اللہ رحمت کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہوا، اور تمہارا قصور معاف فرما دیا، اب تم عورتوں سے مل جل سکتے ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے، اس کی جستجو بھی کر سکتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ صحابہ کرام روزہ کی حالت میں جماع کر بیٹھتے تھے، ہم جیسے کمزور مسلمان اس قسم کے خیال سے بھی پناہ پکڑتے ہیں، وہ کیسے مسلمان تھے، کہ روزہ میں بار بار گناہ کر لیا کرتے تھے، کیا اس آیت میں توہین صحابہ نہیں؟ اگر ہے تو کیا یہ آیت معیار پر پوری اترتی ہے۔

(۸) فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (المائدہ)	موسٰے علیہ السلام کے صحابہ نے کہا اے موسٰے تم جاؤ، اور تمہارا رب تم دونوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔
(۹) اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (الاعراف)	موسٰی علیہ السلام کے صحابہ نے ایک قوم کو بت پوجتے دیکھ کر کہا، کہ ہمارے لئے ایسا خدا بنا دیجئے جیسا ان کا ہے تو موسٰی علیہ السلام نے کہا تم جاہل ہو

(۱۰) موسٰی علیہ السلام کے اصحاب نے بچھڑے کی پوجا کی، ہارون علیہ السلام نے منع کیا

تو کہنے لگے۔

لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى (طٰہٰ)

ہم تو اس کی پوجا ہرگز نہیں چھوڑیں گے، جب تک موسیٰ (علیہ السلام) نہ آجائیں

ایک رسول موجود ہے، اس پر ایمان لاچکے ہیں لیکن اس کا کہنا نہیں مانتے، اور بچھڑے کی پوجا میں مصروف ہیں، یہ ہے دو پیغمبروں کی صحبت میں رہنے والی جماعت!

(۱۱) موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کہ تم گائے ذبح کرو، تو کہنے لگے :-

اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (البقرۃ)

کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں

پھر اس کے بعد طرح طرح کے بچکانہ سوالات کیئے۔

(۱۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ کرام فرماتے ہیں۔

هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (المائدہ)

(اے عیسیٰ) کیا آپ کے رب میں استطاعت ہے، کہ ہم پر آسمان سے ایک دسترخوان نازل فرمادے۔

دیکھیے کتنا بچکانہ سوال ہے؟

خلاصہ کیا مندرجہ بالا آیات سے صحابہ کی توہین نہیں ہوتی، اگر یہ صحیح ہیں، تو کیا وجہ کسی حدیث میں کوئی ذرا سی بات بھی نظر آجائے، تو اسے جعلی سمجھا جائے، کیونکہ اس معیار پر قرآنی آیات بھی پوری نہیں اترتیں، لہٰذا یہ معیار ہی باطل ہے، نہ کہ آیات قرآنی۔

(۴) برق صاحب کا چوتھا مجوزہ معیار

"حقائق کونیہ کے خلاف ہونا" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جو حدیث حقائق کونیہ کے خلاف ہوگی، وہ موضوع ہوگی، اس سلسلہ میں بھی چند آیات قرآنی پیش کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمایئے :-

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (الانبیاء)

اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈی ہوجا، اور سلامتی والی بن جا۔

آگ کا کام جلانا ہے، اس کی خصوصیت گرم ہونا ہے، لہذا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ وہ اپنی حقیقت کو تیہ کے خلاف ٹھنڈی ہو اور جلائے نہیں، لہذا یہ آیت معیار پر پوری نہیں اترتی۔

(۲) اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (الطلاق) — اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور ان ہی کے مثل (سات) زمینیں

چونکہ زمین صرف ایک ہے، اور یہ ایک کرہ ہے، جو سورج کے گرد گردش کرتا ہے، لہذا سات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا وَاَغْطَشَ لَیْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا۔ (النازعات) — کیا تم زیادہ مضبوط ہیں یا آسمان، اللہ نے اس کو بنایا، پھر اس کی چھت کو بلند کیا، پھر اس کو ہموار کیا، اور اس کی رات کو ڈھانک دیا اور اس کے دن کو نکال دیا۔

دن اور رات تو سورج کے گرد زمین کے گھومنے سے بنتے ہیں، آسمان کے دن اور رات کہاں سے آ گئے

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (الطارق) — قسم ہے آسمان کی جو چکر لگاتا ہے، یا جس سے بارش ہوتی ہے۔

خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (ملک) — اللہ نے سات آسمان اوپر تلے بنائے

بلحاظ جدید سائنس آسمان کوئی چیز نہیں محض حد نگاہ ہے، لہذا اس کا سات ہونا، یا چکر لگانا کیا معنی رکھتا ہے۔

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ (الذاریات) — اور ہم نے زمین کو بچھایا، پس ہم کیسے اچھے بچھانے والے ہیں۔

زمین تو ایک کرہ ہے، لہذا بچھانا کس حد تک صحیح ہے؟

(۶) وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ (الصافات) — اور ستاروں کو سرکش شیاطین سے بچاؤ کا سبب بنایا

کیا جدید سائنس بھی یہی کہتی ہے۔

(۷) وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ (الکہف) — ذوالقرنین نے سورج کو کیچڑ کے ایک چشمہ میں ڈوبتے ہوئے پایا

کیا یہ حقیقت ہے؟

(۸) موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھی سے کہا:۔

آتِنَا غَدَاءَنَا (الکہف) ہمارا ناشتہ لاؤ

ان کے ساتھی نے جواب دیا

(۹) وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا (الکہف) بڑا عجیب وغریب واقعہ ہوا، کہ وہ بھنی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی

(۱۰) وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ البقرۃ اور بعض پتھر ایسے ہیں، جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔

کیا پتھروں میں احساس ہوتا ہے، کیا پتھر کا ڈرنا حقیقت کونیہ ہے؟

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۔ برق صاحب یہ ہیں، قرآنی آیات، اور وہ ہے آپ کا معیار

اب اگر معیار کو صحیح مانیں، تو بڑی مشکل ہوتی ہے، کہ قرآنی آیات مشکوک ٹھہرتی ہیں، لہٰذا یہ

نتیجہ معیار ہی غلط ہے، اگر آیات کی تاویل کی جائے، تو پھر یہی چیز حدیث کے سلسلہ میں بھی قابل عمل ہونی چاہیئے، خواہ مخواہ فرضی معیاروں پر کستا نامناسب ہے۔

(۵) برق صاحب کا پانچواں مجوزہ معیار

"انسانی فطرت کو جھٹلانا" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جو حدیث انسانی فطرت کے خلاف ہو وہ موضوع ہوگی، اس سلسلہ میں چند آیات قرآنی ملاحظہ فرمائیں:۔

(۱) رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا قَالَ كَذَٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (مریم) حضرت زکریا عرض کرتے ہیں، اے میرے رب میرے لڑکا کیسے ہوگا، حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے، اور میں بے حد بوڑھا ہوگیا ہوں حتیٰ کہ اکڑ گیا ہوں، اللہ نے فرمایا، ایسی حالت میں ہی ہوگا، یہ مجھ پر آسان ہے۔

الغرض حضرت یحییٰ علیہ السلام تولد ہوئے، یہ پیدائش انسانی فطرت کے خلاف ہے، مرد بوڑھا ہو، اور عورت بانجھ ہو، تو بچہ پیدا ہونا ناممکن ہے، لہٰذا یہ آیات مجوزہ معیار پر پوری نہیں اترتیں،

(۲) حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت دی جاتی ہے، تو وہ کہتی ہیں:۔

اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّا۔ قَالَ کَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ (مریم)

میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے، حالانکہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا، اور نہ میں بدکار ہوں فرشتے نے کہا اسی حالت میں ہوگا، تیرے رب نے کہا ہے، کہ یہ مجھ پر آسان ہے۔

بغیر باپ کے بچہ پیدا ہونا، یہ بھی فطرت انسانی کے خلاف ہے

(۳) قوم کے لوگ حضرت مریم کے پاس آئے، اور انہیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا، حضرت مریم نے شیر خوار بچے کی طرف اشارہ کر دیا، کہ اس سے پوچھو، قوم کہنے لگی۔

کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا (مریم)

ہم گہوارے میں جھولنے والے بچے سے کیسے بات کر سکتے ہیں

اس بچہ نے کہا:۔

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ (مریم)

میں اللہ کا بندہ ہوں۔

نوزائیدہ بچہ کا بولنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دی گئی، تو ان کی بیوی بولیں:۔

یٰوَیْلَتٰٓی ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا (هود)

اے افسوس کیا میں جنوں گی، حالانکہ میں بڑھیا ہو چکی ہوں، اور یہ میرے خاوند بھی بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔

پھر اس بشارت کے مطابق حضرت اسحاق علیہ السلام تولد ہوئے، جب مرد و عورت دونوں بوڑھے ہوں، تو ان کے اولاد ہونا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

نتیجہ۔ چونکہ اس معیار سے قرآنی آیات پر زد پڑتی ہے، لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

(۶) برق صاحب کا چھٹا مجوزہ معیار

عقل، تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف "برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جو حدیث عقل تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو، وہ موضوع ہوگی" اس سلسلہ میں چند آیات بینات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (النمل)

اس شخص نے جس کو کتاب کا کچھ علم تھا، کہا کہ میں ملکہ سبا کا تخت اتنی دیر میں لا دوں گا جتنی دیر میں آپ کی نگاہ واپس آئے، اور اتنی دیر میں وہ آگیا، تو اس کو اپنے پاس دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا یہ میرے رب کا فضل ہے

یہ عقل و تجربہ کے خلاف ہے، کہ پلک جھپکنے میں ہزاروں میل دور سے ایک وزنی چیز منتقل ہو جائے گویا یہ آیت بھی معجزہ معیار پر پوری نہیں اترتی، اب اس کے متعلق کیا کہا جائے۔

(۲) وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْہِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ (الانفال)

جب شیطان نے کافروں کے اعمال ان کو مزین کر کے دکھلائے، اور کہا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا، اور میں تمہارا ساتھی ہوں، دونوں فوجیں کو ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں، تو الٹے پاؤں واپس ہو گیا، اور کہا میں تم سے بیزار ہوں، میں وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے، میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔

شیطان کا سامنے آنا، اور بات کرنا، تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے، پھر اس کا اللہ سے ڈرنا بھی حیرت انگیز ہے، اس کو تو قیامت تک کے لئے از روئے قرآن مہلت دے دی گئی ہے لہذا اس کا خوف الٰہی سے ڈر کر بھاگنا خلاف عقل ہے، اور کافروں سے اس کا بیزار ہونا بھی خلاف عقل ہے، اس کے اصلی دوست تو کافر ہی ہوتے ہیں۔

(۳) وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی شَھِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ (الاعراف)

اور جب تمہارے رب نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا، اور ان سے ان پر گواہی طلب کی، کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، سب نے کہا، کیوں نہیں بے شک تو ہمارا رب ہے، ہم گواہ ہیں یہ اس لئے کیا کہ کہیں روز قیامت تم یہ نہ کہدو کہ ہم تو اپنے رب سے غافل تھے۔

یہ بالکل خلاف عقل ہے، کہ پیدائش سے پہلے اقرار کرالیا، اس اقرار سے کیا فائدہ؟ یہ اقرار کس کو یاد ہے، پھر یہ بھی خلاف عقل ہے، کہ اولاد آدم جو ابھی وجود میں نہیں آئی تھی، ان کی پیٹھیں کہاں سے آگئیں، کہ ان کی پیٹھوں سے تمام اولاد کو نکال لیا۔

(۴) وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (الانفال)

اور اگر تم دیکھو جس وقت فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، اور ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے جاتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں، کہ جلنے کا مزہ چکھو۔

یہ آیت بھی مشاہدہ کے خلاف ہے، نہ کبھی یہ آواز سنائی دیتی ہیں، نہ فرشتے دکھائی دیتے ہیں، اگر وہ مارتے، تو کیا آواز نہیں آتی، مارا جائے، اور آواز نہ ہو، یہ خلاف عقل و تجربہ ہے۔

نتیجہ یہ قرآنی آیات ہیں، جو اس معیار پر پوری نہیں اترتیں، لہذا یہ معیار غلط ہے، نہ کہ قرآنی آیات ہماری عقل اور ہمارا تجربہ حقیقت میں کوئی چیز نہیں، جو شخص جانتا ہے، وہ جانتا ہے، اور جو نہیں جانتا، اس کی سمجھ میں اس جاننے والے کی بات نہیں آسکتی، بذریعہ لاسلکی جو ہزاروں میل کی بات ہم سن لیتے ہیں، کیا ہمارے اجداد کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی، کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، اور آج بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں، جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں، مثلاً پانی کے ایک قطرہ میں کروڑوں جراثیم کا ہونا یہ عقل میں آنے والی بات نہیں، نہ اس کا ہم نے کبھی مشاہدہ کیا، لہذا یہ عقل کے بھی خلاف ہے، اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے محض چند فضلاء پر اعتبار کرکے ہم یقین کر لیتے ہیں، کہ واقعی ایسا ہوگا، اور جب فضلاء کے علم و فضل پر اعتبار کرکے ہم ان کی خلاف عقل و مشاہدہ عجیب و غریب بات تسلیم کر لیتے ہیں، تو پھر اس رسول کی کوئی بات، جس رسول پر ہم ایمان لاتے ہیں، اگر ہماری عقل و تجربہ کے خلاف ہو، تو کیوں نہ تسلیم کریں، ہوسکتا ہے، کہ ہماری عقل کی رسائی وہاں تک نہ ہو، ہوسکتا ہے، کہ ہم مشاہدہ کر ہی نہ سکتے ہوں، ہوسکتا ہے، کہ ہمارا تجربہ غلط ہو، لہذا صرف ان باتوں کی بنا پر حدیث کی یا رسول کی تکذیب نہیں کرسکتے، نہ پانی کے ایک قطرہ میں لاتعداد جراثیم کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے نہ ہماری عقل میں آتا ہے، لیکن پھر بھی ہم اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں، یہ بھی ایک قسم کا ایمان بالغیب ہے، اور اور جب کسی حکیم یا سائنسدان کی بات پر ایمان بالغیب ہوسکتا ہے، تو پھر رسول کی بات پر ایمان بالغیب کیوں نہ لایا جائے، کیوں اس کی بات کو عقل و تجربہ کی میزان میں رکھ کر تولنے لگیں، کیا یہ انصاف ہے؟ رسول پر ایمان بالغیب ہی ذریعہ ہدایت و نجات ہے، اور یہی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے

مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (البقرۃ)

اللہ کی کتاب متقی لوگوں کے لئے ذریعہ ہدایت و نجات ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

اب سنیئے مشاہدہ کی بات، ہم ریل میں سفر کرتے ہیں، تو نزدیک کی چیزیں ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا ہماری مخالف سمت میں بھاگ رہی ہیں، یہ نظر کا دھوکہ ہے، پھر دور کی چیزیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہی سمت جا رہی ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ بھی ہماری مخالف سمت میں ہی جاتی ہوتی ہیں لیکن مشاہدہ حقیقت کے خلاف ہے، اب اگر کوئی سائنسدان ہم سے یہ کہے، کہ وہ دور کی چیزیں بھی مخالف سمت میں جا رہی ہیں، تو کیا ہم اس کی تکذیب کریں، کیونکہ ہمارے مشاہدہ کے خلاف ہے، نہیں بلکہ حقیقت کو جاننے والے کی بات ماننی چاہیئے، مشاہدہ غلط ہو سکتا ہے آنکھیں خطا کر سکتی ہیں، لہٰذا ہم رسول کی خلاف مشاہدہ بات کو بھی تسلیم کریں گے، اور ایمان اسی کا نام ہے اس کے علاوہ کفر ہی کفر ہے

اسی طرح جب ہم کہیں جاتے ہیں، تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ چاند بھی ہمارے ساتھ چل رہا ہے، یہ بھی آنکھ کی غلطی ہے، اسی طرح جب بادل چاند کے نیچے سے گذرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ چاند دوڑ رہا ہے، اور بادل ساکن ہیں حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے، دو مساوی خطوط علیحدہ علیحدہ کچھ فاصلے پر کھینچے جائیں، اور پھر ان میں سے ایک کے پاس ایک بہت لمبا خط کھینچا جائے تو یہ خط اپنے دوسرے مساوی خط سے چھوٹا معلوم ہوگا، حالانکہ یہ بھی حقیقت کے خلاف ہے، ریگستان میں سراب کا نظر آنا بھی محض دھوکا ہے غرض یہ کہ اس قسم کی کئی خطائیں ہیں، جو آنکھ سے سرزد ہوتی ہیں، مشاہدہ غلط ہوتا ہے، لہٰذا محض مشاہدہ کی خاطر ہم رسول جیسے مخبر صادق کی خبر پر شبہ کرنے لگیں، یہ کسی طرح بھی ایمان کی شان نہیں، اس تمام بحث سے ثابت ہوا کہ یہ معیار بھی غلط ہے۔

(۷) برق صاحب کا مجوزہ ساتواں معیار

"مسلمہ تاریخی واقعات کی تردید" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جو حدیث کسی مسلمہ تاریخی واقعہ کی تردید کرتی ہو، وہ موضوع ہے، اس سلسلہ میں قرآنی آیات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) یہ مسلمہ تاریخی حقیقت ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب رسولوں کے آخر میں آئے لیکن قرآن کہتا ہے:۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى (النجم) — یہ پہلے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر ہیں۔

(۲) کوہ طور آج بھی موجود ہے، لیکن قرآن کہتا ہے:۔

وَجَعَلَهٗ دَكًّا (الاعراف) — تجلیات الٰہی نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔

(۳) فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الشعراء) — ہم نے قوم فرعون کو باغات، چشمے اور خزانوں اور محلات سے نکال کر باہر کر دیا، اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دیا۔

بنی اسرائیل تو مصر چھوڑ کر چلے آئے تھے، پھر وہ وارث کیسے ہو گئے، یہ تاریخ کے خلاف ہے

(۵) اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا (آل عمران) — جو نقصان کافروں سے تمہیں پہنچا تم اس سے دگنا انہیں پہنچا چکے ہو۔

یہ مسلمہ تاریخی واقعہ ہے، کہ جنگ بدر میں ستر کافر قتل ہوئے، اور جنگ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے، یعنی دونوں کا نقصان برابر برابر ہے، لیکن قرآن کی مذکورہ بالا آیت کافروں کا نقصان دگنا بتاتی ہے، لہٰذا یہ آیت مسلمہ تاریخی واقعہ کے خلاف ہے اب بتایئے، اس آیت کے متعلق کیا کہیں کیونکہ اس معیار پر قرآنی آیات بھی پوری نہیں اترتیں لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے، تاریخ غلط ہو سکتی ہے، لیکن قرآن و حدیث غلط نہیں ہو سکتے۔

(۸) برق صاحب کا آٹھواں مجوزہ معیار

"اسلام کے اہم اصولوں مثلاً جہاد و ایثار وغیرہ کی منزلت گھٹاتی ہو" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جس حدیث سے جہاد وغیرہ کی منزلت میں فرق آتا ہو وہ حدیث جعلی ہے، اس سلسلہ میں قرآنی آیات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ - الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ - وَ — بے شک ایمان والے فلاح پائیں گے وہ جو نماز میں خشوع کرتے ہیں، اور لغو کا مول

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ	سے پرہیز کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو زکوۃ ادا
وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ وَ	کرتے ہیں، اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت
الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ	کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے اور اپنی
اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ	لونڈیوں کے، کیوں کہ ان سے ایسا کرنے
اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ	میں کوئی ملامت نہیں، اور ان کے علاوہ
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ	کسی دوسری عورت سے کرنے والے گنہگار
هُمُ الْعٰدُوْنَ ـ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ	ہیں، اور وہ جو اپنی امانت اور عہد کی حفاظت
وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ	کرتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت
عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ـ اُولٰٓئِكَ	کرتے ہیں، یہ ہی لوگ جنت الفردوس کے
هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ـ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ	وارث ہوں گے، اور یہ اس میں ہمیشہ
الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ	رہیں گے۔ (المومنون)

ان آیات میں کہیں جہاد کا ذکر نہیں، اور باوجود اس کے جنت الفردوس کا وعدہ ہے، کیونکہ یہ آیات جہاد کی اہمیت گھٹاتی ہیں، لہٰذا ان کے متعلق کیا کہا جائے۔

(۲) اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ	جو لوگ ہمیشہ نماز ادا کرتے رہتے ہیں
وَالَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ	اور جن لوگوں کے مال میں سائل اور محروم
لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ـ وَالَّذِیْنَ	کے لئے حصے مقرر ہیں، اور جو لوگ یوم
یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ وَالَّذِیْنَ	آخرت کی تصدیق کرتے ہیں، اور جو لوگ
هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ	اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے
اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ	ہیں، بے شک ان کے رب کا عذاب
وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ	غیر مامون ہے، اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں
اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ	کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں
اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ	اور لونڈیوں کے، ان کے معاملہ میں ان پر کوئی
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ	ملامت نہیں، اور ان کے علاوہ تلاش کرنے
هُمُ الْعٰدُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ	والے گنہگار ہیں، اور جو اپنی امانتوں اور
وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ	عہدوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور جو اپنی

بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ (المعارج)	شہادتوں پر قائم رہتے ہیں، اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں یہ لوگ باغوں میں عزت کے ساتھ رہیں گے

ان آیات میں جہاد کی طرف اشارہ تک نہیں، پھر بھی جنت کا وعدہ ہے۔

(۳) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا. وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا. اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا. وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا. وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا. يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا. اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا. وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ	اور اللہ کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب جاہلوں سے بات کرتے ہیں، تو صاحب سلامت کی بات کہتے ہیں، راتوں کو نماز پڑھتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں، کہ اے اللہ ہم کو عذاب دوزخ سے بچا، اس کا عذاب بہت برا ہے، اور وہ بہت بری جگہ ہے، اور وہ لوگ جو کفایت سے خرچ کرتے ہیں، نہ فضول خرچی کرتے ہیں، اور نہ بخل کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں پکارتے نہ کسی ایسی جان کو قتل کرتے ہیں، جس کا قتل کرنا اللہ تعالے نے حرام کر دیا ہے اور قتل کرتے ہیں، تو حق کے ساتھ، اور جو لوگ زنا نہیں کرتے، اور جو شخص ایسا کرے، تو وہ گنہ گار ہے، اس کے لئے قیامت کے دن کئی گنا عذاب ہے، اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، مگر وہ جو توبہ کرے، اور ایمان لے آئے، اور نیک عمل کرتا رہے تو اس کی برائیوں کو ہم نیکیوں سے بدل دینگے اور اللہ غفور ہے رحیم ہے، اور جو توبہ کرے اور پھر نیک عمل کرے، تو ایسا ہی شخص

الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا	درحقیقت اللہ کے ہاں تائب شمار ہوتا ہے
كِرَامًا. وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ	اور جو لوگ بے ہودہ کاموں میں حاضر نہیں
رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ	ہوتے، اور جب بیہودہ مشاغل کے پاس
عُمْيَانًا. وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا	سے ان کا گذر ہوتا ہے، تو وقار سے گذر جاتے
هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا	ہیں، اور وہ لوگ کہ جب ان کے سامنے
قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ	اللہ کی آیات بیان کی جائیں، تو اندھے
اِمَامًا. اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ	اور بہرے نہیں بن جاتے۔ جو اس طرح دعا
بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً	کرتے ہیں، کہ اے ہمارے رب ہماری
وَّسَلٰمًا. خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ	بیویوں اور اولاد کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے
مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا	اور ہمیں متقین کا پیشرو بنا دے، ان لوگوں
(الفرقان)	کو ان کے صبر کے عوض جنت کے بالا خانے

ملیں گے، ان کی ملاقات تحیۃ و سلام سے ہوا کرے گی، ان اچھے مقامات میں وہ ہمیشہ رہیں گے نیک اعمال کی اتنی لمبی فہرست ہے، لیکن کہیں بھی جہاد کا ذکر نہیں، اور نہ ایثار کا، اس قسم کی بہت سی آیات ہیں۔

نتیجہ: کیونکہ اس مجوزہ معیار پر قرآنی آیات بھی پوری نہیں اترتیں، لہذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

(۹) برق صاحب کا مجوزہ نواں معیار

"رہبانیت اور نفس کشی کو جہاد اکبر قرار دیتی ہو" اگرچہ ایسی کوئی حدیث نہیں، جس میں رہبانیت اور نفس کشی کو جہاد اکبر قرار دیا ہو، تاہم معیار کی قوت ملاحظہ فرمائیے، قرآن میں ہے:۔

(۱) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ	اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو، اور تمام دنیاوی
اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (المزمل)	علائق سے قطع تعلق کر کے اس کی طرف رجوع کرو

(۲) یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ	وہ سردار ہوں گے نفس کشی کرنے والے ہونگے
الصّٰلِحِيْنَ (آل عمران)	اور نبی ہوں گے صالحین میں سے۔

(۳) إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي (آل عمران)

جب عمران کی بیوی نے کہا، اے رب میں نذر مانتی ہوں، کہ جو کچھ میرے پیٹ میں ہے، اس کو تیرے لئے آزاد چھوڑ دوں گی پس تو اسے قبول فرما۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ

اللہ نے اسے بوجہ احسن قبول فرمالیا۔

ان آیات سے معلوم ہوا، کہ ترک دنیا اللہ کو پسند ہے، اور اگر مرد و عورت راہبانہ زندگی گذاریں، تو یہ اس کو محبوب ہے، یعنی راہب Monk اور راہبہ Nun بن جانا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

کیونکہ ان آیات میں بظاہر رہبانیت اور نفس کشی کی ترغیب پائی جاتی ہے، لہذا یا تو یہ آیات محل نظر ہیں، یا پھر یہ معیار باطل ہے، اور یہی صحیح ہے۔

(۱۰) برق صاحب کا مجوزہ دسواں معیار

"مسلمانوں کو دنیا سے بیزار کرنا" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جو حدیث مسلمانوں کو دنیا سے بیزار کرے، وہ جعلی ہے، اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقَى (النساء ع ۱۱)

کہدیجیے کہ دنیا کی پونجی بہت تھوڑی ہے، اور آخرت بہتر ہے اس کے لئے جو تقویٰ اختیار کرے

(۲) مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ (آل عمران)

تم میں سے بعض دنیا کے طالب ہیں، اور بعض آخرت کے طالب ہیں، پھر اللہ نے تم کو ان سے پھیر دیا، تاکہ تم کو مبتلائے مصیبت کرے۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ دنیا طلبی کی سزا میں مسلمانوں کو جنگ احد میں مبتلائے مصیبت کیا گیا اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ آگے فرماتا ہے:۔

فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ (آل عمران)

پس تم کو غم پر غم پہنچایا گیا

(۳) مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہے، تو ہم

نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ۔ (الشوریٰ ع ۳)

اس کی کھیتی میں زیادتی کر دیں گے، اور جو شخص دنیا کی کھیتی کا خواہش مند ہے، تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں لیکن آخرت میں اس کے لئے کچھ نہیں۔

(۴) ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے دنیا مانگی، تو جواب ملا، کہ:۔

اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۔ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (الاحزاب)

اگر تمہیں دنیا کی زندگی اور دنیا کی زیب و زینت چاہیے، تو آؤ، میں تم کو مال دے کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کئے دیتا ہوں اور اگر اللہ تعالےٰ اور اس کا رسول اور آخرت کے گھر کی طالب ہو، تو بے شک اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لئے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

گویا اللہ، رسول اور آخرت کے طلب گار کو دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے،

(۵) لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (طٰہٰ)

اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس مال و متاع کو مت دیکھیے، جو ہم نے ان لوگوں کو دے رکھا ہے

الغرض اس قسم کی بیسیوں آیتیں ہیں، جو دنیا سے بیزار کرتی ہیں، لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

(۱۱) برق صاحب کا تجویز کردہ گیارھواں معیار

"ایک ایک دعا پر لاکھوں جنتیں تقسیم کرنا"

برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جس حدیث میں یہ ہو، کہ فلاں دعا پڑھنے سے ایک لاکھ جنتیں مل جائیں گی، وہ حدیث جعلی ہے، برق صاحب ایسی صحیح حدیث تو کوئی موجود نہیں، البتہ ایسی آیت ضرور موجود ہے جو صرف "ربنا اللہ" کہنے پر جنت کا ٹھیکیدار بنا دیتی ہے، سنیئے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا

بے شک جن لوگوں نے، کہا "ربنا اللہ" ہمارا رب اللہ ہے پھر اسی پر جمے رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ

بِالْجَنَّةِ (حم سجدہ ۵) نہ ڈرو نہ غم کھاؤ، اور جنت کی بشارت سنو،

کیونکہ اس معیار پر قرآن مجید کی آیات بھی پوری نہیں اترتیں، لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

(۱۲) برق صاحب کا تجویز کردہ بارھواں معیار

"وضو کرنے پر سارے گناہ معاف کرنا" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جس حدیث میں یہ بشارت ہو، کہ وضو کرنے سے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، وہ حدیث صحیح نہیں ہے، برق صاحب وضو تو خیر بہت بڑا عمل ہے اور ایک بہت بڑے مقصد کا پیش خیمہ ہے، قرآن تو صرف جھک کر "حطۃ" کہنے پر سارے گناہوں کے معاف کرنے کی خوشخبری دیتا ہے، سنیئے:۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ (البقرۃ)

اور جب تم دروازے میں سے داخل ہو، تو جھک جانا، اور "حطۃ" کہنا، ہم تمہارے سب گناہ معاف کردیں گے۔

اس معیار پر بھی قرآنی آیات پوری نہیں اترتیں، لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے۔

(۱۳) برق صاحب کا تجویز کردہ تیرھواں معیار

"دوات کی سیاہی کو ایک لاکھ شہیدوں کے خون سے افضل ٹھہرانا" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جس حدیث میں یہ ہو، کہ دوات کی سیاہی ایک لاکھ شہیدوں کے خون سے افضل ہے، وہ جعلی ہے، برق صاحب ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں ہے، لہٰذا یہ معیار ہی بے کار ہے، مگر اتنا ضرور عرض ہے، کہ ایک عالم کی دوات کی سیاہی کا مقصد کیا ہے، وہی جو ایک شہید کے خون کا مقصد ہے، یعنی دین الٰہی کی حفاظت، پھر مزید براں سیاہی سے دین الٰہی کی حفاظت ہی نہیں ہوتی، بلکہ دین الٰہی کی تبلیغ بھی ہوتی ہے، گویا سیاہی دونوں کام کرتی ہے، حملہ بھی کرتی ہے، اور دفاع بھی، پھر خون شہید کا اثر عارضی ہوتا ہے، لیکن اس سیاہی سے لکھی ہوئی کتاب کا فیضان قیامت تک جاری رہتا ہے، لہٰذا لکھنے والے کے نامہ اعمال میں ثواب در ثواب کے انبار لگ جانے ہیں، اس اعتبار سے دیکھا جائے، تو یہ معیار باطل ہے۔

(۱۴) برق صاحب کا مجوزہ چودھواں معیار

"ذکر خدا کو جان و مال کی قربانی سے بہتر قرار دیتی ہو" اس سلسلہ میں سنیئے، کہ قرآن کیا فرماتا ہے:۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ	اور بے شک اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے

اس آیت کے علاوہ بہت سی آیات میں اللہ کے ذکر کی فضیلت بیان ہوئی ہے بلکہ بعض آیات میں تو جہاد کو مقامات ذکر کی حفاظت کا ذریعہ بتایا گیا ہے، گویا اصل مقصد ذکر الٰہی ہے اور جہاد اس کا خادم، اس لحاظ سے اور مذکورہ بالا آیت کے لحاظ سے یہ معیار بھی باطل ہے۔

(۱۵) برق صاحب کا مجوزہ پندرھواں معیار

"سورج کو عرش کے نیچے سجدہ کرانا" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جس حدیث میں ہو، کہ سورج عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے وہ باطل ہے،

سورج کا سجدہ کرنا، تو قرآن سے ثابت ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ (الحج)	کیا تم نے نہیں دیکھا، کہ اللہ تعالےٰ کو زمین و آسمان کی تمام مخلوقات سجدہ کرتی ہے. اور سورج، چاند، تارے، اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی سجدہ کرتے ہیں۔

یعنے قرآن کی رو سے تو سورج ہی سجدہ نہیں کرتا، بلکہ پہاڑ بھی سجدہ کرتے ہیں، درخت بھی سجدہ کرتے ہیں، جانور بھی سجدہ کرتے ہیں، اور یہاں سجدہ سے حکم کوئی مراد نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ حکم کوئی کے تو تمام انسان تابع ہیں، اور آیت میں تمام انسانوں کا ذکر نہیں، لہٰذا سجدہ سے مراد وہی عبادت کا سجدہ ہے، اور یہی عبادت کا سجدہ سورج بھی کرتا ہے، اور پہاڑ بھی، لہٰذا اس مجوزہ معیار پر آیت قرآنی بھی پوری نہیں اترتی، اور اس لحاظ سے یہ معیار بھی باطل ہے۔

(۱۶) برق صاحب کا مجوزہ سولھواں معیار

"درختوں کو رلانا" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جس حدیث میں یہ خبر ہو، کہ درخت رو دیا تو وہ حدیث موضوع ہے، برق صاحب درختوں کے احساسات کو جدید سائنس نے بھی تسلیم کر لیا ہے، مگر ابھی تک معجزہ پر آپ کو شک ہے، اچھا اب قرآنی آیات سنیے:۔

(۱) وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ (الانبیاء) اور ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے ساتھ مسخر کر دیا تھا، وہ پہاڑ تسبیح پڑھا کرتے تھے

اگر پتھر تسبیح پڑھ سکتے ہیں، تو پھر درخت کا رونا تعجب خیز کیوں؟

(۲) وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ (الانبیاء) اور ہوا سلیمان کے تابع تھی، اس کے حکم سے چلتی تھی

ہوا جیسی چیز ایک رسول کی محکوم ہو، تو کوئی تعجب نہیں، درخت کا رونا تعجب خیز کیوں؟

(۳) وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ (البقرۃ) اور بعض پتھر ایسے ہیں، کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔

گویا پتھروں کو خوف محسوس ہوتا ہے، وہ گر پڑتے ہیں، ان میں بغیر دل و دماغ کے احساس ہوتا ہے۔

الغرض اس معیار پر بہت سی آیات پوری نہیں اترتیں، لہٰذا یہ معیار بھی باطل ہے، پھر معجزہ کا نام ہی اس قسم کے معیاروں کے بطلان کے لئے کافی ہے

(۱۷) برق صاحب کا مجوزہ سترھواں معیار

"صوم و حیض میں مباشرت کی اجازت دینا" برق صاحب مباشرت سے مجامعت مراد لیتے ہیں، اور کیونکہ کسی حدیث میں بحالت صوم و حیض مجامعت کی اجازت نہیں، لہٰذا یہ معیار ہی کالعدم ہے۔

(۱۸) برق صاحب کا مجوزہ اٹھارہواں معیار

"طریقت اور پیری گری کو اچھالنا" کسی صحیح حدیث میں یہ مضمون نہیں، لیکن قرآن میں اس کا

اشارہ پایا جاتا ہے، سنیئے:۔

سورہ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات اور سفر کا ایک قصہ مذکور ہے، اس سفر میں حضرت خضر نے ایسے کام کئے، جو یا تو خلاف شرع تھے، یا خلاف عقل یعنی جس کشتی میں سوار تھے، اس کشتی کو توڑ ڈالا، ایک معصوم بچے کو قتل کر دیا، ایک دیوار کی بلا وجہ اور بغیر اجرت کے مرمت کر دی، ان تینوں باتوں کے رمز تک حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر نہ پہنچ سکے، بلکہ ہر بات پر اعتراض کیا، بالآخر حضرت خضر نے استادانہ حیثیت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان باتوں کا راز سمجھا دیا،

کہنے والے کہتے ہیں، کہ شریعت کے عالم ظاہر پرست ہوتے ہیں، انہیں حقیقت کا علم نہیں ہوتا، طریقت والے شریعت سے ماوراء ہوتے ہیں، وہ ایسے کام کر گذرتے ہیں، جو بظاہر خلاف شرع معلوم ہوتے ہیں، لیکن باطن میں وہ عین شرع ہوتے ہیں، دیکھئے موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت پیغمبر تھے، لیکن ان کو صرف ظاہر کا علم تھا، اور حضرت خضر صاحب طریقت و معرفت تھے، وہ ان حقائق سے آشنا تھے، جن سے موسیٰ علیہ السلام قطعاً نابلد تھے، بلکہ ان تک موسیٰ علیہ السلام کی رسائی نہ ہو سکتی تھی لہذا صاحب طریقت کا مرتبہ صاحب شریعت سے بڑا ہے، اگر کوئی پیر خلاف شریعت کام کرتا نظر آئے، تو اس کو کرامت سمجھو، بلکہ یہ خیال کرو، کہ پیر ایسی جگہ پہنچ گیا ہے، جہاں ظاہری شریعت سے بے پرواہ ہو کر وہ کام کرتا ہے، اور وہ حقیقی شرع ہے، الغرض قرآن کے اس قصہ سے بظاہر طریقت اور پیری مریدی کو بڑی تقویت پہنچتی ہے، کہئے کیا یہ قصہ بھی محل نظر ہے لیکن قصہ تو محل نظر ہو نہیں سکتا، اس لئے کہ قرآن میں ہے، اور معیار بھی صحیح ہے، لہذا سوائے تاویل کے اور کوئی چارہ کار نہیں، اسی طرح کوئی بات اگر بفرض محال حدیث میں آجائے تو اس کی بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں تاویل کر لینی چاہیئے۔

(۱۹) برق صاحب کا مجوزہ انیسواں معیار

"صرف کلمہ پڑھنے پر زانی کو جنت میں بھیجنا" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جس حدیث میں یہ ہو، کہ صرف کلمہ پڑھنے سے جنت مل جائے گی، خواہ کلمہ پڑھنے والا زانی ہی کیوں نہ ہو، تو وہ حدیث موضوع ہے، برق صاحب حدیث تو ایسی کوئی نہیں، جس کا یہ مطلب ہو، آپ کو غلط فہمی ہو گئی، اور آپ کی اس غلط فہمی کا جواب

بارھویں باب میں تفصیل سے دیا جا چکا ہے، اب سنیئے، قرآن تو صرف "ربنا اللہ" کہنے پر جنت کی خوشخبری دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ (حم سجدہ)	بے شک جن لوگوں نے کہا، ربنا اللہ اور پھر اس پر جمے رہے، تو ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، جو کہتے ہیں، نہ ڈرو نہ غم کھاؤ اور جنت کی بشارت سنو۔

کیونکہ اس معیار پر قرآن کی آیت بھی پوری نہیں اترتی، لہٰذا یہ معیار ہی باطل ہے

(۲۰) برق صاحب کا مجوزہ بیسواں معیار

"سورج کو شیطان کے سینگوں میں پھنسانا" حدیث کا یہ مطلب تو نہیں، کہ سورج شیطان کے سینگوں میں پھنس جاتا ہے، جس حدیث کی طرف برق صاحب کا اشارہ ہے، اس کا جواب انیسویں باب میں دیا جا چکا ہے، اب قرآن کی آیت سنیئے:۔

تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَۃٍ (الکھف) سورج کیچڑ کے چشمہ میں ڈوبتا ہے۔

فرمایئے، جو آیت سورج کو کیچڑ کے چشمہ میں ڈبوتی ہے، وہ صحیح ہے یا نہیں، اگر صحیح ہے، اور ضرور صحیح ہے، تو پھر یہ معیار ہی باطل ہے، قرآن و حدیث کے ظاہری معنوں پر ایمان لانا چاہیے اگر ان کی حقیقت تک ہم نہیں پہنچ سکتے، تو خاموش ہو جانا چاہیئے، نہ کہ اعتراض کرنا چاہیئے۔

(۲۱) برق صاحب کا مجوزہ اکیسواں معیار

"مشکل اسلام کو چھوڑ کر آسان اسلام کی دعوت دینا" برق صاحب کا مطلب یہ ہے، کہ جس حدیث میں یہ مذکور ہو، کہ بغیر محنت و مشقت کے جنت مل جائے گی، تو وہ حدیث موضوع ہوگی، غالباً ان کا مطلب یہ ہے، کہ جب تک کوئی مسلمان تکالیف برداشت نہ کرے، صدمے نہ سہے وہ حقیقۃً مسلمان ہی نہیں، حالانکہ بات درحقیقت یہ نہیں ہے، آسان اسلام تو خود اللہ تعالیٰ پیش کرتا ہے، سنیئے:۔

(۱) مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج) — اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی مشکل نہیں ڈالی۔

(۲) يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ) — اللہ تم پر آسانیوں کا ارادہ کرتا ہے، اور تم پر مشکلات ڈالنا نہیں چاہتا۔

(۳) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ) — اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں ڈالتا

(۴) يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف) — اللہ کا رسول لوگوں سے ان کے بوجھ اتار کر الگ رکھ دیتا ہے، اور مشکلات کی بیڑیوں کو توڑ کر پھینک دیتا ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تعلیم دیتا ہے، کہ اس طرح دعا مانگو۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (البقرۃ) — اے ہمارے رب ہم پر ایسے بھاری احکام نافذ مت فرما، جو تو نے ہم سے پیشتر لوگوں پر نافذ فرمائے تھے، اور ایسے احکام بھی نافذ نہ فرما جن کی تعمیل کی ہم میں طاقت نہیں

ان آیات سے معلوم ہوا، کہ قرآن آسان اسلام کی دعوت دیتا ہے، لہٰذا اس معیار پر قرآن بھی پورا نہیں اترتا، پس دونوں میں سے ایک چیز صحیح ہے، اور ایک چیز غلط، یعنی یا تو قرآن صحیح ہے یا معیار، اور قرآن قطعی الصحت ہے، لہٰذا یہ معیار باطل ہے۔

دوسری بات یہ ہے، کہ قرآن مجید میں احکام بہت مجمل ہیں، نماز کے نہ اوقات ہیں، نہ شرائط، نہ رکعات کی تعداد، نہ ان کی ہیئت، احادیث میں جو جو باتیں مذکور ہیں، ان کی وجہ سے نماز ایک باقاعدہ اور منظم عبادت بن جاتی ہے، صرف قرآن کی رو سے تو نماز کو آسان بنانے والا آسان بنا سکتا ہے، لیکن حدیث ایسا کرنے سے روکتی ہے، یعنی وہ نماز کو مشکل بنا دیتی ہے پھر سود کے احکام اور مختلف صورتیں، خرید و فروخت کے مفصل احکام وغیرہ وغیرہ، یہ سب مشکلیں ہیں جو احادیث میں ملتی ہیں، پھر جہاد کے متعلق مختلف ہدایات اور پابندیاں یہ بھی احادیث میں ملتی ہیں، احادیث میں ناچ گانے، فنون لطیفہ اور لغو کھیلوں کی ممانعت ملتی ہے، غرض یہ کہ احادیث کی وجہ سے کچھ مشکلات بڑھ ہی جاتی ہیں، لہٰذا احادیث کا پیش کیا ہوا اسلام قرآن کے اسلام

سے کچھ زیادہ ہی مشکل ہے، اس لحاظ سے اس معیار کی زد احادیث سے زیادہ قرآن پر پڑتی ہے لہذا یہ معیار باطل ہے

خلاصہ یہ کل اکیس معیار تھے، جو برق صاحب نے پیش کئے ہیں، اور ان میں سے کسی معیار پر قرآن بھی پورا نہیں اترتا، لہذا تمام معیار لغو اور باطل ہیں۔

احادیث کو پرکھنے کے لئے یہ معیار آخری سند نہیں ہو سکتے، صادق، حافظ، ضابط اشخاص کا بیان تسلیم کرنا ہی پڑے گا، خواہ ہمارے فہم میں آئے یا نہ آئے، احادیث کی اصل کسوٹی یہی ہے، کہ بیان کرنے والا صدق، حفظ ضبط کے اوصاف سے متصف ہو، اور اگر کسی راوی میں یہ اوصاف نہ پائے جائیں، تو پھر ان معیاروں پر بھی غور ہو سکتا ہے، ورنہ نہیں۔

معیار زائد

برق صاحب نے ایک معیار چھوڑ دیا، اور وہ ہے "اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف بات بیان کرنا" یہ بات احادیث میں تو غالباً نہیں ملتی، لیکن قرآن میں ضرور مل جاتی ہے، مثلاً:۔

(۱) إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (الاحزاب) — جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان پر اللہ کی لعنت ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی

اس آیت میں اللہ کو تکلیف پہنچنا مذکور ہے، تو کیا یہ بات اللہ کی شان کے خلاف ہے؟

(۲) اَللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرۃ) — اللہ ان سے مذاق کرتا ہے

(۳) قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ (آل عمران) — کہہ دیجیئے کہ اپنے غصہ میں مر جاؤ۔

یہ طنز ہے یا بدی کا حکم؟

(۴) وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا (النساء) — اور جس کو اللہ گمراہ کرے، اس کے لئے تمہیں ہرگز راستہ نہیں ملے گا۔

(۵) فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا (البقرۃ) — ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے اللہ نے بیماری اور زیادہ کر دی۔

(۶) خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ (البقرۃ) — اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی

(۷) بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ (النساء) — بلکہ اللہ کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں۔

(۸) وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال)
اور جب آپ نے مٹی پھینکی تھی تو آپ نے نہیں پھینکی تھی، بلکہ اللہ نے پھینکی تھی

اس آیت سے لوگ حلول کا مسئلہ نکالتے ہیں، بلکہ رسول کو خدا بنا دیتے ہیں۔

(۹) كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (یوسف)
یہ کید ہم نے یوسف کے لئے کیا تھا۔

(۱۰) وَمَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ. كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ (حجر)
اور جب کوئی رسول آتا ہے، تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اور یہ چیز ہم ہی گنہ گاروں کے دل میں ڈال دیتے ہیں۔

(۱۱) لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (الحجر)
تیری جان کی قسم! وہ اپنے نشہ میں بہک رہے تھے۔

(۱۲) تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا. وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ (مریم)
یہ جنت ہم اپنے متقی بندوں کو دیتے ہیں اور ہم نازل نہیں ہوتے مگر تیرے رب کے حکم سے

اللہ میاں کس کے حکم سے نازل ہوتے ہیں؟ اگر ظاہر مطلب کیا جائے!

(۱۳) أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا (مریم)
کیا آپ نے نہیں دیکھا، کہ کافروں پر شیاطین کو ہم نے بھیجا ہے، یہ شیاطین ان کو کفر پر ابھارتے رہتے ہیں۔

(۱۴) لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا (الانبیاء)
اور اگر ہم چاہتے، کہ کوئی کھلونا بنائیں، تو اپنے پاس ہی بناتے۔

کیا اللہ کے لئے بھی قرب و بعد کا سوال پیدا ہوتا ہے؟ کیا یہ دنیا اللہ سے دور ہے؟

(۱۵) وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (الاعراف)
اور جس کو اللہ گمراہ کردے، اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔

(۱۶) وَأَرْسَلْنٰهُ إِلٰى مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيْدُوْنَ (الصافات)
اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ کی طرف رسول بنا کر بھیجا

کیا اللہ تعالیٰ کو صحیح تعداد معلوم نہیں۔

(۱۷) وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ
اپنے ہاتھ میں ایک جھاڑو لو، اور اس سے

بیدہ وَلَا تَحْنَثْ (ص) مارو، اور قسم مت توڑو۔

سو کوڑے مارنے کی قسم کو اس طرح پورا کیا جا رہا ہے

(۱۸) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (تکویر) یہ قرآن رسول کریم کا قول ہے

اور ہم قرآن کو کلام اللہ سمجھتے ہیں کیا ہم حق پر ہیں ؟

(۱۹) عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (الجن) اللہ عالم الغیب ہے، وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، مگر اس کام کے لئے رسول کو منتخب کر لیتا ہے، پھر اس کے آگے پیچھے چوکیدار مقرر کر دیتا ہے

کیا اللہ کو بھی چوکیدار کی ضرورت ہے؟

(۲۰) وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا (الکہف) اور وہ لڑکا اس لئے قتل کیا گیا، کہ اس کے ماں باپ مومن تھے، ہم ڈرے کہ کہیں وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے

یہ ڈرنے والا کون ہے ؟

یہ ہیں چند آیات جو نمونۃً پیش کر دی گئی ہیں، ظاہر معنوں کے لحاظ سے تو ہم ہی کہہ سکتے ہیں، کہ یہ آیات قرآن میں نہیں ہو سکتیں، کیونکہ یہ اللہ کی شان اقدس کے خلاف ہیں، لیکن ہیں یہ قرآن ہی کی آیتیں، اور ان پر ہمارا ایمان ہے، اب اگر تاویل کر کے ان کو اعتراض سے بچایا جا سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے، کہ اسی قسم بلکہ اس سے کم اعتراض والی احادیث کے ساتھ یہ رویہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا۔

معیار مزید

برقی صاحب چاہتے، تو ایک معیار کا اور اضافہ کر دیتے، وہ یہ کہ اگر کوئی حدیث کسی جاہلانہ رسم کی سرپرستی کرتی ہو، تو وہ بھی موضوع ہے، لیکن مشکل یہ ہے، کہ اس معیار کے لئے قرآن ہی سدِ راہ ہے، قرآن میں ہے:۔

(۱) فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَسُبْحٰنَ جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس آئے، تو آواز آئی، کہ جو بھی آگ میں ہے،

اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، يٰمُوْسٰى اِنَّهٗ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (النمل)

وہ برکت والی ہے، اور جو اس کے آس پاس ہے، وہ بھی برکت والا ہے، پاک ہے وہ اللہ جو رب العالمین ہے، اے موسیٰ وہ ہستی میں ہوں، زبردست، اور حکمت والا،

کیا ان آیات سے آتش پرستی کو تقویت نہیں پہنچتی؟

(۲) فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (قصص)

پھر جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے پاس پہنچے، تو وادی ایمن کے کنارے مبارک مقام میں ایک درخت سے آواز آئی، کہ اے موسیٰ میں اللہ ہوں رب العالمین،

اگر کسی تاویل سے ان آیات پر ایمان ہے، تو پھر بہت ہی کم اعتراض والی احادیث پر ایمان کیوں نہ لایا جائے، بظاہر یہ آیات قابل اعتراض نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں اعتراض سے بالکل پاک ہیں، اسی طرح بعض احادیث بظاہر قابل اعتراض معلوم ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں وہ بھی اعتراض سے بالکل پاک ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ یہ تمام معیار باطل ہیں، معتبر آدمی کی بات قابل تسلیم ہونی چاہیے۔

سب سے بڑا معیار

احادیث کو پرکھنے کا سب سے بڑا معیار یہ بتایا جاتا ہے، کہ قرآن کی کسی آیت کے خلاف نہ ہو، کسی قرآنی آیت سے متعارض نہ ہو، واقعی بظاہر تو یہ بڑا زبردست معیار ہے، اور بہت ہی خوشنما اور دیدہ زیب معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے، تو یہ بھی بالکل قابل وقعت نہیں ہے، کچھ بحث تو اس پر معیار اول کے ضمن میں گذر چکی ہے، لیکن اس معیار کی اہمیت کے پیش نظر اس پر کچھ مزید تحریر کر رہا ہوں، سوال یہ ہے، کہ اگر کوئی حدیث کسی قرآنی آیت کے خلاف ہو، تو وہ موضوع ہے، تو کیا اگر کوئی قرآنی آیت کسی دوسری آیت کے خلاف ہو، تو کیا وہ بھی موضوع ہے یا نہیں؟ اگر وہ آیت موضوع نہیں، تو حدیث کیوں؟ آپ کہیں گے ایسی تو کوئی بھی آیت نہیں، جو دوسری آیت کے خلاف ہو، میں کہتا ہوں، ایسی بہت سی آیات ہیں، ملاحظہ فرمائیے:۔

۵، تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ (الحاقہ)	(۱) إِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (التکویر)
(ترجمہ) یہ قرآن رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے	(ترجمہ) یہ رسول کریم کا قول ہے

ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ قرآن اللہ تعالےٰ کا کلام ہے، دوسری سے معلوم ہوتا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے، یا کسی فرشتہ کا۔

(۲) فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ أَنْ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ يٰمُوْسٰى إِنَّهٗ أَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (النمل)	(۲) فَلَمَّا أَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يٰمُوْسٰى إِنِّيْ أَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (القصص)
(ترجمہ) پس جب موسیٰ علیہ السلام آگ کے پاس پہنچے، تو آواز آئی، کہ جو ہستی آگ میں ہے وہ برکت والی ہے، اور جو آگ کے اطراف میں ہے، وہ بھی، اور اللہ رب العالمین پاک ہے، اے موسیٰ وہ ہستی میں ہوں اللہ زبردست حکمت والا۔	(ترجمہ) پس جب حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کے پاس پہنچے، تو وادی ایمن کے کنارے مبارک مقام میں ایک درخت سے آواز آئی، کہ اے موسیٰ میں اللہ رب العالمین ہوں۔

پہلی آیت میں ہے، کہ آگ سے آواز آئی، دوسری میں ہے، کہ درخت سے آواز آئی،

(۳) وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (البقرۃ)	(۳) وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً (الاعراف)
(ترجمہ) اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ لیا	(ترجمہ) اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ لیا۔

پہلی میں چالیس رات، اور دوسری میں تیس رات

(۴) كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (البقرۃ)	(۴) كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِيْ ( )
(ترجمہ) یہ لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے	(ترجمہ) اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے، کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے،

پہلی آیت میں رسول کے مغلوب اور مقتول ہونے کا ذکر ہے، اور دوسری میں رسول کے غالب

نہ نے کی بشارت ہے،

(۵) كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ (آل عمران)

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ ٱللَّهُ لَكَ (التحریم)

(ترجمہ) ہر طعام بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا، سوائے اس کے جو حضرت یعقوب نے اپنے لئے خود حرام کر لیا،

(ترجمہ) اے نبی تم اس چیز کو کس طرح حرام کر سکتے ہو جس چیز کو اللہ تعالے نے تمہارے لئے حلال کر دیا ہے۔

پہلی آیت میں نبی کو حرام کرنے کی اجازت، اور دوسری میں ممانعت،

(۶) قُلْ إِنَّ ٱلْأَمْرَ كُلَّهُۥ لِلَّهِ (آل عمران)

(۶) أَوَلَمَّآ أَصَـٰبَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَـٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ (آل عمران)

(ترجمہ) کہہ دیجئے کہ تمام کام اللہ تعالے کے اختیار میں ہیں

(ترجمہ) جب تم کو مصیبت پہنچی جس سے دگنی تم انہیں پہنچا چکے تھے، تو تم نے کہا، یہ کیوں؟ کہہ دیجئے، کہ یہ مصیبت تمہاری ہی طرف سے ہے۔

پہلی آیت میں مصیبت اللہ کی طرف سے، اور دوسری میں انسانوں کی طرف سے:

(۷) وَٱلَّـٰتِى يَأْتِينَ ٱلْفَـٰحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَٱسْتَشْهِدُوا۟ عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ ۖ فَإِن شَهِدُوا۟ فَأَمْسِكُوهُنَّ فِى ٱلْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّىٰهُنَّ ٱلْمَوْتُ (النساء)

(۷) ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِى فَٱجْلِدُوا۟ كُلَّ وَٰحِدٍ مِّنْهُمَا مِا۟ئَةَ جَلْدَةٍ (النور)

(ترجمہ) جو عورتیں بے حیائی کا کام کر گزریں تو چار گواہوں کی گواہی کے بعد ان کو موت تک قید میں رکھو،

(ترجمہ) زانیہ اور زانی کو سو سو کوڑے مارو،

پہلی آیت میں سزا قید، اور دوسری میں سزا سو کوڑے، نیز پہلی آیت میں مرد کی کوئی سزا نہیں

اور دوسری میں مرد کو بھی سو کوڑے۔

(۸) فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (النساء)

(ترجمہ) اگر تم کو نا انصافی کا خوف ہو تو ایک ہی عورت سے نکاح کرو۔

(۸) وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ (النساء)

(ترجمہ) اور تم ہرگز بیویوں میں انصاف نہیں کر سکتے، اگرچہ تم کو اس کی حرص ہی کیوں نہ ہو

پہلی آیت میں نا انصافی کی ممانعت، اور دوسری میں نا انصافی کی اجازت، کیونکہ انصاف ناممکن العمل ہے۔

(۹) هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (الانعام)

(ترجمہ) اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا ہے۔

(۹) إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ (الحجرات)

(ترجمہ) ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔

پہلی آیت میں ایک جان سے پیدا کیا، اور دوسری میں دو جانوں سے پیدا کیا۔

(۱۰) فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ (الاعراف)

(ترجمہ) ہم ضرور ان لوگوں سے سوال کریں گے جن کے پاس رسول بھیجے گئے ہیں

(۱۰) وَلَا يُسْأَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ (القصص)

(ترجمہ) اور مجرمین سے ان کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔

پہلی آیت میں ہے، کہ سوال ہوگا، اور دوسری میں ہے، کہ سوال نہیں ہوگا۔

(۱۱) قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ (الاعراف)

(ترجمہ) قوم فرعون کے سرداروں نے کہا، یہ بڑا جادوگر ہے، یہ چاہتا ہے، کہ تم کو تمہارے ملک سے نکال دے۔

(۱۱) قَالُوا إِنْ هَٰذَانِ لَسَاحِرَانِ يُرِيدَانِ أَنْ يُخْرِجَاكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ (طٰہٰ)

(ترجمہ) انہوں نے کہا، کہ یہ دونوں جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں، کہ تم کو تمہارے ملک سے نکال دیں

(۱۱) قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ

(ترجمہ) فرعون نے سرداروں سے کہا، کہ یہ بڑا جادوگر ہے، یہ چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے

اَرْضِكُمْ (الشعراء) ملک سے نکال دے۔

پہلی آیت میں ہے، کہ یہ تم کو نکال دے، دوسری میں ہے، کہ یہ دونوں تم کو نکال دیں، ایک میں واحد دوسری میں تثنیہ،

پہلی آیت میں ہے، کہ سرداروں نے یہ بات کہی تھی، اور تیسری میں ہے، کہ خود فرعون نے سرداروں سے یہ بات کہی تھی،

(۱۲) قَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي (القصص)

(ترجمہ) فرعون نے کہا، اے سردارو میں نہیں جانتا، کہ میرے سوا بھی تمہارا کوئی معبود ہے

(۱۲) قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ (الاعراف)

(ترجمہ) سرداروں نے کہا، تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دے گا، کہ وہ ملک میں فساد برپا کریں، اور تجھ کو اور تیرے معبود کو چھوڑ دیں

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ فرعون کسی کو الٰہ نہیں مانتا تھا، دوسری میں ہے، کہ اس کا بھی کوئی معبود تھا،

(۱۳) قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا (التوبۃ)

(ترجمہ) آپ کہدیجیے کہ ہم کو کوئی مصیبت ہرگز نہیں پہنچ سکتی، مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے

(۱۳) وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ

(ترجمہ) اور جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے، وہ تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

پہلی آیت میں تقدیر ہی سب کچھ ہے، اور دوسری میں تدبیر ہی سب کچھ ہے۔

(۱۴) يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا (النحل)

(ترجمہ) اس دن ہر شخص اپنے لئے جھگڑتا ہوا آئیگا

(۱۴) هَٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُونَ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ (المرسلات)

(ترجمہ) اس دن کوئی نہیں بولے گا، اور نہ کسی کو معذرت کرنے کی اجازت ملے گی۔

پہلی آیت میں ہے، کہ وہ بولے گا، جھگڑے گا، عذر پیش کرے گا، دوسری میں اس کے خلاف ہے۔

(۱۵) لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا (الاسراء)

(ترجمہ) اگر زمین میں فرشتے بستے ہوتے، تو ہم آسمان سے ان کے لئے فرشتہ ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔

(۱۵) اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ (الحج)

(ترجمہ) اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول منتخب کرتا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا (الفاطر)

(ترجمہ) سب تعریف اللہ کے لئے ہے، جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا، اور فرشتوں کو رسول بنانے والا ہے۔

پہلی آیت میں فرشتوں کو رسول بنانے کی نفی ہے، اور دوسری میں اثبات،

(۱۶) اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ (الحج)

(ترجمہ) بے شک اللہ کے ہاں دن تمہارے حساب سے ایک ہزار سال کا ہے

(۱۶) تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (المعارج)

(ترجمہ) فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں، ایک دن میں جو پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔

پہلی آیت میں یوم ۱۰۰۰ سال کا ہے، اور دوسری میں یوم ۵۰۰۰۰ سال کا۔

(۱۷) قَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ (ابراھیم)

(ترجمہ) ضعیف لوگ متکبرین سے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع تھے، اب

(۱۷) فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ (القصص)

(ترجمہ) ان کو سب خبروں سے محروم کر دیا جائے گا، پس اس دن وہ آپس میں ایک

۔۔۔۔ اب تم ہمارے عذاب میں کچھ کمی کرا سکتے ہو؟ وہ کہیں گے، اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا، تو ہم بھی تمہیں ہدایت دیتے اب برابر ہے، خواہ ہم جزع کریں یا صبر کریں، اس سے چھٹکارا نہیں ہے۔

دوسرے سے سوال بھی نہ کر سکیں گے۔

پہلی آیت میں سوال و جواب کا اثبات ہے، اور دوسری میں انکار ہے۔

(۱۸) وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (الروم)

(ترجمہ) اور ہم پر مومنین کی مدد کرنا لازم ہے۔

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (المؤمن)

(ترجمہ) ہم ضرور مدد کریں گے رسولوں کی بھی اور مومنین کی بھی، دنیا کی زندگی میں

(۱۸) قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ ه النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ه إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ه وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ (البروج)

(ترجمہ) کھائی میں ایندھن جمع کر کے آگ جلانے والے برباد ہو گئے، جب کہ وہ اس کھائی کے کنارے بیٹھ کر مومنین کے جلنے کا تماشہ دیکھتے تھے

پہلی آیت میں ہے کہ ہم ضرور مدد کریں گے، دوسری آیت میں ہے، کہ مدد نہیں کی، اور تمام مومنین جلا دیے گئے

(۱۹) لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ (سجدہ)

(ترجمہ) تاکہ تو ایسی قوم کو ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا

(۱۹) وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر)

(ترجمہ) کوئی قوم ایسی نہیں جس میں رسول نہ آیا ہو۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد)

(ترجمہ) ہر قوم کے پاس ہادی آیا ہے۔

پہلی آیت میں ہے، کہ اس قوم کے پاس کوئی رسول نہیں آیا، دوسری میں ہے، کہ ہر قوم کے پاس رسول آیا ہے۔

(۲۰) وَإِن تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ (محمد)

(۲۰) وانفقوا فی سبیل اللہ (بقرۃ)

(ترجمہ) اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔

(ترجمہ) اگر تم ایمان لاؤ، اور ڈرتے رہو، تو اللہ تم کو اجر دے گا، اور تم سے تمہارے مال طلب نہیں کریگا

وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا (البقرۃ)

(ترجمہ) اور اللہ کو قرض حسنہ دو،

پہلی آیت میں مال طلب کرنے کی نفی ہے، اور دوسری میں اثبات ہے۔

(۲۱) قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (المائدہ)

(ترجمہ) کہہ دیجیے اللہ کلالہ کے ورثہ کے متعلق فتوی دیتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے اولاد نہ ہو، ایک بہن ہو، تو اس بہن کو نصف ترکہ ملے گا، اور اسی طرح بھائی بہن کا وارث ہوگا، اگر بہن کے اولاد نہ ہو اور اگر دو بہنیں ہوں، تو دو ثلث ملے گا اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں، تو مرد کو عورت سے دوگنا ملے گا (النساء)

(۲۱) وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ (النساء)

(ترجمہ) اگر مرد یا عورت کلالہ ہو، اور اس کے ایک بھائی یا بہن ہو، تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر وہ زیادہ ہوں تو تہائی میں شریک ہوں گے، لیکن بے ضرر وصیت پورا کرنے، اور قرض کی ادائیگی کے بعد یہ تقسیم ہوگی،

پہلی آیت میں کلالہ کے ورثہ کی تقسیم کچھ اور ہے، اور دوسری میں کچھ اور، نیز پہلی میں کوئی شرط نہیں دوسری میں تکمیل وصیت اور قرض کی ادائیگی کی شرط ہے۔

(۲۲) اَلْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ (مائدہ)

(ترجمہ) آج تم پر پاک چیزیں حلال کی جاتی ہیں

(۲۲) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ .... وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ (النساء)

(ترجمہ) تم پر حرام کر دی گئیں تمہاری

اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے، اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے، اور ایمان والی محصنات تمہارے لئے حلال ہیں۔

مائیں اور تمہاری بیٹیاں . . . . . . اور محصنات بھی حرام ہیں۔

پہلی آیت میں محصنات حلال ہیں، اور دوسری میں حرام

(۲۳) اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ (آل عمران)

(ترجمہ) اگر تم کو مصیبت پہنچی ہے، تو اس قوم کو بھی تمہاری مثل مصیبت پہنچی ہے

(۲۳) اَوَلَمَّآ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْهَا (آل عمران)

(ترجمہ) اور جو مصیبت تم کو پہنچی، تو اس سے دگنی مصیبت تم ان کو پہنچا چکے ہو۔

ایک ہی جنگ کے متعلق پہلی آیت میں مصیبتوں کی نسبت مساوی (۱:۱) دوسری آیت میں یہی نسبت دوگنی (۱:۲)

(۲۴) اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (الاحزاب)

(ترجمہ) جو لوگ اللہ کی رسالت کے فرائض انجام دیتے ہیں، وہ اللہ سے ڈرتے ہیں، اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے

(۲۴) وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ۔ (الاحزاب)

(ترجمہ) اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ ہی حقدار ہے، کہ اس سے ڈرا جائے۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام سانپ سے ڈر گئے تھے، اور ابراہیم علیہ السلام فرشتوں سے (قرآن)

پہلی آیت میں ہے، کہ رسول سوائے اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتا، دوسری میں ہے، کہ دوسروں سے بھی ڈرتا ہے۔

(۲۵) وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (النساء)

(ترجمہ) اگر کوئی بھلائی ان کو پہنچتی ہے، تو کہتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی برائی

(۲۵) مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ( )

(ترجمہ) جو بھلائی آپ کو پہنچتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، جو برائی آپ کو پہنچتی ہے

ان کو پہنچتی ہے، تو کہتے ہیں یہ آپ کی طرف سے ہے آپ کہہ دیجئے کہ سب اللہ کی طرف سے ہے — وہ آپ ہی کی طرف سے ہے۔

پہلی آیت میں برائی کا پہنچانے والا اللہ تعالیٰ ہے، اور دوسری میں خود انسان،

(۲۶) فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (البقرۃ) — (۲۶) فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (البقرۃ)

(ترجمہ) مسجد حرام کی طرف منہ کرو، — (ترجمہ) تم جدھر منہ کرو، ادھر ہی اللہ کا منہ ہے

پہلی آیت میں مسجد حرام کی طرف منہ کرنا فرض، اور دوسری میں مسجد حرام کی طرف منہ نہ کرنے کی اجازت ہے۔

(۲۷) وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ (النور) — (۲۷) وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ (النور)

غیر شادی شدہ مردوں، عورتوں کا نکاح کر دیا کرو اور تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے جو نیک ہوں، ان کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ فقیر ہوں گے، تو اللہ انہیں اپنے فضل سے مالدار کر دے گا، — (ترجمہ) جو لوگ نکاح نہیں کر سکتے انہیں چاہئے کہ پاک دامن رہیں، یہاں تک اللہ انہیں اپنے فضل سے مالدار کر دے۔

پہلی آیت میں ہے، کہ شادی سے فقر دور ہو جاتا ہے، دولتمندی آتی ہے، اور دوسری میں ہے، کہ شادی سے پہلے فقر کو دور کر لو، دولتمندی حاصل کر لو، پھر شادی کرو،

(۲۸) وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ (البقرۃ) — (۲۸) كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ (الکھف)

(ترجمہ) اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا، کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے — (ترجمہ) ابلیس جن تھا، اس لئے اس نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی،

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ ابلیس فرشتہ تھا اور دوسری میں ہے، کہ وہ جن تھا۔

(۲۹) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ — (۲۹) وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي

ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (البقرۃ)

(ترجمہ) جو لوگ کافر ہیں، انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہیں لائیں گے

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (النصر)

(ترجمہ) آپ نے دیکھ لیا، کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔

پہلی آیت میں ہے، کہ ایمان نہیں لائیں گے، اور دوسری میں ہے کہ فوج در فوج ایمان لے آئے۔

(۳۰) هُدًى لِلْمُتَّقِينَ (البقرۃ)

(ترجمہ) قرآن متقی لوگوں کے لئے ہدایت ہے

(۳۰) هُدًى لِلنَّاسِ (آل عمران)

(ترجمہ) سب لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔

پہلی آیت میں صرف متقی لوگوں کے لئے ہدایت ہے، اور دوسری میں ہے، کہ سب لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔

(۳۱) وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (البقرۃ)

(ترجمہ) اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ لیا، تو ان کے آنے کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا، اور تم بڑے ظالم ہو، پھر ہم نے تم کو معاف کر دیا، تاکہ تم شکر ادا کرو

(۳۱) إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ (الاعراف)

(ترجمہ) جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا، ان پر اللہ کا غضب ہوگا، اور دنیا کی زندگی میں ذلت نصیب ہوگی، اور افترا پردازی کرنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔

پہلی آیت میں ہے، کہ سب کو معاف کر دیا، اور دوسری میں ہے، کہ سب کو یا بعض کو عذاب ہوگا،

(۳۲) وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ (ھود)

(ترجمہ) اور اللہ تعالےٰ نے نوح علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ تمہاری قوم میں سے اب کوئی

(۳۲) رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا ... رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا (نوح)

(ترجمہ) نوح علیہ السلام نے کہا اے رب میں نے اپنی قوم کو دن رات تبلیغ کی، لیکن وہ اور زیادہ

ایمان نہیں لائے گا، سوائے ان کے جو ایمان لا چکے ہیں	ہی بھاگے ..... اے رب اب کافروں کو زمین پر زندہ نہ چھوڑ۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے ایمان لانے سے اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ناامید کیا دوسری سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ خود ناامید ہوئے، اور ہلاکت کی دعا کی۔

(۳۳) خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (آل عمران)	(۳۳) وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ (النور)
(ترجمہ) اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا	(ترجمہ) اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔

پہلی آیت میں ہے، کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا، دوسری میں ہے، کہ پانی سے پیدا کیا۔

خلاصہ غرض یہ کہ اس قسم کی متعدد آیات ایسی ہیں، جو غلط فہمی کی وجہ سے بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نظر آتی ہیں، اب کیا ہمارا یہ فرض ہے، کہ دونوں کو یا ایک کو مسترد کر دیں نہیں، ہرگز نہیں، اور نہ ہم ایسا کرتے ہیں، اور نہ برق صاحب ایسا کریں گے، اور جب ایسا نہیں کرتے تو کوئی صورت تطبیق کی نکالنی پڑتی ہے، اور ظاہری تضاد کو دور کر لیتے ہیں، تو پھر آخر کیا مشکل ہے کہ اگر احادیث میں غلط فہمی کی وجہ سے تضاد نظر آئے، تو ان میں تطبیق کے عمل کو بالائے طاق رکھ کر مسترد کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، احادیث کے اختلاف کو اکثر لوگوں نے ایک ہوّا بنا رکھا ہے حالانکہ ایسا اختلاف تو قرآن میں بھی موجود ہے، پھر کیا قرآن کو چھوڑ دیا جائے؟ اگر نہیں تو احادیث کو چھوڑنے کی کیا وجہ؟

غلط فہمی برق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔
"ساری امت، حدیث کو اسلام سمجھ بیٹھی ہے" (دو اسلام ص ۳۴۹)

ازالہ تو پھر برق صاحب آپ کا عقیدہ ساری امت کے خلاف کیوں؟ صحیح ہے، کہ ساری امت حدیث کو اسلام سمجھتی ہے، اور اس کو سمجھنا ہی چاہیئے اس لئے کہ اس کے بغیر قرآن بازیچہ اطفال بن کر رہ جاتا ہے، جو چاہے، جیسے معنی کر لے، اور اس کی مثال میں گذشتہ صفحات میں اور خصوصاً تمہید میں دے چکا ہوں، اور میرا خیال تو یہ ہے، کہ حدیث کو اسلام تو آپ بھی سمجھتے ہیں ہاں موضوع حدیث کو آپ اسلام نہیں سمجھتے، جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے۔

"اسلام دو ہیں، ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے، اور دوسرا وضعی احادیث کا اسلام" (دو اسلام ص ۳۰)

ہم بھی اس وضعی احادیث کے اسلام کی مخالفت میں آپ کے ساتھ ہیں، اور آپ کا یہ بھی ارشاد ہے، کہ:۔

"حاشا و کلاً مجھے حدیث سے بغض نہیں، بلکہ ان انسانی اقوال سے ضد ہے، جنہیں یہودیوں، زندیقوں اور ہمارے فرقہ باز راہنماؤں نے تراش کر مہبط الوحی صلعم کی طرف اس لئے منسوب کر دیا تھا، کہ خدا، رسول اور قرآن کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہ رہے" (دو اسلام ص ۵۹)

ہمیں بھی آپ کے ارشاد سے اتفاق ہے، بے شک بعض لوگوں نے حدیثیں گھڑیں، لیکن وہ حدیثیں الگ چھانٹ دی گئیں، پھر آپ ہی کا یہ بھی ارشاد ہے، کہ:۔

"ائمہ حدیث میں ایسے بزرگ بھی پائے جاتے ہیں، جن پر ملت اسلامیہ کو ہمیشہ ناز رہا ہے، ان کا علمی مقام اتنا بلند، اور ان کے ثقافتی کارنامے اتنے عظیم ہیں، کہ ہمیں ان پر تنقید کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی" (دو اسلام ص ۹۴)

ہم بھی آپ کی تائید کرتے ہیں، آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے، بلکہ آپ کا تو اقوال رسول پر ایمان ہے، جیسا کہ آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"م:۔ تو کیا اقوال رسول قابل ایمان نہیں؟

ب۔ کیوں نہیں! بشرطیکہ کہیں سے کوئی قول رسول مل جائے، رونا تو اسی بات کا ہے، کہ اقوال رسول کا دستیاب ہونا بے حد دشوار ہے، اگر اقوال رسول مل جاتے، تو مجھے یقین ہے، کہ ہر لفظ قرآن حکیم کی تشریح ہوتا، اور قرآن پہ ایمان لانے ہی وہ ہمارے دائرہ ایمان میں شامل ہو جاتے" (دو اسلام ص ۱۱۱)

گویا برق صاحب اقوال رسول پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اقوال رسول قرآن حکیم کی تشریح ہیں، اور ہمیں بھی برق صاحب سے اس معاملہ میں کلیتہً اتفاق ہے، اب رہی یہ بات کہ اقوال رسول ہیں کہاں؟ تو برق صاحب خود آپ ہی کا ارشاد ہے، کہ بہت سے اقوال رسول موجود ہیں، محدثین نے کھرا کھوٹا الگ کر دیا ہے، آپ کی عبارات یہ ہیں۔

"بحمد اللہ کہ اسلام میں کچھ محققین بھی ہو گذرے تھے جنہوں نے ایسے تمام واقعات پر سخت تنقید کی، فجزاہم اللہ احسن الجزاء" (دو اسلام ص ۹)

"اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں، کہ امام مالک کا کردار تقدس اور خلوص تمام شبہات سے ورا تر تھا، اور کہ انہوں نے صحیح کو غلط سے جدا کرنے کے لئے تمام انسانی ذرائع استعمال کئے ہوں گے (دو اسلام ص ۱۶۳)

"اس میں کلام نہیں، کہ امام بخاری (وفات ۲۵۶ھ) نے صحیح احادیث کی تلاش میں لمبے لمبے سفر کئے، ہر حدیث کو پرکھنے کے لئے تمام امکانی وسائل اختیار فرمائے ...... راویوں کا کھوج لگایا، ہر قابل ذکر محدث سے مشورہ کیا، اور سالہا سال کی مسلسل جستجو اور تگاپو کے بعد اپنا مجموعہ تیار کیا" (دو اسلام ص۱۷۵)

برق صاحب کو اعتراف ہے، کہ اس مجموعہ صحیح بخاری میں صرف چند احادیث ناقابل اعتنا ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اس مجموعہ میں چند ایسی احادیث موجود ہیں ...."

گویا ان چند کو نکال کر باقی احادیث کو برق صاحب بھی صحیح سمجھتے ہیں، برق صاحب کو یہ شبہ تھا، کہ اقوال رسول کہیں ہیں ہی نہیں، لیکن اب وہ خود ہی تسلیم کر رہے ہیں، کہ چند احادیث کو نکال کر صحیح بخاری کی تمام احادیث صحیح ہیں فللہ الحمد

لہٰذا ان سے گذارش ہے، کہ اس مجموعہ پر اب ان کو اعتماد کر لینا چاہیے، چند احادیث کے متعلق جو شکوک تھے، وہ دور کر دیئے گئے، لہٰذا پورا مجموعہ صحیح بخاری قطعاً صحیح ہے، پھر برق صاحب آپ ہی نے یہ تحریر فرمایا ہے، کہ:۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، کہ کوئی صحیح حدیث موجود ہی نہیں" (دو اسلام ص۳۴۱)

"دوم۔ کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں" (دو اسلام ص۳۴۱)

آپ ہی کا ارشاد ہے، کہ:۔

"اس طرح کی ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں، جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں، بلکہ وہ آنحضرت صلعم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں، صحابہ کرام کی جرأت، شجاعت ایثار، سرفروشی، خدمت خلق، حرارت ایمانی، عشق رسول، تقوی اور نظم وضبط کی حیات انگیز داستانیں سناتی ہیں، اس عہد کے تمدن پر مکمل روشنی ڈالتی ہیں، اور بتاتی ہیں، کہ اسلام کی حیرت انگیز ترقی کے اسباب کیا تھے؟ اکاسرہ کیوں مٹ گئے، قیاصرہ کو کیوں شکست ہوئی، مٹھی بھر مسلمان سندھ کے ریگستان سے فرانس کی عشرت گاہوں تک کیسے چھا گئے؟ لٹیرے فرمانروا کیسے بن گئے؟ گڈریے اور نگ جہانبانی پر کیسے جا بیٹھے؟ وحشی فلسفہ وحکمت کا درس کیسے دینے لگے؟ شرابیوں اور جواریوں میں اس بلا کی پاکیزگی کہاں سے آگئی؟ ۳۶۰ بتوں کے پجاری ایک خدا، ایک قبلہ، ایک مرکز، اور ایک نصب العین کے تخیل پر کیسے متحد ہو گئے؟

یہ تمام تفاصیل احادیث میں ملتی ہیں، اور یہی وہ بیش بہا سرمایہ ہے جس پر ہم نازاں ہیں، اور جس سے اب تک کروڑوں غیر مسلم متاثر ہو چکے ہیں، مولانا شبلی کے "الفاروق" کا ماخذ یہی احادیث تھیں، اور یہ وہ کتاب عظیم ہے جو اس وقت تک لاکھوں کیرکٹر (کردار) بنا چکی ہے اگر عہد رسول کے ایک فرد کی سیرت اس قدر انقلاب پیدا کر سکتی ہے، تو اندازہ لگائیے، کہ اگر احادیث کے تمام کردار اسی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کر دیئے جائیں تو نتائج کس قدر حیرت انگیز ہو سکتے ہیں" (دو اسلام ص ۳۴۲ ـ ۳۴۳)

برقی صاحب آپ کی یہ عبارات بتا رہی ہیں، کہ صحیح اقوال رسول آپ کو مل چکے ہیں، ہزارہا احادیث صحیح موجود ہیں جن پر آپ نازاں ہیں، لہٰذا اب کیوں نہ ان احادیث پر آپ کا ایمان ہوگا، ضرور ہوگا، کیونکہ آپ نے اپنے آخری باب کا عنوان ہی یہ رکھا ہے، کہ:۔

"صحیح احادیث کو تسلیم کرنا پڑے گا"

فللہ الحمد!

خلاصہ کتاب

برقی صاحب! غلط فہمی سے آپ نے تدوین حدیث اور بعض صحیح احادیث پر اعتراض کئے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، کہ آپ کی ان غلط فہمیوں کا گذشتہ صفحات میں ازالہ کر دیا گیا ہے، آپ نے جو اعتراض کئے تھے، وہ نیک نیتی سے کئے تھے، ورنہ حقیقت میں آپ حدیث کے منکر نہیں ہیں، آپ نے جو کچھ لکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے والہانہ عقیدت کی بنا پر لکھا، اس لئے اس میں ایک حد تک آپ معذور ہیں،

اب اس کتاب کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ مولوی فاضل، ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ، پروفیسر اسلامک اسٹڈیز پیرس یونیورسٹی کے ایک مفید اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"حدیث نبوی اصل میں دو ستونوں پر قائم ہے، کتابت، اور قرأت سماعت، اور وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں، اگر کوئی شخص حدیث نبوی کے تحفظ اور صحت میں جو حزم و احتیاط برتی جاتی رہی ہے، اس کا مقابلہ اسلام سے پہلے دوسرے پیغمبروں کی حدیثوں کے ساتھ، جو معاملہ ہوا اس سے، اور اسی طرح ہمارے اس موجودہ زمانہ کی تاریخ سے کرتا ہے، جو اخبارات و جرائد کے عمداً جھوٹ اور سرکاری دستاویزوں کے مکارانہ بیانات اور تدلیسات پر مبنی ہوتی ہے، اور فکر سلیم سے کام لے، تو اس پر حدیث کی فضیلت اور فوقیت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی

واضح ہو جائے گا، کہ محدثین کے کارنامے، عہد صحابہ سے لے کر آج تک جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہ سکے ہیں، کتنی فوقیت رکھتے ہیں! مسلمانوں کی حدیث اور غیروں کی حدیث میں وہی فرق ہے، جو زمین و آسمان میں ہے، اور ان دونوں کے فرق کا کیا ٹھکانہ ہے، حدیث اسلامی کی خوبیوں پر نہ دشمن کا معاندانہ طعن و طنز پردہ ڈال سکتا ہے، اور نہ دوستوں کی ناواقفیت"

(پیش لفظ صحیفہ ہمام بن منبہ طبع ثالث ص ۶۲)

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

ضمیمہ

رسول کی اتباع واطاعت کی اہمیت جاننے کے لئے یہ ضروری ہے، کہ ہم قرآن کی وہ تمام آیات مطالعہ کریں، جن میں رسول پر ایمان لانے کا حکم ہے، یا جن میں رسول کی اطاعت واتباع کو لازم قرار دیا گیا ہے، اور اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، وہ آیات درج ذیل ہیں:-

(۱) اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (البقرۃ)

ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

(۲) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (البقرۃ)

اور جس قبلہ پر کہ آپ ہیں، وہ ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا، کہ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کون رسول کا اتباع کرتا ہے، اور کون الٹے پاؤں کفر کی طرف واپس ہو جاتا ہے، اور رسول کی اطاعت اگرچہ بہت مشکل چیز ہے، مگر ان لوگوں کے لئے کچھ مشکل چیز نہیں، جن کو اللہ تعالٰی نے ہدایت دی ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے، کہ اتباع رسول کتنی اہمیت کی چیز ہے، کہ اس کی جانچ کے لئے احکام میں ترمیم وتنسیخ کی جا رہی ہے، ایسی ایسی باتوں کا حکم دیا جاتا ہے کہ جن میں بظاہر کوئی اہمیت نظر نہیں آتی، تاکہ رسول پر ایمان لانے والے اور اپنی عقلوں پر ایمان لانے والوں میں امتیاز پیدا ہو جائے، اور رسول کے سچے متبعین، جھوٹوں سے ممتاز ہو جائیں، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتباع رسول ہدایت والے ہی کر سکتے ہیں، اور جو اتباع رسول سے منہ موڑتے ہیں محض اس لئے کہ حکم رسول کی مصلحت ان کی عقل میں نہیں آتی، وہ گویا کفر کی طرف واپس ہو جاتے ہیں۔

(۳) لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرۃ)

یہ نیکی نہیں ہے، کہ مشرق کی طرف منہ کیا جائے یا مغرب کی طرف، بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، قیامت پر، فرشتوں پر کتاب پر، اور انبیاء پر ایمان لائے۔

(۴) كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (البقرة)

ہر ایک ایمان لایا اللہ پر، اور اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر، مومن اسی طرح کہتے ہیں، کہ ہم رسولوں میں سے کسی ایک میں تفریق نہیں کرتے، اور اسی طرح کہتے ہیں، کہ ہم نے رسول کی بات سنی، اور ہم نے اطاعت کی۔

(۵) فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ (آل عمران)

پس اگر کافر حجت کریں، تو کہہ دیجئے کہ میں نے اللہ کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا ہے، اور یہی کام ان لوگوں نے بھی کیا ہے، جو میری اتباع کرتے ہیں۔

(۶) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران)

کہہ دیجئے، کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ ہے، تو میری اتباع کرو، پھر اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے کے لئے یہ لازمی ہے، کہ وہ اتباع رسول کرے، خواہ اللہ سے محبت کرنے والا مرکز ملت ہو یا عام آدمی، خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم اللہ اسی شخص سے محبت کرتا ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے

(۷) قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران)

کہہ دیجئے کہ اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اگر تم اس اطاعت سے منہ موڑو، تو اللہ ایسے کافروں سے محبت نہیں کرتا،

گویا اطاعت رسول سے انحراف کفر ہے، اور غضب الٰہی کا سبب ہے

(۸) رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (آل عمران)

عیسیٰ علیہ السلام کے حواری دعا کرتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمایا، اور ہم نے رسول کی پیروی کی، پس ہم کو شاہدین کے ساتھ لکھ لے۔

کتاب الٰہی پر ایمان لانے کا ذکر کر کے پھر اتباع رسول کا ذکر کیا، حالانکہ انہیں یہ کہنا چاہئے تھا کہ اس کتاب کی ہم نے پیروی کی، لیکن اتباع رسول کا ذکر کر کے اس کی اہمیت کو واضح کر دیا، گویا اتباع

رسول کے بغیر ایمان و عمل بے کار ہے۔

(۹) اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (آل عمران) | ابراہیم سے تو ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی، اور اس نبی کا تعلق ہے، اور مومنین کا تعلق ہے،

یہاں بھی رسول کی پیروی پر زور دیا گیا ہے۔

(۱۰) وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (آل عمران) | اور جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جب تمہیں کتاب اور حکمت مل جائے، پھر کوئی نبی مبعوث ہو، جو تمہاری شریعت کی تصدیق کرتا ہو، تو اس پر ضرور ایمان لانا، اور اس کی مدد کرنا

(۱۱) وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ (آل عمران) | تم کیسے کفر کر سکتے ہو، حالانکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جا رہی ہیں، اور اللہ کا رسول تم میں موجود ہے

گویا اللہ کے رسول کی موجودگی بہت ہی اہمیت رکھتی ہے۔

(۱۲) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (آل عمران) | اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے،

گویا بغیر اطاعت رسول کے رحمت کی امید فضول ہے

(۱۳) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران) | محمد رسول ہی تو ہیں، ان سے پہلے بھی رسول ہو چکے ہیں پس اگر وہ انتقال فرما جائیں، یا شہید ہو جائیں، تو کیا تم الٹے پاؤں کفر کی طرف واپس ہو جاؤ گے، اور جو کوئی واپس ہو گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اور اللہ شکر کرنے والوں کو جزائے خیر دے گا۔

(۱۴) لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ | بے شک اللہ نے مومنین پر احسان کیا ہے کہ ایک رسول انہیں میں سے مبعوث فرمایا جو

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ (آل عمران) — اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے

آیت نمبر ۱۳۳ میں فرمایا، کہ شکر کرنے والوں کو جزا ملے گی، اور آیت نمبر ۱۶۴ میں فرمایا، کہ رسول کی بعثت احسان عظیم ہے، لہذا شکر بھی اس احسان ہی کا ادا کرنا مقصود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے گا، جو بعثت رسول کا شکر ادا کرتے ہیں، اور وہ اس طرح نہیں، کہ اس کی زندگی میں شکر ادا کریں، اور موت کے بعد نہیں، یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک نکتہ بیان فرمایا ہے، وہ یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہر حال ایک رسول ہیں، لہذا ان کو موت آنا لازمی ہے، تو پھر یہ نہیں ہونا چاہیئے، کہ اطاعت کو زیست کا تابع بنا دیا جائے، اور بعد میں اطاعت سے منہ موڑ لیا جائے، نہیں بلکہ رسول اور اس کی اطاعت کا سوال اس کی زیست کے ساتھ وابستہ نہیں، بلکہ دائمی ہے، اگر اس کی رسالت دائمی ہے، تو اطاعت بھی دائمی ہے۔

(۱۵) وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران) — اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا، جب کہ تم اس کے حکم سے کافروں کا قلع قمع کر رہے تھے یہاں تک کہ تم نے نامردی دکھائی، اور حکم رسول میں اختلاف کیا، اور اس کے حکم کی نافرمانی کی، حالانکہ حسب دلخواہ تم کو فتح مل چکی تھی

گویا حکم رسول کی نافرمانی کرنے کی شامت میں فتح و کامرانی کو مصیبت میں تبدیل کر دیا گیا،

(۱۶) مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (آل عمران) — تم میں سے کسی کو اللہ غیب پر مطلع نہیں کرتا لیکن اپنے رسولوں کو اس کام کے لئے منتخب کر لیتا ہے پس تم اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ

بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ وہ رسول جسے غیب پر مطلع کیا گیا ہو، اس کی تشریح قرآنی غیر مستند ہو، اور دوسروں کی مستند مانی جائے،

(۱۷) رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ (آل عمران) — اے ہمارے رب ہمیں وہ چیزیں عطا فرما جو تو نے اپنے رسول کے ذریعہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے

یہاں بھی کتاب الٰہی کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ کتاب الٰہی میں تمام وعدے نہیں ہوتے بلکہ تمام

وعدوں کا جامع رسول ہے، اس کے بیان میں کتاب الٰہی کے علاوہ دوسرے وعدے بھی شامل ہوتے ہیں۔

(۱۸) مَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (النساء)	جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اللہ اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔
(۱۹) وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ يُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِيۡهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ (النساء)	اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، اور اس کے حدود سے آگے نکل گیا، اللہ اس کو ہمیشہ کے لئے دوزخ میں داخل کرے گا اور اس کے لئے ذلت کا عذاب ہوگا
(۲۰) يَوۡمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَعَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ وَلَا يَكۡتُمُوۡنَ اللّٰهَ حَدِيۡثًا (النساء)	قیامت کے دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اور رسول کی نافرمانی کی ہوگی یہ چاہیں گے کہ کاش انہیں مٹی میں ملا دیا جائے، اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے،
(۲۱) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ‌ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا (النساء)	اے ایمان والو اللہ تعالےٰ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے امراء کی، ہاں اگر امراء سے تمہارا اختلاف ہو جائے تو اللہ تعالےٰ اور رسول کی طرف رجوع کرو، اگر تم اللہ تعالےٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے، اور عمدہ بات ہے۔

دو جگہ "اَطِيۡعُوا" کا لفظ ذکر کر کے رسول کی اطاعت کو مستقل حیثیت دی گئی ہے، اور اس سے اختلاف کو جائز ہی نہیں سمجھا گیا، بلکہ تمام اختلافات کے وقت اس کی طرف رجوع کرنے کو ایمان کی نشانی بتایا گیا ہے۔

(۲۲) وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ رَاَيۡتَ	اور جب ان سے کہا جاتا ہے، کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ شریعت کی طرف اور رسول کی طرف

الْمُنَافِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء) — تو آپ دیکھیں گے کہ منافقین آپ کے پاس آنے سے اعراض کرتے ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوا، کہ رسول سے اعراض کرنے والا منافق ہے، اگر "الیٰ ما انزل اللہ اور الی الرسول" کی درمیانی واؤ کو واؤ تفسیری مانا جائے، تو صاف ظاہر ہے، کہ جو کچھ رسول کہے وہ سب "ما انزل اللہ" ہے، اور اگر اس واؤ کو واؤ معطوفہ مانا جائے، اور "ما انزل اللہ" سے قرآن مراد لیا جائے، تو پھر یہ ظاہر ہے، کہ "الی الرسول" قرآن کے علاوہ مستقل ماخذ قانون ہے۔

(۲۳) وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء) — اور ہم نے ہر رسول کو اس لئے بھیجا ہے، کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے

یہاں بھی کتاب الٰہی کا ذکر نہیں کیا، بلکہ رسول کی اطاعت کا ذکر کیا، تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے اور لوگ یہ نہ سمجھ لیں، کہ بس کتاب الٰہی کی اطاعت ہم پر فرض ہے، کیونکہ وہ اللہ کی اطاعت ہے اور اللہ کے ساتھ دوسرے کی اطاعت شرک ہے، لہٰذا اللہ ہی نے فرمادیا، کہ ہمارے حکم سے رسول کی اطاعت کرو، گویا رسول کی اطاعت ہمارے حکم دینے کی وجہ سے شرک نہ ہوگی، بلکہ رسول ہونے کی وجہ سے وہ جو کچھ کہے گا، وہ ہمارا ہی حکم ہوگا، اس کا ذاتی حکم نہ ہوگا، ہاں اگر تم اپنی طرف سے کسی کی اطاعت کروگے، تو یہ شرک ہوگا، کیونکہ اللہ نے اس کی اطاعت کا حکم نہیں دیا، اور اسی ضمن میں ائمہ کی تقلید بھی آجاتی ہے، جو شرک ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی امام کی تقلید ہم پر فرض نہیں کی، نہ اس کی اجازت دی، صرف رسول کی اطاعت کا حکم دیا، لہٰذا رسول کی اطاعت شرک نہیں، بلکہ اللہ کے حکم سے فرض عین ہے

یہاں "رسول" سے مراد مرکز ملت لینا کسی طرح صحیح نہیں، اس لئے کہ مرکز ملت کو اللہ نہیں بھیجتا بلکہ لوگ منتخب کرتے ہیں، اور آیت میں بھیجنے کا ذکر ہے، لہٰذا رسول ہی کی اطاعت مستقلاً فرض ہے نہ کہ کسی اور کی،

(۲۴) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا — آپ کے رب کی قسم لوگ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے تمام اختلافات میں آپ کو حاکم نہ مان لیں، پھر آپ کے فیصلے سے دل میں تنگی بھی محسوس نہ کریں بلکہ

تَسْلِيْمًا (النساء) برضا و رغبت تسلیم کر لیں۔

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و اطاعت کو کتنے مہتم بالشان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس سے مرکز ملت کی اطاعت مراد ہے، اور پھر صرف عملی اور ظاہری اطاعت پر ہی زور نہیں دیا گیا، بلکہ دل کی اطاعت اور کشادگی پر بھی زور دیا گیا ہے، گویا ایمان کی شان یہ ہے، کہ رسول کی بات دل سے مانی جائے، اس پر ایمان ہو، جو شخص عملاً تو اطاعت کرتا ہے لیکن دل سے تسلیم نہیں کرتا، آیت کی رو سے وہ بھی مومن نہیں، چہ جائے کہ وہ شخص جو نہ دل سے مانے نہ عمل سے، وہ تو کھلا باغی ہے۔

(۲۵) وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (النساء)

جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔

(۲۶) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء)

جس نے رسول کی اطاعت کی پس در حقیقت اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔

گویا رسول کی اطاعت عین اطاعت الٰہی ہے، اور اس بنا پر رسول کی اطاعت شرک نہیں ہے، اس لئے، کہ وہ جو کچھ کہتا ہے، اپنی طرف سے نہیں کہتا، بلکہ وہ تو احکام خداوندی پہنچاتا ہے۔

(۲۷) وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء)

جو شخص ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسول کے خلاف چلے، اور مسلمانوں کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ کو اختیار کرے، تو ہم بھی اسے ادھر ہی جانے دیں گے، اور اس کو دوزخ میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

چودہ سو سال سے مسلمانوں کا یہی راستہ رہا ہے، کہ وہ اللہ و رسول سے قرآن و حدیث ہی مراد لیتے رہے، اب جو اس راستہ کو چھوڑ کر اللہ و رسول کے معنی مرکز ملت کرتا ہے، وہ گویا ہدایت کے آجانے کے بعد رسول کی مخالفت کرتا ہے، اور اپنا ٹھکانہ جہنم میں بناتا ہے۔

(۲۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ

اے ایمان والو، ایمان لاؤ، اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس پر نازل کی گئی، اور اس کتاب پر بھی جو پہلے نازل کی

اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۔ (النساء)	گئی ہے، اور جو انکار کرے اللہ کا، اور اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اور اس کے رسولوں کا، اور قیامت کے دن کا، تو وہ بہت بڑی گمراہی میں مبتلا ہو گیا،
(۲۹) اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (النساء)	بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسولوں کے مابین تفریق کرنا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں، کہ بعض پر ہم ایمان لاتے ہیں، اور بعض پر نہیں لاتے، اور چاہتے ہیں، کہ درمیان میں کوئی راستہ نکال لیں، ایسے لوگ ہی حقیقی کافر ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ جو اہل کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے، وہ کافر ہے۔

(۳۰) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء)	اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اور ان میں تفریق نہیں کی، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے گا، اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے
(۳۱) رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (النساء)	اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے، بشارت دینے والے اور ڈرانے والے، تاکہ لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

اس آیت میں بھی کتاب الٰہی کو حجت تمام کرنے والا نہیں فرمایا، کیونکہ کتب الٰہی کی موجودگی میں اختلافات باقی رہ سکتے ہیں، اور گمراہی پھیل سکتی ہے، لیکن رسول کے آجانے کے بعد اختلافات ختم ہو جاتے ہیں، تاویلات بعیدہ کا سدباب ہو جاتا ہے، اور اختلافات، اور گمراہی پر اڑے رہنے کی کوئی حجت باقی نہیں رہتی، گویا رسول کی ذات ہی اتمام حجت ہے، اور بس،

(۳۲) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ	اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کیطرف

الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ (النساء)	سے حق کے ساتھ رسول آگیا، پس ایمان لے آؤ، یہ تمہارے لئے بہتر ہے
(۳۳) فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (النساء)	پس اللہ تعالےٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ،
(۳۴) اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ (المائدۃ)	(اے بنی اسرائیل) میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم کی، اور زکوۃ ادا کی، اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی اعانت کی،
(۳۵) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (المائدہ)	اے اہل کتاب بے شک تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا، جو شریعت کی ان باتوں میں سے جو تم چھپاتے تھے بہت سی باتوں کو بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے درگذر کرتا ہے،
(۳۶) يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ (المائدہ)	اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آ چکا ہے، جو اگلے رسولوں کے آنے کے بہت مدت بعد آیا ہے، کہ کہیں تم یہ نہ کہہ دو، کہ ہمارے پاس تو کوئی بشیر اور نذیر آیا ہی نہیں لہٰذا اب تمہارے پاس بھی بشیر اور نذیر آگیا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کی طرف بھی نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، نہ کہ صرف مکے کے کفار کی طرف، جیسا کہ بعض لوگ غلط فہمی سے کہدیا کرتے ہیں۔

(۳۷) اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْۤا اَوْ يُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (مائدہ)	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں، اور ملک میں فساد برپا کرتے ہیں، ان کو قتل کر دیا جائے، یا پھانسی دے دی جائے یا مخالف طرف کے ہاتھ پیر کاٹ دیئے جائیں، یا جلا وطن کر دیا جائے (یا قید کر دیا جائے)

(۳۸) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (البقرۃ)

پس اگر تم سود لینا نہیں چھوڑو گے، تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے تم کو اعلانِ جنگ دیا جاتا ہے۔

(۳۹) اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (المائدہ)

تمہارا دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول ہونا چاہیئے، اور وہ مومنین ہونے چاہئیں جو نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اور رکوع کرتے ہیں، یعنی عاجزی کرتے ہیں۔

(۴۰) وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (المائدۃ)

اور جو شخص اللہ، اس کے رسول، اور ایمان والوں کو دوست رکھے، پس ایسے ہی لوگ اللہ کا لشکر ہیں، اور یہی غالب ہیں۔

(۴۱) وَلَوْ كَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِیِّ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (المائدہ)

اور اگر بنی اسرائیل اللہ، نبی اور جو کچھ اس کی طرف اتارا گیا ہے، اس پر ایمان لاتے، تو کبھی بھی کافروں کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

(۴۲) وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (المائدۃ)

اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور ڈرتے رہو، اگر تم اس کی اطاعت سے منہ موڑو، تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے۔

(۴۳) وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ (المائدۃ)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے، کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور رسول کی طرف، تو کہتے ہیں، کہ جس راستہ پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا وہی کافی ہے کیا ایسی حالت میں بھی جب کہ ان کے آباؤ اجداد کو کچھ علم ہی نہ تھا، اور نہ وہ ہدایت یافتہ تھے

اس آیت سے رسول کا ماخذ قانون ہونا بالبداہت ثابت ہے۔

(۴۴) اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ (المائدہ)
مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ

(۴۵) وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰی نُؤْتٰی مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام)
اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں، کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہمیں بھی ویسی ہی چیز نہ ملے جیسی اللہ کے رسولوں کو ملی، اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کو دے۔

اس آیت سے منصب۔ رسالت کی بلندی آشکارا ہے، ایسی بلند مرتبہ شخصیت کی تشریح کے ہوتے ہوئے، دوسرے شخص کی تشریح کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، اور نہ ہی شریعت میں اس کی کوئی قدر و قیمت ہے۔

(۴۶) رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الاعراف)
میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، میں اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو پرہیزگاری کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، یعنی وہ لوگ جو رسول، نبی امی کی پیروی کرتے ہیں، جس کا تذکرہ وہ تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ رسول ان کو نیک باتوں کا حکم دیتا ہے، بری باتوں سے روکتا ہے، ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے، اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے، اور ان کے طوق اور بوجھ اتار کر پھینک دیتا ہے جو طوق اور بوجھ ان پر رکھ دیے گئے تھے پس جو لوگ اس پر ایمان لائے، اس کو قوت دی، اس کی مدد کی، اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اتباع رسول کی اہمیت کو کتنے شاندار الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، پھر شریعت سازی کو اللہ تعالےٰ

نے رسول کی طرف منسوب کر کے بتا دیا، کہ جو کچھ رسول کہے، وہ دین ہے، وہ نور ہے، اس کی اتباع موجب فلاح ہے۔

(۴۷) قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (الاعراف)

کہہ دیجیے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، وہ اللہ جس کی حکومت آسمانوں میں اور زمینوں میں ہے، اس کے سوائے کوئی حاکم (معبود) نہیں، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے، پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول، نبی امی پر بھی ایمان لاؤ، وہ نبی بھی اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے، اور تم اس ہی کی پیروی کرو، تاکہ تمہیں ہدایت مل جائے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا، کہ اتباع رسول کے بغیر ہدایت نہیں مل سکتی، کیا کوئی کہہ سکتا ہے، کہ اس آیت اور گذشتہ آیت میں رسول سے مراد مرکز ملت ہے۔

(۴۸) قُلِ الْأَنفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (الانفال)

کہہ دیجیے، کہ مال غنیمت اللہ تعالے، اور رسول کے لئے ہے، پس اللہ سے ڈرو، اور اپنے آپس کے معاملات کی اصلاح کرو، اور اللہ تعالے، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم مومن ہو،

(۴۹) ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَن يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (الانفال)

کافروں پر یہ مصیبت اس لئے آئی کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے پس بیشک اللہ سخت عذاب والا ہے

(۵۰) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ (الانفال)

اے ایمان والو اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اس سے منہ مت موڑو ایسی حالت میں کہ تم اس کا حکم سن رہے ہو،

(۵۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے

لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال)

احکام قبول کرو، جب وہ تمہیں بلائیں ایسی چیز کی طرف جس کے ذریعہ تمہیں اصلی زندگی نصیب ہو۔

(۵۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الانفال)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت مت کرو، اور جان بوجھ کر اپنی امانتوں میں بھی خیانت مت کرو،

(۵۳) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (الانفال)

خبردار ہو جاؤ، کہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ تعالے کے لئے ہے، اور رسول کے لئے ہے، اقربا، یتامی، مساکین اور مسافروں کے لئے ہے۔

(۵۴) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (الانفال)

اور اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں مت جھگڑو، ورنہ نامرد ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی،

(۵۵) بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (التوبۃ)

جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا، اللہ اور اس کا رسول ان سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔

(۵۶) وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ (التوبۃ)

اللہ تعالے اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن اعلان عام ہے، کہ بے شک اللہ تعالے اور اس کا رسول مشرکین سے بیزار ہیں۔

اس آیت کے آخری حصہ میں اللہ اور اس کے رسول کے درمیان "بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ" کے الفاظ ہیں، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ اللہ اور رسول دو مختلف ہستیاں ہیں، نہ یہ کہ "اللہ و رسول" ایک ہی معنی ہے یعنی "مرکز ملت" اگر بالفرض محال ایسا ہوتا بھی، تو دونوں کو اس طرح علیحدہ نہ کیا جاتا، بلکہ جہاں اللہ تھا، اس کے متصل "رَسُوْلُهٗ" بھی ہوتا، اور کیونکہ ایسا نہیں ہے، لہذا بالبداہت ثابت ہوا، کہ "اللہ و رسول" سے مراد مرکز ملت ہرگز نہیں، اور یہ آیت اس زعم باطل کے پرخچے اڑانے کے لئے بھرپور وار ہے۔

(۵۷) كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (التوبۃ)	اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک مشرکین کے لئے عہد کیسے ہو سکتا ہے ہاں جن سے تم نے مسجد حرام کے قریب معاہدہ کیا ہے، وہ مستثنیٰ ہیں۔

یہاں بھی "عند اللہ و رسولہ" نہیں ہے، بلکہ "عند اللہ" اور "عند رسولہ" علیحدہ علیحدہ ہیں اس سے بھی یہ ثابت ہوا، کہ یہ دو ہستیاں ہیں، نہ کہ دونوں کو ملا کر ایک ہستی، اسی طرح اللہ اور رسول کے ساتھ "اطیعوا" علیحدہ علیحدہ آنا بھی اسی بات کو ثابت کرتا ہے

(۵۸) اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (التوبۃ)	کیا تم گمان کرتے ہو، کہ یوں ہی چھوڑ دیئے جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے یہ معلوم ہی نہیں کیا، کہ کون تم میں سے جہاد کرتا ہے، اور کون اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور مؤمنین کے علاوہ کسی کو دوست نہیں بناتا، اللہ کو سب خبر ہے، جو تم کر رہے ہو۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے رسول کو اپنے سے، اور مؤمنین سے علیحدہ ذکر کیا ہے، نہ کہ اللہ اور رسول کو ایک جگہ جمع کیا، جس سے مرکز ملت مراد لیا جائے، اور نہ رسول کو مؤمنین میں شمار کیا، بلکہ رسول کو مؤمنین کا مطاع ہونے اور اپنا رسول ہونے کے لحاظ سے الگ ذکر کر کے اس کے بلندی مقام کی طرف اشارہ کیا، اس سے یہ دعویٰ بھی باطل ہو گیا، کہ کیونکہ رسول بھی مؤمن ہے، لہٰذا اس پر بھی اللہ و رسول یعنی مرکز ملت کی اطاعت فرض ہے" اس دعویٰ کی حقیقت ایسی ہی ہے، جیسے کوئی کہے، کہ نفس اللہ کا بھی ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (البقرۃ) اللہ تعالیٰ اپنے نفس سے تم کو ڈراتا ہے

لہٰذا اللہ کو بھی (نعوذ باللہ) موت آئے گی، جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران) ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔

رسول کو مؤمنین میں شمار کر کے اس پر مرکز ملت کی اطاعت کو فرض قرار دینا ایسا لغو دعویٰ ہے، کہ اس کے توڑنے کی چنداں حاجت ہی نہیں ہے،

(۵۹) قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ	کہہ دیجیئے، کہ اگر تم کو اپنے آباء و اجداد، اور

وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (التوبۃ)

اولاد، بھائی بند، بیویاں، اور رشتہ دار، اور وہ مال جو تم نے کمایا ہے، اور وہ تجارت جس کے مندا ہو جانے سے تم ڈرتے رہتے ہو، اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کے راستہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہانتک کہ اللہ اپنا حکم نازل فرمائے (یعنی عذاب بھیجے) اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

(٦٠) قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (التوبۃ)

ان اہل کتاب سے لڑو، جو اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں لاتے، اور ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے، جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کر دیا ہے، اور سچے دین کو قبول نہیں کرتے، اور اس وقت تک لڑائی جاری رکھو، جب تک وہ ذلیل ہو کر جزیہ دینا قبول نہ کریں۔

اس آیت سے بھی ثابت ہوا کہ تحریم کا اختیار رسول کو بھی دیا گیا ہے، اور مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی کے ماتحت رسول کا حرام کیا ہوا بالکل ایسا ہی ہے، جیسا کہ اللہ کا حرام کیا ہوا، اگر تحلیل و تحریم صرف قرآن کے ذریعہ ہی سے ہوتی تو اس آیت میں اس کام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول کی طرف منسوب نہ کیا جاتا۔

(٦١) هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (التوبۃ)

اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، تاکہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے، اگرچہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

رسول کی علو شان ملاحظہ فرمائیے، کیا مرکز ملت کی بھی یہی شان ہے، کیا مرکز ملت کو بھی اللہ ہی مبعوث فرماتا ہے، یا قوم منتخب کرتی ہے؟ کیا اس آیت میں بھی رسول سے مراد مرکز ملت ہے،

(۶۲) وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ (التوبۃ)

اگر منافق اس چیز سے راضی ہو جاتے، جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دی، اور کہتے، کہ ہم کو اللہ کافی ہے، وہ ہم کو اپنے فضل سے دیگا اور اس کا رسول دے گا، بے شک ہم اللہ کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

یہاں بھی "مِنْ فَضْلِهٖ" بیچ میں لاکر یہ ثابت کر دیا، کہ اللہ اور رسول دو ہستیاں ہیں، نہ کہ ایک یعنی مرکز ملت۔

(۶۳) وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (التوبۃ)

بعض منافق نبی کو ایذا پہنچاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ اُذن ہے، کہہ دیجئے کہ اذن ہونا یعنی تمہاری مکاری کی باتیں سنکر چشم پوشی کرنا تمہارے لئے بہتر ہے، وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، اور مسلمانوں کی بات بھی مان لیتا ہے، اور تم میں سے وہ لوگ جو درحقیقت مومن ہیں ان کے لئے تو وہ رحمت مجسم ہے، اور جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

(۶۴) وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ (التوبۃ)

ان سے مال قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا گیا، کہ انہوں نے اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا،

(۶۵) يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ (التوبۃ)

منافقین تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ تم راضی ہو جاؤ، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ حقدار ہے، کہ اسے راضی کیا کریں اگر وہ مومن ہیں۔

(۶۶) اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ (التوبۃ)

کیا انہیں یہ معلوم نہیں ہے، کہ جو شخص اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کے خلاف چلتا ہے، اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، یہ بڑی رسوائی ہے۔

(۶۷) وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ (التوبۃ)

اگر آپ ان سے پوچھیں، تو کہہ دیں گے، کہ ہم تو یوں ہی بحث و مذاق کرتے تھے، آپ کہہ دیجیے، کیا اللہ، اس کی آیات، اور اس کے رسول سے مذاق کرتے ہو۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کے درمیان لفظ "آیات" ہے، یعنی اللہ و رسول مل کر کوئی ایک فرد نہیں، بلکہ الگ الگ دو ہستیاں ہیں، لہٰذا اس آیت میں "اللہ اور رسول" سے مرکز ملت مراد لینا قطعاً ناممکن ہے۔

(۶۸) وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (التوبۃ)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں، لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہیں، اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں اللہ ان پر جلد رحم فرمائے گا بے شک اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

اس آیت میں بھی رسول کو مومنین سے علیحدہ شمار کیا گیا ہے، اب اگر رسول کو بھی مومنین میں شمار کر لیا جائے، اور "اللہ و رسول" سے مرکز ملت مراد لیا جائے تو پھر یہ سوچنا چاہیے، کہ وہ کونسا مرکز ملت ہے، جس کی اطاعت رسول کو بھی کرنی پڑتی ہے۔

(۶۹) وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِن فَضْلِهِ (التوبۃ)

منافقین اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے اور اس بات کا ارادہ کیا، جو ان کو نہ مل سکی، کیا یہ اس بات کا بدلہ لے رہے ہیں، کہ اللہ اور اس کے رسول نے اللہ کے فضل سے ان کو مالدار کر دیا۔

(۷۰) اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاللَّهُ

ان منافقین کے لئے آپ استغفار کریں یا نہ کریں، اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (التوبۃ)

کے ساتھ کفر کیا، اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

(۷۱) وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ (التوبۃ)

اور ان منافقین میں سے اگر کوئی مرجائے، تو آپ اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیئے، اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں، بے شک انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا، اور اس حالت میں مر گئے، کہ وہ فاسق تھے۔

(۷۲) لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ (التوبۃ)

اگر ضعیف، مریض، اور ایسے لوگ، جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں، جہاد نہ کریں، تو کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کریں۔

(۷۳) وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (التوبۃ)

اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول تمہارے اعمال کو دیکھیں گے، پھر تم اللہ عالم الغیب والشہادۃ کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے، اور وہ تمہیں بتائے گا، جو کچھ تم کرتے تھے۔

(۷۴) وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ قُرُبَاتٍ عِندَ اللَّهِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ ۚ أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ (التوبۃ)

اور بعض دیہاتی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں، اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس سے اللہ کا تقرب، اور رسول کی دعائے خیر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خبردار بے شک یہ چیز ان کے لئے باعث تقرب ہے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ اور رسول دو ہستیاں ہیں، نہ کہ اللہ اور رسول ملا کر ایک ہستی یعنی مرکز ملت۔

(۷۵) خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ

اے رسول ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر ان کو مطہر و مزکی بنائیے، اور ان کے لئے دعا کیجیئے، بے شک آپ کی دعا ان

وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (التوبۃ)

کے لئے باعث تسکین ہے، اور اللہ تعالیٰ سمیع اور علیم ہے۔

کیا کسی مرکز ملت کی دعا بھی باعث تسکین ہو سکتی ہے، کیا اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت ہے۔

(۷۶) قُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُہٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (التوبۃ)

کہہ دیجئے، کہ عمل کرو، تمہارے اعمال کو اللہ اور اس کا رسول اور مومنین دیکھیں گے

اس آیت میں بھی رسول کو، اللہ اور مومنین سے الگ ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ رسول ایک ایسی ہستی ہے، جو اللہ تعالیٰ اور مومنین کے درمیان واسطہ ہے، جب تک اس واسطہ کی اتباع نہ کی جائے، اللہ کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۷۷) وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّکُفْرًا وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی وَاللّٰہُ یَشْہَدُ اِنَّہُمْ لَکٰذِبُوْنَ (التوبۃ)

اور جن لوگوں نے ضرر پہنچانے، کفر کرنے اور مسلمانوں کے درمیان تفریق پیدا کرنے، اور ان لوگوں کے گھات میں بیٹھنے کے لئے جو پہلے ہی سے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ رہے ہیں مسجد بنائی، اور وہ قسمیں کھائیں گے، کہ ہمارا ارادہ بھلائی کا تھا، اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں

(۷۸) لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (التوبۃ)

بے شک تمہارے پاس تم میں سے ایسا رسول آیا ہے، کہ تمہاری تکلیف اس پر شاق گذرتی ہے، تمہاری بھلائی کا حریص ہے، اور مومنین کے لئے رؤف ہے رحیم ہے،

کیا کسی مرکز ملت کی بھی یہی شان ہے؟ کیا یہاں بھی رسول سے مراد مرکز ملت ہے،

(۷۹) قُلْ ہٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (یوسف)

کہہ دیجئے کہ یہ ہے میرا راستہ، میں تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، بصیرت پر میں بھی ہوں اور میری پیروی کرنے والے بھی، اور اللہ پاک ہے، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اتباع رسول کی اہمیت اس آیت سے واضح ہے۔

(۸۰) الٓرٰ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ (ابراھیم)

یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف اس لئے نازل کی ہے، تاکہ آپ لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف لے آئیں، ان کے رب کے حکم سے اللہ عزت والے تعریف والے کے راستہ کی طرف لے آئیں۔

تاریکی سے روشنی کی طرف لانے کا فاعل رسول ہے، نہ کہ کتاب الٰہی، غور فرمایئے۔

(۸۱) وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ یَتَفَكَّرُوۡنَ (النحل)

اور ہم نے اس نصیحت کو آپ کی طرف نازل فرمایا ہے، تاکہ آپ لوگوں کے لئے اس چیز کی تشریح کر دیں، جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے، اور شاید وہ غور کریں۔

(۸۲) قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ (الحج)

کہہ دیجئے، کہ اے لوگوں میں تم سب کے لئے نذیر مبین ہوں۔

کیا اس معاملہ میں کوئی مرکز ملت آپ کا شریک ہو سکتا ہے۔

(۸۳) وَیَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوۡلِ وَاَطَعۡنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ (النور)

اور لوگ کہتے ہیں، کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور رسول پر ایمان لائے، اور ہم نے اطاعت کی، پھر ان میں سے ایک فریق اس سے منہ موڑ لیتا ہے، اور یہ لوگ حقیقت میں مومن ہی نہیں ہیں۔

(۸۴) وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِیَحۡكُمَ بَیۡنَهُمۡ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ وَاِنۡ یَّكُنۡ لَّهُمُ الۡحَقُّ یَاۡتُوۡۤا اِلَیۡهِ مُذۡعِنِیۡنَ (النور)

اور جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، تو ایک فریق اس سے اعراض کرتا ہے، اور اگر وہ سمجھتے ہیں، کہ حق ہمارا ہے تو رسول کے پاس مطیع بن کر حاضر ہو جاتے ہیں

(۸۵) اَفِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا اَمۡ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّحِیۡفَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ

کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے، یا شک میں پڑے ہوئے ہیں، یا ڈرتے ہیں کہ اللہ تم

وَرَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (النور)

اور اس کا رسول ان کی حق تلفی کریں گے بلکہ یہی لوگ ظالم ہیں۔

(۸۶) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (النور)

یقیناً مومنین کا تو یہ قول ہونا چاہیئے، کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو یہ کہیں کہ ہم نے سن لیا، اور ہم نے اطاعت کی، اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں

(۸۷) وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (النور)

اور جو کوئی اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی، اور اللہ سے ڈرے اور پرہیزگاری اختیار کرے، تو بس ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

(۸۸) قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (النور)

کہہ دیجئے کہ اللہ کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم منہ موڑو، تو رسول اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے، اور تم اپنے فرائض کے ذمہ دار ہو، اور اگر اس کی اطاعت کرو گے، تو ہدایت یاب ہو گے، اور رسول کے ذمہ تو صاف صاف پہنچا دینا ہے،

اس آیت میں لفظ "اَطِيْعُوا" اللہ سے پہلے بھی آیا ہے، اور رسول سے پہلے بھی، اگر صرف ایک جگہ ہوتا، تو یہ گنجائش نکل سکتی تھی، کہ دونوں کو ملا کر ایک ہی ہستی مراد ہے، لہٰذا ثابت ہوا، کہ اللہ، اور رسول دو ہستیاں ہیں، نہ کہ ایک مرکز ملت،

دوم۔ اللہ اور رسول کا ذکر کرنے کے بعد جن جن آیات میں ضمیر صیغۂ واحد غائب آیا ہے، اس کا مرجع ذات رسول ہے، کیونکہ دوسری آیات کی طرح اس آیت میں بھی اللہ اور رسول کے ذکر کے بعد ضمیر صیغہ واحد غائب ہے، اور اس آیت میں اس کا مرجع کسی طرح سے بھی اللہ نہیں ہو سکتا۔

سوم۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا، کہ رسول کی اطاعت کے بغیر ہدایت نہیں مل سکتی اس آیت میں کسی صورت میں بھی اللہ اور رسول سے مراد مرکز ملت نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ مرکز ملت

کے ذمہ صرف پہنچانا نہیں ہوتا، بلکہ منوانا بھی ہوتا ہے، حاکم وقت اپنا قانون منوا کر چھوڑتا ہے، لیکن رسالت کا منوانا رسول کے ذمہ لازم نہیں ہوتا، اور نہ وہ رسالت منوانے پر مجبور کرتا ہے، بلکہ وہ رسالت کو پہنچا دیتا ہے، اور یہی اس کا فرض منصبی ہوتا ہے، الغرض اس آیت میں رسول سے مراد حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور ان کی اطاعت ہر ایک فرض ہے، بغیر ان کی اطاعت کے ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

(۸۹) وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (نور)	نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، اور رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے،

اس آیت میں صرف رسول کی اطاعت کا ذکر ہے، لہٰذا جو لوگ اللہ اور رسول سے مرکز ملت مراد لیتے ہیں، اب وہ صرف رسول سے کیا مراد لیں گے؟ حقیقت یہ ہے، کہ اس آیت میں "اللہ" کے لفظ کو چھوڑ کر صرف لفظ "رسول" کا ذکر کرنا، اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ اللہ کی اطاعت بھی رسول کی اطاعت میں مضمر ہے، اگر رسول کی اطاعت ہو گئی، تو بس اللہ کی اطاعت ہو گئی جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے

وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (نساء) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی لہٰذا کہنا یہ چاہیئے، کہ "اللہ ورسول" جہاں دونوں آجائیں، وہاں بھی اس سے مراد رسول ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔

(۹۰) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلٰى أَمْرٍ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا حَتّٰى يَسْتَأْذِنُوهُ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ (النور)	مومن تو صرف وہ لوگ ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، اور جب وہ رسول کے ساتھ کسی کام پر جمع ہوں، تو بغیر اس کی اجازت کے وہاں سے ہلتے نہیں، بیشک جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا، کہ "اللہ ورسول" کے ذکر کے بعد جب ضمیر واحد غائب آئے تو اس کا مرجع عام طور پر رسول ہی ہوتا ہے،

(۹۱) لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ	رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا آپس میں ایک دوسرے کے بلانے کو سمجھتے ہو تحقیق

يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (النور)

اللہ ان لوگوں سے خوب واقف ہے، جو تمہارے پاس سے نظر بچا کر کھسک جاتے ہیں، پس ایسے لوگوں کو جو رسول کے حکم و فعل کی مخالفت کرتے ہیں ڈرتے رہنا چاہیئے کہ کہیں وہ کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں، یا دردناک عذاب میں نہ پھنس جائیں۔

کیا کوئی دوسرا شخص بھی اس خصوصیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہے،

(۹۲) وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا (الفرقان)

اور قیامت کے روز ظالم اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے گا، اور کہے گا اے کاش میں نے رسول کی راہ اختیار کی ہوتی،

(۹۳) حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا :۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (الشعراء)

اللہ سے ڈرو، اور صرف میرا ہی کہا مانو

(۹۴) حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا :۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (الشعراء)

اللہ سے ڈرو، اور صرف میرا ہی کہا مانو،

(۹۵) اسی چیز پر حضرت ہود علیہ السلام نے پھر زور دیا، اور دوبارہ فرمایا

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (الشعراء)

اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو۔

(۹۶) حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا :۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (الشعراء)

اللہ سے ڈرو، اور صرف میری اطاعت کرو،

(۹۷) اسی چیز پر حضرت صالح علیہ السلام نے پھر زور دیا، اور فرمایا :۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (الشعراء)

اللہ سے ڈرو، اور صرف میری اطاعت کرو،

(۹۸) حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا :۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (الشعراء)

اللہ سے ڈرو، اور صرف میری اطاعت کرو،

(۹۹) حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا :۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (الشعراء)

اللہ سے ڈرو، اور صرف میری اطاعت کرو

(۱۰۰) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا :۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (آل عمران)

اللہ سے ڈرو اور صرف میری اطاعت کرو،

ان آیات بینات سے ثابت ہوتا ہے، کہ اسلام کا اصول اولین نبی کی اطاعت ہے، اور یہ کہ ہر نبی نے صرف اپنی ہی اطاعت کی طرف دعوت دی ہے، حالانکہ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے، کہ اللہ سے ڈرو، اور صرف اسی کی اطاعت کرو، لیکن ایسا نہیں کہا، بلکہ اپنی اور صرف اپنی اطاعت کی طرف بلاتے رہے، کیا اس سے نبی کی اطاعت کی اہمیت واضح نہیں ہوتی۔

(۱۰۱) فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (الشعراء) — اگر یہ لوگ آپ کی نافرمانی کریں، تو آپ کہہ دیجئے، کہ میں تمہارے اعمال سے بیزار ہوں

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے، کہ دوسرے انبیاء کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض ہے

(۱۰۲) فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِیْنِ (النمل) — پس آپ اللہ تعالے پر بھروسہ رکھیے، بے شک آپ حق مبین پر ہیں۔

کیا کسی مرکز ملت کو بھی یہ سند عطا ہوئی ہے۔

اللہ تعالے نے موسیٰ، اور ہارون علیہما السلام سے فرمایا

(۱۰۳) اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ (القصص) — تم اور جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے غالب رہیں گے،

مندرجہ ذیل ارشاد باری میں غور فرمایئے:۔

(۱۰۴) اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (الاحزاب) — نبی مومنین کے لئے ان کے نفوس سے زیادہ اولیٰ ہے، اور نبی کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔

کیا کوئی مرکز ملت بھی اس حکم میں داخل ہے، کیا یہاں بھی نبی سے مراد مرکز ملت ہے، کیا ہر خلیفہ کی بیویاں امت کی مائیں ہیں، کیا خلفائے راشدین میں سے حضرت عمر رضؓ وغیرہ کی بیویوں سے دوسروں نے نکاح نہیں کئے، پس ثابت ہوا، کہ رسول سے مراد مرکز ملت ہرگز نہیں، اور نہ رسول کو مومنین میں شمار کیا جاتا ہے، بلکہ مومنین سے الگ ایک اور اعلےٰ اور انسب مرتبہ کے ذیل میں اس کا ذکر آتا ہے، وہ اگرچہ مومن ہوتا ہے، لیکن کیونکہ وہ تمام مومنین کے لئے نمونہ اور مطاع ہوتا ہے، لہٰذا اس کے متعلق احکام کو خصوصیت سے علیحدہ بیان کیا جاتا ہے، تاکہ عام مومنین کی طرح کوئی اس کو امت کا ایک معمولی فرد نہ سمجھ لے۔

(۱۰۵) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (الاحزاب)

ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور قیامت کے دن کی امید رکھتے ہیں، اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں، رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

کیا کسی مرکز ملت کی بھی یہی شان ہے، کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اس کے لئے مرکز ملت کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہو، ہرگز نہیں، مرکز ملت سے غلطی ہو سکتی ہے اس کے لئے صواب پر ہونے کی کوئی آسمانی سند موجود نہیں ہوتی، زندگی سے اس کی خطا کی اصلاح ہوتی ہے، لہذا وہ زندگی کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا، پس ثابت ہوا، کہ اس آیت میں رسول سے مراد مرکز ملت ہرگز نہیں ہو سکتا،

(۱۰۶) وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا (الاحزاب)

اور جب مؤمنین نے لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے، یہ وہ ہے، جس کا اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا، اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا تھا، اس سے ان کی ایمانی قوت اور اطاعت شعاری اور بڑھ گئی،

کیا مرکز ملت بھی ایسا وعدہ کر سکتا ہے، ہرگز نہیں کر سکتا، اس کو کیا خبر کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے رسول کے پاس وحی آتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ اطلاع پاکر وعدہ کر سکتا ہے، پھر جس آیت میں یہ وعدہ کیا گیا تھا، وہ آیت قرآن میں کہاں ہے، کیونکہ وہ قرآن میں نہیں، لہذا اس کا نزول قرآن کے علاوہ کسی اور وحی کے ذریعہ ہوا، اور وہ وحی وہی ہے جس کو حدیث کہا جاتا ہے، اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ اللہ و رسول سے مراد مرکز ملت ہرگز نہیں ہو سکتا، اور جہاں کہیں بھی قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں، ان سے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہوتے ہیں، نہ کہ فرضی الفاظ "مرکز ملت" مراد ہوتے ہیں۔

(۱۰۷) وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا (الاحزاب)

اے نبی کی بیویو! اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طلب گار ہو تو پھر اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لئے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

کیا اس آیت میں "اللہ ورسول" سے مراد مرکز ملت ہے، کیا اس آیت میں ازواج مطہرات سے کہا جارہا ہے، کہ تم جو بھی مرکز ملت ہو، اس کی طلب گار رہو، اس کی طرف رغبت کرو، اس کی اطاعت کرو، ہرگز نہیں، بلکہ رسول سے مراد یہاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں،

(۱۰۸) وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا (الاحزاب)

اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی، ہم اس کو دہرا اجر دیں گے اور اس کے لئے ہم نے عزت والا رزق تیار کر رکھا ہے۔

کیا ازواج مطہرات کو حکم دیا جارہا ہے، کہ امیر وقت کی فرمانبرداری کرو، ہرگز نہیں، بلکہ رسول سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

(۱۰۹) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب)

کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لئے یہ حلال نہیں ہے، کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو ان کو اس معاملہ میں اختیار باقی رہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا۔

(۱۱۰) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (الاحزاب)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، بلکہ وہ تو اللہ کے رسول ہیں، اور نبیوں کے ختم کرنے والے، اور اللہ ہر ایک شے کو جاننے والا ہے۔

کیا یہاں بھی رسول اللہ سے مراد مرکز ملت ہے! اور اگر ہے، تو پھر اس کے ساتھ خاتم النبیین کا کیا جوڑ ہے؟ لہذا ثابت ہوا، کہ رسول سے مراد کہیں بھی مرکز ملت نہیں، بلکہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں، جیسا کہ اس آیت میں صریحاً نام نامی واسم گرامی مذکور ہے۔

(۱۱۱) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب)

اے نبی ہم نے آپ کو شاہد، مبشر، نذیر اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

کیا اس آیت میں بھی نبی سے مراد مرکز ملت ہو سکتا ہے۔

(۱۱۲) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (الاحزاب)

اے نبی ہم نے آپ کے لئے آپ کی وہ بیویاں حلال کر دی ہیں، جن کا آپ نے مہر دیا ہے اور وہ لونڈیاں بھی حلال ہیں، جو اللہ تعالےٰ جہاد میں آپ کے قبضہ میں دے دے اور چچا کی بیٹیاں، پھوپھی کی بیٹیاں، ماموں کی بیٹیاں، اور خالہ کی بیٹیاں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو، اور وہ مومن عورت جو اپنے نفس کو نبی کے حوالہ کر دے، اگر نبی اس سے نکاح کا ارادہ کرے، یہ بات خالص آپکے لئے ہے رمؤمنین کے لئے نہیں ہے

کیا یہ خصوصیت ہر مرکز ملت کو حاصل ہے؟ ہرگز نہیں۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا، اور بالبداہت ثابت ہوا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ عام مؤمنین سے بہت بلند ہے، اور آپ کا شمار عام مؤمنین سے علیحدہ ہوتا ہے، اور عام مومنین سے بہت ہی اونچے درجہ میں آپ کا ذکر آتا ہے، اور آپ کے لئے مخصوص احکام ہوتے ہیں، جو مومنین کے لئے نہیں ہوتے، لہٰذا یہ کہنا، کہ رسول بھی مؤمن ہے، اور اس پر بھی مرکز ملت کی اطاعت فرض ہے، مضحکہ خیز ہے۔

(۱۱۳) يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا (الاحزاب)

جس دن کافر آگ میں ڈالے جائیں گے، تو کہیں گے، اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی، اور رسول کی اطاعت کی ہوتی

(۱۱۴) وَمَا كَانَ لَكُمْ أَن تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَن تَنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِن بَعْدِهِ أَبَدًا إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمًا (الاحزاب)

تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے، کہ اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاؤ، اور نہ تمہارے لئے یہ حلال ہے، کہ کبھی بھی اس کے بعد اس کی بیویوں سے نکاح کرو، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے۔

کیا مرکز ملت کی بیویوں سے بھی اس کی موت کے بعد نکاح حرام ہے؟ کیا خلفاء کی بیویوں سے ان کے مرنے کے بعد نکاح نہیں ہوئے،

(۱۱۵) إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (الاحزاب)

بے شک اللہ تعالےٰ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے رہتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود و سلام بھیجتے رہا کرو،

(۱۱۶) إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا (الاحزاب)

بے شک جو لوگ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہے، اور ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے

(۱۱۷) مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا (الاحزاب)

جس شخص نے اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، تو اس نے حقیقت میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی،

(۱۱۸) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الاحزاب)

اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۱۱۹) وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰسٓ)

اور نبی کو ہم نے شاعری نہیں سکھائی، اور یہ اس کے شایانِ شان بھی نہیں۔

کیا یہاں بھی نبی سے مراد مرکز ملت ہے؟ کیا بہت سے مرکز ملت شاعر نہیں تھے، کیا حضرت علی رضؓ شاعر نہیں تھے؟

(۱۲۰) قَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ (الدخان)

بے شک ان کے پاس رسول مبین آ چکا ہے۔

(۱۲۱) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى

بے شک جو لوگ کافر ہیں، اور اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں، اور ہدایت کے ظاہر ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت

لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ (محمد)	کرتے ہیں، یہ لوگ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ ان کے سارے اعمال ضائع کر دیئے جائیں گے
(۱۲۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (محمد۲)	اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اعمال کو ضائع مت کرو،
(۱۲۳) اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (الفتح)	بے شک ہم نے آپ کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے، اے مسلمانوں یہ اس لئے کہ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اس کو قوت دو، اس کی توقیر کرو، اور صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کرو،
(۱۲۴) وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا (الفتح)	اور جو اللہ تعالےٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے، تو ہم نے ایسے کافروں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے
(۱۲۵) مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا (الفتح)	جو اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اس کو ایسے باغوں میں داخل کیا جائے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جو کوئی منہ موڑے گا، تو اللہ تعالےٰ اس کو دردناک عذاب دے گا۔
(۱۲۶) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (الفتح)	وہی ہے، جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرے، اور اللہ گواہی کے لئے کافی ہے،
(۱۲۷) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (الفتح)	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں،

یعنی کوئی مرکز ملت رسول نہیں ہے، بس محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہیں، اس صراحت کے باوجود اگر کوئی شخص رسول کے معنی مرکز ملت کرے، تو وہ یہ سوچ لے، کہ میدان محشر میں اللہ تعالیٰ

کو کیا جواب دے گا۔

(۱۲۸) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (حجرات)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو، اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ سمیع وعلیم ہے۔

(۱۲۹) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (الحجرات)

اے ایمان والو! نبی کی آواز سے اپنی آواز کو بلند مت کرو، اور اس سے بات کرتے وقت اتنے زور سے بات مت کرو جتنے زور سے کہ آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، ایسا نہ ہو، کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

اب اگر تسلیم کر لیا جائے، کہ رسول بھی ایمان لانے والوں میں شامل ہے، اور ہر وہ حکم جو ایمان لانے والوں پر فرض ہے، رسول پر بھی اسی طرح فرض ہے، تو پھر بتایا جائے، کہ اس آیت کا مطلب کیا ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا، کہ وہ نبی کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کریں، اور وہ نبی کون تھا؟

(۱۳۰) إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ (الحجرات)

بے شک جو لوگ رسول اللہ کی موجودگی میں اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں، جن کے قلوب کو اللہ تعالےٰ نے تقویٰ کے لئے آزما لیا ہے، ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

(۱۳۱) وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ (الحجرات)

خبردار اللہ کا رسول تم میں موجود ہے، اگر وہ بہت سی باتوں میں تمہارا کہنا مان لے، تو تم مشکل میں مبتلا ہو جاؤ۔

(۱۳۲) إِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (الحجرات)

اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروگے تو اللہ تمہارے عملوں میں ذرا سی بھی کمی نہیں کریگا، بے شک اللہ غفور رحیم ہے

(۱۳۳) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات)	یقیناً مومن تو وہ لوگ ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں، پھر انہوں نے شک نہیں کیا، اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا یہی لوگ سچے ہیں۔
(۱۳۴) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم)	نبی اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا، وہ جو کچھ کہتا ہے، وحی ہوتی ہے۔
(۱۳۵) اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (الحديد)	اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اس میں سے خرچ کرو، جس میں تم خلیفہ بنائے گئے ہو پس تم میں سے جو لوگ ایمان لائے، اور خرچ کیا ان کے لئے بڑا اجر ہے
(۱۳۶) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ (الحديد)	اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے پس یہی لوگ اللہ کے نزدیک صدیق ہیں، اور شہید ہیں۔
(۱۳۷) سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (الحديد)	اپنے رب کی مغفرت کی طرف دوڑو، اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کے مثل ہے، وہ جنت ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے، جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے،
(۱۳۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الحديد)	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اللہ تم کو اپنی رحمت سے دو حصے عطا فرمائے گا، اور تمہارے لئے نور مقرر کردے گا، کہ تم اس کی روشنی میں چل سکو، تم کو معاف کردے گا اور اللہ غفور رحیم ہے۔

(۱۳۹) ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (المجادلة)

یہ احکام اس لئے دیئے جارہے ہیں، تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ،

(۱۴۰) اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (المجادلة)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہ اسی طرح ہلاک ہوں گے جس طرح ان سے پہلے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں، اور بے شک ہم نے روشن نشانیاں اتاری ہیں، اور کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

(۱۴۱) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَیَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَیَّوْكَ بِمَا لَمْ یُحَیِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَیَقُوْلُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ یَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِیْرُ (المجادلة)

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جن کو کانا پھوسی کرنے سے منع کیا گیا تھا وہ لوگ پھر وہی کام کر رہے ہیں جس سے منع کیا گیا تھا اور گناہ، زیادتی، اور رسول کی نافرمانی کے متعلق کانا پھوسی کرتے ہیں، اور جب آپ کے پاس آتے ہیں، تو آپ کو اس طرح سلام کرتے ہیں، جس طرح اللہ نے نہیں کیا، اور پھر اپنے دلوں میں کہتے ہیں، کیوں ہم پر ہمارے اس کہنے کی وجہ سے اللہ عذاب نہیں بھیجتا، ان کے لئے دوزخ کافی ہے، اس میں وہ داخل ہوں گے، پس وہ بہت بری جگہ ہے

(۱۴۲) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ (المجادلة)

اے ایمان والو! تم جب کانا پھوسی کرو تو گناہ، زیادتی، اور رسول کی نافرمانی کے لئے کانا پھوسی مت کرو، بلکہ نیکی اور اور تقوے کے لئے کانا پھوسی کیا کرو، اور اللہ تعالٰے سے ڈرتے رہو، جس کی طرف تم اکٹھے کئے جاؤ گے

(۱۴۳) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ

اے ایمان والو! جب تم رسول سے کانا پھوسی کیا کرو، تو پہلے صدقہ دیا کرو، یہ تمہارے

يَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (المجادلة)

لئے بہتر اور پاکیزہ تر ہے، پھر اگر تمہارے پاس کچھ نہ ہو، تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے

(۱۴۴) ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المجادلة)

کیا تم سرگوشی سے پہلے صدقہ دینے سے ڈر گئے، پس اگر تم یہ نہ کر سکے، تو اللہ تم تمہاری طرف متوجہ ہوا، پس نماز کو قائم کرو زکوٰۃ دیا کرو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو، اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے،

(۱۴۵) اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ (المجادلة)

بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، یہی لوگ ذلیل ہونے والوں میں سے ہیں،

(۱۴۶) لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (المجادلة)

آپ کوئی ایسی قوم نہیں پائیں گے، جو اللہ تعا پر اور قیامت پر ایمان رکھتی ہو، اور پھر بھی ان لوگوں سے دوستی رکھے، جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، خواہ وہ لوگ ان کے آباء واجداد، اولاد واحفاد، بھائی اور قبیلہ والے ہی کیوں نہ ہوں، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو ثبت فرما دیا ہے اور اپنی روح کے ساتھ ان کو تقویت دی ہے ان کو جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اللہ ان سے راضی ہوا، وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہ اللہ کی جماعت ہے، خبردار اللہ ہی کی جماعت کے لوگ فلاح پانے والے ہیں

(۱۴۷) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ

یہ سزا انہیں اس لئے دی گئی، کہ انہوں نے اللہ

وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الحشر)

اور اس کے رسول کی مخالفت کی، اور جو اللہ تعالٰے کی مخالفت کرتے، پس بے شک اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔

(۱۴۷) وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (الحشر)

اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو دیا، اس کے لئے تم نے نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ، لیکن اللہ تعالٰے اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے، مسلط کر دیتا ہے، اور اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

(۱۴۸) مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الحشر)

جو مال اللہ تعالٰے رسول کے قبضہ میں دے وہ اللہ کے لئے ہے، رسول کے لئے ہے اور اقربا، مساکین اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ وہ دولت اغنیاء ہی میں نہ آتی جاتی رہے اور جو تم کو رسول دے، وہ لے لو، اور جس سے منع کرے، اس سے باز رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تو سخت عذاب دینے والا ہے۔

(۱۴۹) لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحشر)

فئے کا مال ان فقراء مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور اپنے مالوں سے محروم کر دیئے گئے، جو اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے جویا ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔

(۱۵۰) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ

اے نبی جب آپ کے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اس بات پر، کہ اللہ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کریں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی

وَلَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ أَيْدِيْهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الممتحنة)	اولاد کو قتل نہ کریں گی، نہ کسی پر بہتان تراشی کریں گی، اور نہ معروف کاموں میں آپؐ کی نافرمانی کریں گی، تو آپ ان سے بیعت لے لیجئے، اور ان کے لئے استغفار کیجئے بیشک اللہ غفور رحیم ہے،
(۱۵۱) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (صف)	اے مسلمانو! کیا میں تم کو ایسی تجارت نہ بتاؤں کہ جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو،
(۱۵۲) وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (المنافقون)	عزت اللہ کے لئے ہے، اس کے رسول کے لئے ہے، اور مؤمنین کے لئے ہے، لیکن منافقین نہیں جانتے،

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے رسول کو مؤمنین سے الگ ذکر فرمایا ہے۔

(۱۵۳) فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (تغابن)	پس ایمان لاؤ اللہ پر، اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا، اور اللہ تم خبردار ہے اس چیز سے جو تم کرتے ہو،
(۱۵۴) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (التغابن)	اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم اطاعت سے منہ موڑو، تو ہمارے رسول کے ذمہ تو صرف علی الاذعان پہنچا دینا ہے
(۱۵۵) مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ	جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے واسطے دوزخ کی آگ ہے جس

فِيهَا أَبَدًا (الجن) میں وہ ہمیشہ رہے گا،

(۱۵۶) لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۔ رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۔ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (بينة) اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر کفر سے باز آنے والے نہیں تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس روشن دلیل نہ آتی، یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول نہ آتا، جو پاک صحیفے تلاوت کرتا ہو جس میں ٹھوس مضامین ہوں

خلاصہ الغرض اس قسم کی تمام آیات کا خلاصہ یہ ہے، کہ رسول پر ایمان لانا فرض، رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا لازمی، رسول کی نافرمانی اور مخالفت کرنے والا جہنمی ہے، بار بار اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اطاعت رسول پر زور دیا، کہیں اللہ کے ساتھ رسول کا لفظ آیا، تو کہیں صرف رسول کا ذکر کر دیا، غرض یہ کہ اس کثرت سے اطاعت رسول کا ذکر کیا، کہ اب اس میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا، کہ رسول کی اطاعت فرض ہے، اور ہر مسلمان پر فرض ہے، اور قیامت تک کے لئے فرض ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ نہیں کیا،

اور جو لوگ یہ کہتے ہیں، کہ رسول سے مراد مرکز ملت ہے، انہیں سوچنا چاہیئے، کہ اگر اللہ کا یہی منشا تھا، تو کہیں تو ان الفاظ کو یا ان کے مترادف الفاظ کو استعمال کیا ہوتا، کہ مرکز ملت کی اطاعت فرض ہے، قرآن کی جو تشریح وہ کرے، اس کا ماننا فرض ہے، اس سے اختلاف کفر ہے، حیرت ہوتی ہے، کہ مسئلہ تو اتنا اہم، اور اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی اس کی وضاحت نہیں کی، کہ رسول سے مراد مرکز ملت ہے، یا امیر المومنین خلیفۃ المسلمین ہے، اس وضاحت کا نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے، کہ رسول سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، مزید برآں بعض آیات اس قسم کی اوپر گذر چکی ہیں جن میں رسول کے معنی مرکز ملت کے ہو ہی نہیں سکتے، لہٰذا یہی ماننا پڑے گا، کہ اطاعت رسول ہی وہ اہم شعبہ دین ہے، جس کے بغیر اسلامیات ہیچ ہے، تمام انبیاء علیہم السلام صرف اپنی اطاعت ہی کی طرف دعوت دیتے رہے، کیوں؟ اس لئے کہ ان کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے لئے ان کو وسیلہ بنایا ہے، اور اپنی اطاعت کو ان کی اطاعت میں منتقل کر دیا ہے، اور یہ کہہ کر معاملہ بالکل صاف کر دیا ہے، کہ:۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ جس نے رسول کی اطاعت کی، بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے رسول کی

عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (النساء) — اطاعت سے منہ موڑا، تو اسے رسول آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

اگر رسول کی اطاعت محض سیاسی اطاعت ہوتی، تو اطاعت رسول پر اتنا زور نہ دیا جاتا، بلکہ امیر کی اطاعت پر زور دیا جاتا، اطاعت رسول پر زور اور اطاعت امیر کا صرف ایک مرتبہ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے، کہ رسول کی اطاعت شرعی، دینی، سیاسی ہر لحاظ سے ضروری ہے، اور یہ کہ رسول کے اقوال و افعال قوانین شرعیہ کا ماخذ ہیں، اسی لئے اللہ تعالےٰ نے اسوۂ رسول کے اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے، اپنی محبت کو اس کی پیروی کے ساتھ مشروط کر دیا ہے اور فیصلہ رسول کو برضا و رغبت بے چون و چرا تسلیم کرنے کا حکم دیا، اور جو فیصلہ رسول کو تسلیم نہ کرے یا تسلیم تو کرے، لیکن دل میں اس کے تسلیم کرنے سے ایک قسم کی چبھن ہو، یا شک ہو، تو قسم کھا کر اعلان فرمایا، کہ وہ مؤمن نہیں، ارشاد باری ہے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء)

تیرے رب کی قسم وہ لوگ مومن نہیں جو اپنے تمام اختلافات میں تجھ کو حکم نہ بنائیں، پھر تیرے فیصلہ سے دل میں تنگی محسوس نہ کریں بلکہ برضا و رغبت تسلیم کر لیں۔

(وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ)